

شریک

قدرت اللہ شہاب



مرتبہ شیما مجید

ساقی آر بائوبق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، آجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224



شہاب نگر

قدرت اللہ شہاب



مرتبہ

شیمامجید

القمر انٹرپرائزز
رحمن مارکیٹ
غزنی سٹریٹ
اُردو بازار ○ لاہور

طبعة مكرمه، مكرمه، مكرمه



الکیمیو انٹرنیشنل

انجمنہ، مکرّمہ، مکرّمہ، مکرّمہ

ISBN 978-969-8981-48-8

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت : ۲۰۱۱
مطبع : زاہد شہیر پرنٹرز، لاہور
قیمت : ۴۵۰ روپے

انتساب

بانو قدسیہ، اشفاق احمد

ممتاز مفتی

اور

ڈاکٹر ثاقب شہاب

کے نام



حسن ترتیب

1	مشفق خواجہ	پیش لفظ
10	شیما مجید	حرفہ تقدیم
21		آج رے آج تیری کون سی گل سیدھی
25	(آپ بیتی)	۱۔ میں کون ہوں
25		۱۔ باتیں شہاب صاحب کی
97		۲۔ قدرت اللہ شہاب
99	(انٹرویوز)	۲۔ کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
101		۱۔ انٹرویو : سجاد باقر رضوی، کشور ناہید، جیلانی کامران
114		۲۔ انٹرویو : الطاف حسن قریشی
132		۲۔ انٹرویو : طاہر مسعود
147		۲۔ انٹرویو : انعام الحق جاوید
155		۲۔ انٹرویو : سحر صدیقی
163		۲۔ شہاب صاحب سے مددہ بھینڑ۔ انتظار حسین
166		۲۔ انٹرویو : تیموری۔ رضا عباس
169		”قدرت اللہ شہاب کی باتیں“ فرزانہ نصرت
176		تین سوال
179		اردو کا مستقبل (مذاکرہ)
184		تصوف (ذوالفقار احمد تابش)
187	(خطبات)	لب تشنہ و تقریر
189		۱۔ یونیسکو سے خطاب
193		۲۔ اقبال کا جشن صد سالہ

197	۳۔ ادیب اور آزادی تحریر
199	۴۔ حکومت کا مرتبہ طفر
201	۵۔ گلڈ کی پہلی سالگرہ پر تقریر
203	۶۔ گلڈ کے تین سال
206	۷۔ سالانہ خطبہ
209	۸۔ تن کی مٹری من کے جالے
212	۹۔ آزادی کے ثمرات
214	۱۰۔ ادب لطیف کی پچاسویں سالگرہ پر خطاب
217	۱۱۔ ٹیڈی یانڈی
220	۱۲۔ مولوی عبدالحق
221	۱۳۔ پس چہ باید کرد
225	۱۴۔ خطبہء صدارت
227	(افسانے) خلد کا اک در
229	۱۔ چند راوی
233	۲۔ سردار جسونت سنگھ
242	۳۔ صنم پلکیت
246	۴۔ فرازونی
252	۵۔ مایا
256	۶۔ جال
260	۷۔ پہلی تحوواہ
264	۸۔ غریب خانہ
270	۹۔ سب کا مالک
277	۱۰۔ نجمی کے بال
281	۱۱۔ شجر ممنوعہ
284	۱۲۔ دو تارے
287	(مضامین) ۵۔ تھنگی ذوق کے مضمون
303	۱۔ قناعت
305	۲۔ آٹھ سال قصر صدارت میں
308	۳۔ سرکاری ملازم کی پینلنس شیٹ

314	۴۔ دورہ
316	۵۔ لیڈر
318	۶۔ جنگی قیدی اورادیوں کی عذرخواہی
322	۷۔ پاکستان میں تعلیم
328	۸۔ طلبہ اور سیاست
332	۹۔ ایس ایس اینوٹریا
336	۱۰۔ چین کا ثقافتی انقلاب
343	۱۱۔ دہلی کا سفر
347	۱۲۔ چناب کے کنارے
350	۱۳۔ کافرستان
353	۱۴۔ دوڑ پیچھے کی طرف
355	۱۵۔ صدر بھٹو کے نام ایک خط
358	۱۶۔ ادیب اور مسئلہ کشمیر
361	۱۷۔ اینٹ کا جواب روپیا
364	۱۸۔ سیرت نگاری کا فن
366	۱۹۔ التماس
368	۲۰۔ حسن نظر
369	۲۱۔ سیاحت
370	۲۲۔ نیا ورق
371	۲۳۔ مشاہیر
373	۲۴۔ میرے کردار
375	۲۵۔ حرف شیریں
376	۲۶۔ پیغام
377	۲۷۔ سات سمندر پار
379	۲۸۔ حرفے چند
382	۲۹۔ پہلا شمارہ
384	۳۰۔ پاکستان تھوڑے حقیقت تک
387	۳۱۔ یادگار غالب
388	۳۲۔ پچاس روپے کا خط
391	۳۳۔ آخری تحریر

(شخصیات)

دوم تحریر

403

405

409

412

414

418

420

423

424

425

428

430

۱۔ قائد اعظم کے تین روپ

۲۔ مولانا مودودی

۳۔ مہاراجہ کشمیر

۴۔ ڈاکٹر احمد سونیکارنو

۵۔ بابائے اردو

۶۔ میراجی

۷۔ میر رفیق

۸۔ علی پور کا ایلی

۹۔ محمد طفیل

۱۰۔ عباس خاں

۱۱۔ کاظمی صاحب

(خطوط)

محشر خیال

431

433

۱۔ قدرت اللہ شہاب بنام مرتبہ

453

455

476

(فلم - تمثیل)

تصویر کے پردے میں

۱۔ نئی کرن (دستاویزی فلم)

۲۔ شہید انتظار کر رہے ہیں۔ (تمثیل)

481

481

انتظاریہ

۱۔ یونیورسل ڈے پر خطاب



پیش لفظ

قدرت اللہ شہاب کی زندگی میں ان کے سرکاری منصب کی وجہ سے ان کی ادبی حیثیت کچھ دھندلائی سی رہی۔ انہیں ”یا خدا“ کے مصنف سے زیادہ ایک مقتدر بیوروکریٹ کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ ان کے حلقہ بگوشوں اور حلقہ باندھنے والوں میں اگرچہ کئی صفِ اوّل کے ادیب شامل تھے لیکن انہوں نے بھی شہاب صاحب کی ادبی شخصیت کو وہ اہمیت نہ دی جس کی یہ مستحق تھے۔ یہ لوگ ان کے سرکاری جاہ و منصب ہی کو ان کی کمالات کی انتہا سمجھتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہاب صاحب کے اندر جو ایک تخلیقی فنکار تھا، اسے اپنے کمالات کے اظہار کا بھرپور موقع نہ مل سکا۔ یہ موقع ملا تو اس وقت جب جاہ و منصب سے ان کی جدائی کا مرحلہ آیا۔ شہاب صاحب نے گوشہ نشین ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں میں سفر کیا تو ”شہاب نامہ“ جیسی بے مثال کتاب وجود میں آئی۔ قطع نظر اس سے کہ یہ کتاب حقیقت کی عکاس ہے یا حقیقت اور افسانے کا امتزاج، اس کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو اردو کی کم..... بہت کم کتابوں میں نظر آتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شہاب صاحب تخلیقی سطح پر ایک ایسی طلسمی فضا پیدا کرتے ہیں جو قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ قاری جب ایک مرتبہ اس حصار میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ کتاب کو نہیں پڑھتا، کتاب اپنے آپ کو پڑھواتی ہے۔ ”شہاب نامہ“ کی دوسری خوبی اس کی نثر کا فطری بہاؤ ہے۔ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ لکھنے والے نے لفظوں کی تلاش اور جملوں کی تراش خراش میں جان کھپائی ہے۔ ان کے ہاں خیال اپنے اظہار کے لیے مناسب ترین الفاظ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ لفظوں کی مناسبت و رعایت سے خیال میں ترمیم کی جاتی ہو۔ شہاب صاحب کے انداز بیان کی سادگی اس پرکاری پر فوقیت رکھتی ہے جو انتہائی محنت و کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نثر کو خوبصورت بنانے کے لئے محنت و کاوش کی بھی اپنی اہمیت ہے، لیکن محنت و کاوش کے بغیر ہی خوب صورت نثر تخلیق کی جاسکے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خوب صورتی طمع سازی کے فن میں مہارت کا نتیجہ نہیں، لکھنے والے کے تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔

”شہاب نامہ“ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ”غبارِ خاطر“ کے بعد شاید ہی کسی نثری تصنیف کے حصے میں آئی ہو۔ اس مقبولیت نے پڑھنے والوں کو شہاب صاحب کی دوسری کتابوں کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ان کی وہ کتابیں جو کسی حد تک گلدستہ طاق نسیاں بن چکی تھیں، انہیں بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا گیا۔ پڑھنے والوں میں شیماء مجید بھی تھیں جن کا پڑھنے کا ڈھنگ دوسروں سے الگ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے انوکھا ہے۔ انہیں جب کسی مصنف سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے تو وہ صرف کتابوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ اس مصنف کی ان تحریروں کو بھی تلاش کرتی ہے جو رسالوں اور اخباروں میں فن ہو کر عام نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان فراموش شدہ تحریروں کے مطالعے سے

انہیں جو ادبی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس میں دوسروں کو بھی وہ شریک کر لیتی ہیں۔ یعنی وقت کی گرد تلے دبی ہوئی ان تحریروں کو مرتب کر کے کتابی صورت میں پیش کر دیتی ہیں۔ یہ بہت اہم اور بنیادی کام ہے جس کے لیے سچی لگن، بے پناہ محنت، مطالعے کی وسعت اور نظر کی گہرائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیمہ مجید کو خدا نے ان نعمتوں سے نوازا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے کئی اہم ادیبوں کی گم شدہ تحریروں کو تلاش کر کے ان کا افادہ عام کر دیا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ گویا شیمہ مجید کا کام اپنی مثال آپ ہے۔

شیمہ مجید کو شہاب صاحب کی تحریروں سے دلچسپی پیدا ہوئی تو انہوں نے بڑے انہماک سے اس جہت میں کام شروع کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈیڑھ دو سو صفحات سے زیادہ کا مواد نہیں ملے گا۔ لیکن جب یہ کام منظر عام پر آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ساڑھے چھ سو صفحات سے زیادہ ضخیم کتاب میرے سامنے تھی! ہر تحریر کے آخر میں ماخذ کا حوالہ موجود ہے۔ ان حوالوں کو دیکھتا ہوں تو شیمہ مجید کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کہاں کہاں سے انہوں نے اپنے کام کی چیزیں سمیٹی ہیں۔ ان ماخذوں میں بعض ایسے غیر معروف رسالوں کے حوالے بھی نظر آتے ہیں جنہیں دیکھنا تو دور کی بات ہے، جن کے نام بھی شاید ہی کبھی سننے میں آئے ہوں۔

”شہاب نگر“ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں شہاب صاحب کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں کچھ انٹرویو ہیں جن میں شہاب صاحب نے اپنی ذات کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو ”شہاب نامہ“ میں نہیں ملتیں۔ خصوصاً وہ طویل انٹرویو جو ایثار رائی نے لیا تھا، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بہت سا ایسا مواد ہے جو ”شہاب نامہ“ پر اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ ان انٹرویوز اور ”شہاب نامہ“ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت سے دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

”شہاب نگر“ متنوع تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں مضامین، خطبات، شخصیات سے متعلق تاثراتی تحریروں اور خطوط کے علاوہ ایک دستاویزی فلم کا مسودہ بھی ہے جو شہاب صاحب کی ادبی قلمرو کے ایک نئے منظر کو سامنے لاتا ہے۔ افسانوں سے قطع نظر، اس مجموعے کی بیشتر تحریریں فرمائشی یا وقتی ضرورتوں کے تحت لکھی گئی ہیں، لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر تحریر لکھنے والے کی شخصیت کے کسی نہ کسی نئے پہلو سے متعارف کراتی ہے اور یوں ان تحریروں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور مل جاتی ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شیمہ مجید کے نام کے خطوں میں شہاب صاحب نے زندگی خصوصاً روحانی زندگی کے بعض بنیادی مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ان مسائل پر مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

شیمہ مجید نے ”شہاب نگر“ مرتب کر کے اردو کی اچھی کتابوں کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کتاب کی اہمیت کسی طرح بھی ”شہاب نامہ“ سے کم نہیں ہے۔

مشفق خواجہ

حرفِ تقدیم

شہاب صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کی مختلف پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ ان کی تخلیقات کے ساتھ پیش آیا ہے۔ نفسانے، ماں جی اور یا خدا کے بعد شہاب نامہ کی اشاعت نے ایک ایسے شہاب کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے جو یوں تو ادب کے قارئین کے لیے نیا نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں قدرت اللہ شہاب کے وہ رنگ بھی جھلکتے نظر آتے ہیں جو اس سے قبل نگاہوں سے اوجھل تھے۔ شہاب صاحب کی شخصیت ایک حد تک متنازعہ ضرور رہی ہے۔ شہاب نامہ کی اشاعت کے بعد بہت سے معاملات کے واضح ہو جانے کے باوجود چند معاملات ابھی تک حل طلب ہیں جن کا تعلق ان کی ذات کے ساتھ ہے اور اس کا سبب غالباً ان کی شخصیت کا ہمہ جہت خصوصیات کا حامل ہونا ہے۔ شہاب صاحب نے 1939ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور 1940ء میں انڈین سول سروس میں آ گئے۔ وہ اڑیسہ میں تعینات ہوئے۔ اس زمانے میں تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ قحط بنگال کے تجزیے سے یکجہم خود گزر رہے ہیں۔ قحط بنگال کے تجزیے سے ان کا متاثر ہونا ہمیں ان کے افسانوں ”غریب خانہ“ اور ”سب کا مالک“ میں بخوبی نظر آتا ہے۔ 1941ء میں انہوں نے انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں بھی مقدور بھر کردار ادا کیا۔ انہیں خود بھی انڈونیشیا جانے کا اتفاق ہوا اور وہیں سویٹکارنو مرحوم سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے آزاد کشمیر حکومت کی تنظیم کا کام کیا۔ اس کے بعد مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے وہ گورنر جنرل غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان کے سیکرٹری بھی رہے۔ تین برس تک ہالینڈ میں پاکستان کی سفارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1969ء میں یحییٰ خان کے مارشل لاء میں ملک سے باہر گئے اور استعفیٰ دے دیا۔ 1972ء میں اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں واپس بلا کر دوبارہ وزارت تعلیم کا سیکرٹری مقرر کیا۔ لیکن دو برس بعد اپنی مرضی کے مطابق ریٹائرمنٹ لے لی۔ سروس کے دوران بیرون ملک اندرون ملک اس وقت کی اہم شخصیات سے ان کی ملاقات رہی جن میں جمال عبدالناصر، مارشل ٹیٹو، ماؤزے تنگ، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ڈیگال، کنیڈی، آئزن ہاور کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح شامل ہیں۔

شہاب نامہ اپنے بعض مندرجات کے متنازعہ فیہ ہونے کے باوجود پاکستان کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کی ایک اہم دستاویز ہے جس میں انہوں نے پاکستان کے حکمران لوگوں اور نوکر شاہی کے بہت سے گھناؤنے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ایوب خان کے دور میں ان کی شخصیت بہت اہم رہی اور اس دور کے حوالے سے ان پر کچھ الزامات

بھی عام کیے جاتے رہے۔ لیکن اس سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ شہاب صاحب کی شخصیت، پاکستان کی تہذیبی تاریخ کی ایک ایسی شخصیت ہے۔ جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی شخصیات کی تمام تر تحریریں قومی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قومی سرمائے کی کھوج لگانا، اسے ضائع ہونے سے بچانا اور اسے قوم کی دسترس میں لانا۔ زندہ قوموں کا شعار ہوتا ہے۔ ایسی شخصیات کی زندگی کے متنازعہ فیہ حصے بھی اس قدر اہم ہوتے ہیں جس قدر کوئی اور۔۔۔ ایسی شخصیات کے معاملے میں ذاتی اور غیر ذاتی کی تیز ختم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی ذات غیر ذات کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ ان کے مشاغل معمولات، دلچسپیاں اور ذاتی سطح کی سرگرمیاں۔ یہ تمام معاملات معنی خیزی کی سطح پر آ جاتے ہیں ان کی خامیاں اور عیوب بھی کسی نوع کی جھجک یا شرمندگی کا باعث نہیں بنتے کہ عیوب سے پاک کیا کوئی بشر ہو سکتا ہے؟ جو لوگ اپنے عہد کا استعارہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی ذات اور ذاتی زندگی کے معاملات تک کا مطالعہ اس عہد کا مطالعہ کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب بھی ایسی شخصیت تھے۔ جن کی زندگی کے کئی گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ خصوصاً شہاب نامہ کی اشاعت نے ایسے بہت سے گوشے ہمیں دکھائے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ شہاب صاحب کی وہ تمام تحریریں جو ان کے مطبوعہ افسانوں، مجموعوں یا ان کی خودنوشت کے علاوہ ہیں کسی طرح سے انہیں قارئین کے سامنے لائی جائیں۔ ”شہاب نگر“ کا اشاعتی پروگرام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے اس میں ہم ان کے تمام افسانے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے لیکن کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں شامل کر دیے ہیں۔ ان میں ان کا پہلا افسانہ ”چندر اوتی“ بھی شامل ہے جو ماہنامہ شاہکار لاہور نومبر 1940ء میں چھپا اور جس سے شہاب صاحب کی ادبی زندگی کے آغاز کے معاملات کو سمجھنے میں مدد ملی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ”چندر اوتی“ اور اس نوع کے دیگر افسانے، افسانے کی دنیا میں شہاب کے مرتبے کے تعین کے لیے ہرگز جمع نہیں کیے گئے۔ بلکہ اس کا مقصد وہی ہے جو ہم اس سے قبل بیان کر آئے ہیں۔ یعنی شہاب صاحب کی ادبی زندگی کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی اس کے علاوہ ”شہاب نگر“ میں ان کے مضامین، تقاریر اور انٹرویوز شامل ہیں۔ جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اور اس کے ساتھ وہ خطبات جو انہوں نے تعلیمی اداروں کی تقاریب تقسیم اسناد کے موقع پر دیے ان سب کی مدد سے شہاب صاحب کی تصویر کے خدو خال کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ کوشش بار آور ثابت ہوگی۔

قدرت اللہ شہاب جیسی بڑی اور اہم شخصیت کا ہم پر قرض کفایہ تھا۔ جسے کسی نہ کسی کو ادا کرنا تھا۔ یہ سعادت اگر میرے حصے میں آئی تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ کیونکہ اس کتاب میں جو کام بھی نظر آئے گا وہ شہاب صاحب کا ہے میں نے تو صرف اسے یکجا کیا ہے۔

○ جناب ممتاز مفتی اور جناب اشفاق احمد۔۔۔ جنہوں نے شہاب صاحب کی گمشدہ تحریروں کی بازیابی کے لیے میری رہنمائی فرمائی۔

○ جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔۔۔ جنہوں نے شہاب صاحب کا کم یاب افسانہ ”چندر اوتی“ فراہم کر کے اس

کتاب کو معتبر کر دیا۔

.....0 جناب شجاعت علی خاں..... جنہوں نے ”شہاب نگر“ کے نئے سرے سے پروف پڑھ کر اسے نہ صرف اغلاط سے پاک کیا بلکہ متن کو بھی درست کیا۔

.....0 محترمہ رضوانہ یعقوب..... جنہوں نے ایم اے اردو کے لیے اپنے لکھے ہوئے مقالہ ”قدرت اللہ شہاب بہ حیثیت افسانہ نگار“ سے دو مضامین ”دورہ“ اور ”لیڈر“ فراہم کیے۔

.....0 جناب مظفر محمد علی..... جنہوں نے اس کی ترتیب میں مفید مشورے دیے۔

.....0 جناب طاہر اصغر..... جنہوں نے مسودے کی ترتیب اور کتاب کی تشکیل میں انتہائی محنت سے کام کیا۔

میں ان سب حضرات کی بے حد شکر گزار ہوں کہ ان سب کے تعاون، مفید مشوروں اور رہنمائی کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ناممکن تھی۔

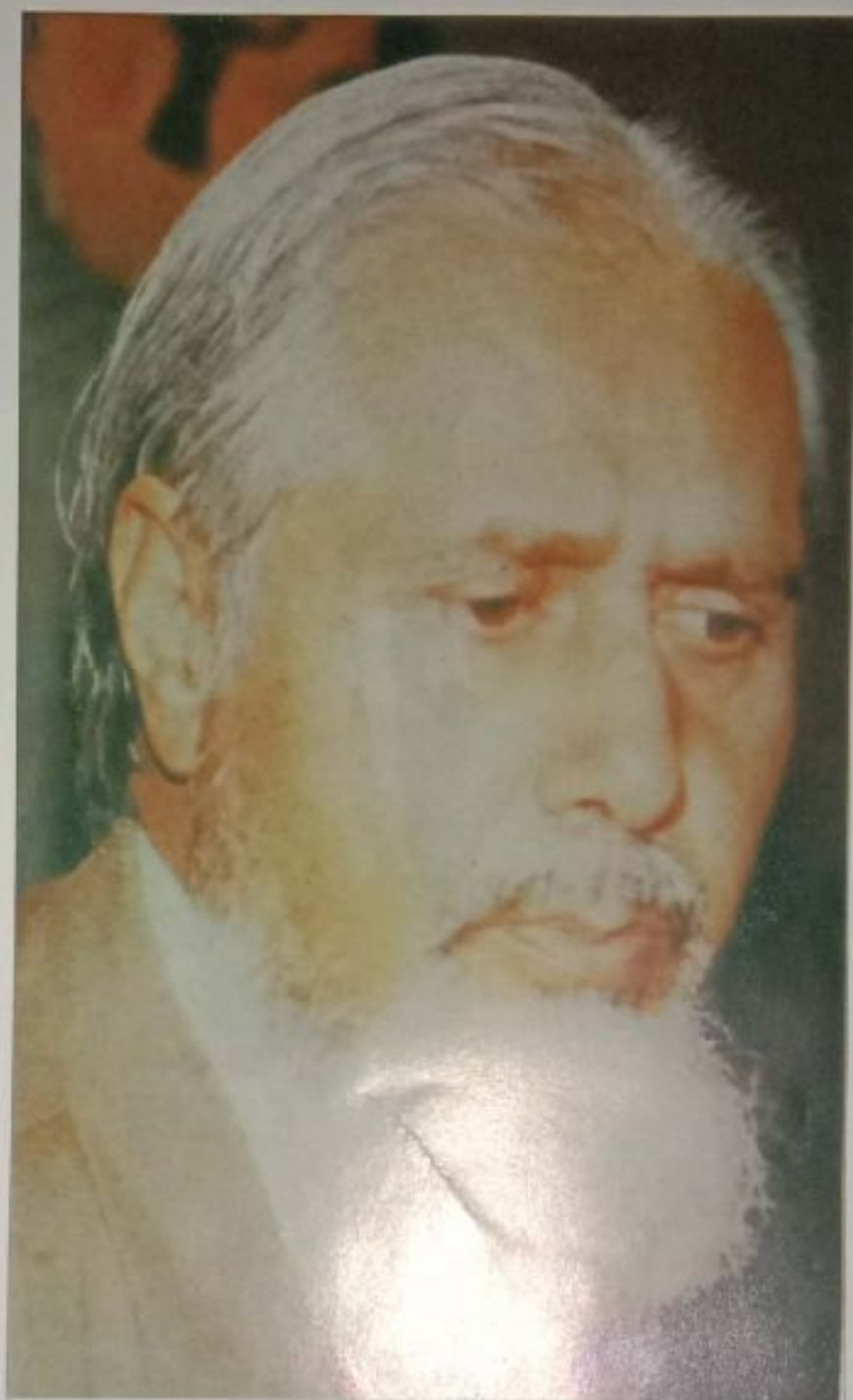
شیما مجید

نیا ایڈیشن

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں لیکن اب کم و بیش دس سال سے یہ کتاب دستیاب نہ تھی۔ پہلے ناشر کو متعدد بار اس کے نئے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے توجہ دلائی لیکن اب شاید ان کی ترجیحات تبدیل ہو چکی ہیں۔ لہذا میں نے القمر انٹرپرائزز کے جناب محمد سعید اللہ صدیق سے نئے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے درخواست کی جسے انہوں نے کمال شفقت سے قبول کیا جس کے لیے میں خصوصی طور پر شکر گزار ہوں۔ اب یہ جدید ایڈیشن نئے اور خوبصورت سائز میں قارئین کے سامنے انہی کی توجہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ توقع ہے ناظرین ہماری تازہ کاوش پسند فرمائیں گے۔

شیما مجید

نومبر ۲۰۰۹ء

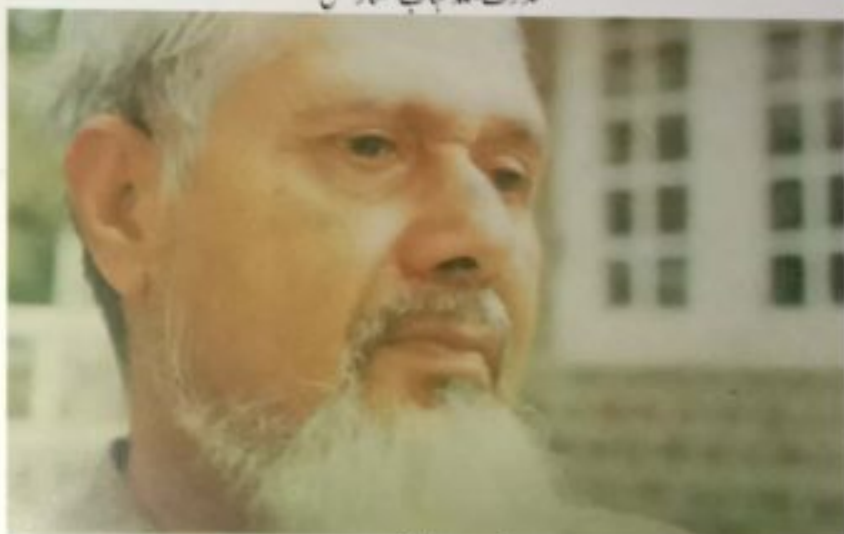


پہا

C M Y B



قدرة الله شهاب ممتاز مفتي



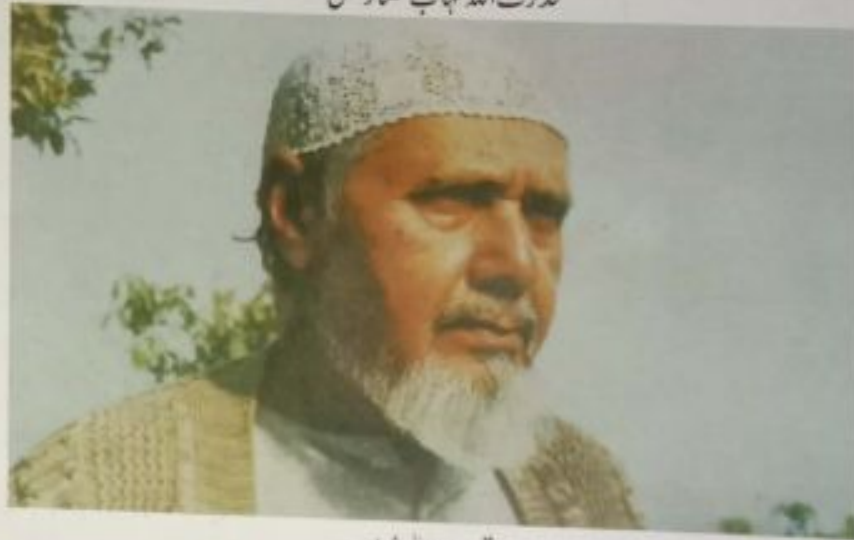
قدرة الله شهاب



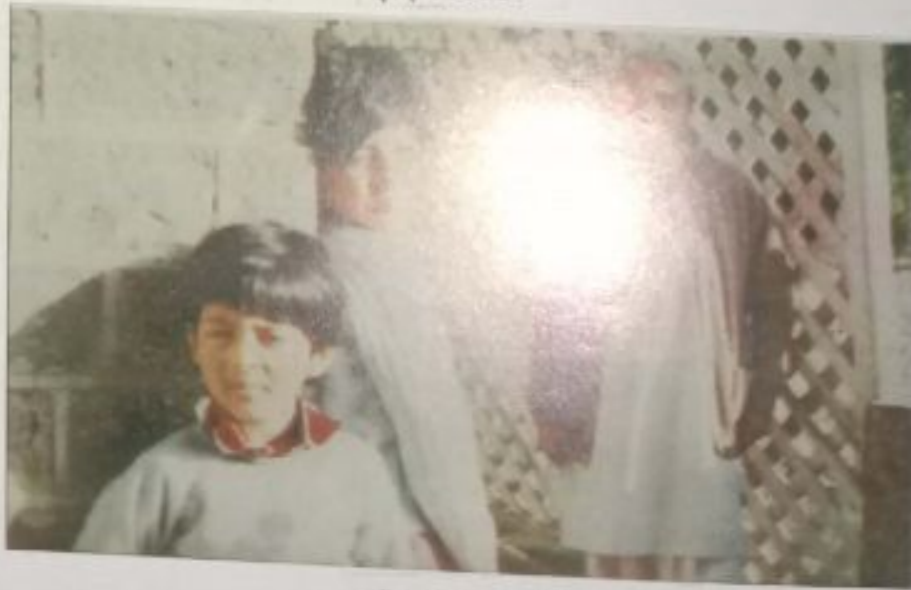
اشفاق احمد، قدرة الله شهاب، ممتاز مفتي



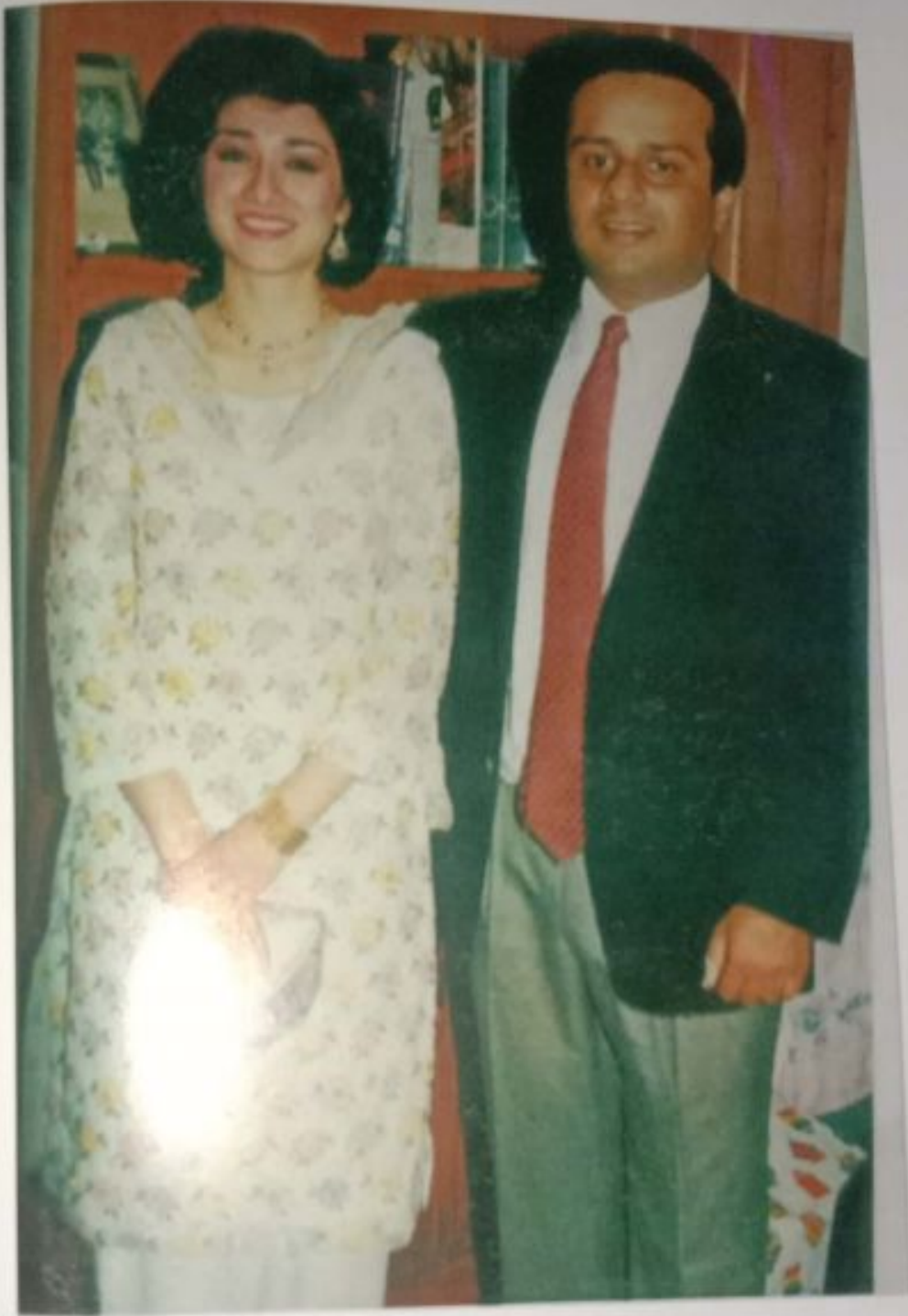
قدرت اللہ شہاب ممتاز مفتی



قدرت اللہ شہاب



قدرت اللہ شہاب بچوں کے ساتھ



قدرت اللہ شہاب کے بیٹے (اکثر) قاتب شہاب اپنی اہلیہ کے ساتھ

آج رے آج تیری کون سی گل سیدھی

روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ کبھی کبھی دعا مانگا کرتے تھے کہ یا اللہ میرا آج کا دن گزری ہوئی گل کے دن جیسا نہ ہو۔ یہ تو خاتم الامین ﷺ کی بات ہے۔ جن کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک ثانیہ، ایک ایک پل قرب و عروج کی شاہراہ پر نئے سے نیا سنگ میل ہوا کرتا تھا لیکن جب کوئی میرے جیسا سنگ دنیا اپنے سلسلہ روز و شب کا جائزہ لیتا ہے تو اسے کرام الکاتبین کے تفصیلی گوشواروں کا سہارا لینے کی حاجت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ میری کوئی آج ایسی نہیں گزری جس کی پچھلی گل یا آنے والی گل سیدھی رہی ہو مضامین کا یہ سلسلہ انہی آج اور گل کے چند میز سے ترقی تھے نقوش کا مجموعہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں کوئی ترتیب نہیں۔ واقعاتی لحاظ سے اس میں کوئی تسلسل نہیں۔ اس میں زیادہ تر وہ حقائق ہیں جو رد ہوا ہوئے۔ کچھ ایسے حقائق ہیں جو حقیقت بننے سے پہلے ہی باطل ہو گئے۔ کچھ تکمیل آرزو کے قفسے ہیں۔ کچھ ناکردہ کاری کے ملبے ہیں، جن کے نیچے غیر آسودہ تمناؤں کی بہت سی ٹیکسٹائیں اور بہت سے مونیجوداز و اس انتظار میں آباد ہیں کہ شاید کوئی منگہ آ جاوے۔ کسی وقت انہیں کھود کر ان پر یہ تختی لگا دے دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو!

اسلوب بیان میں میں نے غالب کے اس فیصلے پر پورا پورا عمل کیا ہے

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بقی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن حتی الوسع کوشش یہی رہی ہے کہ لن ترانی، مصلحت کوشی یا زیب داستان کی سان پر چڑھ کر بنیادی حقائق نہ

زیادہ مسخ ہوں، نہ زیادہ مجروح، کیونکہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔

قدرت اللہ شہاب

میں کون ہوں

(آپ بیتی)

”باتیں شہاب صاحب کی“ ایک طویل انٹرویو ہے، جسے معروف صحافی ایثار رائے نے کیا اور یہ انٹرویو روزنامہ مشرق لاہور میں مندرجہ ذیل تاریخوں میں قسط وار شائع ہوا۔

18 دسمبر 1983ء	یکم جولائی 1983ء	یکم مئی 1983ء
31 دسمبر 1983ء	8 جولائی 1983ء	6 مئی 1983ء
یکم جنوری 1984ء	15 جولائی 1983ء	13 مئی 1983ء
6 جنوری 1984ء	29 جولائی 1983ء	27 مئی 1983ء
13 جنوری 1984ء	5 اگست 1983ء	3 جون 1983ء
20 جنوری 1984ء	12 اگست 1983ء	10 جون 1983ء
27 جنوری 1984ء	23 اگست 1983ء	17 جون 1983ء
10 فروری 1984ء	30 اگست 83ء	24 جون 1983ء

میں کون ہوں اے ہم نفساں اک سوختہ جاں ہوں

اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

(میر تقی میر)

”باتیں شہاب صاحب کی“

یہ غالباً 1951ء کے آخر یا 52ء کے اوائل کی بات ہے۔ پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت قائم ہو چکی تھی۔ صوبائی حکومت نے مرکز سے کچھ سی ایس پی تجربہ کار افسروں کی خدمات پنجاب کے لیے مانگیں، مرکز نے اس درخواست پر میری خدمات صوبائی حکومت کے سپرد کر دیں۔ مجھے میاں ممتاز دولتانہ نے ملاقات کے لیے بلایا۔ وہ مجھے صوبائی محکمہ اطلاعات کی ذمہ داری اس شرط پر سونپنا چاہتے تھے کہ ان کی وزارت اس محکمہ سے جو سیاسی مراعات حاصل کرے، میں اس میں مزاحمت نہ کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی حکومت کی پالیسی مجھے بتادیں میں اس پالیسی کے تحت محکمہ کا نظام چلاؤں گا، البتہ اس محکمہ کے فنڈز کے استعمال اور کام میں بے جا مداخلت مناسب نہ ہوگی۔ میاں ممتاز دولتانہ نے یہ بات پسند نہ کی اور مجھے جھنگ کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا۔ جھنگ میں کم و بیش میں نے دس ماہ گزارے اور بعد میں مجھے ایک تربیتی کورس میں شمولیت کے لیے سوئٹزر لینڈ جانا پڑا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ضلع جھنگ کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے یہ دس ماہ میرے ملازمتی کیریئر کے شاندار ایام ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ضلع پس ماندہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ تھا اور یہاں کی انتظامیہ میں ان وڈیروں کا عمل دخل تھا۔ کوئی چھوٹا آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی زمیندار کی سفارش کے بغیر ضلع کا کوئی سرکاری اہلکار اس کا جائز کام بھی کر دے گا۔ میں نے لوگوں کے مسائل کا جائزہ لیا اور انہیں حل کرنے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ ہفتہ میں دو دن لوگوں سے ملاقات کے لیے مختص کر دیئے۔ یہ ملاقات اس عام سی ملاقات سے جتنی کہ جس میں اعلیٰ سرکاری افسر کسی سائل کی بات سن کر یا اس کی درخواست پر کوئی واجب سافترہ لکھ کر درخواست متعلقہ اہلکار کو بھیج دیتے ہیں اور بعد میں پتہ نہیں کرتے کہ ان کے احکامات پر کیا کارروائی کی گئی بلکہ میں نے اپنے دفتر کے باہر موٹے حروف میں یہ نوٹس بورڈ آویزاں کرایا ”ہر سائل کو ملاقات کی کھلی اجازت ہے، بے مقصد کے ملاقاتی اور سفارشی حضرات تکلیف نہ اٹھائیں“ اور ملاقات کے لیے آنے والوں کے نام ایک رجسٹر میں درج کرنے کے لیے ایک کلرک کو دفتر کے باہر بٹھا دیا تاکہ جو شخص پہلے آئے، اس کا نام درج کر کے اس کی ملاقات پہلے کرائی جائے۔ اس طرح میں نے بلا تخصیص لوگوں سے ملنے کا سلسلہ شروع کیا۔ سائل کی بات سنتا اور متعلقہ اہلکار سے موقع پر ہی کوائف دریافت کر کے حکم دے دیتا۔ ابتداء میں ملاقات کے لیے آنے والوں کی تعداد صرف پندرہ سے بیس افراد تک رہی، بعد میں جوں جوں لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ مجھ سے بلا روک ٹوک مل سکتے ہیں اور مجھ تک رسائی کے لیے انہیں زمیندار کا وسیلہ تلاش نہیں کرنا پڑتا تو یہ تعداد روزانہ ڈیڑھ سو سے دو سو تک پہنچ گئی۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ چار بجے شام دفتر سے گھر کے لیے نکلا، دفتر سے کوشی کا فاصلہ کوئی سو گز ہوگا مگر راستے میں سانکوں نے گھیر لیا اور میں ان کی بات سننے کے لیے رک گیا۔ ان کی بات سننے سنتے بعض اوقات رات کے گیارہ بج جاتے اور گھر پر ماں جی

میرے انگار میں پریشان رہیں۔ یوں لوگوں سے ہار روک و ٹوک ملاقاتوں پر بعض زمینداروں کو مجھ سے شکایت ہونے لگی۔ ایک روز میرے پاس کرل عابد حسین مرحوم آئے اور گلا کیا کہ میں نے انہیں سیاسی طور پر بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا وہ کیسے تو کہنے لگے میرا علاقہ کا ایک شخص آپ سے بندوق کے لائسنس کی تجدید کروا کر گیا ہے اور ہر دوسرے شخص کو بتاتا پھرتا ہے کہ میں اپنی کمشنر کے پاس گیا، اس سے ملاقات کی اور بغیر کسی سفارش کے بندوق کے لائسنس کی تجدید کروالی۔

میں نے کرل عابد حسین کی بات سن کر انہیں کہا کہ شاہ جی یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے آپ کی مشکل آسان کر دی، ورنہ اس معمولی کام کے لیے آپ کو آنا پڑتا۔ عابد حسین کہنے لگے وہ تو ٹھیک ہے، پر یہ لوگ ہمیں آئندہ دوٹ نہیں دیں گے آپ تو انہیں ایک طرح سے بغاوت پر اکسارہے ہیں۔

لوگوں کی شنوائی ہونے لگی تو مجھے ڈاک کے ذریعے اپنی شکایات لکھ کر بھیجنے لگے۔ لوگوں کے آنے والے خطوط میں ٹوٹ کھولتا تھا کہ کوئی اہلکار اپنے خلاف شکایت پڑھ کر پھاڑ نہ دے۔ ایک روز مجھے ڈاک میں بیرنگ لفافہ ملا۔ یہ خط سیکینہ کا تھا، سیکینہ کہروڑ عیسٰی کی 16 سالہ خوبصورت لڑکی تھی، اس نے لکھا ڈپٹی کمشنر صاحب! میرے باپ کے پاس پیر نے پگڑی بھیج دی ہے۔ وہ میری عزت لوٹنا چاہتا ہے، میری مدد کرو۔ پیر نے پگڑی بھیج دی ہے والی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ شام کو میں جھنگ کے مشہور پیر سٹر یوسف شاہ کی کوٹھی پر خط لے کر پہنچا اور خط انہیں پڑھایا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس علاقہ کی یہ ایک ریت ہے کہ اگر کسی سے کوئی کام لینا ہے اور وہ اس کو کرنے پر آمادہ نہ ہو تو لوگ اپنی پگڑی یہ کہہ کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ میری عزت اب آپ کے پاس ہے، اس کا لحاظ کریں یا نہ کریں تو گویا وہ پیر سیکینہ سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا یقیناً۔ رات ہو چکی تھی۔ سردی کا موسم تھا، میں نے اپنی کار نکالی اور سیکینہ کے گاؤں روانہ ہو گیا۔ صبح تڑکے سیکینہ کے گاؤں پہنچا، اس کے کپے کوٹھے کے طاق پر ایک بڑی سی پگڑی رکھی تھی اور اس پر پڑی ہوئی پھولوں کی پیتیاں خشک ہو چکی تھیں۔ سیکینہ نے مجھے رو رو کر بتایا کہ ایک بوڑھا کھوسٹ پیر مجھ سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے پگڑی بھیجنے پر میرے باپ نے میرا رشتہ دینے کی حامی بھر لی ہے۔ میں نے اس پگڑی کو اٹھایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رو مال بنا کر گاؤں کے بچوں میں تقسیم کر دیے اور گاؤں کے بڑوں کو جمع کر کے انہیں سمجھایا کہ بیٹیوں کو دس گز پگڑی کی قیمت پر دوسروں کے سپرد نہ کر دیا کرو۔ دوپہر کو جب میں واپسی پر تھا نہ قادر پور جمبر کے قریب سے گزرا تو تھانے کے ایس ایچ او کو حکم دیا کہ فلاں پیر گندم کی سنگلنگ کرتا ہے، اسے فوراً گرفتار کر لو۔ بعد میں ایس ایچ او نے رپورٹ دی کہ وہ پیر سرگودھا ضلع میں کہیں روپوش ہو گیا ہے۔

ایک شام میں سول ہسپتال چلا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ کہنے لگا کہ انیس بیس کے قریب ہسپتال میں ایسے مریض آچکے ہیں جنہوں نے شکایت کی ہے کہ ایک پیر کچھ پڑھ کر پھونک مارتا ہے اور جسم کا کوئی حصہ سُن ہو جاتا ہے۔ بہر کیف علاج سے یہ لوگ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ میں نے سول ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر سے اس پیر کا ٹھکانہ معلوم کیا اور اگلے روز گڑھ مہاراجہ موڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی کار میں دو چڑا سی اور ایک سٹریچر بھی لے گیا، جب میں پیر کے ٹھکانہ کے قریب پہنچا تو کار سے اتر کر پیدل پیر کے کوٹھے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دونوں چڑا سیوں کو میں نے سمجھا دیا کہ اگر میں تودہ گھنٹے میں واپس نہ آؤں تو مجھے اٹھانے کے لیے سٹریچر لے آنا۔ مبادا مجھ پر بھی پیر کی کرامات کا اثر ہو جائے۔ دوپہر کے وقت بلا کی گرمی میں وہ مونٹا مشینڈ آگ کے الاؤ کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چند

عورتیں اور مرد اس کے قریب بیٹھے تھے۔ میں اس پیر کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور آیت الکرسی پڑھنے لگا کہ اس پیر کے شر سے بچا رہوں۔ تھوڑی دیر جب میں نے اس پیر کو گھور کر دیکھا تو وہ بولا کون ہو تم؟ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارا علاج کرنے آیا ہوں۔ اس نے کچھ پڑھ کر مجھے پھونک ماردی لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ صورت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ دریں اثناء میرے دونوں چیز اسی سڑیچر لے کر آ گئے۔ لوگوں نے مجھے تو نہیں پہچانا تھا، البتہ میرے چیز اسیوں کے چہرے ان کے لیے شناسا تھے، میں نے اپنے ملازموں کی مدد سے پیر کو پکڑا اور جب اس کے کونٹے کاٹا کھلوایا تو اس کے اندر دیسی گھی کے ٹین اور دوسری چیزیں کثرت سے پڑی تھیں جو اس پیر نے لوگوں کو جادو ٹونے سے ڈرا کر حاصل کی تھیں، میں نے ساری چیزیں لوگوں میں بانٹ دیں اور اسے کار میں بٹھا کر ضلع فیصل آباد کی حدود میں چھوڑ آیا اور ساتھ ہی فیصل آباد کے ڈپٹی کمشنر کو فون کر دیا کہ تمہارے ضلع میں ایک بدمعاش چھوڑ کر جا رہا ہوں، ذرا اس کی نگرانی رکھنا۔

ضلع جھنگ میں چند ماہ کے قیام کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ غربت کے ساتھ یہاں جہالت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مقامی زمیندار اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ غریب عوام کے بچے تعلیم حاصل کریں کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ اگر غریب مزارعہ کا لڑکا تعلیم حاصل کر گیا تو اس کے حقے کی چلم گرم کرنے سے انکار کر دے گا۔ چنانچہ میں نے ڈپوؤں پر چینی کی فروخت پر ایک پیسہ فی من سرچارج لگا دیا اور اس طرح ایک بھاری رقم تعلیمی فنڈ کے لیے جمع کر لی اور بعد میں اس فنڈ سے غریب اور مستحق طالب علموں کو وظیفہ دیتا رہا۔

دیہی علاقہ میں نمبردار، پٹواری اور تھانیدار حکومت کے اہم ستون تصور ہوتے ہیں۔ شاید انگریز نے برسوں ان ہی ستونوں کی مضبوطی پر اقتدار کا محل قائم کر رکھا تھا۔ ایک روز میرے پاس ایک بوڑھی خاتون یہ شکایت لے کر آئی کہ پٹواری اس کی اراضی کا انتقال کر کے نہیں دیتا۔ اتفاق سے میرے پاس اس وقت سٹاف کا کوئی ملازم نہیں تھا۔ یہ لوگ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد گھروں کو جا چکے تھے۔ اگلے روز عام تعطیل تھی، میں نے اس بوڑھی اور سادہ خاتون کی داستان سنی تو کچھ جذباتی سا ہو گیا۔ میں نے اسے کار میں اپنے ساتھ بٹھایا اور اٹھارہ ہزاری کی طرف چل پڑا۔ جھنگ سے 35 میل دور مجھے وہاں کے پٹواری سے ملنا تھا تا کہ اس خاتون کی اراضی کا انتقال کرا سکوں۔ جب میں منزل مقصود پر پہنچا اور پٹواری سے اس بوڑھی بے سہارا عورت کی اراضی کا انتقال کرنے کو کہا تو اس نے مجھے وکیل سمجھا اور کہا کہ وکیل صاحب یہاں عدالت نہیں لگی ہوئی کہ آپ فیس کمانے آ گئے ہیں۔ میں نے اپنا تعارف کرائے بغیر پٹواری کو سمجھایا کہ اس عورت کا جائز کام ہے۔ آپ اس کے بڑھاپے کا احترام کرتے ہوئے اس کی مدد کریں، مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ اتنے میں گاؤں کا نمبردار ادھر آ نکلا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ اب پٹواری، پٹواری خانے کے اندر گیا اور بستہ اٹھائے باہر آیا اور کہنے لگا مجھے اس مقدس کتاب کی قسم ہے، میں بے قصور ہوں۔ بوڑھی اماں نے کہا بیٹا دیکھ لو اس بستہ میں قرآن مجید ہے بھی یا ایسے ہی کہہ رہا ہے۔ میں نے نمبردار کو اس بستہ کو کھولنے کے لیے کہا تو اس میں جمع بندی تھی۔ پٹواری نے انتقال کے کاغذات مکمل کر کے اس بوڑھی اماں کو دیے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کام ہو گیا ہے۔ وہ بار بار نمبردار کو انتقال کے کاغذات دکھاتی اور تسلی کرتی کہ انتقال ہو گیا ہے نا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی اراضی کے انتقال کے کاغذات پٹواری نے مکمل کر دیے ہیں تو اس نے اپنے بوسیدہ دوپٹے کے ایک پلو میں بندھی ہوئی ریز گاری کی گانٹھ کھولی۔ اس میں سے ایک ایک آنہ گن کر نکالا اور جب سولہ آنے ہو گئے تو اس نے چپکے سے میری جیب میں ڈال دیے اس بوڑھی ماں کے سولہ آنے رشوت لے کر اپنے آپ کو اتنا فنی پایا کہ شاید میں سیٹھ ڈالیا کے نیجر سے ہزار روپے لے کر کرنسی نوٹوں

سے بھرا ہوا بریف کیس لینے سے بھی نہ ہوتا جو وہ مجھے رشوت دینے کے لیے اس روز لایا تھا۔

صوبہ بہار ضلع آگرہ میں ایک سب ڈویژن سہرام ہے۔ میں ان دنوں وہاں ایس ڈی ایم تعینات تھا۔ میرے سب ڈویژن میں ایک صنعتی شہر ڈالیا گیا تھا۔ وہاں پر سیٹھ ڈالیا کی پندرہ کے قریب ملیں تھیں، ان ملوں میں سکٹ، کمبل، چینی اور اسی نوع کی دیگر استعمال میں آنے والی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، ان ملوں میں بعض مطالبات پر مزدوروں اور انتظامیہ میں جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس فساد کو دیکھتے ہوئے دفعہ 144 کے تحت تمام ملیں بند کر دیں۔ میرے اس اقدام پر چیف سیکرٹری اور دوسری اعلیٰ سطح سے سفارشات آنا شروع ہوئیں کہ جنگ کی سپلائی رک جائے گی۔ لہذا میں دفعہ 144 اٹھا لوں اور ملیں کھول دوں۔ میں نے اعلیٰ حکام کو سمجھایا کہ فساد کی صورت میں ملوں کو آگ لگائی جاسکتی ہے۔ لہذا یہ خدشہ مول لینے کو تیار نہیں، جوں ہی حالات سازگار ہو گئے میں ملیں دوبارہ کھول دوں گا۔

سیٹھ ڈالیا نے جب یہ دیکھا کہ میں اپنی ضد پر قائم ہوں تو اس نے اپنے منیجر کو جسے میں پہلے سے جانتا تھا، میرے پاس بھیجا۔ میں کوٹھی کے لان میں باہر بیٹھا تھا کہ یہ صاحب میرے پاس آئے ان کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا اور ان کے ہمراہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بھی تھی۔ لڑکی نے بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ ڈالیا کے منیجر نے مجھے کہا کہ ہمارا لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں ہزار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ چلتے تھے۔ منیجر نے بریف کیس کھولا جس میں لاکھوں روپے کے کرنسی نوٹ گڈیوں کی شکل میں نیچے اوپر رکھے تھے۔ تب وہ ان نوٹوں کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگا۔

YOU CAN HAVE THIS۔

اور پھر اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور کہا OR BOTH OR THIS

میں نے وہ چائے دانی جس سے اس کے لیے چائے بنا رہا تھا اس کے سر پر دے ماری اور چپڑا اسی کو بلا کر کہا اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔

چند روز بعد ڈالیا نگر کے صنعتی یونٹوں میں امن وامان کی صورتحال بحال ہو گئی اور میں نے دفعہ 144 کا حکم واپس لے لیا اور ملوں میں دوبارہ کام شروع ہو گیا۔ جونہی میں نے دفعہ 144 اٹھائی، سیٹھ ڈالیا نے مجھے رات کھانے کی دعوت دے دی۔ میں نے کسی تعصب یا تنگ دلی کے بغیر منظور کر لی۔ رات جب میں سیٹھ کے کھانے کی میز پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے سونے کی پلیٹوں میں کھانا چنوا یا تھا، کھانے کے دوران سیٹھ ڈالیا مجھے بتاتا رہا کہ وہ کس طرح حکومت کے کارندوں کو رشوت کے پھندے میں گرفتار کرتا ہے، اس نے مجھے خاص طور پر بتایا کہ جو مسلمان افسر دیانت دار ہوں اور ساتھ کمزور ایمان رکھتا ہو میں اسے کھانے کی دعوت دیتا ہوں اور کھانا سونے کی پلیٹوں میں لگاتا ہوں اور جب وہ دعوت سے فارغ ہو کر جانے لگتا ہے تو ترغیب کے لیے اس سے کہتا ہوں کہ چونکہ آپ نے ہماری پلیٹوں کو چھو لیا ہے اس لیے وہ پوڑ نہیں رہیں۔ لہذا یہ ہمارے لیے بے کار ہیں آپ انہیں ساتھ لیتے جائیں۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگا لیکن مسٹر شہاب میں آپ کو پلیٹیں ساتھ لے جانے کی ترغیب نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جس شخص نے لاکھوں روپے کی رشوت اور ”قیامت ڈھانے والی جوانی“ سے منہ موڑ لیا وہ بھلا چند پلیٹوں کا لالچ کیوں کرے گا، سیٹھ ڈالیا نے مجھے ایک انگریز گورنر کا قصہ سنایا کہ ایک بار میں نے گورنر کو سونے کی طشتری میں کرسمس کیک بھجوا یا، گورنر کی بھانجی نے جو اس کے ساتھ رہا کرتی تھی سونے کی طشتری رکھ لی اور کیک یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ کرسمس کے موقع پر ہم اس قسم کے تحفے قبول نہیں کرتے۔

ضلع جھنگ میں قیام کے دوران میں نے جس کام پر زیادہ توجہ دی وہ غریب طلبہ کو حصول تعلیم کے لیے مدد دینا تھی میں نے راشن ڈپو پر چینی کی فروخت پر ایک پیسہ فی سیر جو سر چارج لگایا تھا، اس سے چالیس ہزار روپے جمع ہو گئے اور اس رقم سے میں غریب طلبہ کو وظائف دیتا رہا۔ جب لوگوں کو میری تعلیم سے اس دلچسپی کا پتہ چل گیا تو ایک روز ایک زمیندار میرے پاس پہنچا اور اس نے غالباً آٹھ ہزار روپے کی رقم میرے سامنے رکھ دی اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اس کے گاؤں میں سکول کھلوادوں، میں نے اس کے جذبے سے متاثر ہو کر اس کا یہ عطیہ قبول کر لیا اور اس گاؤں میں سکول کھولنے کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر کو کہہ دیا۔ چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ میرے پاس ایک دوسرا زمیندار روٹا پیٹا آیا اور مجھے بتانے لگا کہ جو زمیندار آپ کو سکول کھلانے کے لیے رقم دے گیا ہے وہ دراصل میرا مخالف ہے اور اس نے اپنی دشمنی کا بدلہ مجھ سے اس طرح لیا ہے کہ میرے گاؤں میں سکول کھلوا دیا ہے۔ آپ براہ مہربانی مجھ سے دس ہزار روپے کی رقم بطور عطیہ قبول فرمائیں اور مخالف زمیندار کے گاؤں میں بھی سکول کھلوا دیں، چنانچہ میں نے اس زمیندار سے بھی دس ہزار روپے کی رقم لے لی اور اس کے مخالف کے گاؤں میں بھی سکول کھولنے کا حکم دے دیا۔

میں ضلع کے جس علاقہ کا دورہ کرتا، وہاں سکول دیکھنے ضرور جاتا۔ ایک دفعہ میں شورکوٹ کے دورہ پر تھا کہ میں نے وہاں گورنمنٹ ہائی سکول کا معائنہ کیا۔ آنکھوں میں جماعت کے ایک طالب علم نے اس موقع پر علامہ اقبالؒ پر بڑے مؤثر انداز میں تقریر کی، بعد میں مجھے سکول کے ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ یہ لڑکا بہت غریب ہے اور اس کے والدین اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے مگر اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے سوچا کسی بہانے اس کی مالی مدد کرنی چاہیے، میں نے اسے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں بلایا اور اس کی تقریر اور انداز بیان کی تعریف کی۔ وہ طالب علم جس کا نام میں نہیں لینا چاہتا کہ کہیں یہ بطور پڑھ کر اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو اس وقت ضلع جھنگ کا لیڈنگ ایڈووکیٹ ہے، وہ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوا اور مجھے بتانے لگا کہ میں نے اقبالؒ پر ایک کتاب لکھی ہے اور میں جب بڑا ہو جاؤں گا اور میرے پاس کچھ رقم ہوگی میں یہ کتاب شائع کراؤں گا، میں نے اس سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ پبلشر جو کتابیں شائع کرتے ہیں وہ کتابیں لکھنے والوں کو اس کا معاوضہ بھی دیتے ہیں۔ لہذا تم میرے ہاتھ یہ کتاب بیچ دو میں اسے شائع کرا دوں گا، چنانچہ میں نے اس طرح اس ذہین طالب علم سے دو سو روپے میں اس کی وہ کاپی خرید لی جس میں اس نے علامہ اقبالؒ کے بارے میں مضامین لکھ رکھے تھے۔ بعد میں میری اس طالب علم سے قلمی دوستی بھی قائم ہو گئی اور جب میں سوئٹزر لینڈ جانے لگا تو اپنا پتہ اسے دے گیا تاکہ وہ مجھے خط لکھتا رہے، چند ماہ بعد میرے قلمی دوست کا ایک خط مجھے ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی خواہشوں کے باوجود تعلیم جاری نہیں رکھ سکے گا کیونکہ اس کے والدین کی فاقہ کشی اسے سکول چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے بہر حال جیسے تیسے بھی اس کی تعلیم جاری رہی اور اس روز میں بے حد خوش تھا جب میرے سامنے اس کا بی اے کا رزلٹ پڑا تھا جس میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔

ضلع جھنگ میں بحیثیت ڈپٹی کمشنر میں بہت مختصر عرصہ تعینات رہا لیکن مجھے لوگوں کی خدمت کرنے کا موقع بہت ملا لیکن ان دنوں ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا جس کا قلق ہمیشہ رہے گا، گو میں نے رات بھر اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھے تاکہ ستم رسیدہ آنے والوں کے دکھ بانٹ سکوں مگر پھر بھی اس علاقہ کے لوگوں نے جو قیامت دیکھی تھی میں اس کے نتائج سے ان کو نہ بچا سکا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ان دنوں غلہ کی شدید قلت تھی، محکمہ خوراک والے پولیس کی مدد سے ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ محکمہ کا ایک افسر پولیس کا دستہ لے کر تھانہ موچی والا کے ایک چک

میں ایک کاشت کار کے گھر پہنچا اور اس کے گھر کی تلاشی لینا چاہی، اس دوران پولیس نے نو جوان دیہاتی کی والدہ کو بھی بے عزت کیا جس سے وہ مشتعل ہو گیا اور اسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس پر حملہ کر دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا پولیس نے نہ صرف اس گاؤں بلکہ اس سے ملحقہ دیہات میں بھی تباہی مچا دی، بوڑھوں کو اپنی جوان بیٹیوں کے سامنے نکال کیا گیا، وہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ خوف سے اپنے ڈھور ڈگر دیہاتوں میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

میں نے بعد میں پولیس کی زیادتی سے متاثر ہونے والوں کی مدد بھی کی لیکن سچی بات یہ ہے کہ پولیس نے ان پر بہت مظالم ڈھائے تھے۔ میں نے ان کے زخموں پر پچھا ہار کھنے کی کوشش کی لیکن گھاؤ اتنے گہرے تھے کہ وہ مُندمل نہ ہو سکے۔

میں دس ماہ کی تربیت کے بعد سوئٹزر لینڈ سے واپس وطن لوٹا تو پنجاب میں میری تعیناتی بطور ڈائریکٹر انڈسٹری کر دی گئی، ان ایام میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی صنعتی املاک کلیم داران کو تقسیم کی جا رہی تھیں، حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک الاٹمنٹ بورڈ بنایا تھا جس کا میں چیئر مین تھا۔ میرے دفتر کے باہر دن بھر کاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ پاکستان میں چھوڑی ہوئی ہندوؤں کی آئس فیکٹریوں، کاشن فیکٹریوں، سینما گھر اور فلور ملوں کی الاٹمنٹ کا کام جاری تھا اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے افراد اپنے کلیم بڑھا چڑھا کر میرے پاس لا رہے تھے۔ اس دوران میں نے صرف ایک شخص ایسا دیکھا جس نے اپنی جائیداد کا بالکل صحیح کلیم داخل کیا تھا۔ اس نے ہندوستان میں چھوڑی ہوئی ایک آٹے کی چکی کا کلیم 3700 روپے کا دیا جب کہ قانون یہ تھا کہ پانچ ہزار روپے تک کی مالیت کے کلیم کے عوض الاٹمنٹ کی جائے۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ حکومت نے الاٹمنٹ کے بارے میں جو معیار بنایا ہے وہ پانچ ہزار روپے کی مالیت یا اس سے زائد کا ہے، میں نے اس سے معذرت چاہی کہ آپ کو موجودہ قانون کے مطابق کچھ الاٹ نہیں کیا جاسکتا البتہ آپ اگر اپنا کلیم بڑھا کر لے آئیں تو کچھ ہو سکتا ہے۔ میری ترغیب کے باوجود اس شخص نے کہا کہ میں جو کچھ ہندوستان چھوڑ آیا ہوں، وہ میں نے کلیم میں درج کر دیا ہے، میں جھوٹ نہیں بولوں گا کیونکہ ایک روز ہم سب نے اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ میں نے اس شخص کو ثابت قدم پایا تو یہ سوچ کر کہ اسے سچ بولنے کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔ ایک آئس فیکٹری کا کچھ حصہ اس کے نام کر دیا۔ بعد ازاں جب میں ایوب خاں مرحوم کا سیکرٹری تھا اور سابق صدر کے ہمراہ دورہ پر لاہور آیا ہوا تھا یہ شخص کئی برسوں کے بعد مجھے چمب ہاؤس میں ملنے آیا۔ اس وقت اس کے پاس ایک لمبی ایئر کنڈیشنڈ کار تھی اور وہ بڑا صنعتکار بن چکا تھا اس نے ملاقات میں بڑے خلوص سے مجھ سے کسی خدمت کے لیے پوچھا تو میں نے اس سے کہا کہ میرے لیے آپ کی یہی خدمات کافی ہے کہ آپ زندگی میں ہمیشہ سچ بولتے رہیں، ہم نے اپنے چہروں پر غرض و طمع کے جو خول چڑھا رکھے ہیں اس سے دوسروں کی پہچان میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

ایک روز ایک عجیب شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا۔ وہ ایک پیر صاحب تھے، ان کا تعلق ملتان سے تھا۔ وہ صورت اور لباس سے بڑے باوقار دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ان کی آمد کی غرض و غایت معلوم کرنی چاہی تو وہ بولے میں تو آپ تک صرف حضرت داتا گنج بخشؒ کا پیغام لایا ہوں، انہوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ میں ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر بات کا مجید پانے کے لیے میں نے پوچھا کہ حضرت داتا کے ہاں کب چلنا ہے، پیر صاحب نے کہا کہ ابھی اسی وقت۔ چنانچہ میں ان کے ہمراہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار پر حاضر ہوا۔ فاتحہ پڑھی اور واپس چلا آیا۔ چند دنوں کے

بعد یہ پھر میرے لیے یہی پیغام لائے۔ میں اس روز بھی ان کے ہمراہ حضرت داتا صاحبؒ کے دربار پر حاضری کے لیے چلا گیا۔ پھر یہ صاحب کافی دن غیر حاضر رہے، میں ان کے بارے میں سوچتا رہا کہ آخر ان کا مدعا کیا تھا، کوئی تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد وہ ایک روز اچانک میرے دفتر میں آدھمکے۔ انہوں نے مجھے آب زم زم کی ایک چھوٹی سی بوتل، چند کھجوریں اور ایک تسبیح دیتے ہوئے کہا کہ درویش یہ تحائف آپ کے لیے سر زمین حجاز سے لایا ہے، جب وہ جانے لگے تو میں نے تکلفاً پوچھ لیا کہ کوئی خدمت اس خادم کے لیے ہو تو فرمائیں۔ کہنے لگے میں نے ملتان میں ایک بیوہ مہاجر کو ایک سینما الاٹ کروایا تھا، ذرا اس کا خیال رکھیے گا۔ مجھ سے پہلے بی اے قریشی ڈائریکٹر صنعت تھے۔ ایک شام میں ان کی رہائش گاہ پر گیا اور ان کے سامنے پیر صاحب کے بارے میں سارا قصہ بیان کر دیا۔ ساتھ یہ بھی پوچھ لیا کہ اگر اس بیوہ کے نام سینما کی الاٹمنٹ آپ نے کی ہے اور بیوہ کا کلیم جائز ہے تو میں بھی اس پر مہر ثبت کر دوں۔ بی اے قریشی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے یار عجیب آدمی ہے، ہمیں تو رنگ و بو کی محفلوں میں کھینچتا ہے اور آپ کو آب زم زم کی شیشی پر ٹرغا گیا۔ ڈائریکٹر صنعت کی حیثیت سے میں نے اتنا فائدہ ضرور اٹھایا کہ لاہور میں سعادت حسن منٹو مرحوم کو ایک آکس فیکٹری کا آدھا حصہ الاٹ کر دیا۔ میں نے سنا ہے کہ بعد میں منٹو اپنے حصہ کی برف بیچنے کے لیے شورش کاشمیری سے انتظام کروانے کی درخواست کرتا رہا اور بالآخر جب اس سے برف کی فروخت کا بندوبست نہ ہو سکا تو فیکٹری میں اپنا حصہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔

یہ واقعہ 1946ء کے آخری دنوں کا ہے۔ میری تقرری کنک میں صوبہ اڑیسہ کے ڈپٹی ہوم سیکرٹری کے طور پر ہو چکی تھی صوبے میں کانگریس کی وزارت تھی، مسٹر ہری کرشن مہتہ صوبے کے چیف منسٹر تھے، ہوم ڈیپارٹمنٹ بھی ان کے پاس تھا۔ وہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور اس کی میٹنگوں میں شرکت کے لیے الہ آباد، بمبئی، دہلی، لکھنؤ، دارودھا اور پونا وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ میں مہتہ صاحب کا ماتحت تھا اور وہ مجھ پر اعتماد بھی کچھ زیادہ ہی کرتے تھے۔ وہ جب بھی ان میٹنگوں سے واپس لوٹتے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیتے۔ میں سیاسی نوعیت کے کاغذات چھانٹ کر ان کے پوٹیکل سیکرٹری کے حوالے کر دیتا اور سرکاری کاغذات مناسب کارروائی کے لیے متعلقہ دفاتر میں بھیج دیا کرتا تھا۔ دسمبر 1946ء میں وہ کسی ایسی ہی میٹنگ سے واپس آئے اور حسب معمول کاغذات کی صندوقچی میرے حوالے کر دی۔ میں کاغذات چھانٹ رہا تھا کہ میری نظر سے ایک ایسی دستاویز گزری جسے پڑھ کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ یہ پانچ صفحات کا انتہائی خفیہ سائیکلو سٹائل خط تھا، جو کانگریس ہائی کمان نے اپنے ان چیف منسٹروں کو لکھا تھا جن کے صوبوں میں اس کی وزارت تھی۔ خط میں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ یہ دستاویز چیف منسٹر کی ذاتی تحویل میں رہے اور کسی دوسرے کے حوالے نہ کی جائے۔ خط میں لکھا تھا کہ عنقریب ملک کے ہمارے کا کوئی نہ کوئی فارمولا طے ہونے والا ہے۔ اس لیے ابھی سے صوبے کی کانگریسی وزارتوں کو مندرجہ ذیل ہدایات پر فوراً عمل شروع کر دینا چاہیے۔

مسلمان افسروں کو ایڈمنسٹریشن کے ہر اہم اور کلیدی عہدے سے تبدیل کر دیا جائے اور مشتبہ قسم کے افسروں کو نکلے لگا دیا جائے۔

مسلمان پولیس افسروں اور سپاہیوں کو کسی ایسی ڈیوٹی پر نہ لگایا جائے جہاں ان کے ہاتھ میں کسی قسم کا اسلحہ دینے کی ضرورت پیش آئے۔

جن صوبوں میں صوبہ سرحد سے بھرتی کیے ہوئے مسلمان گھوڑسواروں کے دستے موجود ہیں، انہیں توڑ دیا جائے اور سپاہی غیر مسلح کر دیے جائیں بلکہ انہیں واپس صوبہ سرحد بھیج دیا جائے، ان کی پنشن کا معاملہ بعد میں ملے ہوگا۔
جن مسلمانوں کے پاس اسلحہ کے لائسنس ہوں، پہلے ان سب کے اسلحہ جات کی پڑتال کی جائے اور پھر ان کو تیر گھنٹے کے اندر اندر قریبی تھانے میں اسلحہ جمع کرانے کا نوٹس دے دیا جائے، اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کا اسلحہ ضبط کر لیا جائے۔

مسلمان آتش بازوں کی فہرست مرتب کی جائے اور ان کے پاس جو آتش گیر مادہ ہو، وہ ان سے واپس لے لیا جائے۔ اس خفیہ خط میں ان پانچ بڑی بڑی ہدایات کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی ہدایات درج تھیں، ان سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے اور پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے۔ کانگریس کی قیادت جو ہندوستان کے بٹوارے اور قیام پاکستان کی زبردست مخالف تھی، ابھی سے مسلمانوں کے خون خرابے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ تبھی تو اس نے کانگریسی چیف منسٹروں کو ہدایات دی تھیں کہ مسلمانوں کو نہرہ کر دیا جائے۔

میں برٹش ایمپائر کی امپیریل سروس کا ممبر تھا اور میری تربیت اس نیچ پر کی گئی تھی کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہر معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہتے ہوئے برٹش ایمپائر کا وفادار ہوں، مگر جب میں نے یہ خط پڑھا تو میرے اندر ایک مسلمان جاگ پڑا اور میں فوراً ایک وفادار پاکستانی بن گیا۔ اس وقت نہ تو مجھے یہ احساس رہا کہ میں مسٹر مہتہ کے اعتماد پر مجروح کرنے چلا ہوں اور نہ ہی مجھے میری ملازمت کی پروا رہی۔ میں نے وہ اہم دستاویز جیب میں ڈال لی اور چھپلے لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔ جہاں ان دنوں قائد اعظم محمد علی جناح مقیم تھے۔ کے ایچ خورشید ان دنوں قائد اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ میری ان سے جان پہچان تھی لہذا مجھے یقین تھا کہ قائد اعظم کے ساتھ ملاقات میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن جب میں دہلی پہنچا تو کے ایچ خورشید چھٹی پر تھے، میں نے دربان کی منت سماجت کی، معاملے کی نزاکت سے اسے آگاہ کیا اور بالآخر وہ قائد اعظم سے میری ملاقات کرانے پر آمادہ ہو گیا۔ میں دبے پاؤں ان کے دفتر میں داخل ہو گیا اور ان کی میز کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔ قائد اعظم اس وقت کچھ کاغذات پڑھ رہے تھے جوں ہی وہ کاغذات کا مطالعہ سے فارغ ہوئے تو انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے بڑے روکھے انداز میں پوچھا:

YES! WHAT DO YOU WANT

میں نے ادب سے کانگریس کی دستاویز جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دی، انہوں نے اسے غور سے پڑھا اور میری طرف دیکھ کر فرمایا SIT DOWN میں بیٹھ گیا تو انہوں نے اس دستاویز کو دوبارہ پڑھا اور انگریزی میں مجھ سے پوچھا تم کون ہو اور یہ دستاویز تمہارے پاس کیسے پہنچی ہے میں نے ان سے اپنا مکمل تعارف کرایا اور انہیں ساری روئیداد سنا دی، یہ سن کر وہ مسکرائے اور کہنے لگے جب تمہارا وزیر اعلیٰ تم پر اعتماد کرتا ہے تو تم نے دستاویز چرا کر اس کے اعتماد کو دھوکہ نہیں دیا۔ میں ”لیس سر“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ انہوں نے مجھے اس دستاویز پر پڑے ہوئے ہندسہ کو دکھایا اور کہا کہ اس خط کی ہر نقل پر الگ الگ نمبر درج ہے اس کے جب گم ہونے کا علم ہوگا تو تم آسانی سے پکڑے جاؤ گے، میرا جواب سنے بغیر وہ دوبارہ گویا ہوئے تمہیں اس کے نتائج کا اندازہ ہے؟ میں نے کہا جی سر! میں نتائج سمجھنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب تم جا سکتے ہو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازہ پر پہنچا ہی تھا تو قائد اعظم نے میرا نام پوچھا اور پھر قدرے بلند آواز میں کہا:

میں چھٹی گزارنے کے بعد جب کنگ واپس پہنچا تو ایک روز مسٹر ہری کرشن مہتا نے مجھ سے اس خفیہ دستاویز کے بارے میں پوچھا میں نے وزیر اعلیٰ کو صاف صاف بتا دیا کہ میں نے وہ دستاویز قائد اعظم کو پہنچا دی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا مسٹر شہاب تم نے اچھا نہیں کیا، میں نے جواباً عرض کیا بلاشبہ میں نے آپ کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ بہر کیف مسٹر مہتا نے اس شکایت کے باوجود میرے خلاف اور کوئی کارروائی نہ کی۔

1948ء کے شروع میں ایک بار پھر مجھے قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، میں ان دنوں کراچی میں مسٹری آف کامرس میں سیکرٹری تھا۔ ایک روز چوہدری غلام عباس صاحب مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر اچانک کراچی پہنچ گئے۔ چوہدری غلام عباس صاحب کے میرے خاندان سے دیرینہ روابط تھے۔ ایک زمانے میں میرے والد گرامی کشمیر میں گورنر رہ چکے تھے، میں نے گریجویشن بھی جموں کالج سے کی تھی۔ بعد میں ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔

میں جب فارغ التحصیل ہو کر والد گرامی کے پاس کشمیر پہنچا تو شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس میرے والد کے پاس آئے اور میری کامیابی پر انہیں مبارکباد دی۔ شیخ عبداللہ تو میرے والد کو مجبور کرتے رہے کہ میں ان کے ساتھ مل کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لوں اور سیاست کو کیریئر بناؤں مگر چوہدری غلام عباس نے والد گرامی کو شیخ عبداللہ کے خیالات کے برعکس مشورہ دیا اور میں آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا۔

چوہدری غلام عباس صاحب دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ہمارے ہاں ہی آکر مقیم ہوئے۔ آتے ہی انہوں نے قائد اعظم کو فون کیا اور اپنی رہائی اور کراچی پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ قائد اعظم نے اگلے روز ان کو لے کر مدعو کیا اور کہا کہ گورنر جنرل ہاؤس کی کار آپ کو لانے کے لیے بھیجی جائے گی۔ شاید چوہدری صاحب نے گیراج میں کھڑی ہوئی ایک کار دیکھ لی تھی۔ وہ کار کم اور کھارہ زیادہ تھی، اسے شارٹ کرنے کے لیے دھکا لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ قیام پاکستان کے وقت میں اپنی کار دیگر سامان کے ساتھ ہندوستان چھوڑ آیا تھا، کراچی آ کے چند ماہ تو میں نے ٹراموں، بسوں اور گھوڑا گاڑیوں یا پھر پیدل چل کر دفتر پہنچنے میں گزار دیے لیکن بعد ازاں جب آئے دن دفتر لیٹ پہنچنے کا احساس ہوا تو مجبوراً میں نے اورینٹل انشورنس کمپنی کی وہ واحد پالیسی اڑھائی ہزار روپے میں بیچ دی جو میں نے ہندوستان کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے حاصل کی تھی اور ایک چالاک اور چرب زبان ہندو سے یہ سیکنڈ ہینڈ کار خرید بیٹھا تھا۔ اس کار کی خوبیاں آہستہ آہستہ بعد میں مجھ پر عیاں ہونے لگیں، جب وہ ہندو بمبئی چاچکا تھا میں نے چوہدری غلام عباس صاحب کو بتایا کہ اس کار کو شارٹ کرنے کے لیے ایک دھکا لگانے والی پارٹی ساتھ لے جانی پڑے گی۔ تاکہ اگر یہ راستہ میں اڑ جائے تو دھکا مار پارٹی اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ چوہدری صاحب نے میرا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ قائد اعظم نے انہیں ایک بچے مدعو کیا تھا، ہم ڈیڑھ دو گھنٹہ پہلے نکل پڑیں گے تاکہ وقت پر پہنچ جائیں۔

چنانچہ اگلے روز ہم نے دھکا لگانے والی نفری اپنے ساتھ بٹھائی اور ٹھیک ساڑھے 12 بجے گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ ایک نوجوان اے ڈی سی نے چوہدری صاحب کا استقبال کیا اور ان سے کہا کہ آپ مقررہ وقت سے پہلے تشریف لے آئے ہیں۔ قائد اعظم ٹھیک ایک بجے پورچ میں آپ کا استقبال کریں گے۔ براہ مہربانی تھوڑا وقت کہیں گزار لیں اور

ٹھیک وقت پر پورق میں تشریف لے آئیں۔ اسے ڈی سی نے جب چوہدری صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس وقت میری کار کا انجن بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے ڈی سی نے دھکا لگانے والی پارٹی کا ساتھ دیا اور کار سنارت کرادی۔ میں کار کو بعد سواریوں کے گورنر جنرل ہاؤس سے باہر لے آیا اور ہم نے کار دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔ سکیورٹی کے لوگوں نے ہمیں مشکوک حالت میں اس طرح کھڑے دیکھا تو پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں نے چوہدری صاحب سے ان کا تعارف کر دیا اور منہ پر مدعو ہونے کی کہانی سنائی۔ سکیورٹی افسر نے مجھے غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور کہا ”کمال ہے آپ کشمیر کے اتنے بڑے رہنما کو اس مہیچری کار میں لیے پھرتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قائد اعظم وقت کے کس قدر پابند ہیں، اگر ایک بے یار سنارت نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔“ بہر حال جب ایک بھاتو سکیورٹی والوں نے دھکا لگا کر کار سنارت کرائی اور ٹھیک ایک بجے قائد اعظم نے پورق کی میز جیوں پر چوہدری غلام عباس کا استقبال کیا۔ میں بھی کار سے نکل کر کھڑا ہو گیا اور قائد اعظم کو ادب سے سلام کیا۔ چوہدری صاحب اخلاقاً میرا تعارف کرانے لگے تو قائد اعظم نے انہیں روک دیا اور انگریزی میں کہا غلام عباس ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ قائد اعظم نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا اور انتہائی نرم لہجے میں فرمایا۔ ”پہلی بار تم میرے پاس جوڈاکومنٹ لے کر آئے تھے، وہ بہت مفید ثابت ہوئی۔ پھر انہوں نے چوہدری غلام عباس صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اس بار تم میرے لیے یہ قیمتی تحفہ لائے ہو، میں تمہارا شکر گزار ہوں اور پھر وہ چوہدری غلام عباس صاحب کو اپنے ساتھ لے کر اندر چلے گئے۔

کشمیر میں مجاہدین آزادی کی جنگی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں انتہائی کوشش کر چکا تھا کہ کسی طرح مرکزی حکومت چھوڑ کر آزاد کشمیر میں کام کرنے چلا جاؤں، لیکن اجازت نہ ملتی تھی۔ جب چوہدری صاحب منہ سے واپس آئے تو انہوں نے مجھے خوشخبری سنائی کہ میں نے قائد اعظم سے تمہارے متعلق بات کر لی ہے۔ تم فوراً آزاد کشمیر پہنچو اور اپنا کام شروع کرو۔ اس طرح میں ترازو کھل پہنچ کر آزاد کشمیر کی پہلی حکومت کی تنظیم و تعمیر میں مصروف ہو گیا۔ میں نے آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پہلے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے وہاں رہ کر لوگوں کو جس جذبہ جہاد میں سرشار دیکھا۔ اس کا بیان کرنا لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ بارہ تیرہ سال کے بچے بھی مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ ان کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی۔ ان کو کسی نے جہاد کے لیے مجبور بھی نہیں کیا تھا مگر وہ تھے کہ شہادت کی موت کی تلاش میں ننگے پاؤں برف پر میلوں چلتے تھے اور گھروں سے اپنا راشن ساتھ لاتے تھے، تاکہ حکومت آزاد کشمیر پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔

ایک روز میں دورہ کرنے پرانے میرپور شہر گیا جو جنگ کی وجہ سے بری طرح مسمار ہو چکا تھا، میرپور کے ڈپٹی کمشنر میرے ساتھ جیب میں بیٹھے تھے۔ راستے میں، میں نے دیکھا کہ بچے کپڑے پہنے ایک شخص گدھے پر ایک بوری لاد کر گئیں جا رہا تھا، اس نے ہماری جیب روکی اور ہم سے پوچھا کہ بیت المال کون سا راستہ جاتا ہے۔ اس زمانے میں سرکاری خزانے کو بیت المال کہا جاتا تھا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا کہ بیت المال کا راستہ تم کیوں پوچھتے ہو تو اس نے بتایا کہ میں اور میری بیوی میرپور شہر کے طے سے سونے اور چاندی کے زیورات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے رہے اور یہ بوری ان زیورات سے بھر گئی ہے۔ میں اس کو بیت المال میں جمع کرانا چاہتا ہوں۔

کشمیر میں مجاہدین جنگ آزادی لڑ رہے تھے۔ لیکن خان پاک فوج میں اس وقت میجر تھا، وہ بھی کسی محاذ پر تھا، ایک روز مجھے جی ایچ کیو راولپنڈی سے ٹیلی فون آیا کہ پاکستانی فوج کے دو افسر کافی دنوں سے لاپتہ ہیں، ان کو تلاش کروائیے۔ میں ابھی ان افسران کی تلاش کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ معززین کا ایک وفد میرے پاس آیا اور ان

لوگوں نے شکایت کی کہ ایک فوجی افسران کے گاؤں کے ایک خالی مکان میں شراب کے نشے میں دھت پڑا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ چھو کمری لا کر دو، اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لے ورنہ لوگ اسے جان سے مار دیں گے۔ میں اسی وقت ایک آدمی کو ساتھ لے کر جیپ میں اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں گاؤں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگوں نے اس مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا اور رات کے وقت مکان کے عقب کی دیوار پھلانگ کر اپنے ساتھی کی مدد سے اس فوجی افسر کو وہاں سے نکالا۔ یہ فوجی افسر کئی خان تھا جسے میں نے بعد میں اپنی جیپ میں راولپنڈی روانہ کر دیا۔

سکندر مرزا کے گورنر جنرل بن جانے کے بعد میرے منصبی فرائض تو وہی رہے، البتہ میں غلام محمد کے غیض سے بچ گیا۔ وزارت کی سطح پر توڑ پھوڑ کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا تھا، سکندر مرزا کے وقت کچھ زیادہ ہی ہو گیا، میرا تعلق چونکہ ان سیاسی تبدیلیوں سے کوئی نہ تھا۔ لہذا مجھے وزارتوں میں رد و بدل کی اطلاع ریڈیو کی خبروں سے ملتی اور میں دفتر میں رکھے ہوئے قمیض کوٹ کی سلوٹیں درست کرنے میں مصروف ہو جاتا جو میں نے وزارت کی حلف برداری کی تقریب کے موقع پر پہننا ہوتا۔ اس زمانے میں وزارتوں کے بارے میں خشک اور تر (WET AND DRY) وزارت کی اصطلاح عام ہو چکی تھی۔ ایک بار حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم بنایا گیا۔ ان کی وزارت میں شریک وزراء حلف اٹھانے کے بعد جھنڈے والی کاروں میں گھروں کو واپس روانہ ہو چکے تو پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ وزارت تعلیم کی ذمہ داریاں کسی کو سونپی رہ گئی ہیں، یقیناً اس وزارت کا شمار خشک وزارتوں میں ہوتا تھا۔ میں نے سکندر مرزا کو اس کوتاہی کی نشاندہی کی تو بولے جلدی سی کسی داؤس کو پکڑ لاؤ، میں گیٹ کی طرف لپکا تو سبھی وزراء جا چکے تھے، البتہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک اقلیتی وزیر جو بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ بیمار بھی تھے اور ٹنگڑا کر چل رہے تھے میں نے انہیں کار میں بیٹھنے سے جا روکا اور سکندر مرزا کے پاس لے آیا تو سکندر مرزا نے انہیں احسان مند کرنے کے انداز میں ان ہی کہا چلو وزارت تعلیم بھی تم رکھ لو۔

ان صاحب کا نام غالباً بسنت کمار واس تھا اور یہ حسین شہید سہروردی کی وزارت کی طرح بہت مختصر مدت کے لیے وزیر رہے۔ ڈاکٹر خان صاحب سے سکندر مرزا کا پرانا یار نہ تھا، ان کی جان پہچان اس وقت سے تھی، جب سکندر مرزا سرحد میں پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ یہ دونوں برج اکٹھے کھیلتے تھے۔ سکندر مرزا مجھے اکثر ان کے بارے میں کہتے رہتے تھے کہ اسے گڈ لائف دو، اس بوڑھے نے ساری عمر انگریز کی جیل کاٹی ہے اور یہ زندگی کی آسائشوں سے محروم رہا ہے، چنانچہ میں نے ان کی سرکاری رہائش گاہ پر دوسرے وزراء کی نسبت آرائش و آرام کا زیادہ سامان بھجوا دیا جن میں فرنیچر، ایر کنڈیشنر، قالین وغیرہ شامل تھے۔ ایک رات برج کی بازی کے دوران ڈاکٹر خان صاحب نے ایک نیاریڈیوسٹ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ اگلے روز سکندر مرزا نے مجھے بلا کر کہا کہ میں ان کی رہائش پر ایک اچھا سا قیمتی ریڈیوسٹ پہنچا دوں۔ میں نے گورنر جنرل کو بتایا کہ ریڈیوسٹ پہلے ہی ان کی رہائش گاہ پر فراہم کر دیا گیا ہے۔ مگر اس نے کہا کوئی بات نہیں اسے ایک سیٹ اور بھجوا دو۔ چنانچہ میں نے ایک نیاریڈیوسٹ خرید کر بھجوا دیا۔ بہر حال اب ڈاکٹر خان صاحب "گڈ لائف" کے عادی ہوتے جا رہے تھے اور ان کی روایتی سادگی میں آسائشوں کی پیوند کاری ہونے لگی تھی۔

30 ستمبر 1955ء کو ون یونٹ ایکٹ پاس ہوا اور 14 اکتوبر کو اس کا قیام عمل میں آ گیا تو سکندر مرزا نے ڈاکٹر خان صاحب کو مغربی پاکستان میں ون یونٹ کی پہلی وزارت کا وزیراعلیٰ نامزد کر دیا۔ بعد ازاں مغربی پاکستان اسمبلی میں

ری پبلیکن پارٹی جس کے قائد ڈاکٹر خان صاحب تھے اور مسلم لیگ کے درمیان اقتدار پر قابض ہونے کے لیے جو کھینچا جانی ہوئی وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ مرکز میں آئے دن وزارتیں ٹوٹنے اور بننے کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ ایک روز محمد علی بوگرہ وزارت غلطی کی کرسی پر متمکن دکھائی دیتے تھے تو اگلے روز آئی آئی چند دیگر وزیر اعظم بنے ہوتے، چند ماہ کے لیے یہ منصب حسین شہید سہروردی کے پاس ہوتا تو پھر باری چوہدری محمد علی کی آ جاتی، غرضیکہ یہ سلسلہ 17 اکتوبر 1958ء تک جاری رہا جب تک کہ پاکستان میں مارشل لا نافذ نہیں ہو گیا۔

میں اپنے معمول کے کاموں میں مصروف رہتا اور سرکاری فرائض کی انجام دہی کے علاوہ مجھے سربراہ مملکت کے لیے وقتاً فوقتاً تقاریر بھی لکھنی ہوتیں جو وہ تقریبات کی صدارت کرنے کے ناطے وہاں کرتے۔ اس بارے میں بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا، کراچی میں دو کانفرنسیں چند گھنٹوں کے وقفے سے ایک ہی روز میں ہو رہی تھیں۔ ایک کانفرنس تاریخ سے متعلق تھی جس کا اہتمام کسی میڈیکل سوسائٹی نے کیا تھا اور دوسری کانفرنس سائنس سے متعلق تھی، سکندر مرزا کو ان دونوں کانفرنسوں کی صدارت کرنا تھی۔ میں نے صدر مملکت کو کثرت سے تقریبات میں شرکت کرتے دیکھ کر تقریروں کا ایک ہی پیٹرن بنایا تھا۔ بس تقریب کا حوالہ بدلنا پڑتا، متن ایک ہی جیسا رہتا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تصویر کا فریم ایک ہی رہتا، البتہ اس میں فٹ کی جانے والی تصاویر مختلف ہوتیں، میں نے صدر کے لیے تاریخ کانفرنس میں پڑھنے کے لیے جو تقریر لکھی اس کا پہلا جملہ کچھ یوں تھا۔

HISTORY IS SCIENCE AND SCIENCE MAKES HISTORY

اے ڈی سی کے پاس چونکہ دونوں تقریروں کا مسودہ موجود تھا، لہذا اس نے ”تاریخ کانفرنس“ میں تقریر کے وقت غلطی سے سکندر مرزا کی ”سائنس کانفرنس“ والی تقریر پکڑادی جو انہوں نے بلا چون و چرا پڑھ دی، شاید اے ڈی سی کو تقریر کے پہلے جملے نے مغالطے میں ڈال دیا تھا۔ اب جب شام کو ”سائنس کانفرنس“ ہوئی تو صدر صاحب کو وہی تقریر دوبارہ پڑھنا پڑی، جو وہ اگلے وقت میں ”تاریخ کانفرنس“ میں پڑھ چکے تھے، مجھے جب صدر مملکت کی اس غلطی کا پتہ چلا تو میں نے بعد میں ریڈیو اور نیوز ایجنسی کے میٹرن تیار کرواتے وقت اس کی تلافی کر دی۔ ”تاریخ کانفرنس“ کی خبر میں ”تاریخ کانفرنس“ سے متعلقہ تقریر اور ”سائنس کانفرنس“ کی خبر میں ”سائنس کانفرنس“ کی تقریر کے حوالے دے دیے گئے۔

سربراہ مملکت کے سیکریٹری کو بعض اوقات رازداری کے بڑے دلچسپ مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سکندر مرزا نے مجھے امور مملکت میں کی جانے والی تبدیلیوں میں قریبی رازدار نہیں بنایا۔ البتہ ان کی پرائیویٹ زندگی کی ایک کمزوری کے بارے میں مجھے بڑی رازداری سے کام لینا پڑا۔ وہ ہر وقت مجھے تاکید کرتے رہتے کہ ناہید کو اس کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ دراصل یہ بات بہت معمولی تھی۔ مگر سکندر مرزا چونکہ اپنی بیگم سے بہت ڈرتے تھے، اس لیے کچھ زیادہ ہی احتیاط برتتے۔ انہیں دراصل سردیوں میں ڈرائی فروٹ کھانے کا بہت چہرہ تھا۔ چلغوزے ان کی خاص کمزوری تھی اور وہ کثرت سے کھاتے، جس سے ان کا گلہ خراب ہو جاتا۔ ناہید انہیں چلغوزے کھانے نہیں دیتی تھی۔ وہ جب بھی ان کے ہاتھ میں چلغوزے دیکھتیں ان سے چھین لیتیں، سکندر مرزا نے بعد میں اس کا حل یہ نکالا کہ چلغوزے اور بادام کی گریاں لا کر میرے دفتر کی میز کی دراز میں چھپا دیتے اور دفتر جاتے وقت وہ وہیں سے مٹھی بھر کر لے جاتے اور کوٹ کی جیبوں میں چھپا کر رکھتے۔ چوری چھپے کا یہ معاملہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک میں ان کا سیکریٹری رہا۔

یہ معمولات چل ہی رہے تھے کہ 22 ستمبر 58ء کو مجھے ہائی بلڈ پریشر کی شدید تکلیف ہو گئی۔ اس میں کچھ ٹچ

ہارٹ کا بھی تھا۔ جس کے باعث میں جناح ہسپتال میں داخل ہو گیا اور مارشل لاء کے نفاذ سے دو روز پہلے ہسپتال سے گھر منتقل ہو گیا۔ مگر ڈاکٹروں کا مشورہ یہی تھا کہ میں مکمل آرام کروں۔ 17 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے چونکہ مارشل لاء نافذ کر دیا ان حالات میں مجھے مجبوراً دفتر جانا پڑا۔ ابھی بظاہر اقتدار چونکہ سکندر مرزا کے پاس تھا۔ لہذا وہی کاروبار مملکت چلاتے۔ ورین اثناء ایوب خان مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے گئے تو سکندر مرزا نے کراچی میں اپنے حق میں مزدوروں کے دو مظاہرے بھی کروا لیے۔ ان دونوں جلوسوں کا اہتمام اس نے خود کروایا تھا۔ ان دو مزدور ریلیوں کے علاوہ سکندر مرزا کے اخبارات میں ایسے بیانات بھی شائع ہوئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ سکندر مرزا ہے۔ ایوب خان اور اس کے ساتھی جنرل سکندر مرزا کی حرکات پر برابر نظر رکھے ہوئے اور محسوس کر رہے تھے کہ سکندر مرزا ان کے مقابلے میں برابری کی قوت بننا چاہتا ہے۔ ایوب خان اور اس کے ساتھیوں کا شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا، جب 27 اکتوبر کی صبح کو صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ایک وفاقی کونسل بنادی گئی اور ایوب خان کو اس میں پرائم منسٹر کی حیثیت دے دی گئی۔ چنانچہ اسی شام فوجی جنرلوں نے سکندر مرزا کو معزول کر کے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ”اس موقع پر میں نے شہاب صاحب سے پوچھا کہ سکندر مرزا نے ایک سفارت کار کے ذریعے ایوب خان کو کھانے میں زہر دینے کا منصوبہ بھی تو بنایا تھا اور منصوبے کے مطابق آپ کو اور اس کے بیٹے کو بھی زہر دیا جانا تھا تا کہ سازش کی کڑیاں ملانے والوں کو سکندر مرزا پر شک نہ گزرے۔ شہاب صاحب نے منع کیا کہ میں اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہ لکھوں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سازش چونکہ ادھوری رہی اور زہر دینے کی نوبت ہی نہیں آئی لہذا اس کا ذکر مناسب نہیں کیونکہ کچھ لوگ اس کا سکیئنڈل بنالیں گے۔ جیسا کہ اب حسین شہید سہروردی کی موت کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ اسے ایوب خان نے قتل کروایا تھا۔

شہاب صاحب نے واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے کہا کہ بلوچستان نے اس وقت تک مکمل صوبے کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ وہاں پر کوئی گورنر نہ تھا بلکہ حکومت پاکستان کا ایجنٹ جنرل وہاں کے معاملات پر با اختیار تھا۔ لہذا سکندر مرزا کو معزول کر کے کوئٹہ بھیج دیا گیا اور اسے ایجنٹ جنرل کی رہائش گاہ پر فوج کی نگرانی میں رکھا گیا۔ بعد میں جب مارشل لاء نے اپنی جڑ پکڑنا شروع کر دی اور اس کے تحت ملکی معاملات کو چلایا جانے لگا تو ایک روز چپکے سے معزول صدر سکندر مرزا کو لندن روانہ کر دیا گیا اب ملکی حالات کی تصویر واضح ہوتی جا رہی تھی اور وہ لوگ جو یہ خیال کرتے تھے کہ سکندر مرزا نے فوج کی قوت کو وقتی طور پر استعمال کرنے کے بعد اختیارات کی ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ وہ جلد ہی اپنی اس سوچ کے چکر سے باہر نکل آئے تھے کیونکہ ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تمام حکومتی معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے تھے اور ان کے فوجی جنرل رفقاء ان کے تمام اقدامات کی نہ صرف نائیدہ حمایت کرتے جا رہے تھے، بلکہ نظام حکومت چلانے میں ان کے ساتھ اخلاص سے شریک تھے۔

لاہور کے شہری 1953ء میں مارشل لاء کا ایک مختصر دور و انداز دیکھ چکے تھے، لیکن 1958ء کا مارشل لاء اس سے بالکل مختلف تھا۔ 1953ء کا مارشل لاء محض چند روز کے لیے ختم نبوت کی تحریک کے نتیجے میں بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لیے نافذ کیا گیا تھا، لیکن یہ مارشل لاء اپنے پس منظر میں آئے دن کی رونما ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے سبب ملکی عدم استحکام کو ختم کرنے اور ملک کو مستقبل میں ترقی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس دعوئی میں کہاں تک صداقت تھی۔ اس سے قطع نظر کم از کم اس کے نافذ کرنے والے فیلڈ مارشل محمد ایوب

خان کا دعویٰ سبکی تھا۔

گو میں ان دنوں ہائی بلڈ پریش اور انجیا ٹکا کی تکلیف میں مبتلا تھا، مگر ملک میں اس اچانک تبدیلی نے اور وہ بھی مارشل لا کے نفاذ کی صورت میں مجھے مجبور کیا کہ میں آرام کرنے کی بجائے باقاعدگی سے دفتر جاؤں تاکہ روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ ملک میں پہلی بار مارشل لا عمل طور پر لگا تھا۔ لہذا ہر سرکاری ملازم اپنے شخصی فرائض کے معاملے میں محتاط تھا۔ پھر میں تو صدر پاکستان کا پرنسپل سیکرٹری تھا۔ ایک ایسے سربراہ کا پرنسپل سیکرٹری جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھا۔

مارشل لا انتظامیہ کی گرفت مکی معاملات پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی، مختلف خرابیوں اور برائیوں کی روک تھام کے لیے مارشل لا کے ضابطے جاری کیے جا رہے تھے۔ ان ضابطوں میں سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزائے موت اور کم از کم سزائے قید کی "تعزیر" کا سامان ہوتا تھا۔ لہذا وقتی طور پر مجرم چھپے ہوئے تھے اور ہندو امن شہری سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اشیائے صرف کی قیمتیں کم ہو گئیں تو پھر خریداروں کی قطاریں دکانوں کے باہر آنے لگیں۔ ابتداء میں تو صرف رسد و طلب کا توازن بگڑا اور پھر طلب ہی طلب تھی۔ رسد کا نام و نشان نہ تھا۔ دکانیں خالی پڑی تھیں اور گاہکوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔

مارشل لا کی ابتداء میں یہ سب کچھ امکان میں تھا، لیکن مجھے جس چیز نے پریشان کیا وہ ملک کی نظریاتی بنیاد کے لیے خطرہ تھا جو اسے مستقبل میں پیش آنے والا تھا۔ خدا معلوم ایوب خان کے وہ کون سے رفقاء یا مشیر تھے، جنہوں نے ان کے ذہن میں یہ زہر گھول دیا تھا۔

یہ نومبر کے ابتدائی ایام تھے۔ مجھے کسی افسر نے پوائنٹ آؤٹ کیا کہ مارشل لا کے جو بھی ضابطے جاری کیے جا رہے ہیں۔ ان کے آخر میں اسلامی ری پبلک آف پاکستان کی بجائے صرف ری پبلک آف پاکستان لکھا جا رہا ہے۔ ایوب خان کے ساتھ مجھے بطور سیکرٹری کام کرتے ہوئے چند ایام ہی گزرے تھے اور اس دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ فائل کو زیادہ وقت اپنے پاس نہیں رکھتے تھے بلکہ اس پر دستخط کرنے کے بعد فوراً واپس بھیج دیتے تھے۔

ایک روز میں نے یہ سمجھ کر کہ مارشل لا کے ضابطوں کے نیچے اسلامک کا لفظ نہ لکھنے کی جو غلطی ہو رہی ہے اس کی اصلاح ہو جائے۔ اس بارے میں ایک نوٹ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ایوب خان کو لکھ کر بھیج دیا اور اس کی کاپی وزارت قانون کو بھی بھیج دی تاکہ آئندہ مارشل لا کے ضابطے جاری کرتے وقت اس کے نیچے ری پبلک آف پاکستان کے ساتھ لفظ اسلامک بھی لکھا کرے۔

لیکن کوئی چار روز بعد جب فائل مجھے واپس ملی تو اس پر میرے نوٹ سے متعلق ایوب خان کا یہ نوٹ تحریر تھا کہ مارشل لا کے ضابطوں کے جاری کرتے وقت ری پبلک آف پاکستان کے ساتھ اسلامک نہ لکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی گئی، یہ بات جب سب کو معلوم ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کا ہے تو پھر اسلامک کا لفظ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ محض ایک اضافی لفظ ہے۔ اپنے نوٹ میں ایوب خان نے یہ ہدایت بھی دی کہ میں اس بارے میں ایک پریس ریلیز تیار کر کے انہیں کل پیش کروں تاکہ اسے اخبارات کے ساتھ دیگر ذرائع ابلاغ کو بھیجا جائے۔ اس دوران میں میرے کانوں تک یہ بات بھی پہنچی تھی کہ ایوب خان کے کچھ مشیر انہیں پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں اور وہ ان کی

قوت استدلال سے بے حد متاثر ہیں۔ اس نوٹ کو پڑھ کر میں پریشان ہو گیا، کیونکہ اس طرح تو ہم اپنی بنیاد ہی ختم کر رہے تھے۔ کچھ بھٹائی نہیں دیتا تھا کہ ایوب خاں کو کیسے سمجھایا جائے۔ ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے، میں ان کے مزاج اور نفسیات سے واقف نہ تھا کہ کس طرح ان کے ذہن سے یہ خیال نکالوں، یہ لمحے میرے لیے بڑے کرب ناک تھے۔ میں اپنے عقیدے کی صلیب پر لٹکا کھڑا تھا۔ میرے اندر کے بیوروکریٹ نے میرے دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس بیوروکریٹ نے میری تربیت ہی کچھ ایسی کی تھی کہ مجھے حاکم کا حکم بلا ہٹوں و چرا ماننا تھا، میں جس تنے کی شاخ تھا وہ مجھے اپنے منہ (بنیاد) سے وابستہ رہنے کو کہہ رہا تھا، میں نے رات بھر دفتر میں بیٹھ کر سیکرٹریوں کا غڈ نکالے اور پھاڑ دیے۔ ان گھڑیوں میں، میں نے صدیوں کا سفر طے کر لیا۔ یہ سفر میری شناخت کا سفر تھا جو مکمل ہو گیا تھا، اب میرے ہاتھ میں پریس ریلیز کی بجائے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ ایوب خاں غالباً صبح کی سیر کو نکلے تھے، وہ میرے کمرے میں روشنی دیکھ کر وہاں چلے آئے اور وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیے۔ میں نے ان سے کہا ممکن ہے آپ آسانی سے نہ پڑھ سکیں، میں انہیں صاف لکھ کر آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ مگر وہ نہیں مانے اور انہیں سطر سطر پڑھنے لگے، میری ایک جیب میں میرا استعفیٰ لکھا ہوا پڑا تھا۔ جسے اختلاف کی صورت میں پیش کرنے کا میں فیصلہ کر چکا تھا۔ ایوب خان جب میری یہ تحریر پڑھ رہے تھے، میں ساتھ ساتھ دعا مانگ رہا تھا، اے رب کریم، اسے سیدھی راہ دکھا، میرے اس نوٹ کا مفہوم یہ تھا کہ اسلام کو ہم پسند کریں یا نہ کریں پر یہ ہماری سیاسی ضرورت ہے۔ یہی اسلام ریڈ کلف لائن کی بنیاد ہے اور اس بنیاد کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔

ایوب خاں جوں جوں یہ نوٹ پڑھ رہے تھے ان کے چہرے پر کچھ عجیب و غریب ڈکھن کے آثار دکھائی دیتے تھے اور جب انہوں نے آخری لائن پڑھی تو رندھی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ YOU ARE RIGHT پھر خود ہی اپنے آپ سے مخاطب ہونے کے انداز میں بولنے لگے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں اسلام میں کیا رکھا ہے۔ یہ واؤس یہ نہیں سمجھتے کہ ہم اسلام کو پسند کریں یا نہ کریں، لیکن ہم اس سے فرار اختیار نہیں کر سکتے۔ کل کیبنٹ میٹنگ ہو رہی ہے میں وہاں ان سے بات کروں گا۔

میری تحریر نے تو شاید نہیں، پر میری دعاؤں نے ضرور اثر دکھایا تھا کہ آگے چل کر ایوب خان مذہب کی طرف راغب ہوتے گئے۔

میں ایوب خان کو دین کے بارے میں وعظ و نصیحت کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا اور نہ یہ میرا جاب تھا۔ البتہ موقع محل کی مناسبت سے میں ان سے یہ ضرور کہتا کہ آپ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ ہیں، آپ کو اور نہ کسی تو دوسروں کے دکھاوے کے لیے ہی مذہبی معاملات کے احترام کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ دینا چاہیے، چنانچہ انہوں نے میری بات کا اثر قبول کیا۔ وہ دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جا رہے تھے، ماہ رمضان کے ایام تھے، کانفرنس کے آغاز سے پہلے ملکہ برطانیہ نے سربراہان مملکت کے اعزاز میں شام کے وقت ایک ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس سفر میں، میں ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ صدر ایوب خاں جب پاکستان سے روانہ ہونے لگے تو میں نے احتیاطاً ایک برقیہ حکومت برطانیہ کو روانہ کر دیا کہ ملکہ معظمہ کی ضیافت کا جو وقت مقرر ہے، اس وقت صدر ایوب خان روزہ سے ہوں گے، لہذا وہ معذرت خواہ ہیں کہ اس حالت میں ضیافت میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ میرے اس برقیہ نے یہ کام دکھایا کہ صدر جب لندن پہنچے تو وہاں کے اخبارات کے صفحہ اول پر بکس آئیٹم خبر شائع ہو چکی تھی کہ صدر ایوب خان نے روزہ کے

باعث ملک پر طائفہ کی ضیافت میں شرکت سے معذوری ظاہر کر دی۔

12 جولائی 1961ء کو صدر ایوب خان نے امریکی کانگریس کے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنا تھا۔ وہ ان دنوں امریکہ کا دورہ صدر کینیڈی کی دعوت پر کر رہے تھے۔ میری شدید خواہش تھی کہ صدر ایوب خان کا جوائنٹ امریکیوں کے سامنے آئے وہ ایک خود مختار ریاست کے سربراہ کا ہو۔ اس کی سوچ ایک غیر جانبدار اور آزاد ملک کے صدر کی ہو۔ ایوب خان کے ساتھ میں نے اولاً بحیثیت ان کے پرسنل سیکرٹری کے اور بعد میں سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات، سیکرٹری وزارت تعلیم کے ایک لمبا عرصہ گزارا تھا، لیکن ان کی نجی زندگی میں اس دوران میں نے کبھی دخل نہیں دیا تھا لیکن اس روز خدا جانے کیوں میں ان کی آرام گاہ میں داخل ہوا۔ انہیں نیند سے بیدار کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کو کہا۔ وہ وضو کر چکے تو ہم کندھا جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم میں سے ایک امام تھا اور دوسرا مقلد۔ ہم دونوں نے ملک کی سلامتی اور اس کے شہرے مستقبل کی دعا کی۔ صدر ایوب خان کانگریس کے اجلاس میں جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ان کی تقریر کے نوٹس پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔

صدر نے کانگریس کو اس کی ذمہ داریاں اور اس کے عالمی فرائض یاد دلائے۔ صدر نے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ ”آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کی مصلحت کے تقاضے کچھ بھی ہوں آپ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو ہمارے مسائل کو مشکل بنادے، ہماری سلامتی کو کسی قسم کے خطرے میں ڈال دے۔ جب تک آپ یہ یاد رکھیں گے ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی“ تو کانگریس کے ارکان سر جھکائے کافی دیر ایک گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ صدر کی تقریر کے اور بھی بہت سے حصوں سے بین الاقوامی حقیقتوں اور سچائیوں کا سرا جھکا ہوا تھا۔ اگلے روز جب اخبارات سامنے آئے تو ان میں صدر ایوب خان کے آؤٹ سپوکن ہونے سے متعلق طرح طرح کی حاشیہ آرائی کی گئی تھی۔ ایک فرنیچ خاتون رپورٹر نے تو اپنی سنوری میں یہاں تک لکھ دیا کہ صدر ایوب خان شیر کی طرح کانگریس میں گرج رہا تھا اور امریکی اس کے سامنے ڈبک بیٹھے تھے۔

صدر ایوب کی تقریر اور کشمیر کے تنازعہ کے بارے میں بار بار کے اظہار سے خدا جانے امریکی حکومت نے یہ تاثر کیونکر قائم کر لیا کہ میں اور ایس کے دہلوی جو اس وقت کے سیکرٹری خارجہ تھے۔ دونوں کیونست ہیں اور صدر ایوب کو دوسرے ٹریک پر لے جا رہے ہیں۔ بعد میں جب پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے تعلقات فروغ پانے لگے اور دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی سمجھوتہ طے پا گیا تو خاص طور پر امریکی حکومت کا میرے بارے میں یہ پختہ یقین ہو گیا کہ میرا تعلق بائیں بازو سے ہے کیونکہ میں نے اس سمجھوتے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں یہ سب کچھ محض اپنے وطن کے مفاد میں کر رہا تھا اور میرا بائیں بازو والوں سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، لیکن امریکی حکومت کی خبر گیری کے ادارے مجھے اس پلڑے میں ڈالنے پر بضد تھے۔ ایوب خان کے مزاج میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ طاقت سے جھکانے والوں کے سامنے جھکتے نہیں تھے۔ امریکی حکومت نے جب یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بتدریج تبدیلی آرہی ہے تو اس نے اس کا سارا کریڈٹ میری اور ایس کے دہلوی کی جھولی میں ڈال دیا۔ صدر پاکستان سے میرے خلاف بہت کچھ کہا گیا۔ جس کا اُلٹا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر ایوب خان نے مجھے وزارت اطلاعات و نشریات کا بیکٹری مقرر کر دیا اور وزارت کا پورٹ فولیو جو اس وقت مشرقی پاکستان کے فضل القادر (سابق سپیکر قومی اسمبلی) کے پاس تھا، وہ ان سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ گویا میں اب وزارت اطلاعات و نشریات کا سیکرٹری ہی نہ تھا

بلکہ کچھ زیادہ ہی باختیار تھا۔

ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ صدر ایوب خاں کا رجحان دین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک روز مجھے کہنے لگے شہاب! مجھے باترجمہ قرآن مجید لاکر دو۔ لیکن ترجمہ آسان اردو میں ہو۔ میں نے قرآن مجید کے انگریزی تراجم پڑھے ہیں، ان سے مجھے مقدس کلام کو سمجھنے میں مدد بھی ملی ہے، لیکن میں تشنگی محسوس کرتا ہوں۔ پھر وہ مجھے بتانے لگے کہ جب وہ چار سال اور کچھ ماہ کے تھے تو ان کے والد نے اس خواہش کے ساتھ گاؤں کے ایک مولوی صاحب کے پاس بھیجنا شروع کیا تھا کہ وہ حافظ قرآن ہو جائیں اور اسلامی عقائد سے بے بہرہ نہ رہیں لیکن مولوی صاحب کی اور ان کی بنی نہیں۔ ایک روز مولوی صاحب نے انہیں کسی بات پر چارٹا رسید کر دیا، جواب میں انہوں نے بھی ہاتھ اٹھایا اور پھر اُستادی شاگردی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ بعد میں وہ قریب کے گاؤں میں ایک بزرگ سے قرآن مجید پڑھنے جاتے رہے اور وہ بقول ان کے حافظ قرآن تو نہ بن سکے البتہ اتنا ضرور پڑھ لیا جتنا ان کی عمر کا لڑکا پڑھ سکتا ہے۔ بہر حال ایوب خاں کی خواہش پر میں نے انہیں مولانا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ قرآن پاک لاکر دے دیا جس کا وہ وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

کوئی اقلیم مارشل لاء کے نظام کے تحت آجائے یا اس پر آمرانہ نظام مسلط کر دیا جائے۔ اس میں ہر قسم کی آزادیوں کو سلب کر لیا جاتا ہے تاکہ کوئی ادارہ عوامی حقوق اور شہری آزادیوں کے حق میں آواز نہ اٹھا سکے۔ 1958ء کا مارشل لاء لگا تو سب سے پہلے اس بات کا اہتمام کیا گیا اور پریس اور عدلیہ پابند تعزیر ہوئے۔ 1960ء میں ایوب خان حکومت کے ایک وزیر ایف آر خاں نے پریس لاز بنائے اور ان قوانین کے تحت ملک کے اخبارات پر پہرے بٹھادیے گئے کہ وہ کوئی ایسی بات شائع نہ کریں جن سے شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کی بحالی کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ یہ سینٹرل پریس لاز چل ہی رہے تھے کہ 1963ء میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی صوبائی حکومتوں نے پریس اینڈ جوبلی کیشن آرڈیننس نافذ کر دیے، جس سے رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ آرڈیننس آج بھی اپنی دیرینہ شکل میں موجود ہے۔ میری شروع دن سے یہ خواہش تھی کہ ملک کے پریس کو آزاد کیا جائے اور اخبارات میں ہر قسم کا مواد شائع کرنے پر پابندی نہ ہو۔ محمد علی بوگرہ پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ ان دنوں امریکہ نے بھارت کو اسلحہ کی فراہمی کا اعلان کیا تو محمد علی بوگرہ نے اخبارات کو ایک انٹرویو دیا، جس میں انہوں نے کہا کہ امریکہ اور بھارت کے درمیان اسلحہ کی فراہمی کا پہلے سے خفیہ معاہدہ طے تھا۔ اس پر امریکی حکومت کی طرف سے ایک تردیدی بیان جاری ہوا جس میں امریکی ترجمان نے کہا تھا کہ بھارت کو اسلحہ فراہم کرنے کے بارے میں پہلے کوئی خفیہ معاہدہ نہ تھا بلکہ بھارت کو امریکہ کی طرف سے اسلحہ فراہم کرنا اس کی پالیسی میں شامل ہے اور اس کا تذکرہ امریکی مندوب سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھی کر چکا ہے۔ امریکی حکومت کی طرف سے اس انکار نے وزیر خارجہ کی پوزیشن خراب کر دی۔ اس سے ان کی بین الاقوامی معاملات سے لاعلمی کا پتہ چلتا تھا۔ ان ہی دنوں مشرقی و مغربی پاکستان کے اخبارات کے ایڈیٹر راولپنڈی میں ایوب خاں کی دعوت پر ان سے ملاقات کے لیے جمع تھے ”اتفاق“ ڈھاکہ کے ایڈیٹر تفضل حسین اور چند دیگر ایڈیٹر صاحبان نے مجھ سے رجوع کیا کہ آیا حکومت پاکستان اس بارے میں کوئی وضاحت یا ہدایت اخبارات کو دے رہی ہے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے معاملات میں بالکل آزاد اور باختیار ہیں، جو بات آپ ملکی مفاد میں بہتر سمجھیں شائع کر دیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ حکومت نے اپنے اخبارات پر جو اعتماد کیا تھا، وہ اس پر پورے اترے اور کسی ایک اخبار نے بھی امریکی

حکومت کا یہ DENIAL شائع نہیں کیا۔

ایک اور موقع پر جب حکومت نے پاکستان پر وکریو سپر زکو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس ادارے کے ملازمین کی ملازمت کو لازمی سروس قرار دے دیا تو احمد ندیم قاسمی نے جوان دنوں امروز کے ایڈیٹر تھے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ حکومت انہیں لازمی ملازمت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر گرفتار کر لے گی۔ میں اسی رات راولپنڈی سے لاہور پہنچا۔ رات کے وقت ان کے گھر پر دستک دی وہ بیدار ہو کر باہر آئے تو انہیں کار میں بٹھا کر نو جہاں کے مقبرہ پر لے گیا۔ ہم دونوں رات کے دو بجے تک وہاں بیٹھے رہے۔ ندیم بغلہ تھے کہ وہ آمریت کے ساتھ کھمبہ نہیں کریں گے۔ وہ حکومت کے پابند ہو کر امروز کی ایڈیٹری نہیں کر سکتے، میری مشکل یہ تھی کہ کہیں ندیم جیل نہ بھیج دیے جائیں۔ رات کے پچھلے پہر ہم دونوں تھکے وجود کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئے جیسے ہم نے برسوں کا سفر طے کیا ہو۔ میں نے احمد ندیم قاسمی کو اس وعدے کے ساتھ ان کے گھر پر چھوڑا کہ میں کوشش کروں گا کہ آپ جیل بھی نہ جائیں اور آپ کا استعفیٰ بھی منظور ہو جائے۔ سی آئی ڈی والوں نے ندیم کے ریکارڈ کی کئی ویز فائلیں ہوائی تھیں۔ میں نے ان کا استعفیٰ تو فوری طور پر منظور کروا لیا۔ البتہ ان فائلوں کو تلف کرانے میں کئی برس لگے، تب جا کر کہیں ندیم پر سے بیرون ملک جانے کی پابندیاں اٹھیں اور ریڈیوٹی وی کے دروازے ان کے لیے کھولے گئے۔

آزادی تحریر کی زد میں آنے والوں کا داویلا اور بیرونی طاقتوں کا دباؤ بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتا کہ میرے سارے نوٹس اور دلیلیں ایوب خاں کے سامنے بے کار جاتیں اور طالع آزمایا اپنا کام کر جاتے۔ ایوب خان اگر ایک قدم جمہوری آزادیوں کی طرف سے بڑھاتے تو دوسری جانب ان کے سیاسی رفقاء اور مشیر کھینچ کر انہیں آمریت کے بند کمرے میں لے جاتے۔ ایوب خان ان دنوں 1962ء کے آئین کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنیادی جمہوریتوں کے منتخب ممبروں کو بطور ووٹ استعمال کر کے صدر اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جائیں۔ فروری کی چھ تاریخ کو میں کسی نجی مصروفیت کے باعث دفتر نہ جا سکا۔ اگلے روز میں پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچا تو صدر ایوب خان کو پریشان پایا۔ وہ چپ چپ سے تھے اور کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر خود ہی انہوں نے خاموشی کے ظلم کو توڑا۔

شہاب! یار تم نے بھارت کے جوتشی کی پیشین گوئی اخبارات میں پڑھی ہے کہ اٹھارہ فروری کو قیامت آجائے گی۔

میں نے کہا ہاں سر!

اٹھارہ فروری تو دور ہے، پر پاکستان میں کل قیامت آرہی تھی۔ میں نے ایوب خاں کو اس قدر پریشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے استفسار پر بتانے لگے۔ میرے پاس کل فوج کے پانچ جرنیل آئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ملک میں کم از کم دس سال اور مارشل لاء نافذ رکھا جائے، کیونکہ ایسا کرنا ملک کے بہترین مفاد میں ہوگا۔ مجھے ان کی نیت خراب لگتی تھی۔ ان کا اصرار بڑھا تو میں نے ان سے کہا کہ آپ کا کہنا درست ہے اور میں مارشل لاء کو JNGERON کیے دیتا ہوں۔ پر میرے پاس اس بات کی تو کوئی ضمانت نہیں کہ میں آئندہ دس سال زندہ بھی رہوں گا، اگر مر گیا تو میرے بعد کون چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوگا؟ اقتدار کس کے پاس ہوگا؟ اس پر وہ خاموش رہے اور میں نے انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ آپ منصوبے کی دوسری کڑیوں کا سرا بھی ملا لیں۔

جب 1962ء کا آئین نافذ ہو گیا اور اس کے تحت انتخابات کا مرحلہ طے پا گیا تو ایک ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ

عیش آیا۔ بنیادی جمہورتوں کے نظام کے تحت ہر قومی اسمبلی وجود میں آئی۔ اس کے 72 کے قریب ارکان ایسے تھے، جنہوں نے بعد میں حزب اختلاف کا کردار اہم و بڑا شروع کیا۔ یہ ارکان جن میں محمد علی بوگرہ، مولوی ظفر احمد، حسین بیٹہ، سردار بہادر خاں جیسے قد آور لوگ شامل تھے، حکومت کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتے۔ ایوب خاں کی کابینہ کے کچھ ارکان کی طرف سے مجھ پر دباؤ پڑتا رہتا کہ میں اخبارات کو ہدایات جاری کروں کہ وہ حزب اختلاف کے ارکان کی تقریروں اور بیانیوں کو اپنے کالموں میں زیادہ جگہ نہ دیں لیکن میں نے ہر بار ان سے یہی کہا کہ صحت مند تنقید حکومت کے مفاد میں ہوگی۔ آپ کو حزب اختلاف کے اعتراضات کو ذہنوں میں جگہ دینی چاہیے۔ مگر میری کون سنتا۔ یہ سب تو اختیارات کے اور وہ بھی کلیت کے ساتھ نوازش مند تھے۔

ایک شام محمد شعیب جو اس وقت وزیر خزانہ تھے مع اپنی بیگم کے مجھ سے ملنے میرے گھر پر آئے اور مجھے اپنے ساتھ کراچی لے جانے پر اصرار کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا وہ بعض انتہائی اہم ملکی معاملات پر میرے ساتھ تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصرار اور ضد بڑھی تو میں نے ان کا ہم سفر بننے کی حامی بھری اور اگلے روز ہم دونوں بذریعہ ٹرین کراچی روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ سفر کے دوران ان کی ساری گفتگو کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ یہ ملک اتنی جمہوری آزادی کا مقبل نہیں ہو سکتا جتنی آزادی ایوب خان دے رہے ہیں اور جب انہوں نے مکمل کران مسائل کے حل کے لیے دو بار مارشل لا نافذ کرنے کی تجویز پیش کی، تو میں حیران رہ گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر ایوب خاں کو دو بار مارشل لا نافذ کرنے پر نہیں ہی رضا مند کر سکتا ہوں۔ میں نے جب ان کو سمجھانا چاہا کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں مارشل لا نہیں بلکہ جمہوریت کا احیاء ہے تو انہیں میرے خیالات کو نہ بڑی مایوسی ہوئی۔

کراچی سے واپسی پر میں نے ایوب خان کو محمد شعیب کے خیالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے شعیب کو بلا کر سخت شست کہا۔ صدر ایوب خاں کا کہنا تھا کہ اگر حزب اختلاف کے ارکان میری حکومت کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو آپ کی بجائے مجھے پریشان ہونا چاہیے۔ آپ فکر مند نہ ہوا کریں، میں اس تنقید کو برداشت کر رہا ہوں۔

ایوب خاں اپنے رفقاء اور مشیروں کے اس قسم کے خیالات پر کان نہ دھرتے تھے مگر یہ وہی دباؤ کا معاملہ ایسا تھا جس کے سامنے وہ مجبور ہو جاتے۔ محمد علی بوگرہ کے بیان کے خلاف امریکی حکومت کے انکار کو جب قومی اخبارات نے اپنے کالموں میں جگہ نہ دی تو پاکستان میں امریکہ کے سفیر نے ایک اور جرم میرے نام لکھ دیا۔ ان دنوں حکومت پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان سرحدی سمجھوتہ کی بات چل رہی تھی۔ اس معاملہ میں قہور ابہت میرا بھی حصہ تھا۔ میں تو محض اپنا فرض ادا کر رہا تھا لیکن خدا معلوم امریکی سفارت کار کی معلومات کن اطلاعات پر مبنی تھیں کہ اس نے اس بارے میں ساری ذمہ داری میرے کھاتے میں ڈال دی اور اگلے روز سکرین اور پرو جیکٹر نے کر صدر ایوب خاں کے پاس کافی گئے اور وزارت اطلاعات و نشریات کی اس کارگزاری کے بارے میں تقریباً ایک گھنٹہ تک انہیں سلائید دکھاتے رہے، جو ان کے خیال میں امریکی حکومت کے خلاف مواد فراہم کرتی تھیں۔ ان سلائیدوں میں زیادہ تر اخبارات کے تراشے تھے، جن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اخبارات امریکی پالیسیوں کے خلاف ہیں اور وہ ایک ایسا کردار انجام دے رہے ہیں جن سے حکومت پاکستان امریکہ سے دور ہوتی جا رہی ہے اور اس کی غیر جانبدار خارجہ پالیسی کی ترقیب و تدوین میں شاید میرا ہی ہاتھ ہے۔ حالانکہ میرا وزارت خارجہ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ میرے خلاف امریکی سفارتخانہ کی یہ چھوٹی چھوٹی شکایات آگے چل کر میرے خلاف ایک محاذ کی شکل اختیار کر گئیں۔ چنانچہ میں نے اگلے برسوں میں یونیسکو

کے ایگزیکٹو کا انتخاب لڑا تو امریکہ نے میری ڈٹ کر مخالفت کی اور میں یہ انتخاب ہار گیا۔

1962ء میں جب وزارت اطلاعات و نشریات کا سیکرٹری تھا۔ میرے اوپر زبردست دباؤ تھا کہ میں پریس لازکو اور سخت بناؤں مگر میں اس دباؤ کے سامنے ڈٹا رہا۔ میں نے ایوب خاں کو بہت سمجھایا کہ اخبارات پر پہلے ہی پابندیاں ہیں۔ ان کی آزادی کو بالکل سلب نہ کریں۔ اس طرح تو حکومت کو ہر طرف سے سب اچھا ہے کہ آواز سنائی دے گی اور کوئی اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے والا نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ خود حکومت کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ پریس کی آزادی عوام الناس کی رائے معلوم کرنے کے لیے بہت بڑا ذریعہ ہے اور حکومت عوام کے خیالات و جذبات سے اسی صورت میں آگاہ ہو سکتی ہے جب پریس آزاد ہو اور وہ عوام کی ترجمانی کا صحیح حق ادا کر رہا ہو۔ مرکز میں تو میں نے پریس لازکو اور سخت نہیں بنانے دیا، البتہ صوبائی حکومتوں نے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کے نام سے ایسے قوانین بنا دیے جن کے تحت مالکان اخبارات کو پابندیوں کے ایک ایسے حصار میں گرفتار کر دیا گیا کہ وہ ہر وقت ایسے مواد کو شائع کرنے سے خوفزدہ رہنے لگے، جس سے کسی کی اہانت کا پہلو نکلنے کا خطرہ ہوتا۔ اس آرڈیننس کی زد سے ورکنگ جرنلسٹ تو کسی حد تک بچا رہا تھا، مگر مالکان اخبارات پورے طور پر پابند تھے، گو اس آرڈیننس کو کھلے طور پر استعمال نہیں کیا گیا، لیکن میرے نزدیک اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ورکنگ جرنلسٹ نے بتدریج ذہنی غلامی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا اور وہ لکھتے وقت اس بات کا خیال کرنے لگا کہ وہ اگر یہ لکھے گا تو سزاوار ہوگا اور اس طرح بات کرے گا تو قانون کی زد سے بچ جائے گا۔ اس ذہنی کیفیت نے اسے خود نافذ کردہ پابندیوں کا محتاج بنا دیا۔

فرد جتنا ہی آزاد کیوں نہ ہو، نظام مملکت کی مصلحتیں اس کے پاؤں میں سو طرح کی زنجیریں ڈال دیتی ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں نے ملک کے مفاد میں اپنے ضمیر کی مکمل آزادی کے ساتھ کام کیا مگر یہ بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایوب خاں کو میں اس بیرونی دباؤ سے نہ بچا۔ کاجوائنیں مجبور کر رہا تھا کہ ملک کے پریس کو مکمل طور پر پابند کر دیا جائے۔ اسی دباؤ کے تحت جب مجھے ایوب خاں نے ملک سے باہر بھیج دیا تو بعد میں پریس کی آزادی پر ایک اور حملہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام کی شکل میں کر دیا گیا۔

دونوں صوبائی حکومتوں کی طرف سے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس جاری ہو چکا تھا۔ امریکی وزیر خارجہ جارج باؤل ان دنوں پاکستان کے دورہ پر آئے، کابینہ کے ارکان اکاؤنٹاں سے مل رہے تھے۔ ان کے ملاقاتیوں میں وفاقی سیکرٹری بھی شامل تھے۔ اس ضمن میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو امریکی سفیر مقیم پاکستان پہلے ہی انہیں میرے بارے میں بریف کر چکا تھا۔ ملاقات میں اپنے ساتھ میں اس روز کے اخبارات لے کر گیا تھا، جن میں پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھیں۔ جارج باؤل کا موڈ میرے بارے میں بڑا جارحانہ تھا۔ جوں ہی میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے کہا کہ مسٹر شہاب کیا بات ہے تم ہر وقت ہماری دُم دباتے رہتے ہو۔ جوابی کارروائی کے طور پر میں نے اخبارات کے صفحات یہ کہہ کر ان کے سامنے پھیلا دیے کہ ”مسٹر باؤل ہم نے آپ کے استقبال کے لیے یہ ریڈ کارپٹ بچھایا ہے۔ جارج باؤل اور میری یہ ملاقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی۔ انہیں شکایت تھی کہ میں امریکہ کا مخالف ہوں۔ میرا موقف تھا کہ آپ لوگوں کا یہ تاثر غلط ہے، میری سوچ اور عمل ملکی مفاد کے تابع ہے، اس سے امریکہ کی مخالفت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا، دراصل معاملہ یہ تھا کہ ماضی میں ہماری پالیسیوں میں امریکہ کا عمل دخل بہت بڑھ گیا تھا اور اب حکومت قدرے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کر رہی تھی، اس کی اس مزاحمت کو جو وہ امریکی صلاح

کاروں کے خلاف اختیار کرتی، ان لوگوں نے میرے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ وزیر خارجہ جارج باؤل نے میرے لب و لہجہ کا بھی شاید بُرا مانا تھا، چنانچہ ان کی صدر ایوب خان سے ملاقات ہوئی تو میرے بارے میں کھل کر کہہ دیا کہ مسٹر شہاب کو بطور سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات برقرار رکھنا انہیں پسند نہیں۔ اگلے روز ایوب خان نے مجھے یاد کیا تو ان کا لب و لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ وہ مری میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا شہاب! تمہیں وزارت اطلاعات و نشریات چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ میں نے ان سے کہا کہ بات وزارت اطلاعات تک ہی کیوں رہے، میں ملازمت سے الگ ہو جاتا ہوں۔ بے شک ایوب خان پر میرے بارے میں امریکی حکومت کا بہت دباؤ تھا لیکن وہ میرے ساتھ سارے رشتے توڑنا نہ چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ مجھے کسی ایسے جاب پر بھیج دیا جائے جس سے امریکی حکام کا یہ تاثر زائل ہو جائے کہ میرا اب بھی حکومت پاکستان کی پالیسیوں میں کوئی عمل دخل ہے اور میں ایوب خان سے بھی دور نہ رہوں، تاکہ انہیں میری مشاورت یا کوئی اہم فائل ورک کروانا ہو تو میری خدمات حاصل کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ میرا یہ خیال تھا کہ ایوب خان امریکی دباؤ کو برداشت کریں گے اور وہ بھی آئندہ اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کے خلاف مزاحمت کی پالیسی اختیار کرتے رہیں گے، لیکن مجھے اس روز اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال بدل چکی ہے۔

ان حالات میں، میں مستعفی ہونے پر بضد تھا اور وہ مجھے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تم جو چاہو کرو مگر تمہاری خدمات پاکستان کے لیے باقی رہیں۔ میرے مستعفی ہونے والی بات چند دوستوں کو بھی معلوم ہو چکی تھی، میرے اوپر ان کی طرف سے بھی دباؤ تھا کہ میں اپنا استعفیٰ واپس لے لوں اور البتہ آرام کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں۔ ایوب خان کا خیال تھا کہ اگر میں نے آرام ہی کرنا ہے تو ملک کے اندر کسی غیر اہم پوسٹ پر رہ کر کیا جاسکتا ہے۔ کم و بیش اٹھارہ روز میرا معاملہ زیر بحث رہا اور آخر کار میں نے صدر سے درخواست کی کہ اگر انہوں نے میرا استعفیٰ منظور نہیں کرنا تو مجھے ہالینڈ میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیج دیا جائے۔ میری اس تجویز کو انہوں نے بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔ صدر ایوب خان نے سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات کی ذمہ داریاں الطاف گوہر کے سپرد کرنے کا طے کر لیا تھا، وہ ملک سے باہر تھے، چنانچہ ان کی واپسی تک میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔

ایک شام ایوب خان مری سے راولپنڈی روانہ ہونے لگے تو ایک ضروری فائل مجھے دی کہ میں اسے ساتھ رکھ لوں، وہ راستے میں مجھ سے اس کے بارے میں ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ جوں ہی گاڑی روانہ ہوئی ڈرائیوروں نے اس کا ایئر کنڈیشنڈ کھول دیا اور گاڑی کے دروازوں کے شیشے چڑھا دیے۔ ایئر کنڈیشننگ میری کمزوری ہے، مجھے اس سے فوراً نیند آ جاتی ہے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے فائل تو ہاتھوں میں کھول رکھی تھی لیکن ساتھ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ مری سے راولپنڈی تک میں سارے راستے سویا رہا۔ گاڑی جب پریذیڈنٹ ہاؤس کی پورچ میں رکی تو ایوب خان نے میرا کندھا تھپتھپایا، میں جب نیند سے بیدار ہوا تو سخت پریشان تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا لیکن ایوب خان نے مسکراتے ہوئے کہا "شہاب! میں نے تم سے بڑھ کر کسی کا مطمئن قلب نہیں پایا۔ تم واقعی خوش نصیب ہو جسے دنیاوی جھمیلوں کی کوئی فکر نہیں۔"

ایوب خان پرانی وضع کے روایتی انسان تھے۔ بعض اوقات وہ دوسروں کا دکھ درد سن کر بہت متاثر ہوتے، ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو متعارف کرانے کے لیے پاک جمہوریت کے نام سے ایک ٹرین چلائی گئی جس میں ایوب خان نے ملک کے دونوں حصوں کا تفصیلی دورہ کیا۔ ٹرین میں سرکاری عملہ کے علاوہ اخبار نویسوں کی ایک ٹیم بھی سفر

کر رہی تھی، جب یہ ٹرین شیڈول کے مطابق فیصل آباد پہنچی تو مجھے بعض دوستوں نے احمد ریاض کی بیوہ اور بچیوں کا بتایا کہ ان کی گزر اوقات مشکل سے ہو رہی ہے اور ان کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں۔ احمد ریاض کی موت تب دق سے ہوئی تھی۔ وہ اس کا پرانا مریض تھا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور اس کا ذریعہ معاش صحافت تھا۔ وہ فیصل آباد کے ایک مقامی روزنامہ میں صرف نوے روپے ماہوار پر ملازم تھا، وہ جو چک جھمرہ سے فیصل آباد کے لیے بذریعہ ٹرین روانہ ہوتا اور شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر واپس لوٹ جاتا۔ تب دق کا ان دنوں مونگا ترین علاج تھا۔ علاج کے ساتھ مریض کے لیے رنج ڈائٹ کی ضرورت پڑتی تھی۔ احمد ریاض کے پاس اس کے ذرائع نہ تھے۔ آخر وہ شخص ایک روز چپکے سے خون کی قے کر کے مر گیا۔ پاک جمہوریت سوشل رات فیصل آباد ٹھہری ہوئی تھی، میں نے صدر سے احمد ریاض کا غائبانہ تعارف کرایا اور اس کی موت اور اہل خانہ کی حرماں زدگی کی کہانی سنائی۔ اگلی صبح وہ میری درخواست پر چک جھمرہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پاک جمہوریت سوشل ٹرین اب فیصل آباد سے شیڈول کے خلاف چک جھمرہ محض اس لیے جا رہی تھی کہ صدر نے ایک بیوہ اور اس کی بچیوں سے ملنا تھا۔ چنانچہ جب ہم چک جھمرہ پہنچے تو صدر ایوب ریلوے اسٹیشن سے احمد ریاض مرحوم کے گھر پیدل گئے اور اس کی بیوہ کو بڑے ہی روایتی انداز میں اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر سو روپے دیے۔ احمد ریاض کی سب سے چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور وہاں سے جب واپسی ہوئی تو صدر نے احمد ریاض کے اہل خانہ کی کفالت کے لیے چار سو روپے ماہوار سرکاری وظیفہ کا اعلان کر دیا۔ بعد میں جب ایک اور شاعر صدیقی کا انتقال ہوا تو میں نے صدر ایوب سے کہہ کر اس کے خاندان کی امداد کے لیے بھی تین سو روپے ماہوار سرکاری وظیفہ لگوادیا۔ سحر صدیقی کا تعلق جالندھر سے تھا اور وہ تقسیم کے بعد جھنگ میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ احمد ریاض کا مجموعہ کلام فیصل آباد کے ادیبوں، شاعروں نے ذاتی کاوشوں سے چھپوا دیا، لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سحر صدیقی کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع ہو کر سامنے نہیں آیا۔

کچھ اس قسم کے واقعات تھے جن سے متاثر ہو کر میں نے رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کے ادیبوں شاعروں کے لیے بہت کچھ کیا گیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ بعض کرم فرماؤں نے بعد میں میرے اس عمل کو سیاسی چال سے تعبیر کیا کہ میں ادیبوں، شاعروں کو گلڈ کے پلیٹ فارم پر ایوب خان کی حمایت کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام اور اس کے پس منظر کے بارے میں، میں بہت سے اخباری انٹرویوز میں سب کچھ بتا چکا ہوں، لہذا اب اس پر مزید کچھ کہنا وقت کا زیاں ہوگا۔

ادیب، شاعر، فنکار اور کھلاڑی یہ سب ہمارا قیمتی قومی سرمایہ ہیں۔ ماضی میں کسی حکومت نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ نہیں کیا اور نہ ہی بڑے وقت میں ان کی مدد کی گئی۔ اچھی یا بُری ایوب خان سے کہہ سن کر میں نے اس کی روایت ڈالی تھی، میری کوشش ہوتی تھی کہ حکومت کسی نہ کسی شکل میں ایسے لوگوں کی مشکل وقت میں مدد کرے۔ اس موقع پر ایسے واقعات کی تفصیل میں جانا خود ستائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی عزت نفس کو مجروح کرنے کا باعث بھی بنے گا۔ مناسب نہیں کہ مزید واقعات پر سے پردہ اٹھایا جائے۔ بہر حال میں نے رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم اور ذاتی حیثیت سے یہ کوششیں جاری رکھی تھیں کہ ادیبوں، شاعروں کی فلاح کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔ رائٹرز گلڈ نے تو ایک زمانے میں ان ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ جو پبلشروں کے رویہ سے مایوس پھرتے تھے۔ مجھے اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ گلڈ نے جعفر طاہر کا مجموعہ کلام "ہفت کشور" شائع کیا۔ بعد

میں اس کتاب پر جعفر طاہر کو آدم جی ادبی انعام بھی ملا۔ انعام کی تقسیم کی تقریب راولپنڈی صدر ہاؤس میں منعقد کی گئی۔ جعفر طاہر کا تعلق چونکہ فوج سے تھا اور صوبہ بیدار میجر تھے۔ شاید وہ ایوب خان کو خوش کرنے کی غرض سے تقسیم انعام کی تقریب میں فوجی وردی پہن کر آئے۔ انہوں نے انعام لینے سے پہلے صدر کو فوجی سلوٹ کیا اور ان سے ہاتھ ملایا۔ صدر نے دیکھ کر کہا شہاب! دیکھا فوج میں کتنے پڑھے لکھے موجود ہیں۔ صدر کا یہ تفسر درست تھا لیکن میں نے برجستہ جواب دیا، یس سر! نان کمیشنڈ افسروں میں ایک آدم پڑھا لکھا شخص مل جاتا ہے۔ ایوب خان تو براہ راست کمیشنڈ افسر بھرتی ہوئے تھے اور وہ میرے اس لطیف مزاح کو سمجھ گئے تھے۔ جعفر طاہر کو فوجی وردی پہن کر صدر کے دربار میں آنا یقیناً اس آیا، کیونکہ بعد میں ایوب خاں نے اسے اعزازی کمیشن بنا دیا۔

شادی کے کئی سال بعد تک ہم اولاد سے محروم رہے تھے۔ ثاقب کی پیدائش کے وقت عفت لندن میں زیر علاج تھیں۔ وہ جب ہری گود کے ساتھ واپس پاکستان آئیں تو ایوب خاں ہمارے گھر میں بیٹے کی پیدائش کی مبارکباد دینے آئے، انہیں ہم میاں بیوی کے ماضی میں اولاد سے محروم رہ جانے کا شدید احساس تھا، وہ اس روز بہت خوش تھے۔ ثاقب کو گود میں لے کر کافی دیر کھلاتے رہے۔ بعد میں گھر پر ان کا یہ معمول بن گیا تھا، میں اور عفت جب بھی کبھی انہیں اور اہل خانہ کو ملنے جاتے وہ ثاقب کو گود میں اٹھا کر کھلاتے رہتے یا پھر وہ کبھی ہمیں ملنے ہمارے گھر آتے تو ثاقب کو پیار کرتے رہتے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ بچے نے ان کی گود میں پیشاب کر دیا اور انہوں نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اسے دوبارہ گود میں لے لیا۔

✓ انسان سربراہ مملکت ہو یا دفتر کا معمولی اہلکار، اس کے اندر انسان تو وہی رہتا ہے شفقت کرنے والا دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا۔ زندگی کے جھمیلوں میں باہر کا انسان اپنے روپ بدلتا رہتا ہے۔ پراندر کے انسان نے شاذ ہی بہروپ بھرا ہو۔

الطاف گوہر نے وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکریٹری کی حیثیت سے اپنی نئی ذمہ داریوں کا چارج سنبھال لیا اور میں ہالینڈ روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے ایک رات ایوب خاں نے مجھے اور عفت کو کھانے پر مدعو کیا، کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ ان کی بیٹی نسیم اور نگزیب بھی تھیں۔ وہ کافی دیر گلہ شکوہ کرتے رہے کہ میں نے ان کی بات نہیں مانی، ان کا اب بھی اصرار تھا کہ میں پاکستان رہ جاؤں، وہ عفت اور نسیم سے کہتے رہے شہاب میرا بیٹا ہے، پر اس نے میرے کہے کی لاج نہیں رکھی آپ دونوں ہی اس کو سمجھائیں۔ بے شک میں نے ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا، وہ میرے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے پر اب وہ امریکی دباؤ کے سامنے مجبور محض تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم میاں بیوی پریذیڈنٹ ہاؤس سے باہر نکلے تو عفت نے کہا شہاب! معلوم ہوتا ہے آپ ایوب خان کے سوتیلے بیٹے ہیں، میں نے کہا وہ کیسے؟

ایوب خان نے اپنے بیٹوں کو تو گندھارا انڈسٹری دے دی پر آپ کو ہالینڈ کی سفارت پر ترخا دیا ہے۔ اگلے روز میں عفت اور ثاقب کے ساتھ ہالینڈ جا رہا تھا۔ ولندیزیوں کے دیس میں جن کے خلاف سویکارنو نے انڈونیشیا کو آزادی دلانے کی جنگ لڑی تھی۔ میں اس وقت برٹش ایمپائر کی نوآبادی ہندوستان کا باشندہ تھا اور بیوروکریٹ ہونے کے ناطے سے اس کے تحت و تاج کا ایک معمولی محافظ بھی، سویکارنو ولندیزیوں کی نوآبادی انڈونیشیا کا فرزند تھا۔ پراس کی روح آزاد تھی۔ اس کی اس جنگ آزادی میں میرا بھی تھوڑا سا حصہ تھا۔

جن دنوں سوئیکارنو ہزاروں جزیروں پر پھیلے ہوئے انڈونیشیا کو ڈچ قوم سے آزادی دلانے کی جدوجہد میں مصروف تھے، میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ہوم سیکرٹری تھا اور کلک میں تھا۔ مجھے ایک خفیہ مشن کے بارے میں رپورٹیں مل رہی تھیں کہ کچھ لوگ جن کی پشت پناہی ایک سیاسی قوت کر رہی تھی، سوئیکارنو کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک ڈکو میں ادویات اور عام استعمال کی چیزیں سوئیکارنو کو پہنچانے کے لیے جکارٹہ کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ چند دنوں کی جستجو کے بعد مجھے ان افراد اور ان کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔ میرا پہلا رابطہ ان دو پائلٹوں سے ہوا، جو ڈکوٹا اڑاتے تھے۔ بعد میں دوسرے افراد سے میں متعارف ہوا جو عطیوں کی شکل میں ہالینڈ کے خلاف جنگ لڑنے والے انڈونیشی مجاہدوں کی امداد کے لیے اشیائے صرف جمع کرتے رہتے تھے۔ جب ہمارے درمیان اعتماد کی فضاء قائم ہو گئی تو میرے شوق کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے مجھے اپنے خفیہ مشن میں شامل کر لیا۔ انہوں نے مجھے ڈکوٹا اڑانے کی ٹریننگ دی اور جب دیکھا کہ مجھ میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ ایک روز جو جکارٹہ کی پرواز پر پہنچ دیا۔ ہم لوگ رات سنگاپور رک کر جو جکارٹہ جاتے تھے، کیونکہ رات کے وقت ڈکوٹا کی پرواز خطرناک ہوتی تھی۔

جکارٹہ ان دنوں سوئیکارنو اور اس کے ساتھیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا ہوا تھا۔ ایک ایسی پرواز میں واپسی پر سوئیکارنو میرے ساتھ کلک آئے اور رات میرے ہاں 18 سول لائن میں قیام کیا۔ یہ وہی 18 سول لائن ہنگہ تھا جس پر بعد میں، میں نے کہانی لکھی تھی جسے بین الاقوامی ادب میں شامل کر لیا گیا تھا۔ میرے ہاں ان دنوں ایک کشمیری ملازم تھا، وہ مرغ پلاؤ بڑا عمدہ پکاتا تھا۔ میں نے اپنے معزز مہمان کی خاطر مرغ پلاؤ سے کی، جس کی سوئیکارنو نے بہت تعریف کی۔ سوئیکارنو کو یہ مرغ پلاؤ کئی برس یاد رہا۔ ایک بار پاکستان کے دورے پر آئے تو ایوب خان کو بتایا کہ شہاب نے مجھے جو مرغ پلاؤ کھلایا تھا۔ اس کی لذت مجھے اب تک یاد ہے۔ سوئیکارنو نے صرف ایک رات میرے ہاں قیام کیا اور اگلی صبح کلکتہ روانہ ہو گئے اور وہاں سے واپس انڈونیشیا چلے گئے، لیکن انہوں نے مجھے زندگی بھر یاد رکھا، عید اور نئے سال کے موقعوں پر وہ گریٹنگ کا کارڈ مجھے ضرور بھیجتے، وہ پاکستان کے دورے پر آئے تو مجھے خاص طور پر یاد کیا اور میں ان سے ملنے گیسٹ ہاؤس گیا تو وہ کافی دیر ماضی کے قصے دہراتے رہے۔ ایک بار میں ایوب خان کے ساتھ آزاد انڈونیشیا کے دورہ پر گیا تو تب بھی مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔

ایک بار سوئیکارنو نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

✓ مجھ تک صرف دل کی راہ سے ہی پہنچا جاسکتا ہے، میں ایک بچے کی مانند ہوں مجھے آپ خلوص دل اور محبت سے ایک کیلا دے دیجئے۔ میں ہمیشہ ہمیش کے لیے آپ کو گلے لگا لوں گا۔ اس کے برعکس آپ مجھے کروڑوں روپے دے کر بھی میرا پیار نہیں جیت سکتے۔

سوئیکارنو جب تک زندہ رہا۔ یقیناً پیار و محبت کی ان تمام تر سچائیوں کے ساتھ زندہ رہا۔

1963ء میں جب میں ہالینڈ میں پاکستان کا سفیر بن کر جا رہا تھا تو مجھے معاً احمد عبدالرحیم سوئیکارنو یاد آ رہے تھے، کچھ انڈونیشیا کی آزادی کے حوالے سے، جو انہوں نے ولندیزیوں سے برسوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سوئیکارنو کے ساتھ میرے اس تعلق کو ہالینڈ کی حکومت نے شاید ہی یاد رکھا ہوگا اور بہت ممکن ہے اسے اس تعلق کا علم ہی نہ ہو لیکن جب میں نے ہالینڈ پہنچ کر اپنے تقرری کے کاغذات دربار میں پہنچ کر ملکہ جولیانہ کو پیش کیے تو انہوں نے میری غلط فہمی جلد ہی یہ کہہ کر دور کر دی "یہ بات ڈچ ریکارڈ میں محفوظ ہے کہ تم احمد سوئیکارنو کے مددگاروں میں ہو،

جاہم اپنے وطن میں بطور سفیر پاکستان آنے پر میں جنہیں خوش آمدید کہتی ہوں۔"

میں جب ہالینڈ میں سفیر تھا تو میرے پاس مختلف ذرائع سے یہ اطلاعات اٹھتی ہوئی تھیں کہ ایک ماسٹر مارکڈ قوت سوویکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاری کر رہی ہے۔ سوویکارنو کے خلاف اس طاقت کو یہ فکایت تھی کہ وہ چین کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اسی وجہ سے روس بھی ان سے خوش نہ تھا۔ 1953ء میں، میں انسٹیٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز بیگ میں جب چھ ماہ کے ایڈمنسٹریٹیشن کورس کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ میرے ساتھ اس کورس میں مغربی ممالک میں سے ایک ملک کے خفیہ سروس کے ایک بہت بڑے آفیسر شامل تھے۔ اس دوران میں میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ سوویکارنو کے خلاف کی جانے والی سازش کی معلومات فراہم کرنے والا میرا سروس یہی اعلیٰ افسر تھے۔ میں ان سے وقتاً فوقتاً ملاقات کر کے معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ ایک روز جب مجھے یقین ہو گیا کہ سوویکارنو کے خلاف واقعی سازش مکمل ہو رہی ہے تو میں نے صدر ایوب خاں کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس خط میں صدر ایوب خاں کو میں نے اس خطرے سے قبل از وقت خبردار کر دیا تھا جو انہیں مستقبل میں پیش آنا تھا۔ میں نے انہیں لکھا تھا کہ مستقبل میں پاکستان میں ایسے ہی واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے اس خط پر صدر ایوب خاں کا رد عمل کیا تھا۔ مگر 1969ء کے شروع میں جب ایوب خاں کی حکومت کے خلاف ایچ ٹی ٹیشن کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے ایک روز فاکل سے میرا خط نکلوا دیا اور اسے دوبارہ پڑھا۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے بھی یاد کیا وہ بہت افسردہ تھے۔ جوں ہی میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے کہا شہاب! میں نے تمہارا خط آج فاکل سے نکلوا کر دوبارہ پڑھا ہے، تم نے جو فرسین کیا تھا، آج حالات ویسا ہی رخ اختیار کر رہے ہیں۔

میرے خلوص نے نہ تو سوویکارنو کو کوئی فائدہ پہنچایا تھا اور نہ ہی اب ایوب خاں بچتے نظر آ رہے تھے۔ بہر حال وہ خط یقیناً اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں، میں نے حکومت پاکستان کو جو معلومات فراہم کی تھیں، وہ دوسری بار درست ثابت ہو رہی تھیں۔ 1953ء سے سوشل سٹڈیز کے ادارہ میں چھ ماہ کے لیے انتظامی امور کی تربیت کی غرض سے بیگ میں تھا تو میں نے اپنی تربیت کے سلسلے میں ہالینڈ کی بعض میونسپل کمیٹیوں کے نظام کا مطالعہ کیا تھا کیونکہ ہالینڈ میں حکومت کے انتظام و احترام میں ان اداروں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس دوران میں مجھے ایک چھوٹی سی میونسپل کمیٹی کا ریکارڈ دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس میونسپل کمیٹی میں، میں نے بچے کی پیدائش کی رجسٹریشن کا فارم دیکھا۔ اس فارم میں بہت سے خانے بنے ہوئے تھے۔ جن میں بچے کی پیدائش کا وقت، تاریخ، اس کے والدین کے شہرہ کوائف کے علاوہ ایک خانہ مذہب کے بارے میں بھی تھا۔ اس خانہ میں یہ ہدایت درج تھی کہ والدین اس خانے کو چاہیں تو خالی چھوڑ دیں، تاکہ بچہ بڑا ہو کر جو بھی مذہب اختیار کرے اس کا اندراج خود کر سکے۔ اس فارم کے مذہب والے خانے کے بارے میں ایک طرف حکومت کے جدید خیالات و نظریات کی عکاسی ہوتی تھی تو دوسری جانب اس کے ساتھ ساتھ اس کی تنگ نظری کا بھی پتہ چلتا تھا، کیونکہ اس فارم میں یہ بھی درج تھا کہ بچہ بڑا ہو کر الگ مذہب اسلام اختیار کر لے گا تو اسے اپنے والدین سے پہلے اجازت لینی ہوگی۔ چنانچہ میں نے جب اپنے تربیتی کورس کی تکمیل پر میونسپل کمیٹیوں کے نظام کے بارے میں رپورٹ لکھی تو اس میں اس چھوٹی سی میونسپل کمیٹی کے متعلق اس کے فارم کے بارے میں لکھا کہ ذی قوم ایک طرف تو بڑے جدید خیالات و نظریات کو اپنانے کی دائمی ہے اور دوسری طرف جہاں جہاں مذہب اسلام کا معاملہ آتا ہے وہ اپنے ان جدید نظریات کے باوجود تنگ نظر

ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس فارم پر درج مذہب اسلام کے اختیار کرنے والی شرط کو ختم کیا جائے۔ بعد میں جب میں ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ وہاں اپنے قیام کے دوران میں تیرہ سال بعد اس چھوٹی سی میونسپل کمیٹی میں دوبارہ یہ دیکھنے گیا کہ میری رپورٹ کا ہالینڈ حکومت نے کیا اثر قبول کیا ہے، لیکن اس بار بچے کی پیدائش والے فارم سے مذہب اسلام اختیار کرنے والی شرط حذف کی جا چکی تھی۔

میں ستمبر 1966ء ہالینڈ میں پاکستان کا سفیر بن کر گیا تھا۔ ان دنوں ملکہ جولیانہ کی حکومت تھی۔ وہ غیر ملکی مہمانوں اور سفیروں کو گروپوں کی شکل میں دعوت دیتی رہتی تھیں۔ ایک روز مجھے بھی حکم ملا کہ میں معدنیگم شام کو چائے کی دعوت میں شریک ہوں۔ میں اور عفت دونوں روزہ سے تھے، کیونکہ ماہ رمضان جاری تھا، چنانچہ میں ملکہ جولیانہ کے حکم کی تعمیل میں عفت کے ساتھ چائے کی دعوت میں پہنچا تو ان سے معذرت کی کہ آپ کا حکم تھا، لہذا ہم میاں بیوی اس کی تعمیل میں یہاں چلے آئے، لیکن چونکہ ہم دونوں روزہ سے ہیں اس لیے کچھ کھانے پینے سے معذرت چاہیں گے۔ میری اس معذرت پر انہوں نے بُرا منانے کی بجائے اپنے وزیراعظم کو بلا کر ڈانٹ پلائی۔ ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے وزیراعظم کو سرزنش کر رہی تھیں کہ ہم نے ساڑھے تین سو سال انڈونیشیا کے مسلمانوں پر حکومت کی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اپنے اتنے لمبے واسطے پر بھی آپ نے مجھے صحیح طور پر گائیڈ نہیں کیا کہ کسی مسلمان مہمان کو ماہ رمضان میں دن کے وقت دعوت پر نہیں بلانا چاہیے۔ پھر وہ مجھ سے اور عفت سے مخاطب ہوئیں اور اس غلطی پر معذرت چاہی۔ ہم دونوں ان کی اس عزت افزائی پر ان کا شکریہ ادا کر کے بھری دعوت سے اٹھ آئے۔

ستمبر 1966ء میں بطور سفیر میں ہالینڈ گیا تو میرے لیے یہ ملک اجنبی نہ تھا، میں پہلے بھی یہاں آچکا تھا، البتہ مجھے جو فرائض سونپے گئے وہ میرے لیے بالکل نئے تھے قبل ازیں میں نے بحیثیت سفارتکار کہیں کام نہیں کیا تھا، لیکن اس کے باوجود ان نئی ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ہالینڈ ایک ایسا ملک ہے جس نے اپنے آپ کو بین الاقوامی سیاست سے کافی حد تک الگ تھلگ رکھا ہوا ہے۔ دوسرا، پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات بھی دوستانہ تھا۔ ہمارے مابین کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ ماضی میں نو سال پریزیڈنٹ ہاؤس میں رہتے ہوئے میں نے انتہائی مصروف وقت گزارا تھا لیکن اب معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ہالینڈ میں کچھ کرنے کو نہ تھا، میری پاس وقت بہت تھا اور میں اسے کسی مصرف میں لانا چاہتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے دو ایک کانفرنسوں میں شرکت کرنے سے اندازہ ہوا کہ باہر کے لوگ پاکستان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ خصوصاً یونیورسٹیوں کے طالب علموں کو معلومات کے لیے پاکستان کے بارے میں ریفرنس بک کی ضرورت ہے، چنانچہ میں نے اس خیال سے کہیں پاکستان پر ایک کتاب لکھ دوں، اجازت کے لیے حکومت پاکستان کو ایک خط تحریر کر دیا کہ اگر مجھے اجازت دے دی جائے تو میں کتاب لکھنے کے سلسلے میں ابتدائی کام کی تیاری شروع کر دوں، میں حکومت کے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک روز مجھے ایوب خان کا خط ملا، انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی کتاب شائع ہونے والی ہے، لہذا میں کوئی نئی کوشش کرنے کی بجائے ان کی کتاب کی اشاعت کا انتظار کروں۔ میں جن دنوں ان کا سیکرٹری تھا، انہوں نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، مگر میں نے ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا میں نے ان سے کہا کہ سربراہ مملکت اپنی آٹوبائی گرافی سبکدوش ہونے کے بعد لکھتے ہیں، یا پھر جب ان کا مشن پورا ہو جائے اور یہ روایت ابھی تک قائم ہے اور کسی نے اس روایت سے انحراف نہیں کیا لہذا اس وقت انہوں نے میرا مشورہ مان لیا اور اپنی یادداشتوں کو

کتاب کی شکل دینے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن جب میں ہالینڈ چلا آیا تو انہوں نے میری غیر حاضری میں اپنے ارادے کو شکل دینے کی سعی شروع کر دی۔ ”یار لوگوں“ نے جنہیں صدر مملکت کی عزت و تکریم سے کہیں زیادہ ان کی خوشنودی مطلوب تھی، کتاب کے انگریزی ایڈیشن کے فوراً بعد اردو میں اس کا ایڈیشن شائع کر دیا۔ ابھی یہ لوگ صدر ایوب خان کا مصنوعی طریقوں سے قد کاٹھ بڑھانے کے لیے کتاب کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کروانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کتاب بک سیلروں کی شیلٹوں سے نکل کر فٹ پاتھوں پر کباڑیوں کے ہاں روٹی میں بکنے لگی۔ یہ سب کچھ کتاب کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کے باعث نہیں ہو رہا تھا، بلکہ ان لوگوں کی غلط منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا جو اس کتاب کو صحیفہ کا درجہ دے کر دوسروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ بہر حال میں نے ایوب خاں سے کتاب خودنوشت سوانح کے بارے میں جس روایت کا ذکر کیا تھا، انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”عام دستور نہیں کہ کوئی شخص اپنے عہد پر فائز ہوتے ہوئے اپنی داستان حیات لکھے، ان پابندیوں سے قطع نظر جو ذمہ داری کے احساس کی بناء پر عائد ہوتی ہیں، اس بات کا برابر اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ذرا سا بھی کامیابی کا ذکر آیا تو اسے ہوا باندھنے سے تعبیر کیا جائے گا۔“

ہالینڈ میں میری مصروفیات بطور سفارتکار واجبی سی تھیں، کیونکہ ہالینڈ میں بین الاقوامی سیاست میں کسی ایسے مقام یا کردار کا حامل نہ تھا کہ اس کی ہمدردیاں یا حمایت پاکستان کے لیے حاصل کرنے میں کوئی وقت پیش آتی، پاکستان کے لیے اس کی حمایت کا موقع وہاں میرے تین سال کے قیام میں صرف ایک بار پیش آیا اور وہ اس وقت جب ستمبر 1965ء میں بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملہ کیا گیا اور جنگ بندی کا معاملہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا۔ ہالینڈ نے سلامتی کونسل میں پاکستان کے موقف کی بھرپور حمایت کی اور اس کا ساتھ دیا۔ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد منظور ہو جانے کے بعد اس وقت کے پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد لندن کے راستے واپس وطن جارہے تھے کہ اچانک ایمرسٹرڈیم کے ہوائی اڈے پر اتر گئے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے ہیک میں فون کیا کہ وہ مجھے ملنے کے لیے یہاں تھوڑی دیر کے لیے رُکے ہیں، چنانچہ میں اپنی گاڑی میں ایمرسٹرڈیم پہنچا اور اڑھائی گھنٹے تک ہماری ملاقات رہی اور وہ اگلی پرواز میں روانہ ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ ایوب خان نے پیش از وقت جنگ بندی کر دی ہے۔ انہیں کچھ دن اور انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس ملاقات میں مسٹر بھٹو نے اپنے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا اور میرے لیے ان کا یہ فیصلہ بالکل غیر متوقع تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ بہت جلد وزارت سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور اگر ایوب خان نے انہیں جیل نہ بھجوا یا تو وہ اپنی سیاسی جماعت بنائیں گے۔ بعد میں اعلان تاشقند کے بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کے نام سے اپنی جماعت بنالی۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی کے بعد روس کی طرف سے دونوں ملکوں کے سربراہوں کو اپنے تنازعات باہمی گفت و شنید کے ذریعے طے کرنے کی دعوت دی گئی اور دونوں کے لیے میزبانی کے فرائض انجام دینے کی نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا گیا۔

مجھے جب معلوم ہوا کہ ایوب خان روس کی دعوت پر وزیر اعظم لال بہادری شاستری سے مذاکرات کرنے تاشقند جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد انہیں ایک طویل خط لکھا۔ میں نے اپنے اس خط میں سلامتی کونسل کے فورم سے باہر کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ براہ راست مذاکرات کرنے کی مخالفت کی۔ میں نے انہیں

سمجھا یا کہ اگر کشمیر کا مسئلہ ایک بار سلامتی کونسل کے دائرے سے باہر نکل گیا تو اسے دوبارہ سلامتی کونسل میں لانا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے انہیں اپنے اس غلطی سے بھی آگاہ کیا کہ اگر آپ تاشقند مذاکرات کی میز پر چلے گئے تو آپ پر روس اور ممکن ہے بعض دیگر بین الاقوامی طاقتوں کی طرف سے دباؤ پڑے کہ آپ بھارت کے ساتھ اپنے مذاکرات کو بہر حال کامیاب بنائیں۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے اس سیاسی دباؤ کا سامنا کرنا مشکل ہوگا۔ میں نے انہیں یہ تجویز بھی دی کہ اگر آپ کو مذاکرات کرنے پر مجبور کیا جائے تو ایسی صورت میں آپ بھارتی کا بہانہ بنا کر مذاکرات میں خود شریک نہ ہوں بلکہ اپنے کسی نمائندے کو وہاں بھیج دیں، اس طرح بھارت کا بھی کوئی نمائندہ مذاکرات میں شریک ہوگا اور وقتی طور پر جو دباؤ آپ پر ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ ایوب خان نے میرے خط میں تحریر باتوں کو دانش مندی سے تعبیر کیا مگر انہوں نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا، بلکہ وہ بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری سے مذاکرات کرنے کی غرض سے تاشقند روانہ ہو گئے۔ اعلان تاشقند کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل کے دائرے سے نکل کر اعلان تاشقند میں دب گیا اور بعد میں یہ مسئلہ تاشقند سے نکل کر شملہ معاہدہ میں دفن ہو گیا۔ بھارت کا کشمیر کے مسئلے کے بارے میں عجیب رویہ ہو گیا ہے۔ وہ اس مسئلہ پر ہماری بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ حکومت پاکستان اگر کسی موقع عمل پر اس مسئلے پر اظہار خیال کر دے تو بھارتی حکومت اس ذکر سے سخت ناہو جاتی ہے۔ میں تو اب بھی حکومت پاکستان سے کہوں گا کہ وہ اس مسئلے کو دوبارہ سلامتی کونسل کے دائرے میں لے آئے تاکہ یہ مسئلہ دوبارہ زندہ ہو سکے۔

ہالینڈ کے پروفیسر ڈاکٹر میلوما سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ ان کا تعلق یونیورسٹی کے شعبہ تدریس سے تھا اور یہ ڈاکٹر پاکستان آتے رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان پر بہت کام کیا۔ یہاں آ کر انہوں نے ہمارے مختلف علاقوں کی فلمیں بنائیں اور ان کی ہالینڈ میں نمائش کی۔ خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر میلوما نے علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ پر بہت تحقیقی کام کیا۔ میں نے حکومت پاکستان سے سفارش کر کے انہیں ستارہ امتیاز کا اعزاز دلوایا۔ میں جب ہالینڈ گیا تو ان سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ وہ اسلام کی تعلیمات میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے اور اکثر اوقات اس پر تبادلہ بھی کرتے رہتے۔ لیکن مجھے ان کے بارے میں اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر محمد نعیم کا وزینگ کارڈ ملا۔ یہ صاحب ملاقات کے لیے آئے تھے۔ میں نے انہیں اندر بلایا تو یہ پروفیسر ڈاکٹر میلوما تھے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا کہ یہ سب کیا ہے؟ پروفیسر ڈاکٹر میلوما نے مجھے بتایا کہ وہ کئی برسوں سے مسلمان ہو چکے ہیں، لیکن انہوں نے اسے اس خوف سے چھپائے رکھا کہ کہیں یونیورسٹی میں اسلام قبول کر لینے سے ان کی ترقی نہ رک جائے۔ یونیورسٹی سے چونکہ اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں لہذا انہوں نے اب مسلمان ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا ہے اور ان کا اسلامی نام محمد نعیم ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم کی بات سن کر حیرت ہوئی کہ ہالینڈ جیسا آزاد خیال ملک جو جدیدیت کے پورے تصور کے ساتھ باہر کی دنیا میں متعارف ہے۔ مذہب اسلام کے معاملے میں وہاں کے لوگ اس قدر تنگ نظر بھی ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان کے ایک صوفی عنایت خاں بیسویں صدی کے شروع میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ ہالینڈ گئے اور وہاں قیام کے دوران انہوں نے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے امریکہ اور یورپ کے کئی ممالک میں بھی صوفی آرڈر قائم کیا۔ ہالینڈ میں رہنے والے ان کے پیروکار راج صوفی کہلاتے ہیں۔ صوفی عنایت کے ”صوفی آرڈر“ میں آنے کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے۔ مثلاً وہ پورا کلمہ طیبہ پڑھنے کی بجائے صرف لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں یا پھر

سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ حلقہ میں شامل ہونے والے افراد اپنے عیسائی نام کے ساتھ اپنا اسلامی نام بھی شامل کر لیتے ہیں اور وہ عام بول چال میں عربی اور فارسی کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ذکر، پیرومید کی بیعت، یہ لوگ پورے مسلمان تو نہیں ہوتے، لیکن عیسائی بھی نہیں رہتے۔ صوفی عنایت نے 48 سال کی عمر میں وفات پائی اور دہلی میں دفن ہیں۔ ان کی امریکن بیوی سے ایک بیٹی تھی جس کا نام نور النساء تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو نور النساء جس کی رہائش پیرس میں تھی اتحادیوں کی مدد کرتی رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لندن اور پیرس کے درمیان واحد رابطہ نور النساء رہ گیا۔ بعد میں جرمنوں کو جب نور النساء کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے نور النساء کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ فرانس میں جب ڈیگال برسرِ اقتدار آیا تو انہوں نے نور النساء کو شجاعت کا سب سے بڑا فرانسیسی ایوارڈ دیا۔ صوفی عنایت کے ایک بھائی صوفی مشرف خاں ہیگ میں ان دنوں مقیم تھے، وہاں ان سے اکثر ملاقات رہتی۔ وہ یورپ میں سارے صوفی حلقہ کے سربراہ تھے۔ ان کی ڈچ بیوی تھی اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کو اس بات کا شدید غم تھا کہ ان کی وفات کے بعد یہ تحریک ختم ہو جائے گی۔ اور لوگوں کا اسلام کی طرف رجحان نہیں رہے گا۔ کچھ سالوں کے بعد مشرف خاں کا انتقال ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مشرف خاں کی وفات کے بعد ڈچ صوفی حلقہ کا رجحان موجودہ دور میں کس طرف ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ اس تحریک کا صدر مقام ان دنوں جنیوا میں ہے۔ ڈچ صوفی حلقہ کی طرف سے صوفی عنایت خاں کی تقریروں اور مواعظ پر مشتمل دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

جن دنوں ہالینڈ میں سفیر تھا۔ ہالینڈ کے وزیر خزانہ کا تعلق بھی اسی حلقہ سے تھا اور ان کا اسلامی نام صوفی نور الدین تھا ان کی بیوی کا اسلامی نام فاطمہ بی بی تھا۔ ایک روز صوفی نور الدین مجھے ملنے میرے گھر پر آئے اور مجھ سے مشورہ کیا کہ کس طرح صوفی عنایت خاں کی میت دہلی سے ہیگ لائی جاسکتی ہے، تاکہ ہمارے حلقہ کے اثرات آئندہ ختم نہ ہو جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اسلام کی رو سے کسی مسلمان کی میت ایک جگہ سے دوسری جگہ لا کر دفن کی جاسکتی ہے اور ماضی میں اس کی چند ایک مثالیں موجود ہیں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ بھارتی حکومت صوفی عنایت خاں کی میت آپ کو وہاں سے لے جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ ہندوستان کی حکومت تنگ نظر ہے وہ نہیں چاہے گی کہ ہالینڈ مسلمانوں کا کسی اعتبار سے مرکز بن جائے۔ میری بات سن کر صوفی نور الدین بہت ہنسا، اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کی حکومت ایک ترقی یافتہ حکومت ہے اور بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ صوفی عنایت خاں کی میت دہلی سے ہیگ لے آئیں۔ لیکن بعد میں واقعات نے میرے خدشے کی تائید کر دی۔ ڈچ صوفی حلقہ کی طرف سے بھارتی حکومت کو صوفی عنایت خاں کی میت دہلی سے ہیگ لے جا کر دفن کرنے کی اجازت مانگی گئی تو بھارتی حکومت نے یہ کہہ کر ان کی درخواست مسترد کر دی کہ ایسا کرنے سے بھارت کے مسلمانوں میں ہرجان پھیلے گا اور حکومت کو ڈر ہے کہ کہیں مسلمان ان کی اجازت دینے پر ہنگامے شروع نہ کر دیں۔

میں ابھی ہالینڈ میں ہی تھا کہ پاکستان میں حکومتی سطح پر کچھ تبدیلیاں ہونے لگیں۔ پہلے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو وزارت سے الگ ہو گئے امد بعد میں وزیر خزانہ مسٹر شعیب اور مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ سبکدوش کر دیے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو جو عام اخباری اطلاعات کے مطابق علاج کی غرض سے لندن اور فرانس وغیرہ میں تھے۔ ایک رات مجھے ملنے ہیگ آئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں آپ سے چھپ کر ملنے آیا ہوں تاکہ میری ملاقات کا آپ کے کیریئر پر اثر نہ پڑے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مطمئن رہیے آپ سے ملاقات کوئی ایسی خطرے والی بات نہیں۔ پاکستان میں کیا

سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور ان کا پس منظر کیا تھا، میں اس ساری صورتحال سے بے خبر تھا، البتہ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ایوب خاں کا 1966ء کے وسط میں ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ اب پاکستان کے حالات تمہارے موافق ہیں اور تم واپس پاکستان چلے آؤ، میں نے ابھی ذہنی طور پر واپسی کا قصد نہ کیا تھا کہ ستمبر 66ء کو مجھے نئی ذمہ داریوں کے ساتھ واپس بلا لیا گیا اور میں نے اسلام آباد پہنچ کر سیکرٹری وزارت تعلیم کے فرائض سنبھال لیے۔

ستمبر 1966ء میں ہالینڈ سے واپس وطن آیا تو میں نے محسوس کیا کہ ملک کے سیاسی حالات نیا رخ اختیار کر رہے ہیں۔ ایوب خان کی معاملات پر گرفت کمزور ہو رہی تھی، ان کے وزراء اور مشیر اپنے اختیارات سے خوب فائدے حاصل کر رہے تھے۔ 1963ء میں جس ایوب خان کو چھوڑ کر گیا تھا۔ ایوب خان اس سے بالکل مختلف تھا جس کو میں دیکھ رہا تھا، ان کے رفقاء دنیا داری کے شاید سارے اسباق پڑھا چکے تھے۔ ایک روز میں نے پاکستان ٹائمز میں ان کی آٹھ تصویریں چھپی دیکھیں، ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس خرابی کی نشاندہی کی کہ پبلسٹی کا یہ انداز آپ کو عوام کی نظروں سے گرا دے گا، اس وقت تو وہ میری بات سن کر خاموش رہے مگر دو روز بعد جب میں ان سے دوبارہ ملا تو وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اس میں آخر برائی ہی کیا ہے۔ میں جب دن میں چار فنکشنوں میں شرکت کرتا ہوں تو پھر ان فنکشنوں کی آٹھ تصویریں تو چھپنی ہی چاہئیں۔ میں نے ان کے جواب سے اندازہ کر لیا کہ بعض مفاد پرستوں نے اپنے اپنے رنگ وارشیشوں میں انہیں اتار لیا ہے۔ 1968ء میں وہ بیمار ہوئے تو حالات پر ان کی گرفت اور کمزور ہو گئی، ملک کے دونوں حصوں میں حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ 1963ء کے بعد سے میں ان سے دور ہو گیا تھا۔ تاہم وفاقی سیکرٹری کی حیثیت سے بعض اجلاسوں میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ نومبر 1968ء میں وہ ڈھاکہ کی ایک ایسی ہی گورنر کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے۔ میں بھی اس کانفرنس میں شریک تھا ملک کے کونے کونے میں ایجنٹیشن کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر کانفرنس ہال میں حکومت کے کارپردازان انہیں ”سب اچھا ہے“ کی خوشخبری سن رہے تھے۔ خوشامد کے اس انداز کو دیکھتے ہوئے، جس میں یار لوگوں نے ہر قسم کی اخلاقی حدود کو پامال کر دیا تھا، میں نے بڑے دکھ سے کہا کہ یہ لوگ شاید بھنگ پی کر بیٹھے ہیں باہر آگ لگی ہے اور یہ آپ کو گرین سگنل دکھا رہے ہیں۔ اس حقیقت بیانی سے کسی کے جذبات کو مجروح کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، بلکہ ان لوگوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ آپ جس شخص کی خوشامد میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں، اس کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ملکی حالات روز بروز ابتر ہو رہے تھے، عملی طور پر حکومت کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ایوب خاں کی حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے موقع پر ایوب خان نے راولپنڈی میں سیاسی رہنماؤں کی گول میز کانفرنس بلا کر حالات کو سنبھالا دینے کی آخری کوشش کی، مگر وہ اس میں بھی ناکام رہے۔ شیخ مجیب الرحمن کو جو اگر تلہ سازش کیس میں جیل میں تھے، گول میز کانفرنس میں شریک سیاسی رہنماؤں کے دباؤ میں آکر ہار کر دیا اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ سے راولپنڈی پہنچے تو ہوائی اڈے پر جنرل یحییٰ خاں کا آدمی ان سے ملا اور انہیں کمانڈر انچیف کا پیغام دیا کہ اگر اقتدار لینا ہے تو میرے پاس آؤ۔ اس بڑھے کے پاس اب دینے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ یحییٰ خان اس سے پہلے ایوب خان کے خلاف راولپنڈی میں دیواروں پر پوسٹر بھی چسپاں کر دیا چکے تھے۔ یحییٰ خان نے ایوب خان کی یہ خواہش پہلے ہی مسترد کر دی تھی ملک کے چند بڑے شہروں میں مارشل لاء لگا دیا جائے تاکہ ہنگاموں پر قابو پالیا جائے۔ لیکن یحییٰ خان کا ایک ہی جواب تھا کہ اگر

مارشل لاء لگا تو وہ پورے ملک میں لگے گا، وہ جزوی طور پر مارشل لاء لگانے کو تیار نہیں۔ ایوب خاں کے لیے جب ابتری کی اس فضا سے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے تو بالآخر انہوں نے وہی کیا جو یگنی خان چاہتا تھا۔

ایوب خان نے ریڈیو پر نشر کی جانے والی اپنی آخری تقریر ریکارڈ کروائی، جس میں انہوں نے صدارتی فرائض سے سبکدوش ہوتے ہوئے اقتدار فوج کے حوالے کرنے کا اعلان کیا۔ یگنی خان نے صدر ایوب خاں کی اس تقریر کی ٹیپ کو اس وقت تک اپنے قبضہ میں رکھا جب تک وہ تقریر نشر نہیں ہوگئی اور اس طرح 25 مارچ 1969ء کی شام کو اس تقریر کے نشر ہو جانے کے ساتھ ہی ملک میں ایک اور مارشل لاء لگ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایوب خاں کے دس سالہ دور اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سانحہ سے ایک روز پہلے ایوب خاں کی موجودگی میں دفاعی سیکرٹری صاحبان پریذیڈنٹ ہاؤس میں جمع تھے۔ یہ لوگ حالات کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال رہے تھے۔ اس موقع پر ایم ایم احمد نے شکوہ کیا کہ قوم نے آپ کی گراں قدر قومی خدمات کا صلہ نہیں دیا اور ہنگاموں میں لگ گئی ہے۔ ہر ایک کو قوم کی بے وفائی کا گلہ تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ قوم پر بے وفائی کا الزام دھرنادرست نہیں، اس نے دس سال تک ایوب خان کا ساتھ دیا ہے اور آپ اس قوم سے کیا توقع رکھتے ہیں، مگر یہ لوگ اور نہ ہی صدر ایوب اس کو ماننے کو تیار تھے۔ یہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کو فراموش کر کے ساری ذمہ داری عوام پر ڈال رہے تھے۔

25 مارچ 1969ء کو مارشل لاء لگا۔ 4 اپریل 1969ء تک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یگنی خان کا سول سیکرٹریٹ سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ البتہ اخبارات کی خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک میں گلیاں نالیاں صاف کی جارہی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کی دکانوں پر کھینوں سے بچاؤ کے لیے چالیاں نصب کروائی جارہی ہیں۔ 4 اپریل کو ہمارا پہلا رابطہ جنرل یگنی خان سے اس وقت ہوا جب اس نے سول سیکرٹریٹ میں وفاقی سیکرٹریوں کی میٹنگ بلائی۔ میں جب میٹنگ ہال میں پہنچا تو پہلی قطار کی تمام کرسیوں پر یگنی خان کے فوجی ساتھی براجمان تھے اور وفاقی سیکرٹری دوسری صف میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جنرل یگنی خان آدھا گھنٹہ تاخیر سے میٹنگ میں آئے اور مختصری تمہید کے بعد وفاقی سیکرٹریوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جی بھر کر سول افسروں کو لعن طعن کی۔ تم خوشامدی ہو۔ تمہاری ہی وجہ سے ایوب خان کا اقتدار زوال پذیر ہوا ہے، میں ایک سادہ سپاہی ہوں اور مجھے خوشامد اور چالوسی قطعاً پسند نہیں۔ پون گھنٹے بعد جب یگنی خان کا لیکچر ختم ہوا تو ایم ایم احمد نے دبے دبے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ماضی میں ہم سے واقعی بہت سی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، آپ کی شکل میں ملک میں اللہ تعالیٰ کی رحمت آگئی ہے، آپ ہمیں موقع دیں ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے۔ یگنی خان اب ایم ایم احمد کی جوابی تقریر سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سر ہلاتے جاتے تھے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھا کہ جو شخص تھوڑی دیر پہلے خوشامد کے خلاف ہمیں لکچر دے رہا تھا۔ وہی اب خوشامد کی اس بین کے سروں پر سر ڈھن رہا تھا۔ ایم ایم احمد کی جوابی کارروائی ختم ہوئی تو میں اپنی نشست سے اٹھا اور یگنی خان سے مخاطب ہوا۔ مسٹر جنرل کیا ملک میں صحت و صفائی کا نظام اتنا خراب ہو گیا تھا کہ آپ نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ یگنی خان میرے اس غیر متوقع سوال پر جھنجھلاتے ہوئے بولے تمہارا مقصد کیا ہے؟

میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ کھیاں ماری جارہی ہیں، گلی نالی صاف کی جارہی ہے، کیا فوج کے لیے اب یہی کام رہ گیا ہے اور آپ نے ملک میں دس سال بعد دوسرا مارشل لاء ان ہی اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے نافذ کیا ہے؟

میں بلڈی چوڑھا ہوں؟ میں گلیاں صاف کرنے نہیں آیا۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ہم نے بہت بڑے کام کرنے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ آپ نے جو کچھ کرنا ہے، جلدی کر لیجئے، میری بات ابھی اُدھوری ہی تھی کہ یجی خان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ آؤ چائے پیتے ہیں۔ یہ لوگ تو چائے پینے کے لیے دوسری میز پر چلے گئے اور میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے دس دن بعد میرا یجی خان سے یہ پہلا رابطہ تھا اور یہ ملاقات بھی اُدھوری رہی تھی۔

ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خاں مارشل لاء حکومت کے اہم منصب داروں میں سے ایک تھے۔ وہ وزارت تعلیم کے انچارج بھی تھے، اگلے روز میں سول سیکرٹریٹ گیا تو ان سے ملاقات ہوئی وہ کافی دیر مجھے سمجھاتے رہے کہ ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ تم دیکھو گے ہم اس ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھ پر یہ انکشاف بھی کیا کہ ہم بددیانت سول افسروں کے محاسبہ کے سلسلے میں ان سے جائیدادوں کے ڈیکلریشن مانگ رہے ہیں، انتظار کیجئے، آپ جو منصب چاہیں گے وہ آپ کو سپرد کر دیا جائے گا۔ ایئر مارشل نور خاں شاید اپنی اور میری ملاقات کے دوران ہونے والی گفتگو سے مطمئن نہ ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے دو روز بعد سینڈرز بینک کے ایک ایگزیکٹو میرے پاس یجی خان کا پیغام لے کر آئے کہ میں ان کے ساتھ تعاون کروں اور وہ حکومت میں اہم ذمہ داریاں مجھے سونپنا چاہتے ہیں، لیکن جب میں نے ہر قسم کی ترغیب اور طمع و لالچ سے پہلو بچا لیا اور وہ میری مخالفت پر اتر آئے اور بعد میں میرے خلاف انتقامی کارروائی شروع کر دی۔

میں نے ایئر مارشل سے کہا کہ مجھے آپ لوگوں کے بارے میں جوشبہ تھا آپ نے اس کی تائید کر دی ہے، سول افسروں سے جائیدادوں کے ڈیکلریشن لینے والی بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کچھ کرنا نہیں چاہتے بلکہ پہلے سے تیار رضا بطوں کی طوالت میں ملکی معاملات کو ڈال کر آپ بددیانت لوگوں کو تحفظ دیں گے۔ اگر آپ پسند کریں تو ہم دونوں بانسالا والا بازار میں جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر راہ گیر سے پوچھ لیتے ہیں کہ اس ملک میں کس کس نے لوٹ مار کی اور کیا کیا اور کہاں کہاں جائیداد بنائی۔ اگر یہ لوگ لوٹ مار کرنے والوں کے حصہ جائیداد اور ان کے پتے بتا دیں تو پھر آپ ان سے ڈیکلریشن لیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو میں آپ کا مجوزہ ڈیکلریشن فارم پُر نہیں کروں گا کیونکہ آپ انسانوں اور گدھوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور میں گدھوں کی صف میں کھڑا ہونے کو تیار نہیں۔

میں یجی خان کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا اور مجھے اس کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ تھی کہ وہ ملک کے لیے کچھ کرے گا، وہ محض حصول اقتدار کے لیے ماضی میں سیاسی سازش میں شریک رہا تھا۔

یجی خان کے مارشل لاء سے چند روز پہلے ایک اسلام پسند صحافی میرے پاس آئے تھے اور مجھے اشاروں کنایوں میں یہ بتا گئے تھے مستقبل قریب میں ان کی حکومت بننے والی ہے۔

ستمبر 66ء میں جب میں ہالینڈ سے واپس آیا اور سیکرٹری وزارت تعلیم کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو حکومت نے مجھ سے کہا کہ میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے انتخاب میں حصہ لوں۔ یہ انتخاب نومبر 1966ء کو ہو رہے تھے۔ جس میں ایگزیکٹو بورڈ کے ارکان کو منتخب ہونا تھا۔ میرے پاس کنوینٹنگ کے لیے وقت کم تھا، دوسرا امریکن اور انڈین لابی بھی میرے خلاف کام کر رہی تھی، میں نے مختصر وقت میں بھاگ دوڑ بہت کی لیکن یہ انتخاب میں دو ووٹوں سے ہار گیا۔ لیکن آئندہ 1968ء میں جب یونیسکو کا ایگزیکٹو کے ارکان کا چھ سال کے لیے چناؤ کا مرحلہ آیا تو میں ایک بار پھر بطور

امیدوار سرگرم ہو گیا۔ اب کی بار بھی امریکن اور انڈین لابی میرے خلاف کام کر رہی تھی، لیکن میری مدد کرنے والوں کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی، سینی گال کے وزیر تعلیم احمد مختار ایم ہاؤ نے جو آج کل یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل ہیں، میری کامیابی کے لیے دن رات کام کیا۔ اس مہم میں افرواشین رائٹرز فورم بھی میری کامیابی کے لیے مصروف عمل تھا۔ میں نے بھی متعدد مقامات پر تقریریں کیں۔ ووٹنگ کا مرحلہ آیا تو میں نے 177 ووٹوں میں سے ایک سو گیارہ حاصل کیے اور اس طرح میں نے SECOND HIGHEST ووٹ حاصل کئے۔ مسلم عرب ممالک کے ساتھ افریقی ملکوں نے مجموعی طور پر مجھے ووٹ دیا جبکہ یورپین ممالک سے بھی کافی تعداد میں ووٹ حاصل کئے۔ یحییٰ خان سے میری اُن بن شروع ہو چکی تھی، دریں اثناء یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس کا ایجنڈا آ گیا۔ میں نے حکومت کو اجلاس میں شرکت کے لیے پیرس جانے سے آگاہ کیا تو یحییٰ خان نے میرے ملک سے باہر جانے پر یہ کہہ کر پابندی عائد کرنا چاہی کہ میری بجائے حکومت پاکستان کا کوئی اور فرد یونیسکو کے اجلاس میں بلایا جائے۔ میں اجلاس میں نہیں جاسکتا۔ بعد میں یحییٰ خان کو سمجھایا گیا کہ میں یونیسکو میں بحیثیت سیکرٹری وزارت تعلیم شرکت کرنے نہیں جا رہا بلکہ میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا منتخب ممبر ہوں اور حکومت مجھے اجلاس میں شرکت کرنے سے روک نہیں سکتی۔ یحییٰ خان کو یہ بھی سمجھایا گیا کہ میں جب بورڈ کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے جاتا ہوں تو میرے ٹکٹ اور رہائش وغیرہ کے اخراجات یونیسکو برداشت کرتی ہے۔ یہ ساری صورت حال یحییٰ خان کے سامنے آئی تو اس نے طوعاً و کرہاً مجھے یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانے دیا۔

میں نے یونیسکو کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے انتخاب میں محض حکومت کے مشورہ پر حصہ لیا تھا، لیکن بعد میں یہی یونیسکو میرے لیے یحییٰ خان کی حکومت کے دوران جلا وطنی کی زندگی گزارنے کا معاشی وسیلہ بن گئی اور میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ کم و بیش تین سال تک لندن میں بے یار و مددگار پڑا رہا۔

بوں ہی میں ملک سے باہر گیا۔ یحییٰ خان نے میرے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کی نیت سے درپردہ تحقیقات کرانی شروع کیں۔ وزارت تعلیم کے ایک سینئر افسر کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ دفتری امور کی انجام دہی میں جو بے ضابطگیاں مجھ سے ہوئی ہوں ان کی فہرست مرتب کرے، چھ ماہ کی چھان پھٹک کے باوجود یہ لوگ میرے خلاف کسی قسم کے الزام کی صحت اور بے ضابطگی کو ثابت نہ کر سکے۔ یحییٰ خان میرے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے جواز تلاش کرنا چاہتے تھے جو انہیں مل نہیں رہا تھا۔

رہجہ محمود آبادان دنوں لندن سے کسی ذاتی کام کے لیے پاکستان آئے۔ وہ اس دوران میں یحییٰ خان سے بھی ملے۔ اگلے روز انہوں نے پاکستان میں میرے دوستوں کو اس ملاقات کی روئیداد سنائی۔ بقول رہجہ صاحب یہ ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔ یحییٰ خان بیٹھے ہوئے تھے جب شہاب کا میں نے (رہجہ محمود آباد) اس سے تذکرہ کیا تو اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ گراموفون ریکارڈ پر جیسے سوئی انک جاتی ہے اور اس سے ایک ہی بول بار بار سنائی دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت یحییٰ خان کی تھی۔ رات کے بارہ بجے تک وہ مجھ سے ایک ہی بات کہتا رہا۔ یہ شخص (شہاب) اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے، وہ مجھے بلڈی چوڑھا کہتا ہے، پتہ نہیں رہجہ صاحب! میں جب اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا ہوں تو میرا قلم اور دماغ میرا ساتھ نہیں دیتے۔

رہجہ محمود آباد میرے مہربان تھے۔ وہ یقیناً چاہتے تھے کہ معاملہ سلجھ جائے، مگر انہیں اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں یونیسکو کے اجلاس کے سلسلے میں پیرس میں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک روز اخبارات کے ذریعے مجھ تک یہ

خبر پہنچی کہ یجی خان نے مجھے وزارت تعلیم کے سیکرٹری کے منصب سے الگ کر کے ممبر بورڈ آف ریونیو بنا دیا ہے۔ میں نے فون پر لندن میں راجہ محمود آباد کو جب اس کی اطلاع دی تو انہوں نے کہا کہ پہلے مجھے دو نفل شکرانہ کے ادا کر لینے دو، میں بعد میں تمہارے ساتھ خود بات کروں گا جو کچھ میں یجی خان سے تمہارے بارے میں سن کر آیا تھا اس سے تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ یا تو تمہیں ملازمت سے برخاست کر دے گا یا پھر بڑا ہی مہربان ہوا تو تمہیں کہیں ”چوگئی محرز“ بنا دے گا۔ یہ خبر تو اس کی ذہنی کیفیات کے بالکل برعکس نتیجہ کی حامل ہے۔

یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا جب سے میں ڈائریکٹر منتخب ہوا تھا، عرب ممالک کی خواہش پر میں ان کوششوں میں لگا ہوا تھا کہ کسی طور پر عربی کو بین الاقوامی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ دو سال کی ان کوششوں کے بعد بورڈ کے اس اجلاس میں جب میں نے عربی کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروا لیا تو پاکستان میں میری اس کامیابی کو اخبارات کے کالموں میں نہیں آنے دیا گیا۔ حالانکہ میری بجائے یہ بات پاکستان کے حق میں جاتی تھی کہ اس کے نمائندے نے عرب ممالک کی خواہش کے احترام میں دو سال کی کوششوں کے بعد یہ کامیابی حاصل کی ہے اور پاکستان اس اہم کامیابی پر عرب ممالک سے خراج تحسین بھی حاصل کر سکتا تھا مگر یجی خان حکومت کی اولین کوشش یہی تھی کہ میرے حق میں اخبارات میں کسی قسم کا مواد شائع نہ ہو۔ گواب انگریزی، فرانسیسی، روسی اور ہسپانوی زبانوں کے ساتھ عربی بھی بین الاقوامی زبان تسلیم کر لی گئی تھی اور یونیسکو اقوام متحدہ کا پہلا ادارہ تھا، جس نے اس بارے میں پہل کی تھی لیکن پاکستان میں اس اہم خبر کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہ تھا، البتہ ان ہی دنوں میں نے یونیسکو کے ایک انتہائی اہم مشن کے لیے اسرائیل کا جب خفیہ دورہ کیا تو پاکستان کے بعض اخبارات میں یجی خان کی حکومت کے چند ایک ”خیر خواہ“ صحافیوں نے میرے اس دورہ کو بہت اچھا اور مجھے سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دیا اور استفسار کیا کہ میں اسرائیل کیا لینے گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ چند روز کے بعد ہی ان ہی اخبارات میں میرے اسرائیل کے خفیہ مشن کے حق میں خبریں اور ادارتی نوٹ شائع ہو رہے تھے، یجی خان کی حکومت کو میرے خلاف کارروائی کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ چنانچہ میری اس بات پر جواب طلبی کی گئی کہ میں حکومت پاکستان کا ملازم ہونے کے باوجود اسرائیل کیوں گیا ہوں اور میں نے حکومت سے اس کی اجازت کیوں طلب نہیں کی۔ یجی حکومت کی اس خط و کتابت سے مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے اسرائیل پاکستان کا انتہائی قریبی دوست ملک ہے اور مجھے اس کی ان مذموم حرکات پر اسے بے نقاب کرنا چاہیے تھا اور میری اس حرکت پر پاکستان اور اسرائیل کے تعلقات ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔

یجی حکومت نے اس بارے میں نہ صرف میری جواب طلبی کی بلکہ ایک بریگیڈیئر کونان ونفٹھ کے خرچے کے ساتھ لندن بھیج دیا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے اور مجھے پاکستان واپس لے آئے۔

میں یونیسکو کے تین ماہ کے اجلاس کے بعد لندن آچکا تھا کہ بریگیڈیئر مذکور نے مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور ملاقات کرنے کو کہا میں نے ان صاحب سے کہا کہ وہ چھ ماہ انتظار کر لیں، میں جب یونیسکو کے اجلاس میں دوبارہ شرکت کی غرض سے پیرس جاؤں گا تو وہ مجھ سے وہاں آ کر مل لیں، میری مصروفیات ایسی ہیں کہ میں ان سے یہاں نہیں مل سکتا۔ بریگیڈیئر صاحب کو حکومت نے لندن کا خرچہ ضرور دیا تھا، لیکن یہ خرچہ چھ ماہ کا نہ تھا، لہذا انہوں نے ٹیلی فون پر ہی مجھے ڈرانے دھمکانے پر اکتفا کیا اور مجبور محض پاکستان واپس چلے آئے۔

دریں اثنا، حکومت مصر کو کہیں سے یہ خبر مل چکی تھی کہ یجی خان حکومت میرا پاسپورٹ ضبط کرنے کا ارادہ رکھتی ہے

چنانچہ ایک روز مصر کے وزیر ثقافت ڈاکٹر ثروت اپنے صدر انور سادات کا ایک خط میرے نام لے کر لندن پہنچے۔ میں نے انور سادات کا خط پڑھا تو اس میں انہوں نے اس اطلاع کی تصدیق کی تھی کہ یجی خان حکومت آپ کا پاسپورٹ ضبط کر رہی ہے۔ میں آپ کے پاس اپنے کلچر منسٹر کو چار عرب ممالک کے شہریت کے کاغذات کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ آپ کا اگر پاسپورٹ ضبط ہو جائے تو آپ ان ممالک کو اپنا وطن تصور کریں اور جہاں رہنا پسند کریں اس ملک کی رہائش اختیار کر لیں۔ میں نے انور سادات کی اس مہربانی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں لکھا کہ مجھے یقین ہے کہ یجی خاں ایسے اقدام کا حوصلہ نہیں کریں گے اور اگر ایسا ہوا تو میں معاہدہ اپنی بیگم اور بچے کے پاکستان واپس چلا جاؤں گا۔

میرے پاکستان سے چلے آنے کے چند روز بعد ہی میری اہلیہ عفت اور بیٹا ثاقب بھی لندن آ گئے تھے اور ہم 24 فاکسل کورٹ مٹن سرے میں رہ رہے تھے اور ہم تینوں کی گزراوقات کا ذریعہ صرف یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے دوران ملنے والے یومیہ الاؤنس کی وہ معمولی رقم ہوتی تھی جو اخراجات سے کسی نہ کسی طرح بچا کر لے آتا ہوں۔

یونیسکو کا اجلاس ہر چھ ماہ بعد ہوتا تھا اور یہ چھ چھ ہفتے جاری رہتا۔ اجلاس کے دوران مجھے چالیس ڈالر یومیہ الاؤنس ملتا چنانچہ میں پیرس میں سستے ہوٹل میں قیام کرتا اور اس طرح ڈالر بچا کر لندن لے آتا تاکہ وہاں قیام کے دوران کے اخراجات کسی طرح پورے کیے جاسکیں، مجھے یاد ہے ان دنوں حکومت برطانیہ اپنے ہاں کے بیروزگار افراد کو تین پونڈ فی ہفتہ گزارہ الاؤنس دیتی تھی، لیکن جو ڈالر میں پیرس سے بچا کر لے آتا، ان کے حساب سے ہم تینوں کو فی ہفتہ پانچ سے سات پونڈ میں گزارہ کرنا ہوتا تھا۔ یجی حکومت نے اس وقت تک نہ ہی میرا استعفیٰ منظور کیا تھا اور نہ ہی مجھے تنخواہ مل رہی تھی۔ میں وطن سے دور اجنبی دیس میں بے یار و مددگار جلا وطنی کے دن پورے کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں عفت کو گردوں کی خرابی کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان کا آپریشن کروایا جائے تو گردوں کی اصلاح کی صورت نکل سکتی ہے۔ میں نے یجی حکومت کو لکھا کہ میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے پنشن کی رقم دے دی جائے تاکہ میں اپنی بیوی کا علاج کروا سکوں لیکن دوسری طرف سے سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عفت کی صحت دن بدن گرنے لگی اور ایک وقت آیا کہ ان کے گردوں نے کام کرنا بند کر دیا اور وہ بلڈ پوریا کی مستقل مریضہ بن گئیں۔ بعد میں وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں مشین کے ذریعے ان کا خون صاف کیا جاتا تھا اور اس طرح انہیں زندہ رہنے کے لیے چند لمحے اور مل جاتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے لندن میں قیام کے دوران میرے اور میرے کنبہ کے افراد کے لیے گزراوقات کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور جلا وطنی کے دن لمبے ہوتے جارہے تھے کیونکہ یجی خان کی حکومت اب بھی اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح مجھے گرفتار کر کے واپس لایا جائے۔ میری گرفتاری کے احکام کی خبر مجھے ایک ایئر ہوٹل سے ملی تھی جس کا نام آج تک مجھے معلوم نہ ہوسکا۔

ایئر ہوٹل کے ایک دفعہ میں یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے پیرس جانے لگا تو جہاز پر سوار ہونے کے لیے ایئر ہوٹل نے میرا پاسپورٹ اور کاغذات چیک کئے۔ میرا معمول تھا کہ میں سفر پی آئی اے کے جہاز سے کرتا تھا۔ ایئر ہوٹل نے پاسپورٹ سے میرا نام پڑھا تو وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی اور مجھے الگ لے جا کر پوچھا آپ قدرت اللہ شہاب ہیں؟ میں نے اسے جواب دیا کہ آپ نے پاسپورٹ میں درج میرا نام پڑھ ہی لیا ہے اور اس پر چسپاں میری تصویر کو دیکھ کر آپ کے لیے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی چاہیے، پر میں آپ کی اس گھبراہٹ کا سبب معلوم نہیں کر سکا۔

ہاں میں خوفزدہ ہوں کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا، آپ پی آئی اے سے سفر نہ کریں۔ میں آپ کو ایئر فرانس کا

ٹکٹ لا کر دیتی ہوں۔ خاتون نے مجھے مختصر بتایا کہ اسلام آباد سے کراچی ایک فلائٹ کے دوران اس نے نیکی خان کو ایک بہت سینئر پولیس افسر مسٹر رضوی کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے سنا تھا، وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ اتنا وقت گزر گیا ہے تم ابھی تک شہاب کو گرفتار نہیں کروا سکے۔

ایئر ہوسٹس نے بھاگ دوڑ کر کے چند ہی لمحوں میں مجھے میرا پی آئی اے کا ٹکٹ واپس کر کے ایئر فرانس کا ٹکٹ لا کر دیدیا اور میں کچھ وقت کے بعد ایئر فرانس کے ذریعے پیرس روانہ ہو گیا، مگر میں آج تک کوشش کے باوجود اس ہمدرد ایئر ہوسٹس کا نام نہ جان سکا جس نے مجھے ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کیا تھا اور میری مدد کی تھی۔

چھ بہت بڑی لعنت ہے، لیکن ضرورت کی حد تک نعمت بھی، میں نے روپے پیسے کو زندگی میں کبھی اہمیت نہیں دی لیکن ان دنوں میں اس کی شدید کمی محسوس کرتا تھا۔ اس بار میں پیرس گیا تو وہاں ایک معمولی ہوٹل کی آخری منزل پر کمرہ لے کر رہنے لگا۔ ہوٹل کا مالک مزاجاً مجھے پاکستانی لگتا تھا، کیونکہ مجھے یاد ہے وہ رات دس بجے کے بعد فلائٹ آف کروا دیتا تھا تاکہ میں زیادہ بجلی صرف نہ کروں۔ ویسے بھی میرے کمرے میں زیرو نما لگا ہوا بلب میری لکھنے پڑھنے کی ضرورت پوری نہ کرتا تھا اور میں یونیسکو کا کام دن کے وقت کرتا۔

یونیسکو کے اجلاس کے خاتمہ کے بعد میں لندن آیا تو اپنا بریف کیس جہاز میں ہی بھول آیا اس میں، میں نے وہ ڈالر بچا کر رکھے ہوئے تھے جن سے میں نے آئندہ چند ہفتوں میں گھر کا نظام چلانا تھا۔ رہائش گاہ پر پہنچا تو بریف کیس کا خیال آیا۔ ان ہی قدموں میں کئی میل کا سفر کر کے ہوائی اڈے پر پہنچا اور عملہ کو بریف کیس کی گمشدگی کی اطلاع دی۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے زندگی میں پہلی بار پیسے کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ اگر میرا بریف کیس نہ ملا تو میں آئندہ ہفتوں میں پیش آنے والی ضرورتوں کو پورا کیسے کروں گا۔ سارا وقت اسی پریشانی میں گزارا کہ بریف کیس سے کوئی وہ لفافہ نہ نکال لے جس میں، میں نے ڈالر رکھے ہوئے تھے۔ اگلی شام مجھے فرانس ایئر کمپنی کے قریبی دفتر سے بریف کیس کی یافت کی اطلاع ملی۔ میں نے دفتر پہنچ کر جوں ہی بریف کیس حاصل کیا تو اسے فوری طور پر کھولا اور سب سے پہلے وہ لفافہ تلاش کیا، جس میں ڈالر رکھے تھے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا ڈالروں والا لفافہ صحیح حالت میں پڑا تھا اور بریف کیس کے دوسرے کاغذات بھی اپنی ترتیب میں رکھے ہوئے تھے۔

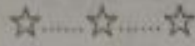
لندن کا قیام ہمارے مشرقی طرز معاشرت سے بالکل مختلف تھا۔ وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ وہاں گھر میں کسی کو ملازم رکھنا تصور کے بھی خلاف تھا چنانچہ ان حالات میں مجھے کام کاج میں عفت کا ہاتھ بٹانا پڑتا۔ ہفتہ میں ایک بار میری ڈیوٹی کپڑے دھونے کی ہوتی۔ میں دھوبی گھاٹ سے کپڑے دھو کر لاتا اور عفت انہیں استری کرتیں۔ کھانا پکانے کی تربیت تو میں نے بہت لی مگر آلو چھیلنے سے زیادہ کچھ نہ سیکھ سکا۔

ہم دونوں میاں بیوی کے لیے جو مسئلہ اہم اور مشکل تھا وہ ناقب کو سکول پہنچانے کا تھا۔ جیب اجازت نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ناقب نو عمری کے باوجود گھر سے سکول تک کا رستہ پیدل چل کر طے کرتا۔ سردی کے موسم میں ایک روز وہ سکول جا رہا تھا کہ راستے میں اسے برفانی طوفان نے گھیر لیا۔ وہ گھر آیا تو اس کے کھٹنے زخمی تھے اور وہ ہمیں مزے لے لے کر برفانی ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی کہانی سن رہا تھا۔

نوا! جس سمت سے برفانی ٹھکر آتا میں اسی رخ پر قدم جما کر کھڑا ہوتا پر نوا وہ تھا بہت زوردار مجھے اٹھا کر دُور پھینک دیتا۔ میں دوبارہ قدم جمانے کی کوشش کرتا مگر بے سود اس کشمکش میں میرے کھٹنے زخمی ہو گئے اور ان سے خون

رہنے لگا۔

ثاقب جب مجھے اور عفت کو بڑے بھول پن سے اپنی داستان سنا رہا تھا تو ہمارے اندر قوت کا ایک ستون خود بنو تعمیر ہو گیا تھا جس پر ہم نے آنے والے دنوں کی دھوپ سے بچنے کے لیے ایک چھت ڈال لی تھی اور اسی چھت کے سائے میں ہم نے مسافروں کے کچھ اور لمحے گزار لئے۔



میری آنکھیں غمناک تھیں، دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یحییٰ خان کے ماتھے پر لکھی ہوئی سیاہ بختیوں کے باوجود یقین نہیں آ رہا تھا کہ کبھی ایسا بھی ممکن ہوگا۔ ثاقب (میرا بیٹا) بھول پن میں کہیں سے اٹس اٹھا کر لے آیا تھا۔ وہ اس کے ورق الٹتا جاتا تھا اور جب کسی چھوٹے ملک کے نقشے پر اس کی نظر پڑتی وہ اسے میرے سامنے رکھ دیتا۔ او! دیکھو یہ ملک کتنا چھوٹا ہے۔ پاکستان آدھا کٹ جانے کے باوجود اس سے بڑا ہے۔ بڑا ہے نا؟ اس نے مجھے کئی ایک ملکوں کے نقشے دکھا کر جو رقبے اور آبادی میں مغربی پاکستان سے چھوٹے تھے تسلی دی پھر اس نے اپنی نرم نرم انگلیوں سے میرے آنسو خشک کیے اور ایک غم بھرے انداز میں کہا تو اگر یہ ملک دنیا کے نقشے پر قائم رہ سکتے ہیں تو پاکستان کیوں نہیں رہ سکے گا؟ جو بات ثاقب نے آدھے ملک کی صورت میں پہلے روز قبول کر لی تھی مجھے شعور اور دانش کی لاشی پڑے اس حقیقت تک پہنچنے میں کئی برس لگے۔

مشرقی پاکستان کے سقوط پر ہمارے مخالفوں نے جو بات اپنے دعوؤں کی تائید میں سب سے پہلے کہی وہ دو قومی نظریے کے وجود سے انکار تھا۔ یہ لوگ اب سارا زور اس پر دے رہے تھے کہ دو قومی نظریہ کا نعرہ غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ اس موقع پر میں ابھی لندن میں ہی تھا۔ میرے لیے یحییٰ خاں کی حکومت میں پاکستان آنا کسی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہاں ٹیلی ویژن نے لارڈ مونٹ بیٹن کا انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا۔ جس کے ہاتھوں ہندوستان کا بنوارہ ہوا تھا۔ ہندوستان کے آخری گورنر کے علاوہ دیگر باتوں کے دو واقعے ایسے بیان کیے جو کم از کم میرے لیے بالکل نئے تھے اور میں نے اس سے قبل ان دعوؤں کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سنا تھا۔

بہر حال اب یہ دونوں سیاسی پیش گوئیاں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ لارڈ مونٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ جب کانگریس نے پاکستان کی صورت میں ہندوستان کے بنوارے کو تسلیم کر لیا تھا ایک روز میں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے پوچھا کہ آپ جیسے متحدہ ہندوستان سے کٹر حامی دعوے دار کی موجودگی میں آخر کانگریس نے یہ فیصلہ کیونکر مان لیا تو اس نے کہا کہ جس ملک کا مستقبل 26 سال سے زیادہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بنانے والے اگر بعید ہی ہیں تو اس کو بن لینے دو۔ بقول لارڈ مونٹ بیٹن میں نے نہرو کی بات سن کر دل میں خیال کیا کہ یہ ایک متعصب ہندو کی رائے ہے جو محض اس کی خوش فہمی پر مبنی ہے مگر جلد ہی بعد مولانا حسرت موہانی نے جب نہرو کے دعوے کی ایک موقع پر تائید کی تو میں حیران رہ گیا۔ مولانا ایک دفعہ میرے پاس آئے۔ قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں جگہ جگہ فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے مجھ سے کہا کہ میرے چند رشتہ دار پاکستان جانا چاہتے ہیں ان کی بحفاظت روانگی کا میں کچھ بندوبست کروں، میں نے مولانا سے کہا کہ آپ یہ بات پنڈت نہرو سے کیوں نہیں کہتے وہ آپ کی اس بارے میں مدد کر کے خوش ہوگا۔ تو

وہ میری بات سن کر بولے پنڈت سے مجھے یہ سب کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے رشتہ دار پاگل ہیں وہ ایک ایسے ملک میں جانا چاہتے ہیں جس کا وجود 26 سال سے زیادہ نظر ہی نہیں آتا۔ میں پنڈت نہرو سے ان کے بارے میں کہہ کر شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے ان دونوں واقعات کو سنانے کے بعد کہا کہ مشرقی پاکستان کے سقوط پر مجھے یہ دونوں باتیں شدت سے یاد آ رہی تھیں۔

مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام میں پیش آنے والے واقعات ہر پاکستانی کے لیے حیران کن تھے، گو مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی باتیں ایک مدت سے سنائی دے رہی تھیں، مگر ان کا اس تیزی سے حقیقت اختیار کر جانا غیر متوقع بھی تھا اور غیر یقینی بھی، مجھے یاد ہے کہ 1962ء میں مشرقی پاکستان میں جب پہلی بار دو معاشی ڈھانچوں کی بات کی گئی، ایوب خاں وہاں دورہ پر گئے۔ ڈھاکہ گورنر ہاؤس میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کا ایک اجلاس بلایا۔ جس میں نور الامین، صبور خاں، تفضل حسین، مائیک میاں، مولوی فرید احمد اور دیگر لوگ شامل تھے۔ ایوب خاں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ پاکستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں، اگر ان کا ارادہ علیحدہ ہونے کا ہے تو یہ علیحدگی دو بھائیوں کے درمیان صلح و امن سے ہو جانی چاہیے لیکن رہنماؤں نے بیک زبان کہا کہ وہ ہرگز پاکستان سے الگ نہیں ہونا چاہتے، بعد میں تفضل حسین ایڈیٹر "اتفاق" ڈھاکہ نے ایک ملاقات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی علیحدگی کا بیج بونے میں سی آئی اے کا ہاتھ بھی یقینی طور پر تھا، ان کا خیال تھا کہ سی آئی اے کا جو ایجنٹ سب سے پہلے پاکستان آیا تھا وہ ایک امریکی تجارتی فرم کا چیف تھا۔ تفضل حسین نے کہا کہ مشروبات کا کاروبار کرنے والی فرم کے اس سربراہ نے میرے دفتر میں مجھ سے ملاقات کی اور کافی دیر مجھے یہ درس دیتا رہا کہ اگر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہو جائے تو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اقتصادی اعتبار سے زیادہ خوش حال ہوگا۔ اس نے مجھے یہ ترغیب بھی دی کہ ہمیں پاکستان سے آزادی حاصل کرنے کے مسلح جدوجہد شروع کر دینی چاہیے۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کو ہمارے بارے میں اتنا فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہم دو بھائیوں کا اندرونی اور ذاتی معاملہ ہے ہمیں جب علیحدہ ہونا ہوگا ہم علیحدہ ہو جائیں گے۔ جس روز ہم لاکھوں کی تعداد میں نہیں بلکہ ہزاروں کی صورت میں ڈھاکہ کے رن وے پر لیٹ گئے اور صدر پاکستان کے جہاز کو ہوائی اڈے پر اترنے نہ دیا تو علیحدگی تو اس صورت ہی میں ہو جائے گی۔ پھر ہمیں مسلح جدوجہد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے مشرقی پاکستان میں دو معاشیات کا نعرہ بھی بیرونی اشارہ پر لگایا گیا تھا۔ اس نعرے کے پس منظر میں یہ مطالبہ کارفرما تھا کہ مشرقی پاکستان بیرونی تجارت سے جو زرمبادلہ کمائے وہ یہاں پر خرچ کیا جائے اور مغربی پاکستان کے ذرائع آمدن وہاں خرچ ہوں۔

ان دنوں ایوب خاں کی حکومت کیلئے قومی یکجہتی کا مسئلہ بہت اہم تھا وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی ذہنی و فوری کو ختم کیا جائے۔ اس ضمن میں کم از کم ادبی و ثقافتی حلقوں میں رائٹرز گلڈ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ایک بنگالی ادیب منیر چوہدری بنگلہ زبان کے معاملے میں بہت متشدد تھے ایک دفعہ ڈھاکہ کے ایک سینما ہال میں اردو مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تو منیر نے اس سینما ہال کو ہی آگ لگوا دی مگر بعد میں جب پاکستان رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے قومی یکجہتی اور علاقائی زبانوں کی ترقی و ترویج کا کام شروع کیا گیا تو اسی منیر چوہدری نے مشرقی پاکستان کا شاید ہی کوئی کونا ایسا ہوگا جہاں اردو مشاعرے کا اہتمام نہ کیا ہو۔

ہنگو دلش کے قیام کے حامی اور بانی شیخ مجیب الرحمن سے میری آخری ملاقات 1970ء میں لندن میں ہوئی۔ یگی خاں نے عام انتخابات کرانے کا اعلان کر رکھا تھا مگر ابھی انتخابات منعقد ہونا تھے۔ مجیب الرحمن لندن آئے تو میں ان سے ملا۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی ساٹھ فیصد نشستیں جیت جائیں گے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ پھر وہ کیا کریں گے تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی حکومت بنائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ یگی خاں کبھی آپ کو اقتدار نہیں دے گا۔ تو انہوں نے یقین سے کہا کہ وہ اقتدار ان کے حوالے کر دے گا۔ میں نے اپنے خدشات کا تفصیل سے اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر یگی خاں نے عوامی لیگ کی انتخابات میں کامیابی کے باوجود اقتدار ان کے سپرد نہ کیا تو وہ اس کے لیے لڑیں گے اور اپنا حق اس سے ضرور لے کر رہیں گے۔ مجھے شیخ مجیب الرحمن کے بعد کے عزائم کے بارے میں تو کچھ علم نہیں مگر اس وقت تک مجھے ان کی باتوں سے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ علیحدگی کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں۔ ان دنوں میں پاکستان میں ہونے والے سیاسی حالات سے واقف نہ تھا کیونکہ میں ملک سے باہر تھا مگر جو کچھ بھی ہوا اور جیسے بھی ہوا وہ ایک تلخ حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ یگی خاں نے اقتدار مجیب الرحمن کے حوالے نہ کیا اور مشرقی حصہ میں ملٹری ایکشن شروع کر کے ملک کے دو ٹکڑے کر دیے جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میں نے یگی خاں کے برسر اقتدار آتے ہی (ریٹائرڈ) ایئر مارشل نور خاں کے سامنے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ مجھے اس شخص کے چہرے پر یہ سیاہ بختی لکھی نظر آتی ہے کہ یہ ملک کے ٹکڑے کر دے گا۔

جنگ کے نتیجے میں جب مشرقی پاکستان بھارت کے قبضہ میں چلا گیا اور نوے ہزار پاکستانی فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے تو یگی خاں کی حکومت کے خلاف لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ فوج کے اندر بھی اس کے خلاف اس کے ساتھی بغاوت کر رہے تھے۔ تو اس نے طوعاً کرہاً اقتدار مسٹر بھٹو کے حوالے کر دیا۔ بعد میں مجھے ممتاز علوی نے جو پاکستان کے سیکرٹری خارجہ بھی رہے بتایا کہ ایک روز وہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں سابق صدر یگی خاں کی میز کی درازیں کھول کر کاغذات نکال رہے تھے کہ ان میں ایک میری فائل بھی تھی جو یگی خاں نے ذبا کر رکھی ہوئی تھی۔ اس فائل کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یگی خاں میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے ریٹائرمنٹ دے چکے ہیں۔ میری وہ فائل لے کر ذوالفقار علی بھٹو کے پاس گئے اور اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ مسٹر بھٹو نے پاکستانی سفارتخانہ کے ذریعے مجھ سے لندن میں رابطہ قائم کیا اور مجھے پاکستان آنے کے لیے ٹکٹ بھیجا اور اس طرح میں تین سال کی جبری جلاوطنی کے بعد پاکستان واپس آیا۔ جس روز میں پاکستان آیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس دن کراچی میں تھے۔ شام کو میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ افسردہ کافی دیر پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات پر روشنی ڈالتے رہے۔ انہوں نے اس پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ مجھے ماضی میں کافی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ انہوں نے مجھے حکومتی امور میں تعاون کرنے کو کہا میں نے جب ان سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کے تعاون کی امید رکھتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ان کی وزارت میں شامل ہو جاؤں مگر میں نے ان سے کہا کہ میں نہ تو قومی اسمبلی کا رکن ہوں اور نہ ہی مجھے سیاست میں حصہ لینا ہے لہذا میرا وزارت میں شامل ہو جانا سیاسی اصول و آداب کے خلاف ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایک ٹیکنیکل وزارت کا قلمدان خالی رکھا ہوا ہے وہ اس بارے میں پیشگی اعلان بھی کر چکے ہیں کہ وزارت کے لیے جو وزیر مقرر کیا جائے گا وہ غیر سیاسی ہوگا۔ میرے ذہن میں اعلان کرتے وقت آپ کا نام محفوظ تھا۔ میں نے اس اعتماد اور فراخ دلانہ پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں جب ان کا بے حد اصرار بڑھا تو میں نے ان کی حکومت سے تین سال تک کے لیے کنٹریکٹ بنیاد پر بطور سیکرٹری

تعلیم کام کرنے کی حامی بھری۔ وہ مجھ سے کہتے رہے کہ یہ منصب میرے لیے بہت کم ہے۔ اگر میں ملازمت ہی کرتا چاہتا ہوں تو وہ مجھے میری ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں اور مجھے سیکرٹری جنرل بنا کر وزارت اطلاعات و نشریات اور وزارت تعلیم کو مدغم کر کے میرے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں نے جب اس کی حامی نہ بھری تو وہ میری تجویز سے متفق ہو گئے اور میں نے کچھ دن کے بعد ایک بار پھر بحیثیت سیکرٹری تعلیم فرائض کا چارج سنبھال لیا۔

ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آنے والے مہاجرین کی تباہی نے ہمارے اندر ایک ہیومن آئیڈل ازم پیدا کیا ہم سب ان تباہ حال لوگوں کی آباد کاری میں مصروف ہو گئے مگر یہ ہیومن آئیڈل ازم پروان نہیں چڑھا بلکہ اس جذبہ کے برعکس ہم میں منافقت آ گئی، ہم منہ زبانی اسلامی نظام حیات کی باتیں کرتے رہے لیکن ہمارا عمل دنیا داری تھا۔ ہم نے پیسہ کو تمام انسانی رشتوں پر فوقیت دی منافقت کے کینسر کے یہ جراثیم تمام شعبہ زندگی میں پھیلنے لگے۔ ڈائریکٹر صنعت کی حیثیت سے میں نے دنیا داری کے اس عمل کا بھرپور مشاہدہ کیا۔ میرے دفتر کے باہر دن بھر کاروں کی ایک لمبی قطار لگی رہتی تھی اور یہ قطار اس وقت تک ختم نہ ہوتی جب تک میں دفتر سے اٹھ کر گھر چلا نہ جاتا میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ان دنوں الاٹمنٹ بورڈ مٹر وکھ صنعتی یونٹوں کی الاٹمنٹ کر رہا تھا اور اس بورڈ کا میں چیئرمین تھا۔ لوگ ہندوستان میں چھوڑی ہوئی صنعتوں کے اپنے اپنے کلیم لارہے تھے اور ان کلیموں کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا، جیسے میں ہندوستان کے سب سے بڑے صنعتکار کی جائیداد کے کوائف کا مطالعہ کر رہا ہوں ان میں ایسے بھی تھے جن کے جذبے ابھی صادق تھے۔ کلیموں اور الاٹمنٹوں کا ایک لامتناہی اجتماع تھا اور اس نے ہمارے اندر کے تمام جذبے اجاگر کر دیے تھے بس ایک ہی دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ دروازہ حرص کا تھا جو دولت اور جائیداد کے حصول کا ذریعہ تھا اس کے لیے فقط جھوٹ بولنا پڑتا تھا ہم یہ کام ضمیر میں خلش محسوس کیے بغیر کر رہے تھے۔ کام کی زیادتی اور دوسرا ان کلیم داروں کی نئی نئی شرائط کے باعث میں ذہنی دباؤ میں رہنے لگا۔ اتوار پر ہائش گاہ پر گزارنے کی بجائے میں دفتر کی فائلیں اٹھائے کار میں لاہور سے باہر نکل جاتا اور دن بھر کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر فائل ورک مکمل کر لیتا جس روز کسی سرکاری کام سے لاہور سے باہر جانا ہوتا میری روانگی سے پہلے یہ ”باخبر لوگ“ اپنے آپ لفٹن کیریئر ہاتھ میں سنبھالے ریلوے سٹیشن پر موجود ہوتے تاکہ سفر کے دوران اگر مجھے ناشتہ یا کھانا کھانے کی حاجت ہو تو انسانی محبت اور پیار کے گرم جذبوں سے کام لیتے ہوئے یہ میری خدمت کر سکیں شاید انہیں یہ بات یاد رہ گئی تھی کہ اللہ حقوق العباد کو زیادہ پسند فرماتا ہے سائے کی طرح پیچھا کرنے والے ان مہربانوں سے میرا تعلق بالآخر ایک روز ختم ہو گیا کیونکہ میری تعیناتی بحیثیت پرسنل سیکرٹری گورنر جنرل پاکستان کر دی گئی تھی۔

ضروری فائلیں دبا کر رکھنے کے اہلکاروں کی پرانی عادت ہے ان کی اسی عادت کو ہم نے ”سرخ فیتہ“ کا نام دے دیا ہے ڈائریکٹر صنعت کے دفتر میں ایک اہلکار اس کام میں بہت بدنام تھے، جو کوئی متعلقہ شخص ان کے پاس اپنا کیس نکلوانے کے لیے جاتا وہ فائل کی نایابی کا بہانہ کر کے اداس بیٹھ جاتے ان کے چہرے مہرے اور گفتگو سے اندازہ ہوتا جیسے وہ زمانے کی بے ثباتی کا سب سے زیادہ شکار بنے ہیں اور اگر سائل ان سے مغموم و اداس ہونے کا سبب دریافت کر لیتا تو پہلے وہ آہ بھرتے اور پھر بات شروع کرتے دیکھئے نا صاحب ہماری کیا زندگی ہے سارا دن دفتر کی چکی پیستے ہیں لیکن گھر میں یہ حال ہے کہ بیگم یا بچوں کی ایک معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے، کل میں آپ کی بھابھی کے ساتھ انارکلی بازار سے گزر رہا تھا کہ بیگم کو ایک ساڑھی پسند آ گئی اس کی قیمت دریافت کی تو دکان دار نے کہا کہ پانچ سو روپے ہے، بھلا آپ ہی بتائیے میں بیگم کو وہ ساڑھی کیسے لے دیتا جب کہ میری تنخواہ ہی پانچ سو سے کم ہے میں کل سے اپنی بے بسی پر

کڑھ رہا ہوں۔ بیگم نے ایک معمولی سی فرمائش کی اور میں وہ بھی پوری نہ کر سکا۔ ہماری بھی کیا زندگی ہے اس میں سوائے محرومیوں کے اور ہے ہی کیا۔

اب سائل نے پوری دانائی سے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں صاحب! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ میں بھابھی کو وہ ساڑھی گفٹ میں لا دیتا ہوں یہ سن کر وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے نیلے رنگ کی ساڑھی ہے۔

اس کا باڈر سنہری ہے فلاں کلاتھ ہاؤس کے شوروم میں لٹکی ہوئی تھی اور جب وہ ساڑھی خرید کر واپس دفتر پہنچتا تو اس کی گم شدہ فائل پر ضروری کارروائی ہو جاتی، سنہرے باڈر والی نیلی ساڑھی کئی بار خرید ہو کر ان کے پاس پہنچتی اور پھر دفتر کے چپڑاسی کے ہاتھ واپس کر دی جاتی میرے دفتر کا یہ اہلکار شاید وہ کولبس تھا جس نے لمبے دہنی سفر کے بعد رشوت لینے کا یہ طریقہ دریافت کیا تھا۔

1 گورنر جنرل غلام محمد کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ وہ گالی دیتے وقت انداز اور زبان پنجابی استعمال کرتے ہیں جس روز مجھے ان کے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا پروانہ ملا میں بہت پریشان ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہیں ”عزت سادات“ میں نوکری ہی نہ چلی جانی، طوعاً و کرہاً میں کراچی روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اپنی نئی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھالیا۔ ابتداء میں وہاں میں ذرا ڈراسا رہا، میری کوشش ہوتی کہ گورنر جنرل کے سامنے نہ جاؤں۔ اگر کوئی ضروری فائل لے کر ان کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی تب بھی میں ان کی انگریز پرائیویٹ سیکرٹری کی معرفت فائل دستخطوں کے لیے ان کے پاس بھجواتا کیونکہ ان کے شاف میں یہی ایک تھیں جو ان کے لبوں کی حرکت سے ان کی بات کا مفہوم سمجھ جایا کرتی تھیں، ایک روز وہ کوئی فائل لے کر غلام محمد کے بیڈروم میں گئیں، کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور فائل غلام محمد صاحب نے فرش پر پھینک دی محترمہ نے فائل فرش پر رہنے دی اور غصے میں لال چیلی ہو کر کمرے سے باہر نکل آئیں مجھے اس صورتحال کا علم نہ تھا میں جب ایک ضروری فائل پہ دستخط کرانے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو پلنگ پر لیٹے تھے اور ایک فائل فرش پر پڑی تھی۔ جس کے کاغذات بکھر چکے تھے، جوں ہی میں نے فائل کے بکھرے ہوئے کاغذات جمع کر کے اٹھانا چاہا وہ غصہ میں چلائے اور اپنے قریب رکھی ہوئی ٹائم پیس اٹھا کر مجھ پر دے ماری۔ میں نے صورت حال کو جانچ لیا اور جلدی سے بدن کو جنبش دے کر ایک طرف ہو گیا اور ٹائم پیس سامنے دیوار سے جا ٹکرائی اگر میں ذرا بھی غفلت کرتا تو میرا سر پھٹ جاتا چونکہ گورنر جنرل صاحب کا حکم تھا کہ فائل پرائیویٹ سیکرٹری خود میز پر اٹھا کر رکھیں گی لہذا میں اپنے سر کی سلامتی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا ☆

☆ ایک روز دفتر پہنچتے ہی پیغام ملا کہ گورنر جنرل یاد فرما رہے ہیں۔ میں ان کے بیڈروم میں داخل ہوا تو فرش پر ایک فائل پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کسی سے بے خیالی میں گر گئی ہوگی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے بکا ہی تھا کہ گورنر جنرل نے اپنا ٹائم پیس ترازو سے میرے سر پر دے مارا اور گرج کر کہا۔ ”فائل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ٹائم پیس اٹھا کر یہاں لاؤ۔“ میں نے ٹائم پیس اٹھا کر انہیں واپس دیا تو انہوں نے ٹول ٹول کر اس کا بغور جائزہ لیا کہ میرے سر سے ٹکرا کر اس کا کچھ بگڑ تو نہیں گیا۔ میرے سر میں اس کی ضرب سے گھمز سا پڑ گیا تھا۔ میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔ ”یہ ٹائم پیس بڑا نازک اور قیمتی ہے۔ اس سے بچ کر کام لینا جائز نہیں۔“

”تمہارا سر بھی تو ٹکڑیٹ سے بنا ہوا ہے۔“ مسٹر غلام محمد نے مسکرا کر کہا۔

”شہاب نامہ صفحہ 254، 255 سبیل پبلی کیشنز لاہور۔“

غلام محمد بہت کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے ایک طرح سے وہ ایک مفلوج شخص تھے جو محض رُعب اور ڈبڈبے سے کام نکال رہے تھے۔ وزیراعظم اور وزراء کو ان سے اختلاف رائے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا یہ لوگ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ ان کی صحت ایسی نہیں کہ وہ معمولی کے سرکاری فرائض انجام دے سکیں۔ ان سے اپنی ذمہ داریوں سے الگ ہو جانے کو کہہ نہ سکتے تھے۔ چوہدری محمد علی، سکندر مرزا اور دوسرے وزراء جب کبھی ان سے ملنے گورنر جنرل ہاؤس میں آتے تو میں ان سے کہتا رہتا کہ آخر آپ نے ایک مفلوج اور لاچار شخص کو اتنے بڑے منصب پر کیوں رکھا ہوا ہے تو وہ اپنی بے بسی کا اظہار کر کے خاموش ہو جاتے۔

ایک روز سکندر مرزا کسی کام کے سلسلے میں گورنر جنرل سے ملنے آئے۔ اس دوران میں وہ موقع نکال کر میرے دفتر میں چلے آئے اور مجھے ترغیب دی کہ میں کسی طرح گورنر جنرل کے استعفیٰ پر ان سے دستخط کروالوں۔ میرے سامنے کافی دیر وہ اس بارے میں اپنی بے بسی کا رونا روتے رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے لیے ایسا کرنا تو انہیں دھوکا دینا ہوگا۔ سکندر مرزا نے کہا پر اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہیں یہ بڑھا بہت ہوشیار ہے۔ یہ آسانی سے ہماری جان نہیں چھوڑے گا۔ بہر حال میں نے سکندر مرزا سے حامی بھر لی کہ میں ان کا استعفیٰ ٹائپ کروا کر ان کے پاس لے جاتا ہوں اور ان سے کہے دیتا ہوں کہ آپ کے رفقاء کا یہ پسند نہیں کرتے کہ آپ ایسی صورت میں جبکہ آپ کسی کام کے قابل نہیں رہے اس منصب سے چمٹے رہیں مناسب یہی ہے کہ آپ اپنے استعفیٰ پر دستخط کر دیں۔ یا پھر وہ زبردستی آپ کو الگ کر دیں گے۔ میری بات سن کر سکندر مرزا بہت پریشان ہوئے خدا کے لیے ایسی کوئی حماقت نہ کر بیٹھنا ورنہ ہم میں سے کسی کی خیر نہیں وہ ہم سب کو فارغ کر کے گھر بھیج دے گا میں نے اس سیاسی ”لکھن میٹ“ سے اپنے آپ کو الگ رکھا ہوا تھا۔ لیکن سچی بات ہے۔ میں اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا بلکہ ہر وقت کڑھتا رہتا کہ یہ لوگ ملک کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کر رہے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب وفاقی وزارت میں اتھل پٹھل ہوتی رہتی تھی۔ مجھے اس کا علم اس وقت ہوتا جب ریڈیو پر خبر آ جاتی یا حلف لینے والے وزراء گورنر جنرل ہاؤس میں آتے۔ یہ سب کچھ چونکہ سیاسی سازشوں کے تحت ہو رہا تھا لہذا قبل از وقت سیاسی تبدیلیوں کا علم صرف ان ہی لوگوں کو ہوتا جو اس کھیل میں شامل ہوتے تھے۔

کراچی کے موسم کی مناسبت سے میں بشرٹ پتلون پہن کر دفتر جاتا تھا۔ مجھے چونکہ تقریباً حلف برداری کے موقع پر موجود رہنا پڑتا تھا۔ لہذا میں نے ایک کوٹ قمیص اور ٹائی مستقل طور پر دفتر میں رکھ چھوڑی تھی اور جب کبھی ایسا موقع آتا لباس تبدیل کر کے اس میں شریک ہو جاتا۔ غلام محمد کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی ہم انہیں کبھی کبھار کار میں خفیہ طور پر سیر و تفریح کے لیے گورنر جنرل ہاؤس سے باہر لے جاتے اور گھوما پھرا کر واپس لے آتے ان کو اس طرح خفیہ طریقے پر سیر و تفریح کے لیے باہر لے جانے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سیوریج کے لیے لمبے چوڑے انتظامات نہ کرنے پڑیں اور لوگوں کو ان کی بگڑتی ہوئی صحت کا بھی پتہ نہ چلے کیونکہ گورنر جنرل کی بیماری کو ہم لوگوں سے چھپا رہے تھے، آخری ایام میں جب ان کے مزاج میں بہت زیادہ چڑچڑاہٹ آ گیا اور وہ بیماری کے باعث بستر پر جا گرے تو کاہنہ کے ارکان کو ان سے استعفیٰ لینے کی کچھ زیادہ ہی فکر ہوتی، میں یہ دیکھتا کہ چارہ گروں کے پاس اس کا کچھ علاج ہے بھی یا نہیں اور چارہ گروں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ میں چالاکی ہوشیاری سے گورنر جنرل سے استعفیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا.....

اس کام کے لیے میں نے چالاکی ہوشیاری کا راستہ اختیار نہ کیا اور چارہ گروں نے ہمت نہ کی بالآخر میں نے غلام محمد کے رشتہ داروں سے بات کی اور انہیں اس پر آمادہ کیا کہ وہ ان سے استعفیٰ لے دیں۔ بعد ازاں جب ان کے ایک عزیز استعفیٰ پر دستخط کروانے ان کے پاس گئے انہوں نے پہلے تو سب کو برا بھلا کہا، اور بعد میں اس پر دستخط کر دیے اس سارے کام میں چونکہ سکندر مرزا سب سے زیادہ مصروف تھے لہذا وہی گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہو گئے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد چند لمحوں کے لیے ان آفیشل مجھے گورنر جنرل بنا دیا گیا اس دلچسپ واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ وفاقی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ گورنر جنرل غلام محمد کو علاج کے لیے سوئزر لینڈ بھیجا جائے۔ لیکن لوگوں کو نہ تو ان کی بیماری کا پتہ چلے اور نہ انہیں پبلک طور پر ہوائی اڈے پر پہنچایا جائے اس سارے واقعہ میں یہ بھی احتیاط برتی جا رہی تھی کہ لوگوں تک ان کے مستعفی ہونے کی خبر بھی نہ پہنچے چنانچہ غلام محمد کو ایک ایسبولینس میں ڈال کر ہوائی اڈے پر پہنچایا گیا۔ جہاں چارٹرڈ پلین ہوائی اڈے پر پہلے سے تیار کھڑا تھا۔

دریں اثناء گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری میرے پاس کالے رنگ کی ایک اچکن اور جناح کیپ لے کر آئے اور مجھے کہا کہ آپ کو چند لمحوں کے لیے گورنر جنرل بننا پڑے گا اور اچکن اور ٹوپی پہن کر گورنر جنرل کی کار میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ ہوئی اڈے جانا ہوگا۔ میں نے ان سے پوچھا گورنر جنرل کہاں ہیں؟ ”انہیں ہم نے ایسبولینس گاڑی میں ہوائی اڈے پر بھیج دیا ہے۔“ پر میرے پاس تو اس وقت کوئی شلوار ہی نہیں جو میں پہن سکوں۔ ملٹری سیکرٹری نے کہا۔ شہاب صاحب! سب چل جائے گا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ بس یہ اچکن پہن کر اور جناح کیپ سر پر پہن کر میرے ساتھ کار میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ میں ملٹری سیکرٹری کی ہدایت پر گورنر جنرل کی فلیگ کار میں بیٹھ گیا۔ باقی کے کردار پہلے سے ریہرسل کر چکے تھے، جوں ہی میری گاڑی ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوئی اس کے آگے آگے فوجی موٹر سائیکل سواروں کا دستہ، پولیس کی حفاظتی گاڑیاں اور میرے پیچھے وزیراعظم کی کار اور دوسری گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ اس سارے منظر کو دیکھنے کے لیے جوں ہی میں سر اوپر اٹھا کر باہر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ ملٹری سیکرٹری میرا کندھا دبا کر نیچے رہنے کا اشارہ کرتے۔ گورنر جنرل ہاؤس سے کراچی کے ہوائی اڈے تک میں نے جب بھی اپنے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے سر اٹھایا۔ ملٹری سیکرٹری کے کرخت ہاتھوں نے میرا کندھا دبا کر مجھے نیچا بیٹھا رہنے پر مجبور کر دیا۔ البتہ اس سارے شو میں مجھے صرف استقبالیہ نعرے لگانے والوں کا جواب دینے کے لیے کار سے باہر ہاتھ نکال لینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ تاکہ میں انہیں ”ٹانا“ کر سکوں۔

حسین شہید سہروردی مرحوم پہلے سے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ ان کے کان میں خدا جانے یہ بھنک کہاں سے پڑ گئی تھی کہ گورنر جنرل علاج کے لیے ہی سوئزر لینڈ جا رہے ہیں اور وہ کچھ دیر میں ایئر پورٹ، پر پہنچنے والے ہیں۔ ہوائی اڈے پر پہنچ کر جب ملٹری سیکرٹری نے مابذولت کی کار کا دروازہ کھولا اور میری پذیرائی کے لیے قدرے جھکے تو حسین شہید سہروردی نے اپنا کیمرہ سیدھا کر لیا کیونکہ انہیں تصویریں بنانے کا بے حد شوق تھا اور وہ اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گورنر جنرل کی نادر تصاویر بنانا چاہتے تھے مگر جوں ہی میں کار سے باہر نکلا اور ان سے مصافحہ کے لیے ہاتھ ان کی جانب بڑھایا تو وہ جھنجھلاہٹ کے ساتھ اپنا اور اپنے کیمرے کا رخ مجھ سے موڑ چکے تھے۔ مجھے اس وقت تو حسین شہید سہروردی کے ساتھ اس بادلِ نخواستہ کیے جانے والے مذاق کا رخ نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم سب ایکٹرا اپنے اپنے کریکٹر کی ادائیگی میں مصروف تھے اور ہم نے ایسبولینس گاڑی سے نکال کر معذور گورنر جنرل کو جہاز میں سوار کرانا تھا۔ البتہ

جب ام ایچہ کامیاب ہو کر پھر کے بعد واپس گورنر جنرل ہاؤس آ رہے تھے تو میں سارے راستے سوچتا رہا کہ ماضی میں بھی قوموں کے ساتھ ہمارے جیسے افراد اسی قسم کا مذاق کرتے رہے ہیں۔

کیا ایسا ممکن نہ تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد اپنی طفیلی اور بیماری کے باعث خود مستعفی ہو جاتے اور ان کے رفقاء قوم سے کوئی بات چھپائے بغیر انہیں پوری نگریم سے ہوائی اڈے پر الوداع کہنے جاتے۔

بہر حال جو کچھ بھی ہوا مجھے وہ کہانی ہڈت سے یاد آ رہی تھی کہ ایک ملک کا دستور تھا کہ جب اس کا بادشاہ مرجاتا تو شہر میں اگلے روز جو اجنبی بھی پہلے داخل ہوتا اسے بادشاہ بنا دیا جاتا۔ کچھ ایسے ہی حادثاتی طور پر ملٹری سیکرٹری نے مجھے ان آفیشل گورنر جنرل بنا دیا تھا۔

یونیسکو کے گزشتہ اجلاسوں میں عرب ملکوں کی طرف سے ایک مسئلہ بار بار پیش ہوتا چلا آ رہا تھا۔ یہ مسئلہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کی زیر نگرانی سکولوں میں پڑھائے جانے والے نصاب اور نیچنگ سٹاف کے بارے میں تھا جسے اسرائیل نے ان علاقوں پر قابض ہونے کے بعد بدل دیا تھا۔ یہ سکول عالمی تنظیم یونیسکو نے عرب مہاجر بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے تھے چنانچہ ان سکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کی تقرری اور عرب بچوں کو پڑھائے جانے والے نصاب کا تعین اس تنظیم کی ذمہ داری تھی۔ اسرائیلی حکومت نے اپنی انتہا پسندی کے باعث جہاں دیگر معاملات میں بین الاقوامی رائے کو مسترد کر رکھا ہے وہاں اس نے یونیسکو کے اس اقدام کو بھی نیکسر مسترد کر دیا۔ اس نے یونیسکو کے مقرر کردہ نیچنگ سٹاف کو فارغ کر کے گھروں کو بھیج دیا اور اس کی جگہ اپنی پسند کے اساتذہ کا تقرر کر دیا۔ یہودی حکومت نے بین الاقوامی اصولوں اور آداب کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک بین الاقوامی تنظیم کے فیصلوں کو یہاں تک ہی رد نہیں کیا بلکہ ان سکولوں میں عرب مہاجر بچوں کو پڑھائے جانے والے نصاب میں ایسی کتاب شامل کر دیں جن میں دریدہ ذہنی سے کام لیتے ہوئے اس نے اسلامی عرب کچھر سے ایسی باتیں منسوب کی تھیں جن کے مطالعہ سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں ذہنوں میں نہایت ہی بھیا تک تصویر ابھرتی تھی۔ معصوم عرب بچے جب ایسی کتابیں پڑھنے سے انکار کرتے تو انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ ان اذیتوں کا تصور ہی اتنا بھیا تک تھا کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ یونیسکو نے عرب ممالک کی شکایت پر دوبارہ معائنہ ٹیمیں تشکیل دیں اور انہوں نے عرب علاقوں میں قائم عرب طالب علموں کے ان سکولوں کا موقع پر معائنہ بھی کیا لیکن اس سے مسئلہ حل نہ ہوا کیونکہ یونیسکو کی معائنہ ٹیم جب حالات کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوتی اسرائیلی حکومت کو اس کا نمائندہ جو یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ میں تھا اطلاع کر دیتا اور اسرائیلی حکومت وقتی طور پر پڑانے نصاب اور نیچنگ سٹاف کو واپس سکولوں میں لے آتی اور جوں ہی وقت نکل جاتا یونیسکو کے مقرر کردہ اساتذہ اور نصاب کی کتابیں گمنامی میں چلے جاتے۔

غالباً اپریل 1969ء کو میں جب یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے لیے گیا اور اس اجلاس میں، میں نے عرب زبان کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروالیا تو عرب ممالک نے یہ مسئلہ بھی میرے سپرد کرنا چاہا۔ مصر کے وزیر تعلیم و ثقافت ڈاکٹر ثروت ایک روز میرے پاس آئے اور مجھے اس مسئلہ کی سنگینی کا احساس دلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ یونیسکو دوبارہ اپنی معائنہ ٹیمیں موقع پر بھیج چکی ہے اور ان ٹیموں کی رپورٹ یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت کے خلاف یہ الزام غلط ہے۔ عرب بچوں کو وہی اساتذہ پڑھا رہے ہیں جو یونیسکو نے مقرر کیے ہیں اور ان کے نصاب میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر ثروت نے مجھے یقین دلایا کہ اس بارے میں اسرائیلی موقف میں کوئی صداقت نہیں۔ یونیسکو کی

معاہدہ نہیں جب موقع پر پہنچتی ہیں تو یہودی حکومت کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے اور وہ وقتی طور پر اپنے مقررہ اساتذہ اور کتب کو وہاں سے ہٹا لیتی ہے۔

یحییٰ خان سے جھگڑے کے بعد میں عجیب الجھنوں کا شکار تھا۔ شاید یہ میری فرسٹیشن کا نتیجہ تھا کہ میں نے ڈاکٹر ثروت سے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو میں اسرائیل چلا جاتا ہوں مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ آپ مجھے وہاں بھجوانے کا بندوبست کریں۔ ڈاکٹر ثروت نے میرے اس غیر متوقع جواب پر پہلے تو حیرت اور پھر اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ان کی حکومت کے پاس تو کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے وہ مجھے اسرائیل بھجوا سکے ہم دونوں کافی دیر تک اس امکان پر غور کرتے رہے کہ کیا میرا اسرائیلی ریاست کے اندر جانا ممکن ہوگا۔ بالآخر ڈاکٹر ثروت مجھ سے یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ وہ اپنی حکومت سے اس بارے میں بات کرنے کے بعد مجھ سے دوبارہ ملیں گے۔ چند دنوں بعد ڈاکٹر ثروت سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کی حکومت کے لیے یہ کام کرنا مشکل ہے۔ البتہ آپ پسند کریں تو فلسطین کی آزادی کے لیے کام کرنے والی تنظیم سے اس سلسلہ میں بات کی جاسکتی ہے۔ لہذا میری آمادگی کے بعد مصری حکومت نے تنظیم آزادی فلسطین کی قیادت سے رابطہ قائم کیا اور اسے میرے مشن کے بارے میں جب بتایا تو اس نے حامی بھرنے میں بھی پس و پیش کیا۔ ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ چونکہ میری شخصیت جانی پہچانی ہے لہذا اسرائیل میں میرے پکڑے جانے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اگر میں پکڑا جاؤں تو اس صورت میں اسرائیل کے اندران کا جو نیٹ ورک ہے۔ اس کی کڑیاں ظاہر ہونے کا خدشہ ہوگا۔ ہاں البتہ اگر میں تنظیم کو اپنی وفاداری کا پورا یقین دلاؤں اور باقاعدہ تربیت حاصل کروں تو اس صورت میں تنظیم مجھے اسرائیل پہنچانے اور میرے مشن کی تکمیل میں میری مدد کو تیار ہے۔ بہر حال میں نے جب ضابطہ کی ابتدائی کارروائی کی تکمیل کر لی تو میری تربیت کا کام شروع کر دیا گیا۔ میری تربیت کا اہتمام پیرس میں ہی کیا گیا۔ تین ماہ میں اس تنظیم کے زیر تربیت رہا۔ میری تربیت کے دوران میں دیگر باتوں کے علاوہ جس بات پر زیادہ زور دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اسرائیل میں قیام کے دوران میں مجھے نیند نہیں آنی چاہیے کیونکہ نیند کی حالت میں جب کوئی سونے والے کو اس کے نام سے پکارتا ہے تو وہ بیدار ہو جاتا ہے۔

تنظیم نے میرا چونکہ اب "کوڈ نام" رکھ دیا تھا اور میں اب قدرت اللہ شہاب نہیں رہا تھا اس لیے سارا زور اس بات پر دیا جا رہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ بیدار رہنے کی مشقت کروں۔ انسان کے تحت الشعور میں چونکہ یہ بات ٹھنسی ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کا نام کیا ہے تو وہ لازماً اصل نام کے پکارے جانے پر تربیت یافتہ ہونے کے باوجود چونک پڑے گا۔ لہذا میری تربیت میں یہ پریکٹس بھی شامل تھی کہ اگر کوئی مجھے قدرت اللہ شہاب کے نام سے پکارے تو میں اس پر نہ تو دھیان دوں اور نہ چونکوں، تربیت کے دوران مجھے ایسی ادویات استعمال کروائی گئیں جن سے میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ خدا خدا کر کے تین ماہ کی یہ تربیت مکمل ہو رہی تھی لیکن ہوا یہ کہ میں ایک ٹیسٹ میں فیل ہو گیا میں ایک روز کسی کام کے لیے ہوٹل سے نکل کر باہر سڑک پر جا رہا تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے آواز دی مسٹر شہاب میں نے گردن کو معمولی جنبش ہی دی تھی کہ میرے انسٹرکٹر نے مجھے بازو سے آن پکڑا اور کہا تم امتحان میں فیل ہو گئے ہو تمہارا نام شہاب نہیں تھا۔ مجھے اپنی اس ناکامی پر افسوس تو کیا ہونا تھا البتہ مجھے مزید چند روز کی تربیت کے لیے روک لیا گیا۔

میں نے اس سے قبل کبھی سگریٹ نوشی نہیں کی تھی لیکن ٹریننگ کے دوران مجھے سگار پینے کی پریکٹس بھی کروائی

گئی۔ کیونکہ سگار پینے کا میرے مشن کی تکمیل میں اہم کردار تھا اور ایک روز جب یہ تمام مرحلے طے پا گئے تو تنظیم کے ایک اہم رکن نے مجھ سے قرآن پر حلف لیا کہ اگر اسرائیل کے قیام کے دوران میں دشمن کو میرے مشن کے بارے میں معلوم ہو جائے اور وہ مجھے پکڑنا چاہے تو میں زندہ اس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اس کے قبضہ میں میری نعش جانی چاہیے۔ حلف لیتے وقت مجھ سے یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ میں کسی بیماری کے سبب کوئی مستقل ادویات تو استعمال نہیں کرتا اور جب میں نے تنظیم کے اس اہم فرد کو بتایا کہ مجھے بلند پریشکی شکایت رہتی ہے اور اس کے لیے میں کپسول استعمال کرتا رہتا ہوں تو تب اس نے مجھے جو زہر بھرا کپسول دیا اس پر لال رنگ کا نشان لگا دیا تاکہ میں جب بلند پریشکی شکایت کے سلسلے میں معمول کے کپسول استعمال کروں تو غلطی سے زہر بھرا کپسول نہ لے لوں۔ زہر بھرا کپسول مجھے اس لیے دیا گیا تھا کہ میرے زندہ پکڑے جانے پر یہ مجھے میند کی گود میں سٹلانے کے لیے کام آئے جب حلف نامے کے تمام کوائف پُر ہو گئے تو مجھے موت سے پہلے وصیت لکھنے کو بھی کہا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کوئی وصیت نہیں لکھنی لیکن میرے رہنما کا اصرار تھا کہ بحیثیت مسلمان مجھے موت سے پہلے وصیت لکھ لینی چاہیے بالآخر ان کے اصرار پر میں نے اہلیہ عفت کے نام ان دو جملوں میں یہ وصیت لکھ دی کہ 'اگر میں مر جاؤں تو آپ ثاقب کو لے کر پاکستان واپس چلی جائیں۔' جب یہ مرحلہ بھی طے پا گیا تو تنظیم کے لوگوں نے سگریٹ جلانے والے لائٹروں کی شکل میں وہ کیمرے میرے سپرد کر دیے جن میں مووی فلمیں بھری ہوئی تھیں۔ میرے رفقاء نے مجھے چھ سو کے قریب گیلے سگار بھی دیے تاکہ میں اسرائیل میں قیام کے دوران یونیسکو کے تحت چلنے والے سکولوں کے بچوں، شاف یا دیگر مقامات کی فلم بنانا چاہوں تو ان لائٹروں کے ذریعے جن میں مووی فلمیں تھیں بار بار گیلے سگار سلگاتا رہوں اور کسی کو یہ شک نہ گزرے کہ میں کوئی فلم تیار کر رہا ہوں۔ بلکہ دیکھنے والوں کی نظر دھوکہ کھاتی رہے کہ میرا گیلیا سگار چونکہ بار بار نکھ رہا ہے لہذا میں مجبور ہوں یہ سگار اگر خشک ہوتے اور میں جلتے سگار کو سلگاتا تو میرا یہ فعل غیر فطری ہوتا۔ اس لیے مجھے میرے رفقاء نے گیلے سگار پینے کو دیے تھے۔

پوری مسلم دنیا اور عرب ممالک میں سوائے ایران کے کوئی ملک ایسا نہ تھا جس نے اس وقت تک اسرائیل کو تسلیم کیا ہو لہذا میرا سپورٹ وغیرہ ایران سے تیار کرایا گیا تھا اور میں ایک ایرانی سیاح کی حیثیت سے تل ابیب بذریعہ جہاز جا رہا تھا۔ میری تنظیم نے وہاں دس دن کے قیام کا ویزا حاصل کیا تھا اور میرے لیے پانچ ڈالر یومیہ کے زیرمبادلہ کا بندوبست ہوا تھا۔ جوں ہی میں تہران سے اپنے مشن پر روانہ ہوا تو موت کے تصور نے میری قوت ایمانی کو کمزور کرنا شروع کیا۔ جہاز جوں جوں فضا میں بلند ہو رہا تھا میری نبض کی حرکت تیز ہو رہی تھی۔ ایک طرف میں اپنے آپ کو ڈھارس دے رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے رفقاء ماہر گوریلے ہیں میں ان کی حفاظت میں رہوں گا تو دوسری طرف میری اپنی اس حماقت پر بھی نظر جاتی کہ بیٹھے بٹھائے میں نے موت کے منہ میں جانے کے لیے کیوں قصد کیا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا وہ اب ماضی کا قصہ پارینہ تھا اور ایک حقیقت میرے سامنے تھی کہ میں تل ابیب جا رہا ہوں میں نے وہاں دس دن اور دس راتیں قیام کرنا ہے اور چھپ کر اپنے مشن کی تکمیل کرنی ہے اور اس دوران اگر مجھے اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا پڑا تو وصیت کا کاغذ عفت کے پاس پہنچ ہی جائے گا۔ کچھ وقت کی پرواز کے بعد جب میرا جہاز ایک مقام پر رُکا تو باہر مجھے پی آئی اے کا جہاز کھڑا نظر آیا۔ اس وقت مجھے وطنِ حداثت سے یاد آیا جس سے میں ہزاروں میل دور تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں دو لمحوں کے لیے یہ سوال ضرور ابھرا ہوگا۔ کیوں نہ میں پی آئی اے کے جہاز میں بیٹھ

کرفرا ہو جاؤں مگر کہاں اور کس لیے میں نے تو اپنے مشن کے لیے یہ سب کچھ رضا کارانہ طور پر قبول کیا تھا۔ کسی نے میرے اوپر جو فیصلہ نہیں ٹھونسا تھا۔

اور اب جب دوبارہ میرے جہاز نے پرواز کی تو میں نارمل ہو چکا تھا اور خوف کے سارے بھوت میرے اندر سے نکل گئے تھے اب میرا سارا دھیان آنے والے واقعات پر تھا اور میں تصور میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں جنہوں نے میرے مشن کی تکمیل میں میرا ساتھ دینا تھا ان کی صورتیں بنا رہا تھا کہ یہ لوگ کیسے ہوں گے میرے ذہن میں ابھی یہ تصویریں اپنے خد و خال واضح نہ کر پائی تھیں کہ میرا جہاز تل ابیب کے ہوائی اڈے پر اتر گیا اور وہ اب رن وے پر دوڑ رہا تھا اور میں اگلے ہی لمحے اسرائیل کی سرزمین پر قدم رکھنے والا تھا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے سے میں باہر آیا تو میں نے قدرت اللہ شہاب کو اس کے روایتی ڈھیلے ڈھالے انداز کے ساتھ اپنے وجود سے الگ کر دیا اور اس کی جگہ ایک تربیت یافتہ گوریلے نے لے لی۔ چنانچہ میں نے ٹیلی فون بوتھ کے قریب پہنچ کر سگار سلاگیا، گویا میں اس شخص کو اشارہ دے رہا تھا جس نے میرے پہلے ”رابطہ“ میں آنا تھا۔ میں نے دیکھا بوتھ کے تھوڑے فاصلہ پر کھڑا ہوا ایک صحت مند شخص میری جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص میرا ہی منتظر تھا، پھر بھی جب اس نے میرے قریب پہنچ کر ”ٹیکسی پلیز“ کے الفاظ دہرائے تو میں نے قدرے توقف کیا تا کہ یہ یقین ہو جائے کہ میں کسی غلط شخص پر اعتماد تو نہیں کر رہا۔ شاید اس نے بھی میری ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ اگلے لمحے اس نے آنکھ مار کر ٹھیٹ پٹخانی لہجے میں کہا ”بادشاہ آ جاؤ“ اس نے مجھے بتایا کہ گوجرانوالہ کا فلاں نامی شخص گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں اس کا چھوٹا بھائی ہوں میں اس کی اپنے بارے میں اس شناخت پر حیران رہ گیا۔ گویا میری تنظیم کے لوگوں نے مجھے تربیت دینے سے پہلے میرے ماضی کو کھنگال لیا تھا اور میں ان کے اعتماد پر پورا اتر رہا تھا۔ اس مختصر تعارف کے بعد میں اپنے پہلے ”رابطہ“ کے ساتھ اس کی ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ راستے میں ہم دونوں نے محض رسماً ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کی، وہ مجھ سے میرے سفر کے بارے میں پوچھتا رہا کہ مجھے یہاں تک آنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے جب اس کو بتایا کہ پتلیوں کے پیچھے ملنے والی تاروں نے صحیح کام کیا ہے تو وہ مطمئن ہو گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے جلد ہی مجھے میرے رفیق کے پاس پہنچا دیا۔ جس نے ساری مہم میں میرا ساتھ دینا تھا۔ 27 سال کی عمر کا یہ خوبصورت جوان جس کا اصلی نام میں آج تک نہیں جان سکا۔ ان دنوں وہاں ایک ٹورسٹ ایجنسی میں گائیڈ تھا۔ اس کا کوڈ ”مصطفیٰ“ تھا مصطفیٰ کے ساتھ ملاقات کے بعد میں نے اس کے مشورہ سے اپنا پروگرام ترتیب دیا اور اگلی صبح ہم دونوں ان سکولوں کی طرف نکل گئے جن کے شاف اور وہاں پڑھائی جانے والی کتابوں کی مجھے اصل حقیقت معلوم کرنا تھا۔

میرا اسرائیل کا قیام دس دن کا تھا۔ چونکہ مجھے تربیت کے دوران اس امر کی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ مجھ پر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہیے اور میں کم کھانا کھاؤں لہذا میں وہاں قیام کے دوران روزے سے رہنے لگا۔ شام کو روزہ افطار کرتے وقت میری خوراک چند کھجوریں شہد کے دو چھج، ڈبل روٹی کے تین چار سلاکس اور کافی کے ایک کپ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ دس دن اور دس راتیں مصطفیٰ سائے کی طرح میرے ساتھ رہا۔ وہ ہر رات میرا ٹھکانہ بدل دیتا۔ دن کے وقت بھی ہم دونوں جہاں قدرے سستانے کے لیے رکتے وہ جگہ محفوظ ہوتی۔ اسرائیل کے قیام کے دوران پانچ ڈالر یومیہ میرے

لیے کرنسی کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی کسی مقدس مقام کی زیارت کے لیے اندر داخل ہوتا۔ مصطفیٰ اس دوران نہ صرف میرے جوتوں کی نگرانی کرتا بلکہ اکثر اوقات اپنی پتلون سے شرٹ نکال کر ان کو صاف کرتا دکھائی دیتا۔ میں اس کی خدمت سے بے حد متاثر تھا۔ بلکہ مجھے اس کے بارے میں یہ تاثر ملا تھا کہ وہ بہت معمولی تنخواہ لینے والا ملازم ہے اور اپنے مشن کی غرض سے چوبیس گھنٹے موت جیسے خطرے میں رہتا تھا چنانچہ میں اس کی خدمت سے متاثر ہو کر ایک ڈالر روزانہ اسے دے دیتا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جس شخص کو میں اپنے طور پر تنگ دست سمجھتا رہا۔ اس کا باپ اس قدر دولت مند تھا کہ اس نے مصطفیٰ کی موت کے بعد ساڑھے چھ کروڑ روپے کے مصارف سے کینسر کے مریضوں کے علاج معالجہ کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔

اسرائیل میں میرے قیام کی تمام تر غرض و غایت یہ تھی کہ مقبوضہ علاقوں میں عرب سٹوڈنٹس کو جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے اس کے بارے میں یونیسکو کو کسی طرح یہ ثبوت فراہم کیا جائے کہ یہ وہ نصاب نہیں جو یونیسکو نے عرب طالب علموں کے لیے مقرر کیا ہوا ہے۔ بلکہ یہودی حکومت نے یہ کتب خود چھپوائی ہیں اور ان میں اسلامی و عرب کچھر کے خلاف الزام تراشی میں گھنیا حرکتیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ میں نے ان چھ سو گیلے رگڑوں کو بار بار سلا کر دو سو پچاس فٹ لمبی فلم تیار کی اور اس فلم میں وہ تمام مناظر بھی شامل تھے جن میں عرب طالب علموں کو یہودی حکومت کی طرف سے لگائی گئی کتابوں کے پڑھنے سے انکار پر اذیتیں دی گئی تھیں۔ رگڑ سلاگنے والے لائٹروں نے اس بارے میں میرا پورا ساتھ دیا۔ میں نے اڑھائی سو فٹ لمبی مووی تیار کرنے کے ساتھ ساتھ نو سو تصویریں بھی بنائیں۔ کتابوں پر انہیں پڑھانے والے ٹیچروں کے آٹوگراف بھی حاصل کیے ان ٹیچروں کے ساتھ میں نے اپنے گروپ فوٹو بھی بنائے اور 113 کتابیں اپنے ساتھ لانے کے لیے ان پر معد ان ٹیچروں کے آٹوگراف کے جمع کیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے میں نے نیند کے غلبے سے بچنے کی خاطر روزہ رکھنا شروع کر رکھا تھا۔ رات کے وقت بھی کم ہی نیند نصیب ہوتی کیونکہ ہر رات میں اور مصطفیٰ ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ پھر ہم دونوں کے پکڑے جانے کا خطرہ بھی تھا لہذا ہم راتیں بھی جاگ کر آنکھوں میں کاٹ دیتے۔ اس صورتحال سے آٹھویں روز میری طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ مصطفیٰ نے میری یہ حالت دیکھی تو مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو آرام نہ ملا تو آپ کا جسم آپ کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ میں رات آپ کے آرام کا بندوبست کرتا ہوں چنانچہ اس نے میرے علم سی بالا مسجد اقصیٰ میں، میرے لیے رات گزارنے کا بندوبست کیا اور عشاء کی نماز کے وقت مجھے لے جا کر مسجد اقصیٰ میں ایک شخص کے سپرد کر دیا۔ ان صاحب نے مجھے سمجھایا کہ میں نماز عشاء کے بعد وہیں رکا رہوں۔ وہ مجھے منبر کے پیچھے چھپا جائیں گے اور صبح جب مسجد اقصیٰ نماز کے لیے کھولی جائے گی تو میں دروازے کی اوٹ میں چھپا رہوں اور نمازیوں میں اس طرح شامل ہو جاؤں کہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ میں نے رات مسجد میں گزاری ہے۔ یہ صاحب تو مجھے حسب پروگرام منبر کے پیچھے دوڑا نوٹھا کر زیر و کابلج جلا کر شب بخیر کہہ کر چلے گئے لیکن میں کیسے سوتا۔ بیت المقدس میں یہ رات عجیب کیفیت میں گزری۔ ساری رات پیغمبروں کے قافلے تصور میں میرے سامنے سے گزرتے رہے اور عبادت و نوافل میں مصروف رہا۔ صبح ہوئی تو میں دوسرے نمازیوں کے ساتھ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد باہر نکل گیا۔

گیارہویں روز جب مجھے اسرائیل سے روانہ ہونا تھا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بارڈر کے راستے اردن

پہنچا دے گا۔ وہاں میری یاسر عرفات سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میرا سامان فلم اور کتابیں وغیرہ بعد میں مجھے پیرس میں مل جائیں گی۔ مصطفیٰ نے مجھے بڑی گرم جوشی سے ایک جیب میں سوار کروایا اور میری سلامتی کے لیے دعا کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میرے گائیڈ نے مجھے خوشخبری دی کہ ہم اردن کی سرزمین پر پہنچ چکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا گائیڈ مجھے یاسر عرفات کے پاس لے گیا۔ وہ ایک کمرے میں جو زمین دوز لکڑی کی ایک صندوقچی کے سامنے بیٹھے کچھ کاغذات پر دستخط کر رہے تھے میں جوں ہی ان کے کمرے میں داخل ہوا وہ میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے گویا وہ میرے ہی منتظر تھے۔ اہل فلسطین کے اس عظیم رہنما نے عربوں کے روایتی انداز میں مجھے گلے لگایا۔ میرے رخصاروں پر بوسہ دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا میں بیٹھ گیا تو یاسر بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کسی تاخیر کے بغیر ایک شخص ہم دونوں کے لیے قبوے کے دو پیالے لے آیا۔ یاسر عرفات کے ساتھ میری یہ ملاقات بہت ہی مختصر تھی۔ انہوں نے مجھ سے اس ساری ملاقات میں صرف تین جملے کہے۔

☆ اول یہ ”الحمد للہ کہ آپ دشمن سے بچ کر زندہ سلامت واپس آ گئے۔“

☆ (دوم) ”آپ نے عرب نسل کے لیے جو کام کیا ہے وہ اس کے لیے آپ کی ہمیشہ احسان مندر ہے گی۔“

☆ اور سوئم یہ کہ ”اس کا اجر آپ کو رب کریم دے گا۔“

اردن سے میں پیرس پہنچا جہاں مجھے یونیسکو کے اجلاس میں ان جملہ ثبوت کے ساتھ وہ کتابیں پیش کرنا تھیں جو میں نے اسرائیل کے مقبوضہ عرب علاقوں کے سکولوں سے حاصل کی تھیں اور یونیسکو کی زیر نگرانی کھولے گئے سکولوں میں اسرائیلی حکومت نے عرب طالب علموں کو زبردستی پڑھانے کیلئے یہ کتابیں لگا رکھی تھیں۔ پیرس پہنچنے کے فوراً بعد جو کام میں نے کیا وہ دوبارہ سونے کی پریکٹس کرنا تھا کیونکہ میری آنکھیں تو نیند کی مٹھاس سے اس دوران نا آشنا ہو چکی تھیں۔

تین دن تھکاوٹ دور کرنے کے بعد جب میں یونیسکو کے دفتر میں پہنچا تو میں نے پیرس میں پہلا کام یہ کیا کہ وہاں پر موجود مختلف ممالک کے سفیروں کو یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے دعوت نامے بھجوائے کیونکہ کوئی بھی یونیسکو کا ڈائریکٹر اگر چاہے تو کسی خاص موضوع پر اس کے اجلاس میں سفیروں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دے سکتا ہے۔ دریں اثناء میرا سامان پیرس پہنچ چکا تھا تمام سلائیڈز اور فلم سلائیڈز تیار ہو چکی تھیں۔

اجلاس شروع ہوا تو میں نے یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے ممبروں اور خصوصی دعوت پر شریک ہونے والے سفیروں کو اجلاس کی غرض و غایت بتائی میں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ اسرائیل کے مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو نے عرب طالب علموں کے لیے اپنی نگرانی میں جو سکول کھولے ہوئے ہیں ان میں عرب طالب علموں کو وہ نصاب نہیں پڑھایا جاتا جو یونیسکو نے تیار کر کے دیا ہوا ہے بلکہ انہیں اسرائیلی حکومت زبردستی وہ کتابیں پڑھاتی ہے جن میں اسلامی و عرب کچھر کے خلاف دریدہ دہنی سے ایسی غلط باتیں شامل کی گئی ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں اور یہودی حکومت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام اور ہمارے اسلاف کو بدنام کر رہی ہے۔ یونیسکو نے دوبار عرب ممالک کی شکایت پر ان مقبوضہ علاقوں میں قائم سکولوں میں معائنہ ٹیمیں بھیجیں مگر اسرائیلی حکومت کو اس کی بروقت اطلاع مل جاتی تھی اور وقتی طور پر ان کتابوں اور اساتذہ کو تبدیل کر دیتی تھی۔ صحیح صورتحال کا پتہ چلانے کے لیے میں نے خود موقع پر پہنچ کر آپ کے لیے چند ثبوت حاصل کیے ہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ادھر میری یہ تقریر ختم ہوئی ادھر پروجیکٹر پر حاضرین کو وہ فلم دکھائی جا رہی تھی جو میں تیار کر کے لے آیا تھا۔

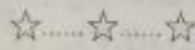
یونیسکو کا خصوصی اجلاس تقریباً تین گھنٹے سے زائد وقت کے لیے جاری رہا۔ اجلاس میں وجود صاحبان کو میں جب مودی، سلائیڈیں، تصویریں اور وہ کتابیں جن پر ان کے پڑھانے والے اساتذہ کے آئوگراف موجود تھے دکھا چکا تو یہ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تو ایسا نہ تھا جو ان صدقاتوں سے انکار کرتا۔ اجلاس میں اسرائیل کا نمائندہ مسٹر ایوی ڈار بھی موجود تھا۔ پشیمانی سے اس کی نظریں ٹھکنی ہوئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی حکومت کے خلاف ان جملہ الزامات کی تردید کیسے کرے؟ ایگزیکٹو بورڈ میں امریکہ کی نمائندہ مس گورے نے یہ ساری صورت حال دیکھی تو اس نے کہا کہ ان تمام ثبوت کی فراہمی کے بعد تو کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہم میں سے کوئی فرد واقعات کی صحت سے انکار کر سکے۔ مس گورے نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جوں ہی خصوصی اجلاس ختم ہوا ایگزیکٹو بورڈ کے ارکان کا اجلاس جاری رکھا جائے تاوقتیکہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی راہ دریافت نہ کر لی جائے۔ چنانچہ سفیر حضرات کو چائے کی پیالی سے خاطر مدارت کے بعد روانہ کر دیا گیا تو مس گورے کی خواہش پر ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس شروع ہو گیا۔ جو رات گئے تک جاری تھا۔ بورڈ نے گو اس مسئلہ کا حل تلاش کر لیا تھا کہ آئندہ ترین (53) کے قریب وہ کتابیں جو مقبوضہ عرب کے علاقوں میں عرب طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ یونیسکو خود شائع کرائے لیکن مشکل یہ تھی کہ یونیسکو فوری طور پر کتابوں کی طباعت پر اٹھنے والے مصارف کا انتظام کیسے کرے۔ میں نے معاملہ کو کھٹائی میں پڑتے دیکھا تو فنڈز کی فراہمی کی حامی بھری۔ مس گورے جو یونیسکو کے بورڈ میں اکثر معاملات میں میری ہم نوا ہوتیں، حیرت اور خوشی کے بلے ٹپے جذبات میں مجھ سے سوالیہ انداز میں مخاطب ہوئیں۔ مسٹر شہاب! کیا ایسا کرنا آپ کے لیے ممکن ہوگا۔ میں نے بورڈ کے ارکان کو یقین دلایا کہ آپ کتابوں کی طباعت کے لیے ڈائریکٹریٹ قائم کریں اس کے جملہ اخراجات کا میں ذمہ لیتا ہوں۔

میں رات گئے اجلاس سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل واپس پہنچا تو اپنے اندر ایک عجیب قسم کی لذت و تازگی محسوس کر رہا تھا۔ میرا جسم و روح کیف و سرور کے آن جانے جذبول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں بستر پر گیا تھا لیکن سونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نیند سے یہ لذت کہیں زیادہ مسحور کن تھی جس میں اس وقت میں مبتلا تھا۔ اب میرے جسم سے گوریلاریننگ اور اسرائیل کے قیام کے دوران میں اٹھائی گئیں صعوبتوں کے سارے دکھ درد دور ہو رہے تھے۔ میری محنت کا مجھے ثمر ملنے لگا تھا۔

اجلاس کے اگلے روز عرب ممالک نے میرے اعزاز میں ایک زبردست استقبال کا اہتمام کیا۔ شام کے وقت میں دفتر سے باہر سواری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میری بد قسمتی کہ وہاں اسرائیل کا نمائندہ مسٹر ایوی ڈار آ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مسٹر شہاب شاید تم عرب ممالک کے سفیروں کی طرف سے دی گئی دعوت میں جا رہے ہو! میں نے اثبات میں ہاں کہا تو اس نے اپنی گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا۔ میں وضع داری میں مسٹر ایوی ڈار کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے وجود کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا کوئی عمل شروع ہو گیا ہے۔ جب استقبال کے مقام پر گاڑی سے نیچے اتر تو میرے قدم اٹھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک شدید درد نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے میں دیوار کا سہارا لے کر اس عمارت کے اندر داخل ہوا جہاں عرب سفراء نے دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔

اہل یہود کے بارے میں جادوؤں نے کی قرآن نے شہادت دی ہے لیکن مجھے اس کا علم نہ تھا کہ مسٹر ایوی ڈار بھی اس کا لے علم میں ماہر ہے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ایوی ڈار اس کام میں یہودیوں کا سرخیل ہے چنانچہ بعد میں کم و بیش اڑھائی سال تک ایوی ڈار کے جادو کے اس عمل کا شکار رہا۔ جو اس نے اس روز شروع کیا تھا۔ اس کے اس عمل کے باعث مجھے اس قدر اذیتیں ملیں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اس قدر پریشان ہو گیا کہ سوچا تھا کہ مدینہ چلا جاؤں اور اپنے پیارے نبی محمد ﷺ سے مدد مانگوں۔

بہر حال اس ذکر کو چھوڑیے میں جب عرب ممالک کے سفیروں کے استقبالیہ میں پہنچا تو یہ لوگ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے تھے۔ ہر ایک باری باری میرے رخساروں کو بوسہ دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک باریش شخص میرے پاؤں پر گرا وہ زار و قطار رو رہا تھا اور ساتھ کہتا جا رہا تھا۔ شہاب تم نے عرب نسل پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ عرب سفیروں کی دعوت سے واپس لوٹا تو میرے لیے بڑی مشکل یونیسکو کے لیے خصوصی فنڈز کی فراہمی تھی تاکہ عرب طالب علموں کے لیے نئی کتابوں کی طباعت کا کام مکمل ہو سکے۔ چند روز کی پلاننگ کے بعد میں نے عرب ممالک کی حکومتوں سے اس بارے میں رابطہ شروع کیا اور جلد ہی میں نے یونیسکو کو مطلوبہ رقم فراہم کر دی اور اس طرح یونیسکو نے ان 53 کتب کی اشاعت کا کام مکمل کر لیا جو عرب طالب علموں کے نصاب میں شامل تھیں۔ الحمد للہ عرب طالب علم اب اس ذہنی اذیت سے نجات پا چکے ہیں جو یہودی حکومت کی طرف سے سکولوں میں لگائی گئی کتابوں کے پڑھنے سے انہیں ملتی تھی۔



اسرائیل جانے کا میرا تجربہ زندگی میں واقعات کے اعتبار سے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ ان اذیتوں کو بھولے جو مجھے اس بارے میں برداشت کرنا پڑیں میں آج بھی جب اس کے فوائد کو دیکھتا ہوں جو عرب طالب علموں کو حاصل ہوئے تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے لیکن اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے میں جب اہل یہود کی طرف سے دی گئی اذیتوں کے عذاب میں جل رہا تھا۔ تو پاکستان میں میرے بعض مہربان صحافی دوست پیچھے سے ہلائی جانے والی ڈوری پر میرے خلاف یہ خبریں شائع کر رہے تھے کہ میں اسرائیلی ہوں۔ یہ حضرات نہ جانے کب تک اپنے آقا کی نمک خواری میں مبتلا رہتے کہ دریں اثناء الفتح لندن نے میرے اسرائیل کے دورہ کی تفصیلات شائع کر دیں اور اس طرح میرے خلاف الزامات کا یہ کاروبار سرد پڑ گیا۔ البتہ یحییٰ خان کی حکومت کو میرے خلاف انضباطی کارروائی کا کچھ اور موقع مل گیا اور میری جواب طلبی کی گئی کہ میں حکومت پاکستان کی اجازت کے بغیر اسرائیل کیوں گیا تھا۔ یحییٰ خان کو شاید یہ فکر تھی کہ اسرائیل کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ ورنہ وہ میری جواب طلبی کیوں کرتی؟

اسرائیل کے قیام کے دوران مصروفیات کی تفصیلات میں نے اس لیے نہیں بتائی کہ اس تنظیم کے میٹ ورک کی جملہ کڑیاں سامنے نہیں لائی جاسکتیں جس نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ اس بارے میں جو کچھ بتایا جاسکتا تھا۔ میں نے بتا دیا ہے۔ البتہ اس دورہ میں ایک کردار مصطفیٰ کا تھا، جس نے میرے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، مصطفیٰ اس وقت اس

دنیا میں نہیں۔ اسے اپنے خالق حقیقی کے پاس جانے میں کتنی جلدی تھی۔ جس روز اس نے مجھے بیروت سے فون کیا اس کے دعوے میں کتنا یقین تھا اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا انشاء اللہ میں دو ہفتے میں اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس روز وہ بہت خوش تھا۔ یہ 1971ء کی بات ہے وہ بیروت کے ہسپتال میں داخل تھا اسے بلڈ کینسر تھا۔ اسرائیل سے واپسی کے بعد میرا اس سے یہ پہلا اور شاید آخری رابطہ تھا وہ بہت جلدی میں تھا۔

اس نے مجھے فون پر بتایا کہ میرا والد آپ کو میری وصیت بھیجے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس درخواست کو رد نہیں کریں گے۔ میں نے حیرانی میں اس سے پوچھا کہ وصیت کیسی تم جوان ہو اور ابھی تم نے کئی برس اپنے مشن کے لیے کام کرنا ہے۔ لیکن اس نے بتایا کہ اسے بلڈ کینسر ہے اور وہ انشاء اللہ دو ہفتے میں اپنے خالق کے پاس چلا جائے گا۔ میں نے اس کی بیماری کا سن کر افسوس کیا تو وہ ہنسنے لگا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ تم پریشان نہ ہونا۔ بلکہ دعا کرو کہ میں اپنے رب کے پاس جلد چلا جاؤں۔ مصطفیٰ اور اس کے رب کے درمیان محبت کا رشتہ کتنا گہرا تھا مجھے اس وقت اس کا احساس نہیں ہوا۔ پر ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ مجھے مصطفیٰ کے والد کا خط آ گیا۔ اس میں مصطفیٰ کی وصیت کی کاپی بھی تھی جو اس نے اس جہان فانی سے کوچ کرنے سے پہلے لکھی تھی۔ یہ مختصر وصیت نامہ صرف تین جملوں پر مشتمل تھا۔

اس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ اس کا والد اس کی موت کے بعد کینسر کے مریضوں کے علاج معالجہ اور تجویز و تدفین کے اخراجات کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کرے گا۔ دوسرا جملہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اس ٹرسٹ کے تین ٹرسٹی ہوں گے۔ ایک یا سر عرفات، دوسرا اس کا واجب التکریم والد تیسرا میں (قدرت اللہ شہاب)

وصیت کے تیسرے جملہ میں یہ تاکید کی گئی تھی۔ یہ ٹرسٹی تمام معاملات کو خط و کتابت کے ذریعہ نبھائیں گے تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے مصطفیٰ کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش کے احترام میں ٹرسٹی بنا قبول کر لیا۔ بعد میں مصطفیٰ کے والد کی خط و کتابت سے پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی وصیت کے مطابق سات کروڑ روپے سے ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ آٹھ نو سال تک، اس ٹرسٹ کی فنانشل رپورٹ میرے پاس آتی رہی۔ اس رپورٹ کے مطابق پانچ سے چھ لاکھ روپے سالانہ تک کینسر کے مریضوں کی امداد اور ان کی مدد پر خرچ ہوتے تھے۔

مصطفیٰ اب اس دنیا میں نہیں، بارہ سال پہلے اس نے اس دار فانی کو الوداع کہا، ان بارہ سالوں میں، میں نے فیصلہ نہیں کر سکا کہ مصطفیٰ میرا مقروض ہے یا میں اس کا مقروض ہوں، میں نے تو دس دن میں اس کو صرف دس ڈالر دیے تھے وہ میرے سپرد سات کروڑ روپے کے مصارف کی ذمہ داری چھوڑ گیا ہے۔

دورہ چین میں چواین لائی ایک میننگ میں پانچ گھنٹے لگا تا ایک زیر بحث مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کے سامنے نہ کوئی کاغذ تھا نہ کوئی فائل، لیکن اس کے باوجود ان کی ساری گفتگو میں ابہام نہ تھا ہر چیز واضح تھی میرے لیے یہ غیر عینی بات تھی۔ شام کے پانچ بج گئے تو چواین لائی نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے میں اب آپ کے سامنے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ چونکہ میں ان کی تقریر کے نوٹس لے رہا تھا اس لیے میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی گفتگو کی سری اسی آرڈر سے سنائی۔ جس ترتیب سے انہوں نے واقعات سنائے تھے ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ جہاں کہیں میں نے نوٹس لینے میں پیچھے رہ جاتا اپنی گفتگو روک لیتے۔ ان کی نظر میری فائل پر تھی۔ وہ میرے ہاتھ کی حرکت سے اندازہ لگا لیتے کہ میں نے ان کا آخری جملہ نوٹ کر لیا ہے تب وہ اپنی گفتگو آگے بڑھاتے میننگ کے دوران ایک چینی لڑکی بگ

میں گرم پانی اور چائے کی پتی ڈال کر وقفوں وقفوں سے لاتی رہی۔ وہ گک پر ڈھکنا دے کر چلی جاتی۔ میں نے محسوس کیا چو۔ این۔ لائی بار بار میری طرف دیکھتے ہیں اس دوران میری توجہ نوٹس لینے سے ہٹ گئی اور میں اپنے آپ کا جائزہ لینے لگا کہ شاید میں اپنی نشست پر ٹھیک سے نہیں بیٹھا میں نے اپنے خیال میں رخ بدل کر اپنے آپ کو درست بھی کر لیا مگر وہ مجھے پھر دیکھتے رہے پھر انہوں نے اس چینی لڑکی کو بلایا اور میرے گک کا ڈھکنا تبدیل کرنے کو کہا کیونکہ پہلا ڈھکنا گک پر فٹ نہیں بیٹھا تھا۔

مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں ان دنوں حالات معمول کے مطابق تھے۔ ہمارے ذہنوں میں ملک کے اس حصے کے بارے میں کسی قسم کی کوئی بدگمانی نہ تھی اور نہ ہی ہم نے کبھی یہ تصور کیا تھا کہ یہ حصہ ہم سے کٹ کر ایک وقت میں الگ مملکت بن جائے گا بلکہ حکومت اس حصہ پر اس کی تعمیر و ترقی پر زیادہ فنڈ خرچ کر رہی تھی لیکن جب ہم ماؤزے تنگ سے ملنے گئے تو انہوں نے ہماری خیریت معلوم کی اور پہلا سوال ہم سے یہ پوچھا کہ کیا مشرقی پاکستان پر سکون ہے۔ ہمارے لیے ان کا یہ سوال بڑا عجیب سا تھا۔ بعد میں ایک کھانے کے موقع پر چو۔ این۔ لائی نے پھر مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو مشرقی پاکستان کے بارے میں خبردار رہنا چاہیے۔ میں بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کوئی ایسے آثار اس وقت موجود تھے جنہیں ہم نے تو نہ دیکھا مگر وہ ہمارے دوست ملک عوامی جمہوریہ چین کے رہنماؤں کو دکھائی دے گئے۔

ماؤزے تنگ سے میری ملاقات ہوئی تو میرے سامنے نیم خوابی والے لگلیسکو بے بی کی تصویر آگئی ماؤ بھی اسی بچے کی طرح گول مٹول تھے۔ مگر جب وہ بات کرتے تو ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ان کی گفتگو میں بڑی شائستگی اور روانی تھی وہ لاٹک مارچ کا فلسفہ سناتے رہے ان کا کہنا تھا کہ جس انقلاب کی بنیاد جڑ سے شروع نہ ہو وہ کامیاب نہیں رہتا اور نہ ہی اس میں پائیداری آتی ہے ان سے ملاقات میں، ابن انشاء کی چینی نظموں کی کتاب میں نے انہیں پیش کی تو انہوں نے، جن چینی شاعروں کی نظمیں شامل کی گئی تھیں ان کی فہرست سنائے کو کہا ان میں ماؤ کا نام نہ تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے تمہارا دوست چینی شاعر اور شاعروں سے ناواقف ہے اس کا یہ انتخاب چینی شاعری کا نمائندہ انتخاب نہیں، پھر وہ اٹھے اور کانڈوں کا ایک پلندا لاکر مجھے دیا اور کہا کہ ان کو پڑھو، یہ ماؤ کی سترہ نظموں کا ترجمہ تھا جو انگریزی میں کیا گیا تھا۔ انہوں نے طنزیہ طور پر کہا یہ بھی شاعری ہے۔ میں نے ان کی ناگواری کو محسوس کیا۔ ماؤ چینی عوام کا اتنا بڑا رہنما ہے۔ پھر ہے ریفا مر ہے مگر اس کی شاعری کی زگ بڑی مضبوط تھی۔ ماؤ سے ہماری ملاقات آدھا گھنٹہ جاری رہی چو۔ این۔ لائی بھی اس ملاقات میں موجود تھے وہ سارا وقت مودب بیٹھے اپنے رہنما کی گفتگو سنتے رہے۔ ماؤ کا گھر سادہ تھا۔ ملاقات ختم ہوئی تو وہ ہمیں باہر سڑک تک چھوڑنے آئے۔

ساری دنیا کے بیشتر بادشاہ، صدر، سربراہوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چند ایک کو تو بار بار مینٹنکوں میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرے تجربے میں اپنی بات سے بالکل مخرب ہو کر مگر جانے والا جو ابر لال نہرو ہے اور دماغی طور پر سب سے غیر سنجیدہ اور کھلنڈرا قسم کا سربراہ شہشاہ ایران تھا۔

ایک موقع پر سکندر مرزا شاہ ایران کے مہمان تھے۔ میں ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے دورہ میں ان کے ساتھ تھا۔ گفتگوئی نسل کی اصلاح کی ہو رہی تھی۔ شاہ نے سکندر مرزا کو مشورہ دیا کہ نوجوانوں میں صحیح تربیت پیدا کرنے کے لیے انہیں جنسی کتابیں اور رسالے پڑھنے کو دیے جائیں۔ اس قیمتی مشورہ کے بعد وہ اٹھے اور اپنی لائبریری سے بہت سی جنسی

کتابیں اور رسالے اٹھالائے۔ امریکہ کے صدر کینیڈی میں بچے کی سی چلبلاہٹ اور صاف گوئی تھی۔ ایک ملاقات میں ایوب خان نے ان سے کہا کہ کسی پنڈت نہرو کو آمادہ کر کے کشمیر کا منصفانہ حل نکالا جائے۔ کینیڈی کا جواب تھا۔ پنڈت جی دانش مند آدمی ہے، پر جب کشمیر کا نام اس کے سامنے لیا جاتا ہے وہ اپنی شیروانی میں لگے ہوئے گلاب کے پھول پر آنکھیں ڈال کر گہرے مراقبے میں چلا جاتا ہے۔ مصر کے جمال عبدالناصر اگر ملاؤں کے خلاف تھے لیکن افریقہ میں اسلام کی تبلیغ کیلئے بڑی کوشش کی اور اس کام پر کافی خرچ کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں لاکھوں افریقی دائرۃ اسلام میں داخل ہوئے۔

شاہ فیصل پاکستان کے بچے بھی خواہ تھے۔ وہ ایوب خاں سے خاصے متاثر تھے۔ میرے ایک دوست انور علی جواب وفات پا چکے ہیں۔ مالیات کے بہت بڑے ماہر تھے اور شاہ فیصل کے انتہائی قریب تھے۔ انہوں نے سعودی عرب میں مالیاتی کنٹرول کا سسٹم رائج کیا۔ سعودی سٹیٹ بینک کھولا اور اس کے پہلے گورنر مقرر ہوئے وہ واحد شخص تھے جنہیں شاہ فیصل کی خدمت میں جانے کے لیے پیشگی اجازت نہ لینی پڑتی تھی۔ وہ جتنی بار ملنے جاتے اتنی ہی بار شاہ فیصل محل سے باہر نکل کر ان کو کار تک چھوڑنے آیا کرتے تھے۔ انور علی پر دل کا دورہ پڑا تو شاہ فیصل نے امریکہ اور انگلستان سے بھاری خرچ پر بڑے بڑے ہارٹ سپیشلسٹ بلا کر طویل عرصہ تک جدہ میں ان کے علاج کے لیے رکھے مجھے انور علی نے بتایا کہ جس وقت مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا اور ہماری افواج نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے شاہ فیصل اس وقت دربار میں بیٹھے تھے جونہی انہیں یہ خبر سنائی گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد اور اسے کامیاب بنانے کے لیے فرمانروائے سعودی عرب نے جو کوششیں کیں اور ان میں عملی حصہ لیا وہ بھی دراصل پاکستان سے ان کی گہری محبت کا اظہار تھا۔ شاہ فیصل سے پہلے ان کے بھائی شاہ سعود فرمانروا تھے وہ کسی قدر عیش پسند اور سادہ لوح انسان تھے۔ ملکی معاملات پر ان کی گرفت مضبوط نہ تھی۔ ایک بار سکندر مرزا سعودی عرب کے دورہ پر گئے ریاض میں ہمیں شاہی محل میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں پر بہت سے ان کے پاکستانی ملازمین بھی نظر آئے۔ ایک صاحب شاہ کے چیف ٹیلر کہلاتے تھے وہ بھی پاکستانی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے یہ عہدہ کس طرح حاصل کر لیا۔ جو لباس عرب پہنتے ہیں وہ پاکستان میں تو سیا نہیں جاتا پاکستان میں اس لباس کی سلائی سیکھنا آسان بھی نہیں انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔ مجھے سلائی دلائی کچھ نہیں آتی تھی مجھے خبر ملی کہ شاہ سعود کے چیف ٹیلر ماسٹر کی آسامی خالی ہے میں نے بھی درخواست دیدی اور اس میں لکھا کہ میں مہاتما گاندھی کا ٹیلر رہا ہوں میری اس کوالیفیکیشن پر مجھے ملازم رکھ لیا گیا۔ بعد میں جب یہ پول کھلا کہ مہاتما گاندھی تو صرف دھوتی پہنتے تھے تو مجھے سرکاری خرچے پر لندن ایک بہت بڑی فرم کے پاس تربیت کے لیے بھیج دیا گیا۔

میں اپنی ملازمت کے دوران اور بھی عالمی شخصیتوں سے ملا ہوں۔ ان میں قائد اعظم تھے۔ انڈونیشیا کی آزادی کے ہیرو سکارنو تھے۔ یا سر عرفات ہیں لیکن ان سے میری ملاقاتوں کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ اب ان کو دہرانا مناسب نہیں ہوگا۔

والد صاحب نے مجھے اکبر ہائی سکول جموں میں داخل کرایا۔ میں نے تعلیم وہاں سے شروع کی پرائمری تک وہاں پڑھا۔ اس دوران جموں شہر میں طاعون پھیل گیا۔ عبداللہ صاحب نے سوچا کہ بچوں کو سری نگر بھیج دیا جائے ہم سری

نمر کے آدھے راستے ہی میں تھے کہ معلوم ہوا کہ سری نگر میں ہینڈ کی وہاں پھوٹ پڑی ہے چنانچہ اس طرح ہم سب نگر والے اپنے آبائی گاؤں چمکور صاحب ضلع اربالہ تحصیل روپڑ آ گئے۔ چمکور صاحب گاؤں سکھوں کا مقدس مقام ہے۔ اس کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ مغل دور میں کسی حاکم نے گورو کے دو بیٹوں اجیت اور جھو جھار کو زندہ دیا اور ان میں چنوا دیا تھا۔ گورو کے ان ہی دو بیٹوں کے نام سے منسوب وہاں ایک ہائی سکول تھا۔ بابا اجیت سنگھ جھو جھار ہری خالصہ ہائی سکول چمکور صاحب میں اس نام سے وہاں سکھوں کا ایک مندر بھی تھا میری دادی اماں نے مجھے وہاں پانچویں جماعت میں جا کر بٹھایا اور جب ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ بچے کی عمر نو سال تو ہوگی تو انہوں نے کہا فٹے منہ یہ تھے نو سال کا لگتا ہے۔ فٹے منہ دادی اماں کا تکیہ کلام تھا۔ سارے گاؤں والے ان کو تائی لتاں کہتے تھے چنانچہ لتاں جی نے میری عمر سکول میں دو سال زیادہ لکھوا دی۔ مجھے اس تاریخ پیدائش کے فرق کا پتہ والد صاحب کی ڈائری سے معلوم ہوا۔ ورنہ نگر فائل اور دسویں جماعت کے دونوں امتحان میں نے اسی اسکول سے دیے اور دونوں امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا امتحانوں کا مرکز گاؤں سے گیارہ میل دور روپڑ تھا۔

امتحان کے دنوں میں چمکور صاحب سے روزانہ روپڑ شہر جانا پڑتا اور اس طرح مجھے بائیس میل کا سفر ایک دن میں کرنا پڑتا۔ سکول میں اپنی جماعت میں واحد مسلمان طالب علم تھا۔ ہر جماعت میں ہر مضمون میں اول آتا۔ جس روز میرے اول آنے کا اعلان ہوتا۔ سکھ لڑکے مجھے گھیر لیتے اور میرے سر پر ٹھنگے لگاتے۔ وہ ٹھنگے مارنے کے ساتھ یہ نعرہ بھی لگاتے جاتے ہوئے سونہال ست سری اکال۔ راج کرو گا خالصہ باقی رہ نہ کو۔“ البتہ سکھ اساتذہ کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ تھا۔ سکول میں رہنے کے دوران پڑھائی کے علاوہ میں نے گورکھی سیکھی۔ سکھوں کی مقدس گرنتھ صاحب بھی پوری پڑھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک ہندو حلوائی کے نام امرتسر میں لاٹری نکل آئی اس کا خیال تھا کہ اسے قیمتی سامان ملے گا لیکن انعام میں اسے چار بڑے بڑے بکس کتابوں کے آگئے یہ کتابیں پرانی تھیں۔ ہندو حلوائی نے انہیں اپنی دکان میں رکھ لیا اور گاہکوں کو ورق پھاڑ پھاڑ کر ان میں مٹھائی لپیٹ کر دیتا رہا۔ ایک روز میں نے ہندو حلوائی کو ڈرایا کہ ان کتابوں میں مسلمانوں کی مقدس کتابیں بھی ہیں اور اگر انہیں اس بات کا پتہ چل گیا کہ تم ان کتابوں کو پھاڑ کر ان میں مٹھائی لپیٹتے ہو تو گاؤں میں فساد ہو جائے گا۔ مناسب یہی ہے کہ تم مجھے یہ کتابیں مفت میں دے دو یا پھر مجھ سے ان کی قیمت لے لو چنانچہ میں نے ان کتابوں میں سے 36 کتابیں چھانٹ کر پانچ روپے میں خرید لیں۔ جن میں عبد الحلیم شرر کے کئی ناول، فسانہ آزاد کی چار جلدیں آب حیات اور حیات جاوید شامل تھیں۔

ان دنوں مجھے پاکٹ منی دو پیسے روزانہ ملتے تھے۔ ایک پیسے کے میں اخروٹ خرید کر ایک جیب بھر لیتا اور دوسرے پیسے کشمش خرید کر دوسری جیب بھری جاتی اور میرا سارا دن گزر جاتا، چنانچہ ہندو حلوائی کو کتابوں کا معاوضہ دینے کے لیے میں نے اپنے ملازم کرم بخش سے پانچ روپے ادھار لئے۔ اب میرے سر پر بھوت سوار ہو گیا، کہ ان کتابوں کو پڑھوں میں غالباً ساتویں جماعت میں تھا۔ میرا چھوٹا بھائی حبیب شہاب میرے ساتھ ہی سکول جاتا۔ ہم نے گھر سے ذرا دور مہمانوں کے لیے ایک مردانہ بیٹھک بنائی ہوئی تھی اب میرا یہ معمول بن گیا کہ میں حبیب کو ایک پیسہ روزانہ رشوت دیتا اور وہ مجھے بیٹھک میں بند کر کے باہر سے تالا لگا کر سکول چلا جاتا۔ اور میں ان کتابوں کو بیٹھک میں بند پڑھتا رہتا سکول میں چھٹی کے بعد جب حبیب واپس آتا تو وہ بیٹھک کا تالا کھول کر مجھے باہر نکالتا۔ چنانچہ اس طرح میں نے تین

ماہ میں یہ 36 کتابیں پڑھ لیں ان کتابوں کے پڑھنے سے میری اردو زبان پر گرفت مضبوط ہوگئی۔ اب میں اپنی جماعت میں جو جواب مضمون لکھتا وہ اساتذہ کی سمجھ میں کم آتا تھا اور وہ حیران ہوتے تھے ان ہی دنوں میں نے لاہور کے ایک بچوں کے رسالہ ”چاند“ میں ایک کہانی لکھ کر بھیجی جو چھپ گئی۔

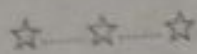
چمکور صاحب میں ہر سال سکھوں کا مقدس میلہ سنگھ سبھا نام سے منعقد ہوا کرتا تھا اس میلے میں ان کے مذہبی عالم بھی آ کر تقریریں کیا کرتے۔ اس سال جلسہ میں گورو نانک پر تقریر کرنے والوں میں میرا نام شامل کر لیا گیا۔ میں نے مرصع مضمون لکھ کر گورو نانک کی شان میں اس جلسہ میں پڑھا جس کے صدر مہاراجہ پٹیلہ تھے۔ حاضرین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ مضمون تو غالباً کسی کو سمجھ نہ آیا۔ البتہ شاہاش سب نے دی۔ مہاراجہ بھوپندر سنگھ نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر مجھے انعام میں دیا۔ جلسہ کے بعد میری جماعت کے سکھ لڑکوں نے یہ روپیہ چھین لیا اور وہی نعرہ لگانے لگے۔

”راج کرو گا خالصہ باقی رہے نہ کو۔“ عبداللہ صاحب چھوٹی عمر میں تھے کہ والد فوت ہو گئے دادی اماں اور ان کی گزر اوقات اس وظیفہ پر ہوئی جو انہیں پرائمری بڈل اور دسویں جماعت میں اول آنے پر ملتا رہا۔ انہوں نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی عبداللہ صاحب نے میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تو سرسید کو انہیں علی گڑھ بلا لینے کا خیال آیا وہ ذہین مسلم اسٹوڈنٹس کو علی گڑھ میں داخل کرنے کی فکر میں رہتے تھے اخبارات میں انہوں نے عبداللہ صاحب کے ٹاپ کرنے کی خبر پڑھی تو پیغام بر چمکور صاحب بھیج دیا۔ ہمارے گاؤں سے قریب ترین ریلوے سٹیشن سرہند تھا۔ وہاں سے روپڑ اور پھر کشتی کے ذریعے چمکور صاحب گاؤں پہنچنا پڑتا تھا۔ پیغامبر نے عبداللہ صاحب اور دادی اماں کو سمجھایا کہ پنجاب یونیورسٹی جو وظیفہ دے گی سرسید اس سے زیادہ وظیفہ دیں گے چنانچہ عبداللہ نے علی گڑھ میں جا کر داخلہ لے لیا علی گڑھ یونیورسٹی کے ابتدائی چند سالوں میں میرے والد نے گریجویشن کی ان کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر نے بھی بی اے کیا عبداللہ صاحب اس دوران میں دادی اماں کو باقاعدگی سے وظیفہ کی رقم بھیجتے رہے سرسید کو عبداللہ سے بہت پیار تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ عبداللہ صاحب آئی سی ایس میں داخلہ کے لیے انگلستان چلے جائیں چنانچہ جب عبداللہ صاحب نے دادی اماں کو خط لکھ کر اجازت لینا چاہی کہ وہ انگلستان چلے جائیں تو دادی اماں نے انکار کر دیا۔

اس زمانے میں بڑے بزرگ سمندر پار بچوں کو بھیجنے سے ڈرتے تھے ان کے ذہنوں میں یہ تصور تھا کہ وہاں بلائیں رہتی ہیں سرسید نے جب عبداللہ صاحب سے انکار کا سنا تو بہت ناراض ہوئے۔ پہلے انہوں نے ان کو مکوں اور لاتوں سے مرمت کی اور پھر ایک کمرے میں بند کر کے باہر تالا لگا دیا بات اس حسن سلوک پر بھی جب نہ بنی تو سرسید نے انہیں یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا کہ دور کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سنوں۔ عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے اتنے ہی سعادت مند شاگرد بھی تھے اور اس طرح عبداللہ گلگت چلے آئے۔

وہ علی گڑھ سے واپس آ رہے تھے کہ اقبالہ سٹیشن پر ایک خاندان کے کچھ افراد گاڑی میں سوار ہونے لگے ان کے پاس سامان زیادہ تھا والد صاحب نے ان کی مدد کر دی خاندان کے سربراہ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھے وضع قطع سے پڑھ لکھے لگتے ہیں اور پریشان بھی والد صاحب نے کہا ہاں میں ملازمت کی تلاش میں ہوں تو ان سے پوچھا تم میرے ساتھ گلگت و کشمیر چلو گے وہاں اینگلو ورننگر کلرک کی آسامی خالی ہے چنانچہ عبداللہ صاحب اس طرح

حکومت ہند میں چلے گئے وہاں جب ان صاحب کو جو انہیں وہاں لے گئے جب عبداللہ صاحب کی صحیح تعلیم اور قابلیت کا علم ہوا تو انہیں وزیر وزارت پر ترقی مل گئی یہ پوسٹ ڈپٹی کمشنر کی ہوتی تھی اور اس طرح بعد میں وہ وہاں کے گورنر بن گئے۔



جولائی 1934ء میں پرنس آف ولز کالج جموں میں، میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا اور بی ایس سی میں نے اسی کالج سے کیا بعد میں ایم اے انگریزی میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ میں تھرڈ ایئر میں تھا کہ مجھے اخبارات کے ذریعے پتہ چلا کہ لندن کی ایک سوسائٹی انگریزی زبان میں مضمون نویسی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ کر رہی ہے۔ مضمون کی طوالت ٹائپ شدہ 80 صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اس کا موضوع تھا کہ سینما نے ان کی زندگی پر کیا اچھے یا بُرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خاص طور پر لکھنے والے کا اپنے ملک کے حوالے سے کیا مشاہدہ ہے۔

میں نے خاموشی سے یہ مضمون لکھا اور بغیر کسی کو بتائے لندن مطلوبہ پتہ پر بھیج دیا چند ماہ بعد کالج کے پرنسپل کو ہمارا ماکہ سوسائٹی نے میرے مضمون پر اول انعام دیا ہے۔ یہ انعام 750 پونڈ نقد اور گولڈ میڈل پر مشتمل تھا بعد میں ایک تفصیلی خط کے ذریعے یہ خبر بھی دی گئی، اس مقابلے میں دنیا کے مختلف ممالک کے کل 9 ہزار امیدواروں نے حصہ لیا۔ اس اعزاز حاصل کرنے پر میرے کالج والوں نے بڑی خوشی منائی میرے لیے بھی یہ خوشی کم نہ تھی اس زمانے میں 750 پونڈ کا نقد انعام اور گولڈ میڈل دل خوش کرنے والی بات تھی۔ کالج والوں نے میری ایک تصویر انٹارچ کروائی اور اسے ایک خوبصورت فریم میں جڑ کر کالج ہال کے سین وسطی ستون پر نمایاں طور پر آویزاں کر دیا اس بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے میں اول آنے پر ہندوستان کے اخبارات نے خبر کے ساتھ ساتھ میری تصویر بھی چھاپی۔ مبارک باد کے بے شمار خطوط مجھے ملے شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں سے ایک آدمی میرے نام نہ آیا ہو۔ ان خطوط لکھنے والوں میں کئی مشاہیر شامل تھے۔ قائد اعظم اور مہاتما گاندھی نے مجھے مبارکباد کے جو خط لکھے ان میں شاید ہندوستانی ہونے کے باوجود محبت کی باس زیادہ تھی۔

لندن کی ایک سوسائٹی کی طرف سے بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے میں اول آنے پر مجھے مبارکبادی کے بے شمار خطوط موصول ہوئے ان میں ایک خط حیدر آباد دکن سے سرائیکبر حیدری کا بھی تھا وہ مجھے انعام میں ایک سو روپے کی کتب بھیجنا چاہتے تھے۔ اس بارے میں ان کی شرط بڑی دلچسپ مگر مضحکہ خیز تھی جو مجھے قبول نہ تھی۔ خط میں لکھا تھا وہ میری کامیابی سے خوش ہو کر ایک سو روپے کی کتابوں کا تحفہ عطا کرنا چاہتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ میں اپنے کالج کے پرنسپل اور مقامی مجسٹریٹ سے اپنی نیک چلنی اور حکومت وقت کے خلاف کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لینے کا یقین دہان کر دوں۔ میں ان دنوں علامہ اقبالؒ کی نظم کے اشعار پڑھ چکا تھا جو انہوں نے ایسے ہی موقع پر کہے تھے ان اشعار کا اثر ابھی میرے ذہن پر قائم تھا چنانچہ میں نے سرائیکبر حیدری سے سو روپے کی کتب کا تحفہ لینے کا خیال ترک کر دیا۔

علامہ اقبالؒ کی نظم کے اوپر یہ عبارت ہے۔

سراکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کے نام یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ منصور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپے کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر حُسن تدبیر سے دے آئی و فانی کو ثبات میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش کام درویش میں پر تلخ ہے مانند نبات غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

بہت ممکن ہے علامہ اقبالؒ کو بھی ہزار روپے کا چیک کسی ایسی ہی شرط کے ساتھ موصول ہوا ہو جس پر انہیں یہ کہنا پڑا ہو غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول۔

اس دوران مجھے ہندوستان آرٹ اکیڈمی نے بڑا عجیب تحفہ پارسل کیا۔ یہ تحفہ چاول کا ایک دانہ تھا جس پر میری تصویر کا عکس تھا۔

چاول کے دانہ کے ساتھ سوسائٹی والوں نے ایک محدب شیشہ بھی پارسل کیا تھا تا کہ میں اس کی مدد سے چاول پر بنی ہوئی باریک اور مخفی تصویر دیکھ سکوں جو ویسے نظر نہ آتی تھی۔ یہ محدب شیشہ ہی اس کے خدو خال نمایاں کرتا تھا۔ چاول پر میری تصویر کا عکس بنانے والے آرٹسٹ نے میری تصویر کسی اخبار سے لی ہوگی کیونکہ ان دنوں اکثر اخبارات نے اسے شائع کیا تھا چاول کا یہ دانہ تیس برس کے قریب صحیح و سلامت میرے پاس رہا پھر غالباً موکی اثرات سے بھر بھر کر ختم ہو گیا اور اس کی یاد محدب شیشہ باقی رہ گیا ہے۔

اردو زبان پر میری گرفت آب حیات، فسانہ آزاد کی جلدیں اور عبداللیم شرر کے ناول پڑھ کر شاید مضبوط ہوئی تھی لیکن انگریزی پر عبور والد صاحب کا ”شینو گرافر“ بننے سے حاصل ہوا۔ عبداللہ صاحب نے بیس بائیس سال ملازمت کی اور پھر 1939ء میں اس سے الگ ہو گئے مہاراجہ ہری سنگھ ان کو پسند نہ کرتا تھا اور یہ اس کو پسند نہ کرتے۔ وہ گلگت میں گورنر ہی تھے کہ اس دوران مسلم کانفرنس قائم ہو گئی۔ ملازمت سے علیحدگی کے بعد عبداللہ صاحب اس تنظیم میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کشمیری رہنما چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ ان کے پاس مشوروں کے لیے آتے رہتے۔ مسلم کانفرنس کی تنظیمی امور کے علاوہ چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ کی تقریروں کے نوٹس بھی تیار کرتے رہتے تھے۔ عبداللہ صاحب انجمن اسلامیہ جموں کے اعزازی سیکرٹری بھی تھے علاقہ کے لوگ اکثر عدالتی اور دفتری معاملات میں ان سے اپنی درخواستیں یا اپیلیں لکھوانے پہنچتے آتے۔ ایسے ہی موقعوں پر وہ مجھے اپنے شینو گرافر کے فرائض سونپتے اور ڈکٹیشن دیتے جاتے اور اس طرح مجھے انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو گیا یہ سلسلہ کئی

برس جاری رہا۔

ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر ان کی حالت مہاراجہ ہری سنگھ کے غلاموں سے زیادہ نہ تھی ان کے حقوق کا کوئی وجود نہ تھا۔ ریاست کے مسلم رہنما حصول حقوق کی جدوجہد کرتے رہتے تھے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے گلینسی کمیشن بنا۔ گورنر پنجاب سر برٹرینڈ گلینسی کمیشن کے سربراہ تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے میمورینڈم پیش کرنا تھا۔ گلینسی نے کشمیری رہنماؤں کو بلا کر کہا کہ اپنے معاملات کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے وہ تحریری شکل میں کل صبح ہی لے کر آؤ۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ پریشانی کے عالم میں عبداللہ صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ میمورینڈم کل صبح تک ہر حال میں دینا ہے ورنہ ماضی کی ساری جدوجہد بے کار جائے گی۔ عبداللہ صاحب نے تین ٹائپسٹ بلوائے اور چار پائی پر بیٹھ کر انہیں ڈکٹیشن دینے لگے۔ ان تینوں ٹائپسٹوں نے ٹائپ رائٹروں پر کاغذ چڑھا رکھے تھے اور وہ ساتھ ساتھ ڈکٹیشن لیتے اور ساتھ ساتھ ٹائپ کرتے جاتے اس طرح 200 صفحات پر مشتمل میمورینڈم تیار ہو گیا جسے اگلے روز گورنر سر برٹرینڈ گلینسی کو پیش کر دیا گیا۔ گورنر نے میمورینڈم پر حاتو حیران رہ گیا۔ وہ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس سے پوچھنے لگا کہ یہ میمورینڈم کس نے تیار کیا ہے میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔ دونوں رہنماؤں نے عبداللہ صاحب کا ذکر کیا اور ان کا غائبانہ تعارف کروا دیا۔ گلینسی نے عبداللہ صاحب سے ملاقات کی اور ان کی انگریزی زبان پر اس بے پناہ عبور کی بے حد تعریف کی۔ بعد ازاں گلینسی کمیشن رپورٹ کے نتیجہ میں جموں و کشمیر اسمبلی قائم ہوئی اور عبداللہ صاحب بھی ایک حلقہ سے انتخاب میں حصہ لے کر اس کے ممبر بن گئے۔

عبداللہ صاحب 62 سال کی عمر میں فوت ہوئے لیکن داوی لٹاں کی عمر 110 سال تھی۔ داوی لٹاں کبھی گاؤں سے باہر نہیں نکلتیں۔ چنگور صاحب میں ہی رہیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ داوی لٹاں نے نہ کبھی ہنس پر اور نہ کبھی ٹرین پر سفر کیا۔ عبداللہ صاحب نے کئی بار خواہش بھی کی کہ وہ ان کے پاس آ کر کشمیر میں رہیں مگر وہ نہ مانیں داوی لٹاں کو میں سے اوپر گنتی نہ آتی تھی۔

ایک بار ہندو تاجر گائے فروخت کرنے ان کے پاس آیا۔ تائی اماں نے (گاؤں والے انہیں اسی نام سے پکارتے تھے) اس ہندو سے پوچھا کیا قیمت لیتے ہو، اس نے کہا ساٹھ روپے فٹے منہ، تو چار بیسوں سے (یعنی 80 روپے) سے زیادہ ایک پیسہ نہ دوں گی۔ ہندو تاجر سمجھ گیا کہ تائی اماں کو ساٹھ روپے کا پتہ نہیں کہ وہ چار بیس سے کم ہوتے ہیں کہنے لگا تائی اماں آپ قیمت تو کم دے رہی ہیں پر میں اپنی مجبوری میں سودا منظور کر رہا ہوں اور اس طرح تائی اماں سے وہ عیار ہندو تاجر بیس روپے گائے کی منہ کی قیمت سے زیادہ لے گیا۔ ایک سو دس سال کی عمر میں بھی تائی اماں کی بینائی بہت تیز تھی سوئی میں دھاگہ خود ڈال لیتی تھیں۔ ایک روز ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ میں ان کے قریب تھا مجھے بلایا اور کہا کہ میرا جی مولی کھانے کو چاہتا ہے پر تمہاری ماں کھانے نہیں دیتی۔ جاؤ کھیت سے ایک مولی اکھیڑ کر لے آؤ۔ میں نے قہقہہ کی، کھیت سے مولی اکھیڑی اسے دھویا اور لا کر تائی اماں کو دے دی پھر مجھے انہوں نے دروازے پر کھڑا کر دیا کہ کوئی اندر آنے لگے تو مجھے بتا دینا۔ مولی پر نمک لگایا اوپر رضائی لی اور ٹھپ کر کچر کچر ساری مولی کھا کر سو گئیں ایک بار جو سوتیں پھر نہ انھیں۔ میں کئی روز خوف زدہ رہا کہ تائی اماں کی موت کی ذمہ داری

مجھ پر آتی ہے۔

بی ایس سی میں نے رائل کالج آف جموں سے کی تھی ایم اے انگریزی میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا تعلیم سے فارغ ہو کر کشمیر اپنے والد صاحب کے ہاں پہنچا تو شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس ان کے پاس مبارکباد دیئے آئے۔ شیخ عبداللہ کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ مل کر مسلم کانفرنس میں سیاسی کام کروں۔ لیکن چوہدری غلام عباس کی رائے ان سے مختلف تھی وہ والد صاحب کی سوچ کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کا ملازمت کی طرف رجحان بہت کم ہے حالانکہ ہمیں سرکاری عہدوں پر مسلمان افسر تعینات کرانے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے پہلے پی سی ایس (صوبائی سول سروس) کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ بعد میں انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گیا اور اس میں بھی کامیاب ہو گیا انڈین سول سروس صوبائی سول سروس سے یقیناً بہتر تھی۔ لہذا میں نے انڈین سول سروس اختیار کر لی۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ آئی سی ایس کے امتحان میں شرکت کے لیے انگلستان جانے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہذا اس کا انتظام مقامی طور پر کر لیا گیا تھا ذریعہ دون میں ٹریننگ کمپ تھا۔ آئی سی ایس کی سلیکشن کے بعد ٹریننگ کے لیے ذریعہ دون چلا گیا۔ ٹریننگ کے دوران میں مجھے دیگر تربیت کے علاوہ ہندی زبان بھی سیکھنا پڑی۔ کیونکہ میری تعیناتی بہار میں ہو رہی تھی۔ اس طرح میں بطور اسٹنٹ کمشنر بھاگل پور سول سروس میں شامل ہو گیا۔

بھاگل پور میں بحیثیت اسٹنٹ کمشنر میری تعیناتی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اگست 42ء میں ”ہندوستان چھوڑ دو“ تحریک شروع ہو گئی۔ صوبہ بہار اس تحریک سے بہت متاثر ہوا۔ بھاگل پور کے علاقہ میں کانگریسی جہوم نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں۔ بنکوں اور تھانوں پر حملہ کر کے انہیں جلا دیا۔ تخریبی کارروائیوں کے نتیجے میں مشتعل جہوم نے ایک گاؤں میں پولیس کانسٹیبل کو قتل کر کے اس کی لاش یونین جیک میں لپیٹ کر درخت پر لٹکا دی مجھے حکم ملا کہ میں تفتیش کے لیے جائے واردات پر جاؤں اور قاتلوں کا سراغ لگا کر انہیں گرفتار کرواؤں چنانچہ میں پہاڑی ملٹری پولیس کا ایک دستہ لے کر گاؤں پہنچا اور کمپ لگا کر تحقیقات شروع کر دی اگلے روز انگریز کمشنر، انگریز کلکٹر، ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور سپرنٹنڈنٹ پولیس گاؤں پہنچے ان کے ساتھ پٹرول کا بھرا ہوا ایک ٹینکر بھی تھا۔

یہ لوگ میرے ٹینٹ میں بیٹھ کر فیصلہ کرنے لگے کہ گاؤں سے مرد عورتوں اور بچوں کو نکال کر مکانوں اور فصلوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جائے۔ فیصلہ کرتے وقت ان انگریز افسروں نے میرے وجود کا احساس کیا نہ میری رائے کو اہمیت دی بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے خاموش کرادیا۔ میں نے انتقام میں ان کے اس پاگل پن کے نتائج پر نظر دوڑائی تو کانپ گیا۔ میں ٹینٹ سے باہر نکلا اور شیر خاں دفعدار کو بلایا۔ میں نے اس کے سامنے انگریز افسروں کا فیصلہ رکھا اور اسے سمجھایا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو سارے ملک میں آگ لگ جائے گی۔ اگر تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو تو اپنے سپاہیوں سے کہو کہ وہ کمپ کو گھیرے میں لے لیں اور جب تک میں تمہیں حکم نہ دوں ان افسروں کو کمپ سے باہر نہ نکلنے دیں۔ پہاڑی ملٹری پولیس کے جوانوں نے جب تعمیل حکم میں پوزیشن سنبھالی تو میں دفعدار شیر خاں کو ساتھ لے کر کمپ کے اندر گیا اور اپنے انگریز افسروں کو کہا کہ اپنے آپ کو میری حراست میں سمجھیں اور میرے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ملیں گے۔ میں نے بیڑ اور بیٹھری وغیرہ ٹینٹ کے اندر بھجوا دی دفعدار شیر خاں کو ان کی نگرانی پر چھوڑ دیا اور خود کمپ سے

باہر چلا گیا۔ پٹرول کا ٹینکر میں نے وہاں سے بھجوا دیا اور جب یہ تسلی کر لی کہ یہ لوگ کوئی حماقت نہیں کریں گے تو ایک گھنٹہ بعد انہیں ٹینٹ سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ ملٹری پولیس کے دستہ نے انہیں سلامی دی اور یہ انگریز افسر واپس چلے گئے۔

تحریک کا زور کم ہو گیا تو انگریز کمشنر نے گورنر بہار کو میرے خلاف رپورٹ بھیج دی تھی اور مجھے اشارہ مل چکا تھا کہ بہتری یہی ہے کہ میں فوری طور پر استعفیٰ دے دوں۔ ایک روز مجھے گورنر کی طرف سے پٹنہ میں ناشتہ ان کے ساتھ کرنے کا حکم ملا۔ میری ملازمت کو ابھی آٹھ ماہ ہی گزرے تھے۔ میں نے اپنا استعفیٰ لکھ کر جیب میں ڈالا اور پٹنہ روانہ ہو گیا۔ جوں ہی میں گورنر کے سامنے پیش ہوا تو ان سے پوچھا کہ میں استعفیٰ ناشتہ سے پہلے دوں یا ناشتہ کے بعد مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ گورنر نے کہا کہ تمہارے اقدام کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا ہے۔ میں تمہارے اقدام پر خوش ہوں۔

You have done the right thing but in the wrong way.

جب میرا معاملہ رفع دفع ہو گیا تو میں نے گورنر سے درخواست کی کہ پہاڑی فوجی پولیس کے دستے اور اس کے انچارج دفعتدار شیر خاں کی ملازمت پر ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے پر اثر نہیں ہونا چاہیے۔ گورنر نے مجھ سے پوچھا کہ ان کی وفاداری حکومت برطانیہ سے کمزور تو نہیں ہوگی اور جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ انہوں نے یہ سب کچھ اچھے جذبے سے میرے کہنے پر کیا تھا تو گورنر نے ان کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد میں جب گورنر نے وائسرائے ہند کے سامنے میرا واقعہ بیان کیا تو وائسرائے نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا اگرچہ تحریک نے سارے ہندوستان میں زور نہیں پکڑا۔ اس کا اثر اتنا بھی نہیں تھا کہ مقامی انتظامیہ بے بس ہو جاتی۔ البتہ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے عوام انگریز کی حکومت نہیں چاہتے میرا خیال ہے کہ

THE DAYS OF BRITISH RULE ARE NUMBERED.

کئی ہندوستانی افسروں نے وائسرائے ہند سے کہنے کی کوشش کی کہ ایسا نہیں لیکن وائسرائے اپنے خیال پر مضبوطی سے قائم رہا گورنر سرنامس سٹیورٹ بھی کافی حد تک وائسرائے کے ہم خیال تھے۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد بنگال میں سائیکلون قحط نے قیامت برپا کر دی لاکھوں انسان مرنے لگے۔ جتنے انسان قحط بنگال میں مرے۔ اتنے شاید دوسری جنگ عظیم میں بھی نہیں مرے ہوں گے۔ میں نے صورتحال دیکھی تو حکومت سے درخواست کی کہ مجھے بنگال میں ریلیف ڈیوٹی پر بھیج دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین بنگال کے چیف منسٹر اور سہروردی سول سپلائی منسٹر تھے خواجہ ناظم الدین کی طرف سے اپیل کی گئی تھی کہ ریلیف کے کام کے لیے دوسرے صوبوں سے کچھ افسروں کی ضرورت ہے چنانچہ میری درخواست پر مجھے بطور خاص بنگال بھیج دیا گیا۔ مغربی بنگال میں ضلع مدنا پور سب ڈویژن تملوک میں مجھے سب ڈویژنل آفیسر بنا دیا گیا۔ اس علاقہ میں قحط اور سائیکلونوں نے پوری تباہی مچائی ہوئی تھی۔

سجاش چندر بوس نے کانگریس میں اپنا فارورڈ بلاک قائم کیا ہوا تھا۔ جو دہشت پھیلانے کا کام کرتا تھا اس بلاک کا ایک مضبوط گڑھ اس سب ڈویژن میں بھی تھا۔ ان دہشت گردوں نے تین انگریز ڈپٹی کمشنروں کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا تھا۔ لاکھوں من چاول دھان حکومت کے ایجنٹوں کے گوداموں میں بند پڑا تھا۔ ان گوداموں کے

باہر ارد گرد ہر روز سینکڑوں انسان بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے۔ میں نے سول سپلائی منسٹر حسین شہید سہروردی کو کئی خطوط لکھے کہ مجھے اجازت دیں، چاول دھان کا کچھ حصہ قحط زدہ انسانوں میں مفت تقسیم کر دیا جائے لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ تنگ آ کر میں نے انہیں ایک تار دیا کہ اگر فلاں تاریخ تک مجھے آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو تملوک شہر میں ایک گودام کا چاول دھان مفت تقسیم کر دوں گا۔ قحط کی اس انتہائی شدت کے باوجود مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ بالآخر مسلم لیگ، کانگرس اور فاروڈ بلاک کا ایک ایک نمائندہ لے کر میں نے ایک کمیٹی بنا دی اور گودام کا تالا توڑ کر اس کا چاول اس کمیٹی کے ارکان کے سپرد کر دیا کہ وہ قحط زدہ لوگوں میں اسے مفت تقسیم کر دیں۔ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دے دیا۔ کمیٹی میں ہندو مہاسبھا کا کوئی نمائندہ میں نے دائرہ شامل نہ کیا تھا۔ اس پر ہندو مہاسبھا کے لیڈر شیاما پرشاد کمر جی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے کلکتہ کے کئی اخباروں میں میرے خلاف بیانات چھپوائے۔

چند دنوں بعد سہروردی صاحب بھی تملوک تشریف لائے۔ گودام خالی دیکھ کر وہ بالکل پریشان نہ ہوئے بلکہ تحلیلہ میں کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا ہے لیکن اب یہاں کانگریز گورنر تمہیں اس صوبے میں نہیں رہنے دے گا۔ میں یہاں سے جانے کے لیے تیار ہوں۔ گودام کے ایجنٹ نے دیوانی عدالت میں کئی لاکھ روپے کے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ جس کی ڈگری اب تک میرے خلاف کہیں پڑی ہوگی۔ چند روز کے بعد مدنا پور کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس مجھے ملنے آیا اور سیر کرنے کے بہانے مجھے اپنی جیب میں تملوک سے باہر لے گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مجھے کلکتہ لاکر چھوڑ دیا کہ اب میں واپس تملوک نہ جاؤں مجھے بنگال سے نکلنے کا تحریری حکم مل جائے گا۔ جب تملوک میں یہ خبر پھیلی کہ شاید مجھے وہاں سے تبدیل کیا جا رہا ہے تو مسلم لیگ، کانگرس اور فاروڈ بلاک کے نوجوانوں کا بہت بڑا ہجوم میری کونٹری پر جمع ہو گیا تاکہ مجھے تبدیل ہونے سے روکے۔ جب معلوم ہوا کہ میں پہلے ہی چلا گیا ہوں تو ہجوم نے غصے سے مکان پر حملہ کر دیا۔ پولیس والوں نے میرا سارا سامان خورد برد کر دیا اور اسے تخریب کاروں کے سر لگا کر اپنی گلو خلاصی کرائی۔

کلکتہ پہنچ کر مجھے حکم ملا کہ میری پوسٹنگ اڑیسہ میں کر دی گئی ہے میں اس وقت کے دارالحکومت کلکتہ چلا گیا۔ وہاں پر کچھ عرصہ کے بعد میری تعیناتی ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر ہو گئی۔ ایک روز کلکتہ سے ایک صاحب مجھے ملے آئے۔ کسی وقت یہ صاحب فوج میں افسر تھے۔ پھر یہ سبشاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے اور انہیں فوج سے نکال دیا گیا۔ یہ صاحب حسین شہید سہروردی کا خط میرے نام لائے تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ان صاحب کو مسلم لیگ کی طرف سے ایک خفیہ مشن پر ملک سے باہر بھیجنا ہے مگر ان کا نام ان لوگوں کی فہرست میں ہے جنہیں پاسپورٹ نہیں مل سکتا۔

تملوک میں چاول کے گودام کا تالا توڑ کر آپ نے لاکھوں روپے کی مالیت کا راشن جس جرأت مندی سے قحط زدہ لوگوں میں مفت تقسیم کروایا ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ انسانی ہمدردی کے تحت کارروائی کرنے میں کسی خوف کو خاطر میں نہیں لاتے ان صاحب کو پاسپورٹ دلوانے میں ایسی ہی کارروائی کر سکتے ہیں یہ ایک قومی خدمت ہوگی۔ مجھے ان صاحب کے خفیہ مشن کا تو معلوم نہ ہو سکا البتہ میں نے ان کا پاسپورٹ بنوا دیا۔ میں

چونکہ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ نے ہی پاسپورٹ جاری کرنا تھا لہذا مجھے یہ کام کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

یہ فروری 1947ء کی بات ہے۔ اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ سری کرشن مہتاب تھے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا شعبہ ان کے ماتحت تھا۔ ایک روز میں کچھ ضروری فائلیں لے کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کہاں رہ رہے ہو میں نے انہیں بتایا کہ سرکٹ ہاؤس میں رہ رہا ہوں۔ کہنے لگے ایک کوٹھی خالی پڑی ہے لیکن اس کے بارے میں شدید ہے کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے اگر تم وہاں رہنا پسند کرو تو وہ مکان ابھی مل سکتا ہے میں اس زمانے میں آسیب زدگی کو دماغی خلل تصور کیا کرتا تھا چنانچہ میں نے بنکوشی حامی بھری اور اس ویران کوٹھی میں جا کر ڈیرہ جمال لیا جو ایک مدت سے خالی پڑی تھی اور اس اجاڑ گھر کو دیکھ کر واقعی اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں جن بھوت ہی رہ سکتے ہیں۔

اس کوٹھی میں رہ کر مجھے عجیب و غریب خوفناک واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ کبھی کبھار کوٹھی کے دروازے کے اندر بسکیاں لیتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دیتی بعض کھڑکیوں دروازوں میں سنگھ بیٹھ جاتے۔ میں نے وہاں رہنے کے دوران میں پیش آنے والے واقعات میں 18 سول لائن کے نام پر اپنی ایک کہانی میں درج کیا اور اب قدرے تفصیل سے اپنی کتاب ”شہاب نامہ“ میں اس کا ایک باب لکھ رہا ہوں رفتہ رفتہ بعد میں یہ راز کھلا کہ اس گھر کے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں 18 برس کی خوب لڑکی کیلاش دفن ہے جس کی وجہ سے غالباً یہ گھر آسیب زدگی کی آفت میں مبتلا ہے۔ چنانچہ پولیس کی نگرانی میں اس مقام کو کھود کر ایک ڈھانچہ نکالا گیا۔ جو طبی تجزیہ میں ثابت ہوا کہ یہ ڈھانچہ 18، 19 سال کی لڑکی کا ہے اور اسے اٹھارہ بیس سال پہلے دفن کیا گیا تھا۔ اس لڑکی کی ماں کو جو بقیہ حیات تھی، آلہ آباد سے بلوایا گیا اور ہندو مذہب کے مطابق ڈھانچہ کو جلایا گیا اور اس کے بعد اس کوٹھی سے آسیب کا سایہ اٹھ گیا۔

ملازمت کے ابتدائی ایام میں دو ایک بار کچھ لوگوں نے رشوت دینا چاہی لیکن جب دیکھا کہ کوئی تحریس و لالچ مجھے ان کے دام میں نہیں لاسکا تو صبر شکر کر کے بیٹھ گئے بعد میں اس بارے میں بدنامی اتنی ہو گئی کہ کسی نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔ بس ساری ملازمت میں ایک بوڑھی عورت نے سولہ آنے گن کر میری جیب میں ڈالے تھے۔ بس سولہ آنے کی اس رشوت نے ہی غنی بنادیا پھر خواہش ہی نہ رہی۔ البتہ رشوت لینے والوں کو میں نے یہ کام سوڈھنگ سے کرتے دیکھا ہے۔ روپے پیسے کی خواہش نے ہمارے معاشرے کو گنہگار کی طرح چاٹ لیا ہے۔ اب لوگوں کی بڑائی کا ہمارے ہاں یہی ایک پیمانہ رہ گیا ہے جتنی زیادہ دولت اتنا بڑا آدمی۔

پہلے ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے پھر رشوت کے دلچسپ واقعات کی بات کروں گا۔

جن دنوں میں صدر سکندر مرزا کا سیکرٹری تھا۔ ایک شام میں کراچی کے ایک ہیرکننگ سیلون میں بال کنوائے گیا۔ میری طرح کچھ اور صاحبان بھی بال کنوائے اور شیو وغیرہ بنوانے میں مصروف تھے کہ ایک صاحب سیلون میں داخل ہوئے۔ تمام حجام حضرات نے اس کا کورنش بجالا کر استقبال کیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے تو سارے حجام اس کے گرد ہو گئے کوئی ان کی مٹھی چا پی کر رہا ہے تو دوسرا ان کے بال کاٹ رہا ہے میرے جیسے دوسرے گا بکوں کو جس حالت میں حجام نے چھوڑا تھا اسی کیفیت میں وہ بیٹھے رہے۔ کسی کی آدمی شیو ہو چکی تو کسی کے بال آدھے کٹے تھے ایسے میں کوئی اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ کب یہ صاحب بال کنوا کر باہر نکلیں اور کب حجام فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوں۔ میری گردن پر بھی

کپڑا پہنا رہا۔ آدھے ہال کئے تھے مجبوراً دوسروں کی طرح میں بھی انتظار میں رہا۔ جب یہ صاحب ہال کٹوا چکے تو انہوں نے پانچ سو روپے کے کرلٹی ٹوٹ جیب سے نکال کر سیلون کے مالک کو دیے کہ ان کو ملازموں میں بانٹ دینا اور دوا دارو سامان وصول کرنے کے بعد سیلون سے باہر نکل گئے۔ میں نے ہال کاٹنے والے جام سے پوچھا، یہ کون صاحب تھے؟ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا، آپ انہیں نہیں جانتے کمال ہے۔ شاید آپ کراچی میں نہیں رہتے میں نے کہا رہتا تو میں کراچی میں ہوں۔ پر ان کو نہیں جانتا۔

وہ بولا یہ سیلٹھ قاسم بھٹی تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ چلو ہال کٹوانے کے بہانے مشہور سمگلر قاسم بھٹی کے تو دیار حاصل ہو گئے جن کا میں نے بہت ٹھہرہ سُن رکھا تھا۔ دکان کا مالک کہنے لگا۔ یہ جب بھی میرے ہاں آتے ہیں۔ اسی طرح پانچ سو روپے انعام و اکرام میں دے کر چلے جاتے ہیں۔

رشوت کا سلسلہ بڑا دلچسپ اور وسیع ہے اس کام کے لیے لوگوں نے بڑے انوکھے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ رشوت لینے کی پہلی دلچسپ جھلک میں نے زندگی میں ڈیرہ دون میں ٹریننگ کے دوران میں دیکھی۔ میری جان پہچان کے یہ صاحب ایک سرکاری دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ میں اکثر ان سے ملنے ان کے گھر جایا کرتا ان کے متعلق یہی شہرت تھی کہ بڑے پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں لیکن مالی حالت ان کی ملازمتی حیثیت سے کہیں زیادہ فراغت اور خوش حالی کی فحاشی کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی ایمانداری کا راز کھلا کہ وہ صبح سویرے تہجد کے وقت اٹھ کر نماز پڑھتے جاتے ہیں کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ گھڑ سواری والے لمبے بوٹوں کے تین جوڑے رکھے ہوتے اور وہ تسبیح کے دانے انہماک سے انگلیوں سے چلاتے جاتے۔ جو بھی صاحب ضرورت آتا پیسے اور ساتھ چٹ ان بوٹوں میں ڈال کر چلا جاتا۔ رشوت میں دیے گئے روپوں کی تعداد اسی چٹ پر درج ہوتی۔ جس پر کام کی نوعیت بھی لکھی ہوتی تھی۔ جب یہ صاحب دفتر جانے کے لیے اٹھتے تو ان کی بیگم ایک کپڑے پر جوتے کے جوڑے اُلٹ دیتیں اور پیسے الگ کرتیں اور کام کی چٹیں اپنے میاں کو دے دیتیں۔

ایک روز جب میری ٹریننگ کا اختتام تھا سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیگم نے مجھے کھانے کی دعوت دی میں نے بھولپن میں اس سے کہا کہ آپ رشوت کا پیسہ استعمال کرتے ہیں۔ میں آپ کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میری بات سن کر وہ سادگی میں کہنے لگیں تو بہ تو بہ ہم نے تو اس حرام کے پیسے کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تو اس کا استعمال کیسے کریں گے، میں نے پوچھا پھر آپ اس روپے کا کیا کرتی ہیں جو رشوت کے طور پر ان بوٹوں کے خول میں ڈالا جاتا ہے، بتانے لگیں۔ میں یہ روپیہ کپڑے میں ڈال کر ملازم کے ہاتھ بٹک بھیج دیتی ہوں اور چیک کے ذریعے دوسرا روپیہ منگوا لیتی ہوں میں اس کی سادگی اور پتہ کاری پر بہت ویر ہستار ہا۔

میں جب گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے تعینات ہوا اور پہلی عید کے موقع پر شام کو دفتر سے گھر لوٹا تو برآمدے میں مٹھائی کے دو بڑے ٹوکڑے رکھے تھے۔ ماں جی ان دنوں حیات تھیں۔ جو سینٹھ یہ عیدی لائے تھے ماں جی نے اندر نہ آنے دی۔ چنانچہ وہ مجبوراً ان ٹوکڑوں کو مع اپنے وزنگ کارڈ کے برآمدے میں رکھ کر چلے گئے۔ میں نے ان ٹوکڑوں کو لانے والے پاکستان کے مشہور صنعت کار کا حدود اربعہ جب اس وزنگ کارڈ سے معلوم کر لیا تو ٹوکڑے کا رکی ڈگی میں رکھے اور ان کے گھر واپس چھوڑ آیا وہ بہت اصرار کرتے رہے کہ صاحب کل

کپڑا پھنسا رہا۔ آدھے بال کٹے تھے مجبوراً دوسروں کی طرح میں بھی انتظار میں رہا۔ جب یہ صاحب بال کٹوا چکے تو انہوں نے پانچ سو روپے کے کرنسی نوٹ جیب سے نکال کر سیلون کے مالک کو دیے کہ ان کو ملازموں میں بانٹ دینا اور دوبارہ سلام وصول کرنے کے بعد سیلون سے باہر نکل گئے۔ میں نے بال کاٹنے والے جام سے پوچھا، یہ کون صاحب تھے؟ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا، آپ انہیں نہیں جانتے کمال ہے۔ شاید آپ کراچی میں نہیں رہتے میں نے کہا رہتا تو میں کراچی میں ہوں۔ پر ان کو نہیں جانتا۔

وہ بولا یہ سیٹھ قاسم بھی تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ چلو بال کٹوانے کے بہانے مشہور سمگلر قاسم بھیٹی کے تو نیاز حاصل ہو گئے جن کا میں نے بہت ٹھہرہ سُن رکھا تھا۔ دکان کا مالک کہنے لگا۔ یہ جب بھی میرے ہاں آتے ہیں۔ اسی طرح پانچ سو روپے انعام و اکرام میں دے کر چلے جاتے ہیں۔

رشوت کا سلسلہ بڑا دلچسپ اور وسیع ہے اس کام کے لیے لوگوں نے بڑے انوکھے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ رشوت لینے کی پہلی دلچسپ جھلک میں نے زندگی میں ڈیرہ دون میں ٹریننگ کے دوران میں دیکھی۔ میری جان پہچان کے یہ صاحب ایک سرکاری دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ میں اکثر ان سے ملنے ان کے گھر جایا کرتا ان کے متعلق یہی شہرت تھی کہ بڑے پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں لیکن مالی حالت ان کی ملازمتی حیثیت سے کہیں زیادہ فراغت اور خوش حالی کی غمازی کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی ایمانداری کا راز کھلا کہ وہ صبح سویرے تہجد کے وقت اٹھ کر نماز پڑھتے جاتے ہیں کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ گھڑ سواری والے لمبے بوٹوں کے تین جوڑے رکھے ہوتے اور وہ تسبیح کے دانے انہماک سے انگلیوں سے چلاتے جاتے۔ جو بھی صاحب ضرورت آتا پیسے اور ساتھ چٹ ان بوٹوں میں ڈال کر چلا جاتا۔ رشوت میں دیے گئے روپوں کی تعداد اسی چٹ پر درج ہوتی۔ جس پر کام کی نوعیت بھی لکھی ہوتی تھی۔ جب یہ صاحب دفتر جانے کے لیے اٹھتے تو ان کی بیگم ایک کپڑے پر جوتے کے جوڑے الٹ دیتیں اور پیسے الگ کرتیں اور کام کی چٹیں اپنے میاں کو دے دیتیں۔

ایک روز جب میری ٹریننگ کا اختتام تھا سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیگم نے مجھے کھانے کی دعوت دی میں نے بھولپن میں اس سے کہا کہ آپ رشوت کا پیسہ استعمال کرتے ہیں۔ میں آپ کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میری بات سن کر وہ سادگی میں کہنے لگیں تو بہت توبہ ہم نے تو اس حرام کے پیسے کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تو اس کا استعمال کیسے کریں گے، میں نے پوچھا پھر آپ اس روپے کا کیا کرتی ہیں جو رشوت کے طور پر ان بوٹوں کے خول میں ڈالا جاتا ہے، بتانے لگیں۔ میں یہ روپیہ کپڑے میں ڈال کر ملازم کے ہاتھ بنک بھیج دیتی ہوں اور چیک کے ذریعے دوسرا روپیہ منگوا لیتی ہوں میں اس کی سادگی اور پُر کاری پر بہت دیر ہنستا رہا۔

میں جب گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے تعینات ہوا اور پہلی عید کے موقع پر شام کو دفتر سے گھر لوٹا تو برآمدے میں مٹھائی کے دو بڑے ٹوکڑے رکھے تھے۔ ماں جی ان دنوں حیات تھیں۔ جو سینٹھ یہ عیدی لائے تھے ماں جی نے اندر نہ آنے دی۔ چنانچہ وہ مجبوراً ان ٹوکڑوں کو مع اپنے وزنگ کارڈ کے برآمدے میں رکھ کر چلے گئے۔ میں نے ان ٹوکڑوں کو لانے والے پاکستان کے مشہور صنعت کار کا حدودِ اربعہ جب اس وزنگ کارڈ سے معلوم کر لیا تو ٹوکڑے کا رکی ڈگی میں رکھے اور ان کے گھر واپس چھوڑ آیا وہ بہت اصرار کرتے رہے کہ صاحب کل

عید ہے آپ کو ملے پینکڑوں لوگ آئیں گے۔ میں نے اسی خیال سے دو ٹوک کرے پہنچائے تھے۔ اگر آپ انہیں واپس کریں گے تو میری نوکروں کے سامنے سبکی ہوگی۔ بہر حال اگلے روز میں جس افسر کے ہاں بھی عیدی کی مبارکباد کہنے گیا میرے سامنے غالباً سیٹھ کی پہنچائی ہوئی مٹھائی ہی رکھی جاتی رہی۔ رشوت ہمارے دفتری نظام کا ایک اہم جزو بن گئی ہے۔ انگریز حاکم سے جن جاگیرداروں نے خان بہادر رائے بہادر کے خطاب لیے اور جاگیریں ہتھیا ئیں انہوں نے انگریز افسروں کو بھی ڈالیوں اور صدقے خیرات کے نام پر رشوت دے کر گمراہ کر لیا تھا۔ بعد میں تو یہ ایک معاشرتی بیماری بن گئی۔

جن دنوں میں صدر سکندر مرزا کا سیکرٹری تھا۔ اپنی شادی کے موقع پر جو دعوت نامے چھپوائے ان کے ساتھ ایک چٹھی چھپوائی۔

NO PRESENTS ARE ACCEPTED OR EXPECTED.

یہ چٹ میں نے ان تمام صاحبان کو بھیجی جنہیں میں نے شادی کی رسم میں شرکت کا دعوت نامہ دیا تھا مجھے معلوم تھا کہ لوگ شادی بیاہ کے بہانے تحفوں کے نام پر قیمتی اشیاء دے جاتے ہیں جن جن افسروں کو میرا دعوت نامہ ملا سب نے مجھے کہا کہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی گفٹ لے لینا کوئی رشوت نہیں اور نہ ہی کوئی برائی ہے مگر میں نے سختی سے تمام احباب کو منع کر دیا کہ میں اس موقع پر کوئی تحفہ قبول نہ کروں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میرا رویہ دیکھ کر کسی کو تحفہ ساتھ لانے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ البتہ سکندر مرزا کی بیوی نے میری بیوی کو طوائف کا نئے تحفہ میں دیے کیونکہ میں نے ان کے نام نہ کوئی دعوت نامہ بھیجا تھا اور نہ ہی ساتھ چٹ روانہ کی تھی صدر کو میں نے دعوت زبانی دی تھی ورنہ ممکن ہے ان کی بیگم بھی تحفہ کا حوصلہ نہ کرتیں۔

میں جن دنوں کی بات کر رہا تھا سرکاری ملازمین کو بلا در بفع اراضی الاٹ کی جا رہی تھی۔ مرکز میں یہ کام ایوب خاں کر رہے تھے تو مغربی پاکستان میں نواب کالا باغ افسروں کو زمینداروں کی صف میں لا رہے تھے نواب کالا باغ نے مجھے بھی ایک بار فون کیا کہ تم کس علاقے میں اراضی لینا پسند کرو گے لیکن میں نے انکار کر دیا صدر پاکستان کا معتمد ہونے کی وجہ سے اراضی کی الاٹمنٹ کے احکامات چونکہ میرے ہاتھ سے نکلتے تھے لہذا مجھے تمام ایسے افسروں کے ناموں کا پتہ تھا۔

ایک بار اسمبلی میں سوال پوچھ لیا گیا کہ کن کن افسروں کو کہاں کہاں سرکاری اراضی الاٹ ہوئی ہے تو میں نے جو فہرست تیار کی وہ کافی طویل تھی۔ ایوب خاں اکثر مجھے کہتے رہتے تھے کہ تم بھی اراضی حاصل کر لو مگر میرے مسلسل انکار پر ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا شہاب تم عجیب شخص ہو کیا تمہیں زمین کی ضرورت نہیں ہے میں نے کہانی الحال تو نہیں البتہ قبر کے لیے دو گز زمین کی ضرورت ہوگی وہ مل جائے گی۔

ایوب خاں کو روپے پیسے سے بڑا پیار تھا۔ پریذیڈنٹ سٹاف میں تنخواہ ہٹ رہی تھی، انہوں نے مجھے بلایا اور ہدایت کی کہ گوہر ایوب کی تنخواہ سے ایک سو روپے کاٹ کر مجھے لا دینا۔ اس نے یہ رقم مجھ سے ادھار لی تھی اور ابھی تک واپس نہیں لوٹائی۔ گوہر ان دنوں ان کا اے ڈی سی تھا۔ چنانچہ اکاؤنٹ افسر نے میری ہدایت پر گوہر ایوب کو تنخواہ میں روپے کم دیے تو وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ آپ نے میری تنخواہ سے سو روپے کاٹنے کو کہا تھا؟ میں نے اس سے

پوچھا تم نے صدر صاحب سے کبھی سو روپے ادھار لیے تھے کہنے لگے ہاں لیے تھے، پر صاحب یہ معاملہ تو باپ بیٹے کا ہے مگر میں نے صدر صاحب کے حکم پر تمہاری تمخواہ سے سو روپے کاٹ لینے کی ہدایت کی تھی۔

سردار بہادر خاں کی تو ایوب خاں سے ناراضگی اس واسطے تھی کہ اس نے ان کی چند کنال اراضی ہتھیالی تھی مگر صدر ایوب کی والدہ کی ان سے ناراضگی کی کئی اور وجوہات تھیں وہ چھٹی کے روز اتوار کو عموماً اپنے گاؤں ہریانہ اپنی والدہ سے ملنے جاتے تھے اس دفعہ نہیں ان کے ہمراہ تھا وہ اپنی والدہ سے ملنے مکان کے اندر گئے تو اٹنے پاؤں واپس آ گئے۔ میں نے غلٹ میں واپس آنے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ والدہ ناراض ہیں اور ان سے ملنا نہیں چاہتیں۔ بعد میں مجھے ان کے ملازم نے بتایا کہ والدہ کی صدر سے ناراض ہونے کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ایوب خاں کے بیٹے سرکاری گاڑیاں لے کر گاؤں آ جاتے ہیں اور ریش (RASH) ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے کسی جاندار کی جان ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو سرکاری گاڑیاں کیوں دے دیتا ہے۔ آئندہ اگر وہ گاؤں آئیں تو گاڑی کے ساتھ ڈرائیور بھی لایا کریں جو احتیاط سے گاڑی چلائیں۔

ناراضگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ایوب خاں نے ہر جگہ کالج کھول دیے ہیں اور بی اے پاس لڑکے ملازمت کے بغیر آوارہ پھرتے ہیں اگر وہ ان کی ملازمت کا بندوبست نہیں کر سکتا تو کالج کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ علاقہ کا پٹواری بڑی لٹناں سے پہلے پیپاس روپے فصلانہ لیتا تھا اور اب یہ کہہ کر سو روپے لے لیتا ہے کہ تیرا بیٹا صدر ہے لہذا اس کی رشوت کا ریٹ بھی دو گنا ہو گیا ہے۔

ایوب خاں اور نواب کالا باغ دونوں کو اعلیٰ منتظم ہونے کا دعویٰ تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ پٹواری کی رشوت بند کرانے کا بندوبست ان سے بھی نہ ہو سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ پیر علی محمد راشدی نے خط لکھ کر ایوب خاں کو سمجھایا کہ پاکستان کے عوام جمہوریت کے قابل نہیں بلکہ بادشاہت پسند ہیں آپ کی مروانہ و جاہت، رنگ و خُسن اس قابل ہے کہ آپ پاکستان کے بادشاہ بن جائیں۔ مگر ایوب خاں مائے نہیں اور انہیں انٹی سیدھی پڑھاتے رہتے تھے۔

ایوب خاں کے مشیروں میں کچھ اصلی اور کچھ نقلی روحانی پیشوا بھی تھے جو دینی معاملات میں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے تھے۔ ایک صاحب نے تو ایوب خاں کے پیر ہونے کی حیثیت میں شہرت حاصل کر لی تھی یہ صاحب کئی کئی دن صدر کے پرسنل سٹاف کے تعاقب میں رہتے کہ انہیں صدر سے ملاقات کا کچھ وقت لے دیں۔ صدر سے ان کی ملاقات ہونے پر سٹاف پر سٹاف کا رنگ کر لے جاتے کہ انہیں ان کے گھر تک چھوڑ دیا جائے کیونکہ ان کے پاس سواری نہیں اور اس طرح وہ اپنے مریدوں میں یہ تاثر چھوڑتے کہ صدر نے باکمال عقیدت مندی سے اپنی سرکاری گاڑی میں گھر پہنچا آنے کا حکم دیا ہے۔

ایک اور صاحب فن کے علمی تبحر کا ملک میں بڑا چرچا تھا۔ ایک روز صدر سے ملنے آئے اور ان سے کہا کہ اگر وہ انہیں ایک کروڑ روپے دے دیں تو وہ اس سیاسی جماعت کو ملک میں بالکل ختم کر دیں گے۔ جس جماعت سے ایوب خاں ارباب تھے اس طویل ملاقات میں ان صاحب نے ایوب خاں کو اپنے منصوبے کے چیدہ چیدہ نکات سے آگاہ کیا اور بحث و چھیڑ کے بعد ایوب خاں یہ رقم قسطوں میں دینے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن جب بعد میں ان صاحب سے میں نے

ہات کی تو ایک کروڑ کا منصوبہ ہزاروں تک آ گیا۔ انہوں نے سیاسی جماعت کو تو کیا قسم کھاتا تھا کہ وہ ذاتی فتنے نہ مت کے طور پر تھوڑی بہت رقم لے جاتے رہتے۔

ایوب خان نے نہ تو بی ڈی مسلم کیوں مسلم کے مطالعہ سے لیا اور نہ ہی اسے کسی نے بنیادی جمہوریت کے نظام کا مشورہ دیا تھا۔ یہ ان کی ذاتی سوچ تھی اور دراصل وہ پنجابی نظام سے بہت متاثر تھے اور اس نظام کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بنیادی جمہوریت کا ڈھانچہ تیار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ایک ہزار آدمی اپنا ایک نمائندہ بنائیں اور ان ہی نمائندوں کی کونسلوں کو عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے میرے خیال میں اگر وہ ان نمائندوں کو صدر کے انتخاب میں رائے دہندگان کے طور پر استعمال نہ کرتے اور انہیں خالصتاً بنیادی سطح پر مفاد عامہ میں کام کرنے دیا جاتا اور ان کا محاسبہ بھی کڑا رہتا تو یہ لوگ بہت بہتر نتائج دے سکتے تھے۔ دراصل انہیں جب یہ باور کرا دیا گیا کہ وہ صدر کا الیکٹورل کالج ہیں تو پھر سیاسی مفاد میں ان کا کڑا محاسبہ ممکن نہ رہا۔

مارشل لا کو نافذ ہوئے تین ماہ ہوئے تھے ایوب خاں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کی حیثیت سے ہر تقریب میں کرسی صدارت پر براجمان ہونے کو اپنا حق سمجھتے تھے اس روز جب وہ رائٹرز گلڈ کے کنونشن میں آئے تو لمبے لمبے ڈگ بھرتے سٹیج کی جانب بڑھے۔ جمیل الدین عالی نے ان کا راستہ روکا اور قراۃ العین حیدر نے ان کے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر کھینچا اور پھر سمجھا سمجھا کر پہلی قطار کی ایک کرسی پر انہیں بٹھا دیا۔ ڈاکٹر عبدالحق اجلاس کی صدارت کر رہے تھے میں گلڈ کا پہلا سیکرٹری جنرل منتخب ہونے کی حیثیت سے ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جمیل الدین عالی سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میری اس وقت عجیب کیفیت تھی میرا باس میرے سامنے حاضرین کی قطار میں بیٹھا تھا اور میں سٹیج پر اونچی کرسی پر جہاں بیٹھا تھا یہ ہم سب کی مجبوری تھی کہ ہم روایت کو توڑنا چاہتے تھے اس وقت تک یہ رواج بھی نہیں پڑا تھا کہ صدر جلسہ کے ساتھ ایک مہمان خصوصی کو بھی مدعو کیا جائے ورنہ شاید۔ ایوب خاں کو سٹیج پر بٹھانے کی گنجائش نکل آتی۔ یہ اس رائٹرز گلڈ کے قیام کی ابتداء ہے جس کے بارے میں بعد میں یہ الزام لگا کہ گلڈ ایوب حکومت کو ادیبوں، شاعروں کی طرف سے سپورٹ دینے کے لیے بنایا گیا تھا ہم نے تو محض روایت کے احترام میں انہیں سٹیج پر کرسی بھی نہ دی تھی ان کی سپورٹ کیا کرتے۔

میں نے "ادیب اور آزادی" اظہار رائے پر اپنا مقالہ دانستہ انگریزی میں پڑھا تا کہ ایوب خاں کو سمجھنے میں وقت نہ ہو۔ مقالے میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ جو حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ادیبوں کے جسموں کو قید کر کے ان کے خیالات بھی قید کر لیتے ہیں وہ دراصل احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ اجلاس میں دوسرے ادیبوں نے بھی کم و بیش ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ جب ایوب خاں کو تقریر کی دعوت دی گئی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ان کے پاس لکھی ہوئی تقریر نہ تھی آخر کار انہیں فی البدیہہ تقریر کرنا پڑی وہ مختصر اتنا کہہ کر سٹیج سے اتر گئے کہ مارشل لا کا زمانہ ہے آپ ملک کو نقصان پہنچا رہے بغیر آزادی سے اپنا تخلیقی کام جاری رکھیں۔ گلڈ کے قیام کو دو چار ہفتے ہی ہوئے تھے کہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر سے صدر ایوب خاں کے پاس ریگولیشن کا مسودہ دستخط ہونے کے لیے آ گیا اس ریگولیشن میں کہا گیا تھا کہ آئندہ جو کتاب چھپے گی اسے چھپنے سے پہلے سرکاری سنسر کمیٹی سے اس کے مسودہ کی منظوری حاصل کرنا ہوگی۔ جب ریگولیشن کا مسودہ میں نے دستخط کرنے کے لیے ایوب خاں کے سامنے پیش کیا تو

انہوں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں ایک اور موقع پر نواب کالا باغ کی حکومت نے عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" پر انہیں گرفتار کرنا چاہا تو ایسا محض وہ اس لیے نہ کر سکی کہ رائٹرز گلڈ نے ناول پر آدم جی پرائز دے دیا تھا۔ پولیس اور ہوم ڈیپارٹمنٹ نے نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کو "اداس نسلیں" ضبط کر کے عبداللہ حسین پر فاشی کے الزام میں مقدمہ چلانے کی سفارش کی تھی نواب صاحب نے اس ضمن میں مجھے فون کیا کہ ایوب خاں نے "اداس نسلیں" کو ایوارڈ دے دیا ہے ہم اس پر مقدمہ کیسے چلائیں۔ یہ کتاب نہیں کنجر خانہ ہے بعد میں نواب صاحب نے ایوب خاں کو میرے خلاف اس بارے میں ایک خط لکھا۔ جسے ایوب خاں نے پڑھ کر پھاڑ دیا اور میرے ساتھ اس کے متعلق بات تک نہ کی۔

ایوب خاں کو آرٹ لٹریچر وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وہ سیدھا سادا سپاہی تھا ایک بار ڈاکٹر عبدالحق کی میں نے ایوب خاں سے ملاقات کرائی میں چاہتا تھا کہ بابائے اردو انجمن ترقی اردو کے دوبارہ صدر ہو جائیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا تعارف بابائے اردو کہہ کر کرایا تو بعد میں ملاقات کے دوران ساری گفتگو میں وہ انہیں بابا، بابا کہتے رہے اور اس کے ساتھ اردو کہنا بھول گئے۔ بہر حال اس ملاقات کے نتیجے میں بابائے اردو انجمن کے دوبارہ صدر بن گئے۔

رائٹرز گلڈ بعض اپنے بیمار ادیب ارکان کے علاج و معالجہ کے سلسلے میں مدد کرتی رہتی تھی۔ کئی مرحوم ادیبوں کے اہلیخانہ کی حکومت کی طرف سے میں نے مالی امداد بھی کرائی لیکن ایک معاملہ میرے سامنے ایسا بھی آیا جس نے مجھے کئی ماہ پریشان رکھا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان صاحب کی کیسے مدد کروں ان صاحب کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور انہیں اپنی محبوبہ کے قتل کے جرم میں عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ اس سزا کے خلاف وہ تمام عدالتی مراحل سے اپیلیں کر کے تھک ہار چکے تھے مگر کسی بھی مرحلہ پر بڑی عدالت نے ان کی موت کی سزا کو عمر قید میں نہیں بدلا تھا۔ اب رحم کی اپیل صدر پاکستان کے پاس آ چکی تھی۔ اس کا بوڑھا باپ میرے پاس آیا اور زار و قطار رونے لگا کہ کسی طرح میں اس کے بیٹے کی زندگی بچا لوں۔ میں نے کیس کا جائزہ لیا تو اس میں معافی کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ کیس بڑا واضح تھا شاید اسی وجہ سے ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ نے بھی اپیلیں مسترد کر دی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی موت کی سزا کسی طرح ختم ہو جائے لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ادھر رحم کی اپیل کے بارے میں سرکاری طور پر بار بار ریما سنڈر آ رہے تھے لیکن میں کئی طرح کے حیلے بہانوں سے ریما سنڈروں کا جواب دے کر معاملے کو کھٹائی میں ڈالتا رہا۔

ایوب خاں کے مارشل لاء کی پہلی سالگرہ قریب آ رہی تھی اور میں اس ٹوہ میں تھا کہ کسی طرح صدر پاکستان اس موقع پر قیدیوں کی سزاؤں میں تخفیف کر دیں تو اسی بہانے اس بوڑھے شخص کے بیٹے کی زندگی بھی بچ جائے جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا سالگرہ سے چند روز پہلے ایوب خاں نے مجھے بلا کر پوچھا کہ ایسے موقع پر کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ مناسب ہوگا کہ آپ کچھ قیدیوں کی سزاؤں کی مدت میں تخفیف کر دیں اور کچھ کی موت کی سزا عمر قید میں بدل دیں۔ صدر نے میرے مشورے کو قبول کر لیا اور میں نے اسی بہانے اس شخص کی رحم کی اپیل پر ان سے موت کی سزا معاف کرتے ہوئے عمر قید کی سزا کے آرڈر پر دستخط کروائے۔ میں نے اس ادیب کی جان بچانے کے لیے قانون کی خلاف ورزی تو نہ

کی البتہ تھوڑی سی بے ضابطگی ضرور کی..... اور اس طرح وہ تختہ دار سے بچ گیا۔ شاید اسی امید پر کہ وہ ایک روز جیل کی سلاخوں سے قید کی مدت پوری کر کے باہر آزاد دنیا میں ضرور جائے گا وہ اپنے اس یقین کے سہارے کال کوٹھڑی میں تخلیقی کام میں جتا رہا اور جب وہ رہا ہوا تو نو دس کتابوں کا مصنف بن چکا تھا۔

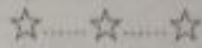
رائٹر گلڈ کے دستور میں ہم نے کسی بھی غیر ملک سے مالی امداد نہ لینے کی شرط رکھی ہوئی تھی۔ امریکی سفارتخانے کو گمان تھا کہ ان کی مدد کے بغیر پاکستان میں کوئی ادارہ نہیں چل سکتا جب کافی عرصہ گزرنے کے باوجود گلڈ زندہ رہا اور اس نے سفارتخانے سے مالی مدد کی درخواست بھی نہ کی تو سفارتخانے کے عملہ کہ شہ ہوا کہ شاید ہم روس سے مالی امداد لے رہے ہیں۔ ادھر روس کے سفارتخانے والوں کو گمان تھا کہ ہم امریکی سفارت خانے کی جھولی میں ہیں دراصل ہم نہ روس کی جھولی میں تھے اور نہ امریکہ کی، ہم تو پاکستانی تھے اور ہمیں پاکستان کی جھولی میں ہی رہنا تھا لہذا ہم اپنی ہی جھولی میں رہے اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ میں نے گلڈ کے قیام کی ابتداء میں ہی لاہور اور کراچی میں اس کے نام جائیداد کی الاٹمنٹ کا بندوبست کروا دیا تھا تاکہ آگے چل کر گلڈ مالی معاملات میں خود کفیل ہو جائے۔

سنو پلا مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے بقیہ پاکستان کی عمان اقتدار سنبھالی تو لندن میں سفارت خانے کی معرفت مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں ان دنوں وہاں جلاوطنی کے دن پورے کر رہا تھا وہ مجھے چند حکومتی ذمہ داریاں سونپنا چاہتے تھے مگر مجھے اس میں قدرے توقف تھا۔ میں اس شش و پنج میں تھا کہ آیا مجھے دوبارہ پہلے جیسے ملازمتی معمولات کو اختیار کر لینا چاہیے؟ یحییٰ خاں نے بڑی رد و کد کے بعد میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے ریٹائرمنٹ دے دی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے عزائم کے بارے میں کچھ علم نہ تھا آیا وہ محض اقتدار سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے یا بقیہ پاکستان کے استحکام کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام تھا۔ ان کے بارے میں اپنے ان شبہات کا اظہار میں نے لندن سے شائع ہونے والے ایک اردو ہفت روزہ میں ایک مضمون لکھ کر بھی کیا تھا میں نے اپنے اس مضمون میں ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کے پاس بہت بڑی لائبریری ہے جس میں بے شمار کتب ہیں مجھے اس کا بھی علم ہے کہ انہیں مطالعہ کا شوق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اپنے علم و دانش سے قوم کی ترقی کی راہوں کو روشن بھی کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں، میرے مضمون کی کاپی سرکاری ذرائع نے فراہم کر دی تھی۔ ان کا اصرار اس کے باوجود بڑھتا گیا اور آخر کار سفارتخانے کے ایک افسر نے ایک روز مجھے وطن واپسی کے لیے پی آئی اے کا ٹکٹ لا کر دے دیا۔ عفت اور ثاقب کو وہیں چھوڑ کر میں پاکستان چلا آیا عفت تو بعد میں وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ وہ وہیں پر دفن ہے جب وہ بیمار ہوئی اور اس کے گردوں میں نقص پڑا تو ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اس کا فوری آپریشن کرا لیا جائے لیکن میرے پاس اخراجات کے لیے پیسہ نہ تھا۔ میں نے یحییٰ خاں کو خط لکھا کہ میرا استعفیٰ قبول کر کے مجھے پراویڈنٹ فنڈ اور گریجویٹ وغیرہ کی رقم دے دی جائے تاکہ میں اپنی بیوی کا علاج کروا سکوں۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہ دیا گیا اور عفت بلڈ یوریا کی مستقل مریضہ ہو کر رہ گئی۔ بعد میں جتنے دن بھی عفت زندہ رہی مشین کے سہارے پر زندہ رہی۔ مشین کے ذریعے اس کا خون صاف کیا جاتا اور وہ زندگی کے چند سانس اور لے لیتی۔

لندن میں تین سال کی جلاوطنی میں اذیتیں اٹھانا پڑیں شاید اس کے اعصاب نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال

دیے تھے۔ تاہم اس وقت چھوٹا تھا۔ راحت اور تکلیف کے درمیان جو معمولی فرق ہوتا ہے اسے اس کا شعور و ادراک نہ تھا۔ اس لیے وہ سب کچھ برداشت کر گیا۔ عفت ان دنوں اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ بیماری مجھے موت کی گود ڈال کر ہٹے گی۔ مرنا تو ہے ہی پر میرا جی چاہتا ہے کہ موت تب آئے جب تاہم اٹھارہ سال کا ہو جائے۔ اسے خدمت کے لیے میری کمی محسوس نہ ہوگی اور وہ اپنے کام خود کر لیا کرے گا۔“ پر ایسا نہیں ہوا۔ موت نے نہ عفت کو معصوم خواہشوں کا لحاظ کیا اور نہ میری کوششیں ہی کام آئیں۔

اور..... میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ بعض اوقات ہماری معصوم خطائیں ہمیں اتنے اندھیروں میں تنہا کیوں چھوڑ جاتی ہیں۔ یحییٰ خاں سے میں نے کیبنٹ مینٹگ میں صرف اتنا ہی تو پوچھا تھا کہ ”مسٹر جنرل کیا ملک میں صفائی کا نظام اتنا خراب ہو گیا ہے کہ آپ کو گلیوں نالیوں کی صفائی کے لیے ملک میں مارشل لاء لگانا پڑا“ لیکن اس نے مجھے سزا کتنی بڑی دی۔



ایک صبح میں کراچی پہنچا۔ ذوالفقار علی بھٹو وہاں پہلے سے موجود تھے رات کو میری ان سے ملاقات ہوئی اس وقت ان کے چند رسمی رفقاء جو کابینہ کے ارکان بھی تھے ان کے گرد جمع تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ میرے معمولات اٹھانے پر اظہارِ افسوس کیا۔ پھر کہنے لگے تمہارا اندازہ درست نکلا۔ یحییٰ خاں نے ملک توڑ دیا ہمیں یہ سب کچھ بھلا کر اب بقیہ پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے لیے کام کرنا چاہیے میری خواہش ہے کہ آپ وزارت کا منصب لے لیں۔ یہ وزارت ٹیکنیکی و سائنسی امور سے متعلق ہوگی۔ اس کی گنجائش رکھتے وقت میرے ذہن میں آپ کا نام تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ عوام کا منتخب نمائندہ نہیں ہوں۔ پھر میرا سیاست میں حصہ لینے کا بھی ارادہ نہیں اس لیے وزارتی منصب سنبھالنا مناسب نہ ہوگا وہ مسلسل اصرار کرتے رہے کہ یہ ٹیکنیکی وزارت ہوگی اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا میں اس بارے میں ایک اخباری بیان میں اس کی پہلے وضاحت کر چکا ہوں اور میں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کا وزیر بھی ٹیکنیکل آدمی ہوگا معاملات کو سمجھنے اور چلانے والا۔

جب میں نے اس بارے میں حتمی انکار کر دیا تو انہوں نے کہا کہ میرا حکومت سے بہر حال کسی نہ کسی طرح تعلق قائم ہونا چاہیے میں نے ان کے سامنے تجویز رکھی کہ آپ مجھے سیکرٹری تعلیم کی ذمہ داریاں دے دیں اس کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت میرے ساتھ تین سال کا معاہدہ کر لے اس دوران میں اگر حکومت کو میرے کسی فعل پر شکایت پیدا ہو تو مجھے اٹھارہ دن کے نوٹس پر ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور ایسی ہی صورت میں اگر مجھے اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی وقت پیش آئے گی تو میں اتنے ہی دنوں کے نوٹس پر ملازمت سے الگ ہو جاؤں گا۔

اس وقت کے صدر مجھ سے کہتے رہے کہ سیکرٹری وزارت تعلیم کا منصب میرے جیسے شخص کے لیے بہت چھوٹا ہے ان کا ایک ارادہ یہ بھی تھا کہ اگر میں نے بطور سیکرٹری ہی کام کرنا ہے تو وہ میری ملازمت کو بحال کر دیتے ہیں اور مجھے سیکرٹری جنرل بنا کر وزارت تعلیم اور انفارمیشن کو ضم کر کے میرے حوالے کر دیتے ہیں لیکن میں نے جتنا مانگا تھا اتنے پر ہی

اصرار کیا اور تین سال کے معاہدہ ملازمت پر سیکرٹری وزارت تعلیمات پاکستان کا چارج سنبھال لیا۔ مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام نے پاکستان کے لیے گہمیر مسائل پیدا کر دیے تھے ایک طرف پاکستان نے نوے ہزار فوجی اور سول افراد بھارت کی قید میں تھے اور دوسری طرف ملک معاشی بحران کا شکار تھا ذوالفقار علی بھٹو کا خیال تھا کہ اسرائیل کے خفیہ مشن پر میری کامیابی اور عربی زبان کو یونیسکو میں بین الاقوامی حیثیت دلوانے کے باعث عرب ممالک کے ساتھ میرے روابط کی نوعیت خصوصی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے عرب ممالک سے مالی امداد کے لیے باہر بھیجے رہے۔ سابق وزیراعظم کے بارے میں مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ عوام کے منتخب نمائندہ ہونے کے باوجود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بنے ہوئے ہیں گو میرا ان کے اس اقدام سے براہ راست کوئی تعلق واسطہ نہ تھا لیکن یہ بات مجھے آخر تک کھٹکتی رہی۔

ایک روز انہوں نے مجھے بلوایا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے کہا کہ وہ 14 اگست کے موقع پر قومی اسمبلی سے خطاب کرنا چاہتے ہیں میں ان کی تقریر تیار کر دوں میں نے ان کی خواہش کے مطابق تقریر لکھ دی اور جب دوبارہ ان سے ملا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کسی بہانے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ نے مجھے عوامی نمائندہ ہونے کے باوجود مارشل لاء کی چھتری تلے حکومت کرنا ہی کیوں پسند کیا ہے تو ان کا جواب تھا کہ اس سے کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے ادھر مارشل لاء کا ایک ضابطہ نکالا اور ادھر کام ہو گیا اسمبلی میں پہلے بل لے جاؤ پھر اس پر ڈیبٹ ہو اور بعد میں اسمبلی اسے پاس کرے اور پھر وزارت قانون اسے قانونی شکل دے اس میں وقت صرف ہوتا ہے۔ ان دنوں وہ بھارت کے دورہ پر جا رہے تھے جہاں جنگی قیدیوں کی رہائی اور دیگر متنازع مسائل پر انہوں نے بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے مذاکرات کرنا تھے میں نے ان سے مشورہ کیا کہ آپ مارشل لاء اٹھالیں، کہیں مذاکرات سے پہلے یا ان کے دوران اندرا گاندھی انہیں نچا دکھانے کے لیے اس کے اٹھانی کا مطالبہ نہ کر دے یا وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں کسی مارشل لاء کے نمائندے سے مذاکرات کرنے کو تیار نہیں میری بات سن کر وہ ایک لمحے کے لیے سوچنے لگے اور پھر مجھ سے پوچھا کہ میں کہیں مارشل لاء اٹھانے کے بارے میں ان کی تقریر میں تو ذکر نہیں کیا میں نے کہا کہ نہیں، میں آپ کی اجازت کے بغیر ایسا کیسے لکھ سکتا ہوں؟

کہنے لگے ٹھیک ہے آپ اس بات کو اپنے تک ہی رکھیں میں تقریر کے بعد اس کا اعلان کر دوں گا چنانچہ انہوں نے بعد میں ایسے ہی کیا جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکے تو ارکان اسمبلی سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب میں آپ کے سامنے ایک اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں اور وہ اعلان مارشل لاء ختم کرنے کا تھا۔ اسی اعلان کی آڑ میں بعد میں انہوں نے عارضی آئین پر حزب اختلاف سے معاہدہ کیا اور وہ جب بھارت کے دورہ پر روانہ ہوئے تو حزب اختلاف سمیت ملک کے تمام طبقوں نے انہیں الوداع کہا اور پوری قوم کے غیر متنازعہ نمائندہ کی حیثیت سے انہوں نے مسز اندرا گاندھی سے کامیاب مذاکرات کیے اور دونوں ملکوں کے مابین معاہدہ شملہ طے پایا جس کے نتیجے میں پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی بھارت کی قید سے آزاد ہو کر وطن واپس آ گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کے ابتدا میں ہی ان کے جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم سے اختلافات پیدا

ہو گئے۔ سرکاری وغیرہ سرکاری سطح پر یہ تاثر عام تھا کہ وہ ان دونوں جرنیلوں کی مدد سے ہی برسرِ اقتدار آئے۔ گل حسن اور رحیم سے مسٹر بھٹو کے اختلافات کی نوعیت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اچانک انہوں نے ان دونوں سربراہانِ افواج کو ان کے مہدوں سے سبکدوش کیوں کر دیا ہے۔ دریں اثناء انہیں کہیں سے اطلاع ملی کہ پاکستان کے سابق سیکرٹری دفاع جنرل احمد نے جو میرے دوست بھی ہیں حیدر آباد کلب میں افسروں کو اپنی ملاقات میں یہ تاثر دیا ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں مسٹر بھٹو کا ہاتھ ہے وہ نذیر احمد کے اس رویے سے پریشان تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ نذیر احمد تک اپنا نقطہ نظر کس طرح پہنچائیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک رات پر پریڈنٹ ہاؤس میں بلایا اور کہنے لگے نذیر احمد آپ کے دوست ہیں وہ مجھ سے اس لیے ناراض ہیں کہ میں نے گل حسن اور رحیم کو سبکدوش کر دیا ہے چونکہ گل حسن نذیر احمد کا دوست ہے اس لیے وہ اپنے رنج کی بناء پر میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے قیام میں میں فریق نہ تھا حالانکہ مشرقی پاکستان محض یحییٰ خان کی مہماتوں کی وجہ سے الگ ہوا سابق صدر نے مجھے بتایا کہ گل حسن اور رحیم کو زخم تھا کہ وہ مجھے برسرِ اقتدار لائے ہیں اور میری حکومت ان کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی چنانچہ جب پہلے سرحد میں اور پھر پنجاب میں پولیس نے ہڑتال کر دی تو میں نے گل حسن کو کہا کہ وہ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے فوج استعمال کرے لیکن اس نے یہ کہہ کر میری بات رد کر دی کہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے میں فوج استعمال نہیں کر سکتا فوج پہلے ہی بدنام ہو چکی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ ان حالات میں مجھے گل حسن اور رحیم کو ان کے منصب سے الگ کرنا پڑا اور میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور تھا۔



قدرت اللہ شہاب

26 فروری 1917ء میں گلگت میں پیدا ہوئے۔

محمد عبداللہ جوعلی گڑھ یونیورسٹی کے اولین گریجویٹوں میں تھے۔

کریمہ بی بی

بابا اجیت سنگھ چھپاہری ہائی سکول میں میٹرک پاس کیا۔

میٹرک کے بعد آپ واپس آ گئے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں داخلہ لیا۔

ایف ایس سی کا امتحان 1935ء میں پاس کیا۔ اس کے بعد اسی کالج سے بی ایس سی کا امتحان

1937ء میں پاس کیا کالج میگزین اردو اور انگریزی حصوں کے ایڈیٹر رہے اس زمانے میں انگلستان

کی ایک علمی انجمن نے مضمون نویسی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ منعقد کیا تھا۔ شہاب صاحب نے بھی

85 صفحات کا مضمون بھیج دیا۔ کوئی 19 ہزار مضامین میں سے ان کا مضمون سب سے بہتر قرار دیا گیا

اور انہیں اول انعام ملا۔

بی ایس سی کے بعد انہوں نے سائنس چھوڑ کر گورنمنٹ کالج سے انگریزی ادب میں 1939ء میں ایم

اے کا امتحان پاس کیا۔

1941ء میں آئی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے انڈین سول سروس میں آئے انہیں اڑیسہ

میں تعینات کیا گیا۔ آزادی سے قبل آپ نے صوبہ بہار اڑیسہ اور مغربی بنگال میں سروس کی۔ بطور

اسسٹنٹ کمشنر ایس ڈی او اور ڈپٹی کمشنر کام کیا۔

خط بنگال کے دوران آپ نے ریلیف کا کام کرنے کی پیش کش قبول کی۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی دو برس آزاد کشمیر گورنمنٹ کی تنظیم کی اور اس کے سیکرٹری جنرل رہے۔

اس کے بعد وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سیکرٹری، جھنگ میں ڈپٹی کمشنر اور صوبہ پنجاب کے

ڈائریکٹر آف انڈسٹریز رہے۔ پھر 1954ء سے 1962ء تک گورنر جنرل غلام محمد، صدر سکندر مرزا

اور صدر ایوب خان کے سیکرٹری رہے۔ 1953ء میں ہیگ (ہالینڈ) میں قائم شدہ ایک ادارے

انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز سے پبلک ایڈمنسٹریشن کا ڈپلومہ لیا۔ وزارت اطلاعات و نشریات

کے سیکرٹری رہے۔ تین برس تک ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ 1966ء میں واپس آ کر

وزارت تعلیم میں سیکرٹری تعینات ہوئے۔ 1969ء میں یحییٰ خان کے مارشل لاء پر ملک سے باہر

پیدائش:

والد کا نام:

مادر کا نام:

ابتدائی تعلیم:

اعلیٰ تعلیم:

ملازمت:

تشریف لے گئے اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1973ء میں وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے واپس بلا کر دوبارہ وزارت تعلیم کا سیکرٹری بنا دیا۔

ادبی زندگی کا آغاز: بابا گورو نانک پر چند مضامین رسالہ چاند میں چھپے لیکن آپ کی پہلی کہانی جو کسی رسالہ میں چھپی۔ وہ چند راوی ہے یہ کہانی معروف شاعر اختر شیرانی کے ادبی رسالہ رومان میں چھپی۔

رائٹرز گلڈ 31 جنوری 1959ء کو معرض وجود میں آیا۔ پہلے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب مقرر ہوئے چنانچہ شہاب صاحب نے رائٹرز گلڈ کے حوالے سے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ انہوں نے ادیبوں کے ایوارڈز کے لیے تحقیقی کاموں کے لیے حکومت سے رقوم لیں اور مراعات دی گئیں۔

شہاب صاحب نے یونیسکو کی جانب سے اسرائیل کے دورے کے بعد وہ معرکتہ الاراء رپورٹ پیش کی جس میں فلسطین میں یہودیوں کے عزائم کو موثر طور پر بے نقاب کیا گیا فلسطینیوں کو کس طرح سماجی، ثقافتی اور مذہبی طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔

دیگر عہدے: صدر مرکزی اردو بورڈ لاہور

نائب صدر اردو سائنس بورڈ لاہور

صدر انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

(1) نفسیاء نے 1950ء میں پہلی مرتبہ مکتبہ جدید نے شائع کی۔

(2) ماں جی 1968ء میں پہلی مرتبہ لاہور اکیڈمی نے شائع کی۔

(3) یا خدا 1948ء میں پہلی مرتبہ لاہور اکیڈمی سے شائع ہوئی۔

(4) شہاب نامہ 1989ء میں سنگ میل کی جانب سے شائع ہوا۔

23 جولائی 1986ء میں اسلام آباد میں وفات پائی۔

وفات:

☆.....☆.....☆

کیا کھویا ہے؟ کیا سیکھا ہے؟

(انٹرویوز)

- انٹرویو: سجاد باقر رضوی۔ کشور ناہید۔ ذوالفقار احمد تابش۔ جیلانی کامران
- انٹرویو: الطاف حسن قریشی
- انٹرویو: طاہر مسعود
- انٹرویو: انعام الحق جاوید
- انٹرویو: سحر صدیقی
- شہاب صاحب سے مدبھیٹر انتظار حسین
- انٹرویو: تیموری۔ رضا عباس
- قدرت اللہ شہاب کی باتیں۔ فرزانہ نصرت
- تین سوال
- اردو کا مستقبل (مذاکرہ)
- تہذیب

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
 جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
 (فیض)

انٹرویو:

سجاد باقر رضوی، کشورناہید، جیلانی کامران، ذوالفقار احمد تابش

سجاد باقر رضوی: کس زمانے سے آپ نے سروس شروع کی؟

قدرت اللہ شہاب: آئی سی ایس میں آیا تھا 1941ء میں۔ مقابلہ کے امتحان کے بعد، تو

(PROBATIONARY PERIOD) کہا جاتا تھا، دہرہ دون میں ہمارا یہ پیریڈ ختم ہوا

تو وہاں نو یا دس مہینے گزارے تھے۔ وہاں سے میری تعیناتی بہار میں ضلع بھاگل پور میں ہوئی اور

جو رپورٹ مجھے PROBATION کے بعد دی گئی اسے میں نے کر بہار گیا۔ اس رپورٹ

میں (جو کہ انگریزی میں تھی، انگریز ہمارا سپروائزر تھا) لکھا تھا کہ.....

THIS IS THE WEAKEST NUT AND BOLTPOR

THE STEEL FRAME OF BRITISH EMPIRE AFTER THREE OR

FOUR YEARS, HE WILL BE LUCKY AND THE SERVICE WILL

BE UNLUCKY.

کشورناہید: تو آخری تجربہ بھی یہ ہے کہ سروس unlucky تھی.....!!؟ کہ آپ خوش قسمت تھے؟

قدرت اللہ شہاب: ہاں میں خوش قسمت تھا، پھر وہ لے کر میں چیف سیکرٹری کے پاس پٹنہ پہنچا۔ آفیسر بولے "تم نے

پرچی ہے یہ رپورٹ" میں نے کہا "جی ہاں"۔ بولے "پھر بھی تم آگئے جو ان کرنے!" میں نے

کہا۔ "جی ہاں! تو کہا" اچھا تم بھاگل پور چلے جاؤ" تو میں وہاں ASST.

COMMISSIONER کے طور پر رہا۔ آٹھ نومبر کے بعد اگست 42ء میں "انڈیا چھوڑ

دو" کی تحریک شروع ہو گئی تو اس تحریک کے دوران مجھے اپنا نوکری کا پہلا استعفیٰ دینے کا موقع

ہاتھ آ گیا۔ وہ چھوٹا سا واقعہ تھا۔

ہوا یہ کہ جب تحریک شروع ہوئی تو بھاگل پور کا ضلع بہت بُری طرح متاثر ہوا، ریلیں کاٹ دیں،

ریلوے لائنز، ٹیلی فون وغیرہ سب منتشر ہو گئے، ایک گاؤں میں تو کانگریسی جھوم نے ایک پولیس

کانسٹیبل کو مار دیا اور ایک یونین جیک میں لپیٹ کر اس کو F1 لٹا کر کے درخت سے لٹکا دیا۔ میری

ڈیوٹی لگی کہ میں وہاں جا کے کمپ لگاؤں اور قاتلوں کی نشاندہی کر کے انہیں پکڑ لاؤں۔ میں

وہاں چلا گیا، جو ہندوؤں کی اکثریت کے صوبے انگریز کے زمانے میں ہوتے تھے۔ وہاں

ماؤنٹین ملٹری پولیس مسلمانوں کی کہلاتی تھی جو مسلمان صوبوں کے ہنگامی حالات کی خاطر رکھی

جاتی تھی، یہ سرحد کے پٹھانوں کی ایک فورس تھی، جس کے دس بارہ آدمی مجھے دے دلائے تو میں نے ایک خیمہ وغیرہ لگا کے کام شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں چار انگریز افسر آ گئے۔ ان میں ایک کمشنر، ایک ڈی سی (کلکٹر) ایک ڈی آئی جی اور ایس پی ایک جیپ میں آئے اور ایک ٹینکر برما شیل کا ساتھ لائے اور میرے خیمے میں آ کے میری خواہش کے بغیر، مجھے نظر انداز کر کے بیٹھ گئے اور بحث کر کے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ اس گاؤں کو انسانوں سے خالی کر کے گھروں اور فصلوں کو پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جائے، تو میں نے انہیں کہا کہ میں بھی ایک افسر ہوں اور مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے کہا ”ہو اس بند کرو“ اور گالی دی تو میں نے کہا کہ اس انکوائری کا میں انچارج ہوں میں یہاں کا دورہ مکمل کر چکا ہوں تو یہ سن کر ایس پی نے مجھے اٹھ کر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ وہ شخص میرے ہی جتنا بڑا تھا۔ میں نے جواباً ایک تھپڑ اسے مارا۔ اس پر ڈی آئی جی اٹھا، اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ کیم و شیم آدمی تھا۔ اس نے مجھے ایسے ہوا میں اٹھا کے اور تک کر کے خیمے سے باہر پھینک دیا، پھر میرے ساتھ جو مسلمانوں کی پولیس (MMP) تھی اس کے انچارج دفعہ دار شیر خان سے ان لوگوں کا ارادہ ظاہر کیا کہ یہ ایسا کرنا چاہتے ہیں، یہ تمہارے بھی افسر ہیں۔ میرے بھی ہیں تو کیا کریں.....؟ اس نے کہا کہ انہیں روکنا چاہیے۔ درخواست کرنی چاہیے۔ میں نے کہا کہ انہوں نے تو مجھے مار پیٹ کے نکال دیا۔ اگر ضرورت پڑی تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ اس نے کہا ہاں! ہم آپ کے ساتھ ہیں، تو میں نے ایک آرڈر لکھ کر جو غلط تھا۔ اندران افسران کے پاس بھیجا کہ.....

"UNDER SECTION 144 YOU ARE RESTRAINED FROM COMING OUT FROM THIS TENT, UNTIL FURTHER ORDERS."

پہلے تو وہ ہنسے، بڑے قہقہے لگائے، گالیاں دیں مگر جب انہوں نے باہر منہ نکال کر دیکھا تو گھڑ سوار پولیس نے خیمے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پھر میں نے وہ ٹینکر خالی کروا کے بھجوا دیا اور ان کو کہا کہ آپ بھی جاپے تو پھر ایک دو ماہ کے بعد ہنگامے فرو ہو گئے..... اس زمانے میں ڈی سی ایس افسروں کو نوکری سے باہر (معطل) یا سبکدوش نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ سیکرٹری آف سٹیٹ کے تحت ہوتے تھے۔ وہی کچھ ایکشن لے سکتا تھا کوئی دو ماہ بعد مجھے گورنر کا دعوت نامہ ملا جس میں دوپہر کے کھانے پر بلایا گیا تھا۔ روایت یہی تھی کہ جب کسی افسر کو اشارنا یہ کہنا ہوتا تھا کہ استعفیٰ دے دو تو ایسے ہی بلایا کرتے تھے۔ میں نے ایک استعفیٰ لکھ کر جیب میں ڈالا اور چلا گیا۔ موڈی صاحب گورنر تھے جو یہاں پنجاب میں بھی رہے۔

ذوالفقار احمد تائبش:

ہاں وہ مشہور آدمی تھے۔

قدرت اللہ شہاب:

جب وہ کھانے کی میز پر تشریف لائے تو میں نے پوچھا:

"YOUR EXCELLENCY! DO YOU WANT IT BEFORE THE BREAKFAST OR AFTER FAST?"

WHAT DO I WANT BEFORE BREAKFAST OR

اور میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا:

NO, NO YOU HAVE DONE THE RIGHT, BUT IN THE WRONG WAY

اچھا جناب پاکستان بننے سے پہلے آپ نے کم از کم پانچ چھ سال انگریزوں کی سروس کی تو کیا اس زمانے میں یہ میٹنگز وغیرہ ہوا کرتی تھیں؟

جہاد باقر رضوی:

کوئی نہیں، مجھے ایک بھی میٹنگ یاد نہیں۔

قدرت اللہ شہاب:

تو کام کیسے ہوتا تھا.....

کشور ناہید

اپنا اپنا کام کرتے تھے اور گھر چلے جاتے تھے اور شام کو کلب میں اکٹھے ہو کر خوش گپیاں کر لیتے تھے، کھانی لیتے تھے، کھیل لیتے تھے۔ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے میں آپ کو اس کی ایک مثال دیتا ہوں..... بہار کے بعد میں بنگال گیا وہاں پر قحط، سیلاب اور سانیکلون سے بڑی تباہی آئی تھی۔ یہ سن 42-43ء کی بات ہے۔ وہاں ریلیف کاموں کے لیے میں گیا تو پھر مجھے اڑیسہ بھیجا گیا۔ وہاں پر چیف سیکرٹری بنگالی تھا، مکر جی.....

قدرت اللہ شہاب:

اڑیسہ میں؟

جہاد باقر رضوی:

جی! تو میں ہوم ڈیپارٹمنٹ کا ڈپٹی سیکرٹری تھا، وہ فائلیں جن پر گورنر کو ڈرافٹ وغیرہ جانا ہوتے تھے تو میں انہیں بنادیتا تھا..... وہ اس ڈرافٹ کا تقریباً ایک ایک لفظ بدل دیتا تھا اور دوبارہ ٹائپ کرا کے بھجواتا تھا..... اور میری فائل پر لکھ دیتا تھا کہ میں اس شاندار ڈرافٹ کے لئے، جو انہوں نے ہزار کیسی لینسی گورنر صاحب کے لیے جمع کروایا..... میں مسٹر شہاب کا بے حد مشکور ہوں۔ یہی روایت لے کر میں یہاں آیا تھا، جہاں تک مجھ سے ہوسکا میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ پاکستان بننے کے بعد میٹنگز کا سلسلہ چلا۔ غلام محمد، اس وقت کے وزیر خزانہ کے کمرے میں میٹنگ تھی، میں چلا گیا۔ تین چار اور بھی وزیر تھے وہاں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ یہ میٹنگ 16 اکتوبر 1947ء کو ہوئی..... اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو نئی نمائندگی اور دفتر بن رہے ہیں ان کے لیے سینٹری ویزز در آمد کرنا ہے۔ اس کے لیے ایک مارگٹ مخصوص کیا گیا۔ کچھ رقم مقرر ہوئی تو وہاں پر ایک ایجوکیشن منسٹر تھے۔ کئی اور وزیروں کے جوائنٹ منسٹر بھی تھے ایک وزیر سابق مشرقی پاکستان سے تھے تو انہوں نے کہا کہ اس میں سے ایک تھوڑا سا کوٹا ڈھا کہ کے لیے بھی رکھ لیں تو ایک وزیر نے کہا کہ یہ تو ڈھا کہ جائے گا اور کلکتہ سب مل ہو جائے گا۔ یہ تھا میٹنگز کا آغاز اور احوال، کہا گیا کہ اس کا کیا فائدہ؟ بنگالی وزیر نے کہا کہ بس علامتی طور پر ہی تھوڑا سا کوٹا آپ رکھ دیں۔

قدرت اللہ شہاب:

کشور ناہید:

اب آپ تھوڑا سا ”ادب“ کی طرف بھی آئیے۔ آپ نے 42ء میں ملازمت حاصل کی اور آپ نے لکھنا کب شروع کیا؟

قدرت اللہ شہاب: 38ء میں کالج کے زمانے میں، ہمیں گورنمنٹ کالج میں پڑھنا تھا تو میری واقفیت ہو گئی ایک ہندو لڑکی سے۔ چند راوی اس کا نام تھا۔ وہ ہمارے کالج میں نہیں پڑھتی تھی۔ وہ میٹھلیوں کا کالج میں

بی ٹی کر رہی تھی تو میں جموں کالج سے بی اے کر کے آیا تھا، وہاں پر اتفاق سے مجھے نین الاتواہی مضمون نگاری کا انعام مل گیا تھا جس کا کافی چرچا ہوا تھا۔ تو ہم دونوں پبلک لائبریری سے ایک ہی کتاب لینے کے امیدوار تھے لائبریری والوں نے وہ مجھے دے دی جب میں نے نام لکھوایا تو بڑی چمک کے بولی ”اچھا تو تمہی وہ تمہیں مار خاں ہو جس نے انعام جیتا تھا، تصویر تو بڑی اچھی چھپوائی تھی، دیکھنے میں تو کہہ مار سے نظر آتے ہو۔ پلیز مجھے یہ کتاب دے دو مجھے پرچہ تیار کرنا ہے میں نے کتاب بھی دے دی اور..... پھر وہ چند ماہ بعد بی ٹی سے مر گئی.....

آپ نے اس پہ اپنے ”شہاب نامہ“ میں ایک باب لکھا ہے، جمیلہ ہاشمی کے ہاں سنایا تھا آپ نے۔

قدرت اللہ شہاب: جب وہ مر گئی تو پھر میں نے پہلا افسانہ، اس کے بعد لکھا، اس کا نام تھا ”چند راوی“ اس کا پہلا فقرہ یہ تھا۔

”جب مجھے چند راوی سے محبت شروع ہوئی اسے مرے ہوئے تیسرا دن تھا۔“

تو میں نے اسے اختر شیرانی صاحب کو بھیج دیا اس وقت ”رومان“ رسالہ نکلتا تھا۔

اس کے ایڈیٹر تھے وہ۔ ذوالفقار احمد تابش:

قدرت اللہ شہاب: تو وہ مجھے خاص طور پر گورنمنٹ کالج میں ملنے آئے اور کہا کہ یہ افسانہ تو نہیں حقیقت ہے، بس پھر

چلے گئے اس افسانے کے چھپنے کے بعد پھر مجھے کئی خط آئے اس سے ہمت بڑھی اور تھوڑے

بہت افسانے لکھنے افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ ”ادبی دنیا“ میں زیادہ چھپے۔ میں مولانا

صلاح الدین کو اس حوالے سے اپنا استاد مانتا ہوں کہ وہ ہر افسانے کے متعلق اپنی طرف سے چار

پانچ سطروں کا تعارف تحریر فرما دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہی سطر میں ہماری ادبی متاع

تھیں۔ ان سے اگلا افسانہ لکھنے کی ہمت جو ان ہوتی تھی۔ پھر اسی زمانے میں میں نے باقاعدہ

لکھنا شروع کر دیا۔ 47ء کے ہزارے میں جب مہاجرین کا رش تھا مجھے ایک کرنل کی تلاش تھی

جو اپنی فیملی کے ساتھ مشرقی پنجاب سے آ رہا تھا۔ تو میں نے ایک مہینہ لگا کے جتنے مہاجر کمپ تھے

ان میں جگہ جگہ ڈھونڈا اس دوران میں نے مہاجرین کا ادھر کا اور ادھر کا حال سنا اور دیکھا۔ پھر

1948ء میں میں نے ایک دن میں صبح سے شام تک ”یا خدا“ لکھ دی ”یا خدا“ مختار شیریں کے

”نیا دور“ میں پہلی دفعہ چھپا اور پھر اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ انگریزوں کے زمانے میں

میں نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا ”دورنگا“ اس کی تقسیم یہ تھی کہ ایک ہندوستانی انجینئر تھا جو انگلستان

چلا گیا اور رنگ اس کا کالا تھا۔ وہاں شادی اس نے ایک میم سے کر لی۔ کلچر اس کا دوغلا سا ہو گیا

وطن واپس آیا تو میں نے یہ لکھا کہ یہ برص کی بیماری ہے، جو انگلستان کے دو چھینٹے بھی برداشت

نہیں کر سکی۔ کچھ اس کہانی میں طنز کا پہلو بھی آ گیا تھا۔ تو یہ ”ادبی دنیا“ یا ”عصمت“ میں چھپی۔

کسی نے چیف سیکرٹری کے پاس جا کے شکایت کر دی کہ یہ انٹی برٹش ہے۔

اس زمانے میں آپ اڑیسہ میں تھے؟

اڑیسہ میں نہیں تھا، بہار میں تھا۔ تو کہا گیا، یہ کہانی ایٹنی انکسٹش ہے کیونکہ اس میں علامت بنا کے ایک ہندوستانی اور انگریز کی شادی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس پر مجھے سرکاری طرف سے خط آیا۔ یہ گورنمنٹ سروسز روز نمبر 7 کے تحت تھا اور کہا گیا تھا کہ:

YOU ARE PERMITTED TO ENGAGE IN LITERARY PURSUITS
IF DOSE NOT INTERFERE WITH YOUR NORMAL DUTIES

اس کے علاوہ مجھ سے انہوں نے کوئی EXPLANATION بھی نہیں مانگا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کا نفس مضمون صحیح ہے یا غلط چیف سیکرٹری کا خط تھا:

IT HAS BEEN BROUGHT TO THE NOTICE OF THE GOVT,
THAT YOU ARE INTERESTED IN WRITING IN MAGAZINES
WE ARE ONLY CONCERNED WHETHER IT DOES OR DOES
NOT INTERFERE WITH YOUR NORMAL WORK

میں نے لکھ دیا کہ نہیں اس سے کوئی حرج نہیں ہوتا۔

میری پہلی طلہی 48ء میں ہوئی جب "یا خدا" کتابی صورت میں چھپا۔ تو اس پر ہوم منسٹری میں ایک فائل شروع ہوئی کہ اس کو بند کیا جائے جیسا کہ طریقہ ہوتا ہے۔ لائسنس روڈ کراچی کے تھانہ میں ایک کانڈ بھیجا گیا کہ اس ادیب کا پتہ لگاؤ، اس پبلشر کا پتہ لگاؤ۔

ایک روز مجھے سمن ملا کہ مسی قدرت اللہ شہاب فلاں تاریخ کو تھانہ لائسنس روڈ کراچی میں حاضر ہو جائے۔ میں آ گیا۔ بہت سے اور لوگ جو بلائے گئے تھے، بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک بیچ پر آ کے بیٹھ گیا، صبح سے ساڑھے تین بجے تک میں بیٹھا رہا۔ کسی کو ڈانٹ کسی کو گالی، کسی کو مار پیٹ کی آوازیں سنتا رہا۔ ساڑھے تین بجے مجھے آواز پڑی۔ مسی قدرت اللہ شہاب حاضر ہو! میں چلا گیا، تھانے دار بیٹھا تھا، بڑا مضبوط سا۔ کہا "کیا نام ہے تمہارا؟ والد کا نام؟ گھر؟" میں نے کہا "گھر تو ابھی کہیں نہیں"۔ اس نے کہا: "یہ کیا بکواس ہے"۔ میں نے کہا "گھر جموں میں تھا، وہاں سے سرکاری گھر اب کہیں بھی نہیں..... جہاں میں رہتا تھا، سرسٹ ہاؤس کہلاتا تھا کراچی میں۔ وہاں سے اب آزاد کشمیر میں چلا گیا"۔ "کیا کام کرتے ہو؟" میں نے اپنی سروس کا نام لیا۔ اس نے مجھے سیلوٹ مارا۔ اس نے کہا "جناب! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ صبح سے تشریف رکھے ہوئے ہیں اور اس نے کانڈ بھاڑ کر ایک نوکری میں ڈال دیا۔ میرے لیے چائے منگوائی اور گھر کے لیے سواری منگوا کر دی۔

پھر آپ نے لکھنا کم کر دیا بلکہ ختم ہی کر دیا، کیا یہ اس لیے کہ آپ نوکری میں ترقی کرنا چاہتے تھے اور ابھی.....

شاہد باقر رضوی:
قدرت اللہ شہاب:

کشور ناہید:

قدرت اللہ شہاب: میں نے لکھنا بند نہیں کیا، اس کے بعد بھی میں نے لکھا ہے۔

”سرخ فیتہ“ اور دوسری کئی چیزیں۔ سرخ فیتہ، ماہ نو میں چھپوایا تھا میں نے خوب شہاب الدین اس زمانے میں ہمارے وزیر تھے انہوں نے برا منایا۔ ماہ نو میں ایک اور بھی چیز چھپی ”اقبال کی فریاد“

ذوالفقار احمد تابش: اس میں شہاب صاحب جو کشور پوچھنا چاہ رہی ہیں اور تھوڑا سا لحاظ بھی آ گیا ہے..... کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے بہت کم لکھا۔ جتنی توقع آپ سے تھی کہ لکھیں گے اور جتنی چیزیں آپ نے لکھیں اور جتنی اچھی تھیں ان کے پیش نظر.....

قدرت اللہ شہاب: میں ایمانداری سے یہی سمجھتا ہوں کہ جتنی مجھ میں صلاحیت تھی لکھنے کی، اتنا میں نے لکھ لیا۔

کشور ناہید: وہ تو آپ نے اپنی جمع کردہ صلاحیت ’شہاب نامہ‘ کی صورت میں ظاہر کر دی، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص، وہ ادیب جو اندر موجود تھا، کبلا تا رہتا تھا، فریاد کرتا رہتا تھا لیکن آپ اسے خاموش رکھے رہے، جب تک آپ نوکری کے بندھنوں میں رہے اور جب تک ایک سے دوسری جگہ کرسی منتقل ہوتی رہی۔

قدرت اللہ شہاب: لیکن ایک اور وجہ بھی ہوئی جب ایوب خان کا مارشل لاء آ گیا تو میری ڈیوٹیز مختلف النوع کی ہو گئیں۔ تو پھر مجھے بلانے لگے کہ کالجوں کے کانوکیشنز میں خطاب کرو۔ کچھ اور ادارے جہاں ہمیشہ سیاست دان جاتے تھے، انہوں نے سیکرٹریز کو بلانا شروع کر دیا تھا۔ اب مجھے چونکہ ادب سے لگاؤ تھا تو انہوں نے کچھ زیادہ ہی بلایا تو میں خطیبانہ کام میں پڑ گیا۔ 1958ء سے لے کر 1962ء تک اسی کام میں مبتلا رہا۔

54ء میں مجھے بیٹھے بٹھائے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز لاہور بنا دیا گیا، جس وقت مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ انڈسٹریز کس چیز کا نام ہے میں ایک کورس کرنے باہر گیا ہوا تھا۔ کورس کر کے واپس آیا تو حکم ملا کہ ڈائریکٹر انڈسٹریز ہو جاؤ۔ میں فیروز خان نون کے پاس گیا جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھے اور کہا کہ مجھے اس کام کا بالکل علم نہیں تو براہ مہربانی مجھے آپ یہاں نہ لگائیں، کچھ اور لگادیں۔ تحصیل دار وغیرہ لگادیں۔ یہ کام مجھے نہیں آتا۔ نون صاحب نے کہا ”تم نے انڈسٹریز تھوڑا لگانی ہے۔ تم نے تو یہ کرنا ہے کہ ہندو جو انڈسٹری یہاں چھوڑ گئے ہیں پنجاب میں، اس کے لیے ایک بورڈ بنے گا اس کے تم ممبر ہو گے، اس کام میں بہت بدعنوانی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ شاید تم اس میں کرپشن نہ کرو، اس پر میں نے کہا ”میں اسے COMPLIMENT سمجھوں یا یہ میرے لیے چیٹنج ہے کہنے لگے ”دونوں ہیں۔“

پھر جو حال میں نے دیکھا وہ لکھا ہے (خیر وہ قصہ لمبا ہو جائے گا) مختصر آہم لاہور سے کراچی میٹنگ کرنے جایا کرتے تھے، درخواست دہندگان وہاں کے بھی تھے۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے معاشرے میں جو اس قدر کرپشن بڑھی ہے اس کی ایک وجہ یہ زمینوں، مکانوں کی الاٹمنٹ کا نظام تھا۔ اس زمانے میں جو میں نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا اور اس کا شہرہ بھی ہوا وہ منٹو کو برف کا

کارخانہ دلانے کا تھا۔

جو ان کو ملا نہیں تھا۔

کشور ناہید:

قدرت اللہ شہاب:

نہیں وہ ان کی بیوی کے نام لگایا تھا..... اس پر منٹو صاحب بڑے ناراض ہوئے تھے بلکہ مجھے مارنے کے لیے دوڑے تھے کہ میرے نام کیوں نہیں لگایا..... مگر میں نے جان بوجھ کر ان کی فیملی کے نام لگایا تھا۔

بیٹانی کا مران:

’یا خدا‘ کو پڑھتے ہوئے آپ کی جو انسانوں کے بارے میں دردمندی ہے، وہ بہت نمایاں ہوتی ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری ایک کلاسیک ہے اور ہمیں اس زمانے میں بڑی بڑی امیدیں پیدا ہوئیں (جب یہ کتاب لکھی گئی) اس وقت میں نے اسے پڑھا جب میں طالب علم تھا۔ نوکریوں میں پڑ کر آدمی اس دردمندی سے انسانوں کی پریشانی کا تعین نہیں کر سکتا، تو آپ اتنے اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ جب یہ سرکاری مشینری کے ذریعے دردمندی کا اظہار نہ ہوا..... اسی موضوع کو آپ کسی کہانی میں بعد ازاں بھی استعمال کر سکتے تھے یہ کیوں نہ ممکن ہوا۔

قدرت اللہ شہاب:

اصل میں ’یا خدا‘ جب کتابی شکل میں شائع ہوا تو مجھ پر اتنے جوتے پڑے کہ..... بس آپ اس زمانے کے ’ادب لطیف‘ کے پرچے دیکھیں، بارہ بارہ صفحات پر مشتمل مضمون اس کے خلاف چھپے۔

سجاد باقر رضوی:

قدرت اللہ شہاب:

میں نے بھی ایک آدھ پڑھے ہیں جن میں کرشن چندر سے موازنہ کیا گیا ہے۔ ان میں یہاں تک کہا گیا کہ اس کتاب میں تو ایک فقرہ بھی درست نہیں، یہ کٹر مسلمان کا لکھا ہوا ہو اس نامہ ہے اس سے دل شکنی سی ہوئی، جواب میں نے کسی کو نہیں دیا، میں نے کہا ”شاید یہ ٹھیک ہوں، مجھے لکھنا ہی نہ آتا ہو، لیکن کچھ لوگوں نے اسے پسند بھی کیا، بعد میں میں آزاد کشمیر چلا گیا..... وہاں نے نئے علاقے آزاد ہو رہے تھے۔ میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ لہذا پڑھنے لکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ محمود ہاشمی جو کہ ہمارا انفارمیشن آفیسر تھا اور یوسف کج ہم اکٹھے ہی ایک کچی سی کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ محمود ہاشمی نے اس زمانے میں ’کشمیر آؤ اس ہے‘ لکھا تھا۔ کیونکہ وہ فارغ تھا..... اسے صرف خبریں دینا ہوتی تھیں۔ مجھے ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی، کیونکہ وہاں تو آئے دن اقوام متحدہ کا وفد آتا تھا۔

میں اسی بھاگ دوڑ میں رہتا تھا۔ البتہ ٹیلیفون سسٹم آزاد کشمیر کا، پاکستان سے بہتر تھا، اس سے بھی بچت ہو جاتی تھی۔ ہم ابتدائی سطح پر تھے مگر ٹیلی فون کے بہترین نظام کے باعث ہمارا رابطہ رہتا تھا۔ اقوام متحدہ کے کمیشن نے آنا تھا، پہلے شیخ عبداللہ کی حکومت کو دیکھ کر پھر ہمارے انتظامات کو دیکھنا تھا، میں نے کہا کچھ کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس اس زمانے میں پولیس کی گیارہ نئی وردیاں تھیں، جب وہ کمیشن آیا تو وہ جو گیارہ پولیس کی وردیاں تھیں ان سے ہم بڑا کام لیتے تھے کمیشن آتا اسے گارڈ آف آؤر دیا جاتا..... پھر ہمارے پاس دو ایک اچھے آفیسرز تھے۔ وہ انہیں کھانے پینے اور دوسرے کاموں میں مصروف رکھتے۔ آدھ گھنٹے، گھنٹے میں جب وہ فارغ ہوتے تو اسی

دوران گیارہ وردیوں کو جیپ میں ڈال کر دوسرے شیشن پہنچا دیا جاتا۔ اس طرح نامصالحہ حالات کے باوجود بھرم رکھ لیتے۔

اور یہ کہ ہماری انتظامیہ جو ہے وہ نظر آئے۔

کشور ناہید:

قدرت اللہ شہاب: ہاں! صورت یہ تھی کہ جوڑ کے کام کرنے والے تھے ان کے پچھنے پرانے کپڑے تھے، محاذوں پر لڑتے تھے ان کے پاؤں میں بعض کے جوتے تک نہیں ہوتے تھے۔

جیلانی کامران: آپ کی ان خدمات کا تذکرہ تو کسی نے بھی نہیں کیا۔ مثلاً سردار ابراہیم نے اپنی کتاب لکھی اس میں بھی ذکر نہیں ہے پھر میجر جنرل اکبر خان کی کتاب (RAIDERS IN KASHMIR) میں بھی ذکر نہیں ہے، آزاد کشمیر کو آپ ایک 'انتظامی شخصیت' دینے والوں میں ہیں۔ یہ ذکر تو کوئی بھی نہیں کرتا۔

قدرت اللہ شہاب: یہ کوئی قابل ذکر بھی نہیں غالباً۔ مجھے یہی تسلی ہے کہ جب میں آزاد کشمیر جاتا ہوں تو وہاں کے لوگ مجھے جانتے ہیں اور میری خوش نصیبی ہے کہ بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل میں وہاں گیا تھا۔ جب اہل قلم کانفرنس ہوئی۔ انہوں نے خاص طور پر بلایا تھا مجھے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

جیلانی کامران: مجھے تو شہاب صاحب آزاد کشمیر جانے کا کئی بار موقع ملا ہے۔ وہاں کے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں حکومت بنی بنائی مل گئی۔ آپ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ جو بھی اس میں انتظامی سطح پر INVOLVE رہا اسے کتنی محنت کرنا پڑی ہوگی۔

قدرت اللہ شہاب: اب یہ ہم لکھ نہیں سکتے، ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس کمیشن کی رپورٹ اے آر سائنس نے دی جواب بھی اقوام متحدہ میں ہوگی۔ اس نے لکھا کہ شیخ عبداللہ کی انتظامیہ سے آزاد کشمیر کی انتظامیہ زیادہ مضبوط اور مستعد ہے۔

جیلانی کامران: خوب! کریڈٹ تو پھر آپ کو گیا۔

قدرت اللہ شہاب: ہمارے ساتھی ہی ایسے تھے۔

کشور ناہید: اچھا شہاب صاحب! آپ نے بتایا کہ 'یا خدا' لکھنے پر بہت یورش ہوئی اور ترقی پسندوں کی طرف سے لعن طعن ہوئی۔ لیکن دوسری طرف آپ نے منٹو کو برف کا کارخانہ دلانے کی کوشش کی اور ایسے کام کیے جن میں ہمدردیاں اور دوستیاں ہیں اور یہ سب کسی لالچ کے بغیر نظر آتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب: ہاں میں نے کسی لالچ کے بغیر کیا۔

کشور ناہید:

قدرت اللہ شہاب: لیکن بطور ادیب کے آپ کیا اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہے؟

میں بھی اس تحریک کے ساتھ رہا مگر اس کا ممبر نہیں تھا۔

کشور ناہید:

آپ سول سروس میں کیوں اور کیسے گئے۔

قدرت اللہ شہاب:

میرے اگر بس میں ہوتا تو میں سروس میں جاتا ہی نہ۔ صرف اس وجہ سے گیا کہ میرے والد کو موقع ملا جانے کا۔ مگر وہ نہ جاسکے۔ میرے والدین ان معدوے چند گریجویٹس میں سے تھے جو

کہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ سرسید نے انہیں آئی سی ایس کرنے کے لیے وٹیفیڈ دلوایا کہ انگلستان چلے جائیں مگر مہرہ کی دادی جو کہ پرانے خیال کی تھیں انہوں نے کہا سات سمندر پار نہیں جانا۔ اکیلا بیٹا تھا ان کا تو انہوں نے سرسید کو جا کے کہہ دیا کہ میں نہیں جا رہا۔ میں نے یہ سب اپنے والد سے سنا کہ سرسید نے اس کی وجہ دریافت کی اور پتہ چلا تو کہا تم اپنی جاہل بوڑھی ماں کو قوم پر ترجیح دیتے ہو؟ انہوں نے کہا ”ہاں“ پھر انہوں نے مارا نہیں.....

سرسید نے؟

جیلانی کا مران:

جی ہاں۔

قدرت اللہ شہاب:

کشور ناہید:

یہی جو جاہل بوڑھی ماں کا فقرہ سرسید کا ہے یہ آپ کے ہاں بازگشت ہوتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب:

ہاں بازگشت ہی ہوتا ہے۔

کشور ناہید:

جی ہاں ”ماں جی“ میں آپ کے ہاں بازگشت ہوا ہے۔

قدرت اللہ شہاب:

تو سرسید نے میرے والد کو کہا ”تم ایسی جگہ جا کے مرو کہ پھر تمہارا نام تک مجھے دکھائی نہ دے۔“

یہ سرسید نے کہا؟

جیلانی کا مران:

وہ اس زمانے کے بی اے پاس ہو کر بھی گلگت نوکری کرنے چلے گئے۔

قدرت اللہ شہاب:

گلگت تو بہت دور تھا۔ جی!

جیلانی کا مران:

ایک ہفتہ لگتا تھا پہنچنے میں، مانگوں میں جاتے تھے۔ راولپنڈی، سیالکوٹ یا جموں سے اور پھر سری نگر سے گلگت پہنچنے میں 19 دن لگے تھے۔ آزادی سے قبل وہاں ایک تو انگریز کی بالادستی تھی، انگریز کا پولیٹیکل ایجنٹ وہاں ہوتا اور ریاست کی طرف سے گورنر ہوتا تھا۔ اس طرح دو انتظامیہ تھیں میرے والد نے گورنر کے آفس میں خود کو میٹرک ظاہر کر کے اینگلو ورننگر کلرک کی نوکری اختیار کر لی۔

قدرت اللہ شہاب:

سرسید سے ڈر کے گئے تھے یا برگشتہ ہو کے۔

کشور ناہید:

جذبات ان کے ایسے تھے کہ.....

قدرت اللہ شہاب:

ایک طرح کا رد عمل کہہ سکتے ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش:

لیکن آہستہ آہستہ راز فاش ہو ہی جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب:

’ماں‘ لکھنے میں ایک اور بات بھی آپ کے ہاں نظر آتی ہے کہ جس موضوع نے یا جس جذبے نے آپ کو گرفت میں لیا، سرکاری نوکری اور تمام مصروفیتوں کے باوجود پھر اس جذبے نے آپ کو افسر سے رہائی دلا کے افسانہ نگار کے طور پر قید کیا اور آپ سے وہ چیز لکھوائی۔

کشور ناہید:

ہاں!..... تو وہ میں آئی سی ایس کی بات کر رہا تھا، اس میں آنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کشمیر میں ایجوکیشن لائن کو جوائن کرنا میرا آئیڈیل تھا۔ دس سال میرے والد نے نوکری کر لی۔ ہمارے شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس سے گہرے روابط تھے۔ میرے والد جلد ہی مہاراجا کی سروس سے ریٹائر ہو گئے تھے اور وہ مسلم کانفرنس کے آنریری سیکرٹری بن گئے تھے۔ اس طرح جوائنٹ

قدرت اللہ شہاب:

مسلم کا نفلس منعقد ہوئی۔ میرے والد ان دونوں کو تقریریں لکھ کر دیا کرتے تھے اور انگریزی میں مسلمان کے لیے جتنے کمیشن بننے ان کے لیے (MEMO RENDAM) جو انگریزی میں ہوتے تھے، وہ میرے والد مجھے (DICTATE) کروایا کرتے تھے، لیکن اس سے ہٹ کر ذہن کے کسی گوشے میں والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس افسر بنوں۔ یہ ان کا پسند تھا۔ شروع ہی سے مجھے کہتے تھے جب میں نے میٹرک پاس کیا تو انٹر کے لیے میں نے کہا کہ سائنس کے مضامین رکھ لیتا ہوں تو کہنے لگے۔ ”نہیں بیٹا سائنس میں مشکل یہ ہوگی کہ آئی سی ایس کے مقابلہ کے امتحان میں سائنس میں نمبر کم آتے ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا میں نے کہا نہیں مجھے سائنس کا شوق ہے تو کہنے لگے سائنس رکھ لو، میں نے پھر ایف ایس سی کر لی۔ اس میں میرے اچھے نمبر آ گئے۔ پھر میں نے بی ایس سی کر لی۔ اس میں بھی اچھے نمبر آ گئے۔ چند راوی کی موت کے بعد میرے اندر ایک خلا سا آ گیا تھا۔ پھر اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ میں نے والد کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے پہلے انگریزی کا ایم اے کر لیا پھر۔۔۔۔۔

ایک بات میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ آپ آلہ کار تھے۔ پی

پی ایل کے قبضہ کرنے میں آپ جیسے مزاج کے آدمیوں سے یہ توقع تو نہیں لیکن۔۔۔۔۔

دو تین چیزیں میرے ذمہ لگائی گئی ہیں جنہیں میں نے کبھی رد نہیں کیا اور قبول بھی نہیں کیا۔ ایک

یہ کہ پی پی ایل کے TAKE OVER میں میرا ہاتھ تھا۔ دوسرے یہ کہ پریس کے کالے قوانین

میں نے بنوائے اور تیسرے یہ کہ ایوب خان کے زمانے میں میں مختار گل تھا۔ تینوں باتیں صحیح

نہیں ہیں۔۔۔۔۔ اس کا تجزیہ کریں یا ریکارڈ نکلو کر تفتیش کر لیں۔ میرے بیان کو لگے ہاتھوں قبول

کرنا ضروری نہیں۔ آخر یہی ثابت ہوگا۔ ایسے کئی کام کرنے پڑے جہاں ایسے کام یا ایسی صورت

حال پیش آئی جنہیں ضمیر رد کرتا تھا وہاں استغفی دے دیا۔ چار دفعہ میں نے استغفی دیا۔

کشورناہید: ایک تو جب آپ آسام میں تھے۔

قدرت اللہ شہاب: وہ ضمیر کی بات نہیں تھی، وہ اصول کی بات تھی۔

کشورناہید: پھر دوسرا موقع؟

قدرت اللہ شہاب: دوسرا سکندر مرزا کے زمانے میں دیا۔

کشورناہید: وہ انا کا مسئلہ تھا یا اصول کا۔

قدرت اللہ شہاب: نہ انا کا مسئلہ تھا نہ اصول کا بلکہ بے ضمیری کا مسئلہ تھا۔ وہ سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کو لے

آئے، جو سکندر مرزا کے ذاتی دوست تھے۔ مرزا صاحب نے کہا کہ انہوں نے کبھی اچھی زندگی

نہیں دیکھی۔ انگریزوں کے ڈنڈے کھائے ہیں، جیلیں کائی ہیں۔۔۔۔۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہ

اچھی زندگی کا ذائقہ حاصل کر سکیں، میں انہیں سنٹرل منسٹر بنانا چاہتا ہوں۔

کشورناہید: یہ سکندر مرزا نے کہا؟

قدرت اللہ شہاب: ہاں! تو میں نے کہا کہ صاحب آپ اسے کرپٹ کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بڑا حیران ہوا اور کہا

DO I WANT TO CORRUPT HIM?

I WANT TO MAKE HIS LIFE EASY AND HAPPY

میں نے کہا نہیں صاحب! کہنے لگے ”وہ انڈیا کے ساتھ تھا اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اسے پاکستانی بنادوں تو اسے کرپٹ بنا رہا ہوں۔“

اس پر انہوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ہم دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ اس پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ اور دل میں سوچا کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں استعفیٰ دے دوں۔ تب میں نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ کوئی استعفیٰ دینے والی بات ہے؟ تم میرے بیٹوں جیسے ہو اور اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔

تیسرا موقع کب آیا؟

کشور ناہید:

جب ایوب خان نے پولیس کے کالے قانون بنائے، تو مجھے دھوکے میں رکھا گیا اور میرا تبادلہ ہالینڈ کر دیا۔ الطاف گوہران دنوں امریکہ گئے ہوئے تھے۔ یہ میرے ماتحت تھے۔

قدرت اللہ شہاب:

میں نے کہا آپ ان قوانین کو نہ بنائیں، اگر بنانا ہی ہیں تو اسمبلی میں بات کریں۔ کہنے لگے ہم اخبار والوں کو ایسا مزہ چکھانا چاہتے ہیں کہ انہیں نانی یاد آ جائے۔ تب میں نے استعفیٰ دے دیا۔

دینی و روحانی معمولات کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہے؟

جیلانی کامران:

روٹین (روزمرہ) کوئی ہو۔ دنیاوی ہو یا دینی ہو..... یا کوئی بھی ہو وہ تکمیلیت کا نچوڑ ہوتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب:

یہ اس لیے میں سوال کر رہا تھا تاکہ آپ سے ایک اور سوال پوچھ سکوں کہ ہمارے ہاں اردو شاعری اور داستانیں تصوف کے پس منظر میں لکھی گئیں جو کہ قدما میں سلوک کی منزلیں اور عشق کے نمایاں پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ اسی طرح غزل وغیرہ میں بھی..... تو اگر آپ کا اس قسم کا کوئی تجربہ ہے تو آپ اس تجربے کو تخلیقی تحریروں کے ساتھ (مثلاً آپ جب افسانے لکھتے ہیں) انہیں ملا کر آپ کا ارادہ ہے کوئی چیز لکھنے کا؟

سجاد باقر رضوی:

میں نے اپنی کتاب میں ایک باب آخر میں رکھا ہے۔ اس کا عنوان ”قلب و نظر“ ہے اس میں میں نے ساری باتیں اپنے تجربے اور مشاہدات کے حوالے سے لکھی ہیں اور انہیں (جو بھی تجربات تھے مرے) بلا روک ٹوک بیان کر دیا ہے۔ یہ میرا عملی تجربہ ہے..... جو میں کبھی تجسس کے ناتے لگا رہا اور کبھی ایک قدم کے طور پر، تاکہ آگے بڑھ سکوں۔

قدرت اللہ شہاب:

اس سے (یعنی مذہب یا دین) سے آپ کی دلچسپی کب شروع ہوتی ہے؟

ذوالفقار احمد تابش:

یہ عجیب واقعے سے شروع ہوئی۔ میری زندگی کے دونوں موڑ ہندوؤں کے باعث آئے۔ ایک چندراوتی سے اور دوسرا جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو جموں میں پلگ پڑ گئی تھی۔ میں جس گاؤں میں بھیجا گیا وہ سکھوں کا تھا۔ ایک خالص سکول تھا وہاں، جہاں ایک ہندو ہوتا تھا..... وہ اذان کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں دے دیتا تھا اور درود شریف سنتے ہی وہ بھاگنا شروع

قدرت اللہ شہاب:

کر دیتا تھا، مجھے ورہنظر فاکسل کا امتحان دینا تھا تو گیارہ میل دور ہمارا سفر تھا۔ اس وقت صبح وغیرہ نہیں ہوتی تھیں۔ تو شہر کے کنارے وہ سڑک جاتی تھی جس پر صبح چار بجے میں پیدل چلا تھا۔ سات آٹھ بجے میں شہر پہنچتا تھا۔ وہاں امتحان کا پرچہ دیتا تھا تو پھر واپسی شام کو ہوتی تھی۔ ایک روز میں جا رہا تھا تو اسی پنڈت کو دیکھا، وہ صبح سویرے گرمی ہو یا سردی، شہر میں نہایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے شرارت سوچھی اور میں نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا زور زور سے۔

اس میں مجھے اتنا مزہ آیا کہ خیر میں نے چند روز میں منٹ لگائے۔ پھر مجھے پرچہ دینا تھا، میں چلا گیا، پھر میں چلتا چلتا درود شریف ہی پڑھتا گیا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ گیا اور راستہ بھی محسوس نہ ہوا امتحان دے کے واپسی پر میں نے یہی شروع کر دیا تو پھر گیارہ بارہ دن امتحان تھے میں نے یہی کیا۔ اس سے مجھے عادت سی ہو گئی درود شریف پڑھنے کی۔ پھر مجھے لطف آنے لگا اور ساری عمر کے لیے یہ وظیفہ بن گیا۔

ایک واقعہ اور ہے آپ کا، یہ سول لائنز نمبر 18۔ پتا نہیں یہ افسانہ کیوں اکثر یاد آتا ہے اور HAUNT کرتا ہے۔ اس کی تفصیل آپ نے افسانے میں بھی تو دی ہے۔

افسانے میں بہت تھوڑی ہے، اس پر میں نے پورا ایک باب مکمل کیا ہے اور اتنا حقیقت کے قریب لے آیا ہوں کہ جب میں نے یہ باب ختم کیا تو نماز پڑھنے چلا گیا۔ وہاں سے جب عشاء کی نماز پڑھ کر نکلا تو اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے لفٹ لے لے، کیونکہ مجھ کو ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت کوئی لفٹ لینے والا نظر نہ آیا۔ تو پھر میں گلیوں سے ہو کر گھر جانے کی بجائے سڑک پر گاڑی کے شیشے کھول کر گھر واپس گیا۔

اس کا بھی کوئی تعلق ہے آپ کی روحانی زندگی سے..... اس نے بھی کوئی اثر ڈالا۔ اس سے مجھے روح کا ادراک ملا۔

آپ نے 'شہاب نامہ' لکھا تو کیا یہ محض یادداشتوں پر مبنی ہے یا آپ نے اس کے لیے نوٹس بنا رکھے تھے... کیونکہ یہ تو پچاس سال پر محیط ہے۔

بچپن کا حصہ جو ہے اس کے تو کوئی نوٹس نہیں۔ یہ تو صرف یادداشتیں ہیں، نوٹس شروع ہوتے ہیں 1936-37ء سے۔ زیادہ نوٹس شروع ہوتے ہیں چند راوتی سے چند راوتی کے نوٹس تو آج تک مجھ سے فراموش نہیں ہوئے۔

مذہب، طریقت اور تجربے کی باتیں تو ہو چکیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو اب ہمارے اس زمانے میں لکھا جا رہا ہے اس میں زمانے کی شکایت بہت ہے۔ احتجاج ہے اور جو ہمیں بنیادی کردار دکھائی دیتے ہیں وہ بیمار ہو چکے ہیں۔ روحانی، ذہنی اور جذباتی طور پر..... تو آپ کے پاس ایک طریق کار اور اصول ہے کہ آپ نے محبت کا مسلک استعمال کیا۔ آپ کا دل بھی آباد ہو گیا آپ کا ذہن بھی آباد ہو گیا۔ اب یہ بے چارے (ہم) جو اس زمانے میں لکھ رہے ہیں، پریشان ہیں، تو ہم کیا کریں۔ مذہب کی طرف جو راستہ شاہراہ کا ہے وہاں یہ جو پگڈنڈیاں

سجاد باقر رضوی:

قدرت اللہ شہاب:

سجاد باقر رضوی:

قدرت اللہ شہاب:

کشور ناہید:

قدرت اللہ شہاب:

جیلانی کامران:

جاتی ہیں وہ بھی بعض دفعہ نہیں ملتیں۔ شاہراہ سے دور ہیں لوگ۔ اب تو ہم گچھ لڑیوں میں بھی نہیں ہیں تو کیا کریں؟

قدرت اللہ شہاب:

میں اصل میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ آج کل لکھنے والوں کا ذہن بیمار ہے۔ زیادہ تر آج کل جو پڑھتا ہوں وہ نئی نسل کے لوگوں کو پڑھتا ہوں، جتنی نئی کتابیں لکھنے والوں کی چلتی ہیں وہ میں ضرور پڑھتا ہوں۔ شروع شروع میں یہ مجھے سمجھ نہیں آتی تھیں اور چوبیس برسوں میں بھی۔ پھر میں نے عام طالب علموں کی طرح پڑھنا شروع کیا اور پھر تھوڑی تھوڑی سمجھ آنے لگی۔ مثلاً علامتی ادب وغیرہ۔ اب میں نے محنت کر کے (جیسے سکول کے لڑکے کرتے ہیں) سمجھنا سیکھا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ مجھے اب پوری سمجھ آتی ہے مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ یہ نسل میری نسل سے بڑھیا ہے۔ سچی بات یہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوں گی۔ میرے نزدیک ایک وجہ یہ ہے کہ آج کل کے حالات (یعنی فضا) میں بہت زیادہ وسعت ہے۔ سہولتیں بھی ہیں۔ مجھے وریننگر کا امتحان دینے گیا وہ ٹیل پیدل جانا پڑتا تھا۔ اب یہاں بعض کو تو گھر سے کالج کے لیے بھی پیدل نہیں جانا پڑتا اور پھر ٹی وی ہمارے پاس نہیں تھا، ریڈیو نہیں تھا، اخباروں کے ادبی ایڈیشن نہیں تھے، ڈائجسٹ نہیں تھے اور کتابیں نہیں تھیں۔

کشورناہید:

قدرت اللہ شہاب:

یہ ان کو بڑھانے والی کیفیتیں تو نہیں ہیں جو آپ بتا رہے ہیں، بلکہ ان کو کم کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود لکھنے والوں کی کتابیں اگر (پھر بھی) نمایاں ہو جاتی ہیں اور اس جنگل میں وہ جو نمایاں ہو جاتا ہے وہ بہت اعلیٰ ہے۔ میں تو اس حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ ہمارے دور میں چند رسالے تھے، چند لکھنے والے تھے، چند پڑھنے والے تھے اور ہم ان میں تیس مار خاں بن بیٹھتے تھے آج ہمارے مقابلے میں اتنی متنوع اور پُرکشش راہیں ہیں کہ ان میں نام پیدا کرنا یا مقام پیدا کرنا اور کامیاب ہونا بڑا مشکل عمل ہے۔ یہ سب وہی کر سکتا ہے جو بڑا ہی پیپر میز ہو۔

”ماہ نو“۔ مارچ 1986ء

انٹرویو:

الطاف حسن قریشی

درد میں ڈوبے ہوئے فنکار، جناب قدرت اللہ شہاب، سے یہ میری پہلی ذہنی ملاقات تھی۔ ان سے ملنے کی خواہش اس وقت پیدا ہوئی جب میں نے 1961ء میں جسٹس کیانی (مرحوم) کا ایک مضمون پڑھا جس میں انہوں نے شہاب صاحب کے سر کو اگالداں سے تشبیہ دی تھی۔ تشبیہ کے پس منظر سے بالکل بے خبر میں ذہن ہی ذہن میں سر کی مختلف تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا، اور جب ایک بھی تصویر مکمل نہ ہو سکی، تو اصل سر دیکھنے کی آرزو پاؤں پھیلائے لگی۔ شہاب صاحب ان دنوں صدر پاکستان کے سیکرٹری تھے اور معلومات کے تمام ذرائع اور وسائل پر قدرت رکھنے کے باوجود انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ایک دل نادان انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے مضطرب ہے۔

1962ء کے آخری دنوں میں جناب شہاب رائٹرز گلڈ کی ایک تقریب پر لاہور تشریف لائے اور جب میرے ایک شناسا نے اشارے سے بتایا کہ وہ ہیں قدرت اللہ شہاب، تو میں نے سب سے پہلے ان کے سر کو دیکھا۔ کوئی عجیب و غریب بات نظر نہ آئی۔ عام انسانوں جیسا سر جس میں دماغ یقیناً عام انسانوں کا نہ تھا۔ میں ابھی حیرت و استعجاب سے غرق آ رہا تھا کہ اتنے میں جناب شہاب میرے قریب آ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا، تو کہنے لگے:

”میں آپ کو تقریباً دو سال سے جانتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟ میری تو آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”میں تمہیں دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اردو ڈائجسٹ 1960ء میں نکلا تھا نا؟“

”جی ہاں۔“

”تحریریں قلم کار کی تصویریں ہوتی ہیں۔“

اُن کی باتوں میں ٹھہراؤ اور دھیمپا پن تھا اور ان سے اپنائیت کی مہک آ رہی تھی۔ ان کے ارد گرد پروانے جمع تھے اور وہ بڑے تحمل سے سب کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ میں اطمینان سے ان کی شخصیت کے نقش و نگار دیکھتا رہا۔ میانہ قامت، بھرا بھرا چہرہ، چمکدار آنکھیں، شکنوں سے بے نیاز پیشانی، لباس میں قیامت کی سادگی اور چال ڈھال میں بلا کی بُردباری۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ شخص اقتدار کی راہوں پر بھی کنارے کنارے دامن سمیٹ کر چلتا ہوگا۔ انتہائی نازک اور پُر خطر حالات میں بھی دماغ کی باگیں اس کے قابو میں رہتی ہوں گی۔

یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی..... صرف چند منٹ کی ملاقات۔

عالمیابیہ 1965ء کے وسط کی بات ہے کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا لکھنے لکھانے کی مشق کر رہا تھا کہ دو صاحب

آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے اور نہایت نرمی سے سلام کر کے میرے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں کچھ زیادہ ہی منہمک تھا۔ آنے والوں پر بھرپور نظر ڈالے بغیر وٹیکم السلام کہا اور مضمون کا آخری فقرہ لکھنے کے لیے قلم کو تیز چلا دیا تاکہ اطمینان سے باتیں کی جاسکیں۔ قلم تیزی میں الجھتا چلا گیا۔ میں نے ٹک آ کر اسے ایک طرف رکھ دیا اور مہمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جناب ابن انشاء اور جناب قدرت اللہ شہاب میری جھنجھلاہٹ پر مسکرا رہے ہیں۔

اپنی ہفت اور ندامت چھپانے کے لیے بڑے تکلف سے ملا اور شکوہ کیا کہ آنے سے پہلے اطلاع کیوں نہ دی۔ میں آپ کے استقبال کے لیے پورے شہر کو یہاں لے آتا۔ (دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ علیحدہ بات ہے کہ میرا ایک شہری پر بھی اختیار نہیں)۔ شہاب صاحب ان دنوں ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر تھے اور رخصت پر اپنے وطن آئے ہوئے تھے۔ وہ میرے تکلف آمیز فقروں پر ایک بار پھر مسکرا دیئے۔ آدھ گھنٹہ بے تکلفی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ جس قدر شہاب صاحب کی تحریر سحر آفریں ہے بالکل وہی تیوران کی باتوں کے ہیں۔

میری ان سے تیسری ملاقات یکم جولائی 1967ء کو ہوئی جب میں ان کا انٹرویو لینے کے لیے اسلام آباد پہنچا۔ حسن اتفاق سے اس روز بارش ہو رہی تھی اور اسی برکھا رت میں اسلام آباد کی سادہ زندگی جس معصومیت سے لڑکھرائی، اس کے حسین مناظر میرے مشاہدے کا ایک لازوال حصہ بن گئے ہیں۔ میں اپنی خلوتوں میں اس سے لطف اٹھاؤں گا اور کسی کو ان میں شریک نہ کروں گا، کیونکہ سنا ہے حسن اور اقتدار شراکت پسند نہیں کرتے۔

شہاب صاحب آج کل مرکزی دفاتر کے ڈی بلاک میں بیٹھتے ہیں اور مرکزی سیکرٹری تعلیم کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے دفتر ہی میں آ جانے کے لیے کہا تھا۔ وقت معینہ سے چالیس منٹ بعد پہنچا۔ وہ سمجھ گئے بارش زنجیر پان گئی ہوگی۔ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اور چونکہ ایک ہی مقام سے تمام مرکزی دفاتر ایئر کنڈیشنڈ کیے جاتے ہیں، اس لیے اسے بند کرنے اور کھولنے پر کمرے والے کا اختیار نہیں۔ بارش ہونے سے باہر کا موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا اور جی چاہتا تھا کہ کمرے کی کھڑکیاں کھول دی جائیں اور باہر کی لطیف اور تازہ ہوا سے لطف اٹھایا جائے، مگر ایئر کنڈیشننگ کے جکڑے ہوئے نظام میں ایسی عیاشیوں کی گنجائش کہاں۔

”آپ بے چین کیوں ہیں؟“ شہاب صاحب نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”گرمی کا احساس ہو رہا ہے۔“

”گرمی کا؟ ہمارا کمرہ تو ایئر کنڈیشنڈ ہے۔“ شہاب صاحب قدرے رکتے ہوئے بولے۔

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا:

”لیکن شاید میں اپنے محسوسات آپ تک نہ پہنچا سکوں۔ ہم شیشوں سے باہر کا منظر تو دیکھ سکتے ہیں، لیکن اس کی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتے، کیونکہ باہر کی دنیا سے ہمارا تجرباتی اور شعوری رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور شاید ہمارے خواص اور عوام کے رشتے بھی اسی طرح ٹوٹ چکے ہیں، اسی لیے ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں نہ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔“

”سچ کہتے ہو۔ زندگی کی آسائشوں نے زندگی کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔“

”شہاب صاحب، ترقی یافتہ ملکوں میں آسائشوں کی فراوانی ہے۔ کیا وہاں بھی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے؟“

معاشرے میں معیار زندگی کا تفاوت تو وہاں بھی پایا جاتا ہے، لیکن ان کے ہاں دولت، ریاضت اور عہدیم جدوجہد کے نتیجے میں ہوئی، اس لیے اس کے اچھے بُرے ثمرات پورے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت کے تدریجی ارتقاء سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خاص انداز کا کردار بھی ابھر آیا ہے جس میں کاروباری اخلاق کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن ہمارے ہاں تقسیم کے بعد دولت اور محنت کے مابین توازن نہیں رہا۔ محنت اور ریاضت کے بجائے دولت فریب کاری اور جعل سازی کے ذریعے بھی حاصل ہونے لگی اور پھر اس پر قابض رہنے کے لیے جھوٹ اور بے ایمانی کا کاروبار بھی بڑھتا چلا گیا، پھر ان نو دولتوں نے حفاظت کے لیے اپنے گرد ہزاروں دیواریں تعمیر کر لیں اور اس طرح زندگی کا نازک شیشہ پاش پاش ہو گیا۔“

”شہاب صاحب، ایسا کیوں ہوا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہم بے اصول اور بے ضمیر بن گئے اور وہ اخلاقی قدریں جن میں ہم طویل مدت سے پرورش پا رہے تھے، پہلے ہی حادثے میں شہید ہو گئیں۔“

ان کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور انگلیوں سے کنورے بناتے ہوئے بولے:

”ہمارا نظام اقدار بڑے عرصے سے متزلزل ہو رہا تھا۔ باہر سے آنے والے حکمران چن چن کر ان قدروں پر ضرب لگا رہے تھے جو ہمارے معاشرے کو صاف خون فراہم کیا کرتی تھیں۔ کچھ ہمارے جاگیرداری نظام نے اخلاقی قدروں میں شکاف ڈالا۔ اس طرح ڈھانچہ تو قائم رہا، لیکن بنیادیں کمزور پڑ گئیں۔ سماج کے خوف سے قدروں کا رشتہ کسی حد تک قائم تھا یا پھر وہ مائیں اپنے دودھ کے ذریعے بچوں میں اچھائیوں کا شعور منتقل کرتی تھیں جن کی زندگیوں میں خدا سے محبت اور رسول کے عشق کی پاکیزگیاں رچی ہوئی تھیں۔ تقسیم کے بعد معاشرہ اس تیزی سے الٹ پلٹ ہوا کہ وہ دیواریں تقریباً منہدم ہو گئیں جن پر اخلاق کی ٹوٹی پھوٹی عمارت قائم تھی۔ مگر الطاف صاحب، ان تمام باتوں کے باوجود اخلاقی عظمت کا ایک ایسا واقعہ بھی دیکھا جسے اب بھی یاد کرتا ہوں، تو نشاط روح کا سامان مل جاتا ہے۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی قدریں اتنی جاندار اور گہری ہیں کہ جہاں بھی چھاپ لگ جاتی ہے منائے نہیں ملتیں۔“

”میں تقسیم کے تھوڑے ہی عرصے بعد صنعتوں کا ڈائریکٹر مقرر ہوا۔ ان دنوں کلیمز داخل کیے جا رہے تھے۔ مالیت کے اعتبار سے صنعتی کلیموں کے مختلف درجے تھے۔ ایک خاص رقم سے کم کے کلیم ہمارے محکمے کے دائرہ کار میں نہیں تھے اور ہم کوئی معاوضہ نہیں دیتے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کلیم آیا جو اس مخصوص رقم سے کم تھا۔ ہم نے کلیم والے کو طلب کیا۔ ایک سفید ریش بزرگ داخل ہوا۔ اس کے نحیف و نزار جسم سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے تقسیم میں بہت سختیاں جھیلی ہیں۔ ہم سب اس ضعیف آدمی کی مدد کرنا چاہتے تھے، مگر قانون کے مطابق اس کلیم کا معاوضہ نہیں دے سکتے تھے ہم میں سے کسی ایک نے اس ضعیف آدمی سے کہا:

”بابا، آپ کا کلیم کم مالیت کا ہی، اس میں اضافہ کر دیجیے۔“

اس نے بھولپن سے جواب دیا:

”زندگی بھر حلال رزق کھایا ہے۔ اب بے ایمانی کیسے کروں؟“

ہم شب و روز جو آوازیں سن رہے تھے، یہ آوازاں سے بالکل مختلف تھی۔ چہا۔ بالکل چہا۔ ہم نے بابا سے

پھر کہا:

”جو مشین آپ چھوڑ کر آئے ہیں، اس کی قیمت اب بڑھ گئی ہے۔“

”جناب، مجھے اتنا بڑا دھوکہ تو نہ دیں۔ میرا وہاں چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشین کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔“

”بابا، افسوس ہے ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”بیٹا، آپ مجھے کچھ دیں یا نہ دیں، میں جھوٹ تو کسی قیمت پر نہیں بولوں گا۔ میرے جسم میں ابھی کچھ توانائی ہے، اس سے حلال رزق کمانے کی کوشش کروں گا۔“

”بابا، اطمینان سے چلا گیا، لیکن ہمارا اطمینان چھین لے گیا۔ میں نے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اس کے کلیم کے متعلق علیحدہ رپورٹ لکھی اور حکومت سے درخواست کی کہ یہ کلیم بطور خاص منظور کر لیا جائے، لیکن اس وقت اہل حکومت کو بڑے بڑے لوگوں کے بڑے بڑے مسائل درپیش تھے، اس چھوٹے مسئلے پر کسی نے توجہ نہ دی۔“

”بظاہر یہ ایک واقعہ چھوٹا سا ہے، لیکن سچ پوچھیے تو اسی سے معاشرے کی زندگی اور آئندہ عبارت ہے۔“

”شہاب صاحب، کیا معاشرے کو دوبارہ بھرپور زندگی مل سکتی ہے؟“

”مل تو سکتی ہے بشرطیکہ سچی لگن موجود ہو۔ ہمارے معاشرے میں نیکیوں اور اچھائیوں کو رواج دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ ہزاروں خرابیوں کے باوجود ہم اب بھی برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی سمجھتے ہیں۔ مغربی معاشرے میں ان چند اخلاقی خوبیوں کے سوا جن کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا، نیکی اور ہمدردی کے تھوڑے رات گلدھڑ ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں اسلام سب سے بڑی معاشرتی اور نظریاتی قوت ہے اور ہمیں تعمیر کردار میں اس قوت سے پوری طرح کام لینا چاہیے۔ میرے نزدیک اس غلط تھوڑے نے ہماری سوسائٹی کے اخلاق پر بہت بُرا اثر ڈالا کہ ایک فرد کی نجی زندگی (پرائیویٹ لائف) کا اس کی معاشرتی زندگی (پبلک لائف) سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ انتہائی گمراہ کن بات ہے۔ ایک فرد اپنی نجی زندگی میں جو رویہ اختیار کرتا ہے، وہی رویہ اس کی معاشرتی زندگی میں کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ فلسفہ غلط کاریوں اور مٹش پسندیوں کو فروغ دینے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اسے جس معاشرے میں بھی نافذ کیا گیا، اس میں بد اخلاقیوں کا سیلاب اُٹھ آیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں ہمیں کوئی ایسا نظام وضع کرنا چاہیے جس میں معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ زندگی کا بھی محاسبہ کیا جاسکے۔ سیاسی میدان میں قوم صرف ان افراد کی قیادت تسلیم کرے جن کی پوری زندگی بے داغ اور قابل تقلید ہو۔ معاشرتی اعتبار سے وہ لوگ کسی بھی احترام کے مستحق نہ سمجھے جائیں جو صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر نہ کر رہے ہوں۔ اس وقت سب سے بڑا انقلاب وہ ہاتھ لاسکتے ہیں جو انتظامیہ کو چلا رہے ہیں۔ میرا حقیر مشورہ ہے کہ ملازمین حکومت کے کیریئر رول“ میں اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ نماز روزے کی پابندی کا کیا عالم ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ترقی دیتے وقت انتظامی صلاحیتوں کے برابر پابندی صوم و صلوٰۃ کو اہمیت دی جائے۔ جب کوئی شخص سرکاری ملازمت کے لیے درخواست دے، اسے ابتدا ہی سے یہ احساس ہو کہ وہ ایسی ریاست کا رکن بننے والا ہے جس میں صاف ستھرا کردار اور نماز روزے کی پابندی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔“

”جناب شہاب، ان ظاہری طریقوں سے روح اور دل میں کوئی خوشگوار تغیر رونما ہو سکے گا؟“

”جی ہاں، میں تو پُر امید ہوں۔ آپ دیکھیں گے پوری نفسیاتی فضا بدل جائے گی۔ سوچنے کے انداز بہتر بن جائیں گے۔ رہن سہن کے انداز میں انقلاب آ جائے گا۔ روابط کے دھارے کوئی اور ہی سمت اختیار کر چکے ہوں گے۔ آپ یہ تجربہ کر کے تو دیکھیں انشاء اللہ اس کے عمدہ نتائج تاریخ کا شاندار حصہ بنیں گے۔“

استنے میں ملازم چائے لے آیا۔ سادہ سی چائے کیا آئی، بجلی روٹھ کر چلی گئی۔ ہم غریب لوگ تو پسینے کے عادی ہیں، اس حد تک کہ اگر پسینہ نہ آئے، تو اپنے وجود کا احساس کم ہونے لگتا ہے، اس لیے بجلی کے چلے جانے سے مجھ پر کچھ اثر نہ پڑا اور جب غور سے دیکھا تو شہاب صاحب کو بھی مطمئن پایا، لیکن دوسرے کمروں سے ہلکی ہلکی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں نہ تھیں، دم توڑتی ہوئی قوت برداشت کی ہچکیاں تھیں۔ اپنی بے بسی پر دل بھرا آیا۔ ان آوازوں نے تو ہمیں اپنا غلام بنالیا ہے اور پھر ہم آہستہ آہستہ ان کے غلام بن جائیں گے جو آسائشیں مہیا کرتے ہیں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے۔

میں چائے پیتا رہا، لیکن شہاب چائے کی پیالی میں اٹھنے والے طوفان سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے اپنے پیچے میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا اور سوچ کے دائرے پھیل رہے تھے۔ ان کے مشاہدے کی گہرائی اور فکر کی گیرائی چھوٹے چھوٹے فقروں میں ڈھل رہی تھی۔ میں اپنی پیالی ختم کر چکا تھا اور چاہتا اب یہ تھا کہ شہاب صاحب چائے پینے نہ پائیں۔ وہ پیالی اٹھانے ہی والے تھے کہ میں نے دانشوری کا سا اسلوب اختیار کیا:

”شہاب صاحب، کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ دین جو چودہ سو برس پہلے ایک غیر متمددن علاقے میں پھلا پھولا، ہمارے آج کے مسائل سمجھ بھی سکتا ہے؟“

انہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کرتے ہوئے بولے:

”کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہندومت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت جیسے مذاہب جن کی تاریخ محفوظ نہیں، جن کی حقیقی تعلیمات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، جن کے ہاں کوئی مربوط اور مستقل نظام فکر نہیں ملتا جن کے پاس عملی زندگی کا کوئی تفصیلی نقشہ نہیں، وہ پوری دنیا کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن اسلام جس کے نقوش انسانی تاریخ پر سب سے گہرے ہیں، کیا وہ عصری تقاضے سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا؟ دراصل ہم اسلام کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یورپ نے اسلام کے خلاف انتہائی بھونڈے نظریات قائم کیے اور ان کو بڑی چالاکي سے علوم تاریخ، فلسفے اور ادب کی کتابوں میں پھیلا دیا۔ اب ان کتابوں کے ذریعے یہ زہریلے اور گمراہ کن تصورات ہم تک پہنچ رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ اب یہی تصورات ہمارے ہاں اسلام کے برتر تصورات کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ہمارے خون میں سرطان سرایت کر رہا ہے اور آہستہ آہستہ صحت مند ذرات ختم ہو رہے ہیں۔ خون کا سرطان نظر آتا ہے نہ اس کا علاج سہل ہے۔ خبر نہیں ہماری دانش کو کیا ہو گیا ہے۔“

”چائے تو پی لیجئے۔“ میں نے شریر لہجے میں کہا۔

وہ میری طرف دیکھ کر صرف مسکرائے اور ملازم کو آواز دی:

”بھائی، گرم گرم چائے اور لے آؤ۔“

ہمیں باتیں کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ باتیں زیادہ تر شہاب صاحب کی تھیں۔ اس عرصے میں ان کا لہجہ یکساں رہا۔ اُتار چڑھاؤ سے کامل بے نیاز، گرمی نہ تیزی۔ بات سیدھی سادی۔ سوچو، تو ایک دفتر معانی۔ مجھ پر حملہ آور نہ ہوئے گذشتہ حملوں کی روداد سنائی نہ اپنی دانشمندی کی داد چاہی۔ میرا ذہن آخری وقت تک ہلکا ہلکا اور مصنوعی ہوا کھانے کے باوجود تازہ اور شگفتہ رہا۔

”الطاف صاحب، ہمیں یہاں بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کہ مغرب میں اسلام کے خلاف کتنا زہر پھیلا یا گیا ہے۔ میرے خیال میں وہ تمام مواد ہمیں یکجا کر دینا چاہیے، پھر اس کے بجائے کہ ہم اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب دیں، مناسب یہ ہے کہ ان امور کی تحقیق کی جائے کہ زیادہ تر کتابیں کس زمانے میں لکھی گئیں۔ اس وقت اسلام اور عیسائیت کے سیاسی تعلقات کس نوعیت کے تھے اور جن لوگوں نے کتابیں لکھیں، ان کی زندگی میں کیا کیا موڑ آئے؟ کیا وہ کبھی کسی مسلمان سے ملے، اگر ملے تو ملاقات کی نوعیت کیا تھی؟ میرا یقین ہے جن اصحاب نے اسلام کے خلاف قلم اٹھایا، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا مقصد شکست یا رجس کا انتقام لینا تھا۔ ایک واقعے نے میرے ذہن کو اس طرح منتقل کیا۔

✓ جن دنوں ہالینڈ میں تھا، میں نے سوچا سیرت رسولؐ پر اس انداز سے ایک کتاب مرتب کی جائے کہ مغرب میں آپؐ کی زندگی پر کیا کچھ لکھا گیا۔ تحقیق کے دوران میں آنحضرت ﷺ کی زندگی پر وکٹر ہیوگو کی ایک کتاب نظر سے گزری۔ میں چونکا، بھلا اسے اس سنجیدہ موضوع پر کتاب لکھنے کیا ضرورت پیش آئی، وہ تو فرانسیسی ادب میں ناول نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے معروف ہے۔ میرا تجسس بڑھتا گیا اور میں نے اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جناب ڈاکٹر حمید اللہ کی خدمت میں رہنمائی کے لیے حاضر ہوا۔ انہوں نے اپنے ایک فرانسیسی شاگرد کو میری مدد پر مامور کر دیا۔ اس طالب علم نے مختلف کتابوں کی مدد سے وکٹر ہیوگو کے حالات زندگی کا خاکہ تیار کیا۔ اس خاکے میں ایک حادثہ بہت اہم ثابت ہوا۔ ہوائیوں کہ وکٹر ہیوگو ایک روز کسی ہوٹل میں گیا وہاں اسے ایک الجزائری مسلمان ملا۔ کسی بات پر ان دونوں میں جھگڑا ہوا۔ وکٹر ہیوگو نے مسلمان کو پیٹنا چاہا، لیکن الجزائری مسلمان پہلے ہی اس پر جھپٹ پڑا اور اس کی خوب دُرگت بنائی۔ وہاں اور بھی الجزائری مسلمان موجود تھے۔ ایک فرانسیسی کی پٹ جانے پر انہوں نے خوب تالیاں بجا کیں۔ اس پر وکٹر نے کہا: اب تو میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لیکن جلد ہی ایک ایسا کام سرانجام دوں گا کہ اس کے ذریعے تم اور تمہاری آنے والی نسلوں سے انتقام لیتا رہوں گا۔ اس جھگڑے کے پانچ مہینے بعد وہ کتاب منظر عام پر آ گئی جس کے ایک ایک فقرے میں محسن انسانیتؐ کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔

”الطاف صاحب، ان کی پالیسی یہ ہے کہ ان تمام اداروں کا مذاق اڑایا جائے جو اسلامی تاریخ میں قوت اور عظمت کی علامت رہے ہیں۔ میں انتہائی دکھ کے ساتھ ایک بات آپ کو بتاتا ہوں۔ ہمارے اپنے کئی سکولوں میں بچے جو انگریزی کی کتابیں پڑھتے ہیں، وہ انگلستان سے آتی ہیں۔ میں نے اپنے بچے کی کتاب اس غرض سے پڑھنی شروع کی کہ اسے پڑھایا کروں گا۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے تمام نام انگریزی تھے۔ ایک نام مسلمان کا سا نظر آیا: سلطان۔

بہت خوش ہوا کہ چلیے ایک نام اپنا بھی ہے، لیکن جب آگے پڑھا، تو پسینے پسینے ہو گیا۔ سلطان ایک کتے کا نام تھا۔ دیکھا آپ نے؟ سلطان ہمارے ہاں طاقت کا منبع رہا ہے۔ اس حوالہ سے اس کا نہایت ہی گھٹیا تصور بچوں کے ذہن پر ڈالنے کا اہتمام کیا گیا۔

مجھے حیرت اس بات پر بھی ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتا کیوں ہے ہمارے اوتیوں، ہمارے دانشور اس بات کی کوشش کریں گے کہ ان کی تحریروں یا تخلیقات میں اسلام کا نام نہ آنے پائے اور جس میں آگیا، وہ معیار سے گر گئی۔ میں نے یورپ میں دیکھا کہ وہاں کا دانشمند طبقہ مذہب کے احیاء کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ وہاں عظیم الشان تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں جو تعمیری لٹریچر کو دنیا بھر میں پھیلانے کے عزائم رکھتی ہیں۔ وہاں کوئی شرماتا ہے نہ جھینپتا ہے، بلکہ وہاں کے ذہین طبقے کو یقین ہو گیا ہے کہ اخلاقی بے راہ روی کا سد باب صرف مذہب کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وہاں پبلک سکول بعد میں تعمیر ہوئے، پہلے گر جاؤ جو د میں آئے۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ مذہب کے اثرات سے محفوظ نہیں۔ ہمیں اسلام کے بارے میں جرأت مندانہ، مثبت اور باشعور رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

”میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یورپی اقوام چُن چُن کر مشرقی اقوام کے وہ پہلو اجاگر کرتی ہیں جو باعثِ رسوائی ہوں۔ انگریزوں کا کردار ہمارے بارے میں بہت ہی ظالمانہ رہا۔ وہ روح فرسا منظر کبھی نہ بھولوں گا جو میری آنکھوں نے 1943ء میں قحطِ بنگال کے زمانے میں دیکھا۔ میں قحط زدہ علاقے کا دورہ کر رہا تھا۔ ایک جگہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فاقہ زدہ انسان لیٹا ہوا ہے۔ ایک گدھ اس کا پیرنوج رہا ہے اور اس میں اتنی سکت نہیں کہ اپنے آپ کو گدھ سے محفوظ رکھ سکے۔ ان دنوں ایک امریکی رفاہی تنظیم اس علاقے میں کام کر رہی تھی، اس تنظیم کی ایک خاتون بھی اس طرف آ نکلی۔ ہم دونوں اس نیم مردہ آدمی کی طرف لپکے۔ اس علاقے کا انگریز ایس ڈی ایم موجود تھا اور وہ انسان کو گدھ سے نجات دلانے کی بجائے اس منظر کی تصویر لینے میں مصروف تھا۔ جب ہم تیزی سے ادھر گئے، تو اس انگریز نے کہا: ”ایک لمحہ توقف کیجئے، میں ذرا تصویر تو لے لوں۔“

امریکی خاتون غصے میں آگے بڑھی اور لپک کر گدھ پر ایک ضرب لگائی۔ اس آدمی کی جان فاقہ زدگی سے لبوں پر آگئی تھی، مگر نکلتی نہ تھی۔ اس نے حسرت سے چاول مانگے۔ ابھی اس نے دو چار نوالے ہی کھائے تھے کہ اس کی جان پنجرے سے آزاد ہو گئی۔

”انسان تو مر گیا، لیکن انگریز کا کیمرہ زندہ رہا۔ وہ اب بھی ہماری تصویریں کھینچتا ہے۔“

ایک بجے کے قریب وزیر تعلیم جناب قاضی انوار الحق نے شہاب صاحب کو بلا بھیجا۔ طے یہ پایا کہ میں شام کے وقت ان کی اقامت گاہ پر پہنچ جاؤں۔ مغرب کی نماز سے پندرہ میں منٹ پہلے حاضر ہو گیا۔ شہاب صاحب اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھے تھے۔ گرمی اچھی خاصی تھی۔

”مطالعے کے دوران میں مجھے گرمی کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر آپ چاہیں، تو ٹھنڈے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”جی نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں“ میں نے جواب میں کہا۔ دراصل الماریوں اور شیلٹ میں قرینے سے رکھی ہوئی

کتابیں لکھنے سے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ انگریزی اور اردو زبان میں مذہب، فلسفہ، ادب اور تعلیم پر عمدہ کتابیں دیکھیں۔ معاذ بن میں ایک سوال پیدا ہوا جسے میں نے بے جھجک شہاب صاحب تک پہنچا دیا: ”ہمارے کتنے فیصدی ایسے پی افسر مطالعے کا سحر مذاق رکھتے ہیں؟“

”مشکل سے 10 یا 15 فیصد“

”اس قدر کم: کیا برطانیہ میں بھی سول سروس کی یہی کیفیت ہے؟“

”جی نہیں، وہاں کی سول سروس نے تو اچھے اہل قلم پیدا کیے ہیں۔ پرانی انڈین سول سروس میں بھی اچھی خاصی تعداد ایسے افسروں کی تھی جو علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔“

”پھر ہمارے ہاں یہ کیفیت کیوں ہے؟“

”کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا معاشرہ ترقی پذیر معاشرہ ہے اور ایسے معاشرے میں انتظامیہ کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مطالعے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مطالعے کا ذوق و شوق تو والدین اور اساتذہ کے فیضانِ نظر سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ میرا اندازہ ہے آج کل طالب علمی کے زمانے میں ہنگاموں سے جھک چلتے رہتے ہیں، اس لیے ذوقِ مطالعہ کا پھول یا تو کھلتا ہی نہیں، یا کھلتا ہے تو جلد مرجھا جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے رنگ ڈھنگ کچھ ایسے ہیں کہ مطالعے کی اب سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ شوق اس قدر زیادہ اور اتنے نئے نئے ہیں کہ کتاب کے بے جان صفحات میں اب کون زندگی کا حسین حصہ ضائع کرے۔“

”شہاب صاحب، ویسے بھی ایک افسر کو کتاب کے مطالعے سے اپنے فرائض کی بجا آوری میں کچھ بھی مدد نہیں ملتی ہوگی؟“

”میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ مطالعے سے ذہن کو تازگی ملتی ہے، سوچ گہری اور صاف ہو جاتی ہے، انسانی زندگی کے مختلف پہلو سامنے نظر آتے ہیں اور انسانی مسائل سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انتظامیہ میں انسانی ہمدردی کا فقدان ہو، تو پھر وہ محض اختیارات کی مشین بن کر رہ جاتی ہے۔“

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شہاب صاحب یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں ابھی آتا ہوں۔ میں ان کی غیر حاضری میں کتابوں کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ پانچ سات منٹ بعد آ گئے۔ میں نے کہا: ”مغرب کی نماز ادا کرنی ہے۔“ وہ خود جائے نماز اٹھا کر لائے۔ جب میں نماز پڑھ چکا تو انہوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ کہا:

”مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کی نماز میں تاخیر ہو گئی۔ دراصل میں آپ سے اجازت لے کر نماز پڑھنے گیا تھا۔ میں نے اصول بنا رکھا ہے کہ نماز کے وقت دوسروں کو پریشان کیے بغیر خود چند منٹ کے لیے چلا جاتا ہوں اور یہ ظاہر نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ اظہار کرنے سے لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ میں لوگوں پر اپنے نمازی ہونے کا رعب جمانا چاہتا ہوں۔“

”شہاب صاحب، آپ اچھا ہی تو کرتے ہیں۔ ہمارے خواص کو کسی کے بارے میں یہ علم ہو جائے کہ وہ شرابی،

کہانی اور جواری ہے، تو خوشی کا اظہار کریں گے کہ ایک اور فرد ہمارے ڈمرے میں داخل ہوا، لیکن اگر انہیں اپنے طبقے کے کسی فرد کے بارے میں یہ بھٹک پڑ جائے کہ وہ نمازی ہے، تو اس کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کیا جائے گا اور مل جل کر اسے قرار واقعی مراد لوٹانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔“

چائے کی ایک پیالی پی کر ہم دوسری منزل کی ہوادار چھت پر آ بیٹھے۔

”شہاب صاحب، کیا آپ ہمارے موجودہ نظام تعلیم سے مطمئن ہیں؟“

”مطمئن تو ہمیں کسی مرحلے پر بھی نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ عموماً اطمینان حاصل کر لینے کے بعد انسانی قوی ڈھیل پڑ جاتے ہیں۔ نظام تعلیم کے بارے میں میری حقیر سی رائے ہے کہ اسے اور زیادہ با مقصد بنانے کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے ذریعے ہم اپنے معاشرے کو ایک مقصد، ایک نصب العین اور ایک منزل عطا کریں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ ہم ایسے باصلاحیت افراد تیار کرتے رہیں جو معاشرے کی تعمیر ہماری قومی امنگوں اور ہمارے روحانی تقاضوں کے مطابق کر سکیں صحیح نظام تعلیم قوم کو عظیم قیادت بھی دے سکتا ہے اور اسے عظمتِ کردار کی لذت سے بھی آشنا بھی کر سکتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں اصل اہمیت کردار کو حاصل ہے اور ہمیں اسی کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔“

”آپ کے خیال میں ہمارے نظام تعلیم کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں؟ یعنی ہم پاکستان میں تعلیم سے سیرت سازی کا کام کیونکر لے سکتے ہیں؟“

”آپ کا سوال خاصا گہرا ہے اور یہ گہرے سوچ بچار کا تقاضا کرتا ہے: تاہم دو تین موٹی موٹی باتیں عرض کیے

دیتا ہوں:

”پاکستان خاص ماحول اور خاص پس منظر میں ابھرا۔ اس کے پیچھے صدیوں کی فکری، تہذیبی اور روحانی تحریک کام کر رہی تھی، اس لیے یہاں کا نظام تعلیم اسی تہذیبی تحریک کی بنیادوں پر اٹھنا چاہیے۔ ہمارے نصاب تعلیم میں تین بنیادی اجزاء کا ہونا بہت ضروری ہے: سیرت رسول کا تفصیلی مطالعہ، تحریک پاکستان کا بنیادی فلسفہ اور اسلامی تاریخ کا ایسے خطوط پر مطالعہ جو ہمیں اپنی تہذیب اور انسانی تہذیب کی تعمیر میں اسلام کے عظیم الشان کردار پر فخر کرنا سکھائے۔ ہماری تمام جماعتوں کے تمام مضامین کے نصاب اس طرح مرتب ہونے چاہئیں کہ ان سب میں ایک ہی فلسفہ، ایک ہی نظریہ اور ایک ہی جذبہ جاری و ساری ہو۔ ایک طرف اسلامیات کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی جائے اور دوسری طرف اور تمام مضامین میں خدا کے تصور سے انحراف، مذہب سے برکشتی، اسلامی تاریخ کی عظمت کی نفی کے رجحانات موجود ہوں، تو اس سے منضبط، راسخ اور جاندار نظریہ حیات پرورش نہیں پاسکتا۔

”ہمیں پاکستان کو ایک عظیم ملک بنانے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ زندگی کی رفتار بہت تیز ہے اور ہم اس کا ساتھ اسی وقت دے سکتے ہیں۔ جب ہم بھی پوری تہذیبی اور تہذیبی سے جدید سائنسی علوم پر دسترس حاصل کریں۔ ہمارے نظام تعلیم میں کم از کم پندرہ بیس برس کے لیے سائنسی علوم کو خاص اہمیت ملنی چاہیے: تاہم ان علوم کی تعلیم حاصل کرتے وقت ہر پاکستانی کے ذہن میں یہ بات راسخ رہے کہ وہ اپنے علم اور اپنی صلاحیتوں کو خدا کی فضا کے مطابق انسانیت کی خدمت کے لیے کام میں لائے گا۔“

”آج کل آپ ہی وزارت تعلیم کے سیکرٹری ہیں، کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ میں نے سیدھا اور سادہ

سوال کیا۔

”ہمارے صدر پاکستان اس بات کے شدت سے خواہش مند ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم جلد سے جلد ہماری قومی
امنیوں کا منبع اور سرچشمہ ہو۔ وہ پہلے بھی انقلابی تبدیلیاں لائے ہیں اور اب بھی تعلیمی نصاب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔
مرکزی حکومت نے حال ہی میں نظام تعلیم کا از سر نو جائزہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ماہرین تعلیم، بچے
اساتذہ اور سٹوڈنٹ جھڑپوں سے بچنے والے والدین کے مشوروں سے متوازن اور بامقصد نصاب ہائے تعلیم وضع کریں مجھے یقین
ہے کہ پوری قوم کے مشورے سے یہ نصاب تعلیم ہمارے قومی مزاج کے زیادہ قریب ہوگا۔

”شہاب صاحب، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ نصاب کے بدل دینے سے نظام تعلیم بامقصد بن جائے گا؟“

وہ ایک دو لمحے انگلیوں سے کھیلتے رہے اور پھر پہلو بدلتے ہوئے بولے:

”نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اساتذہ میں بھی ایک نئی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ انہیں اپنے کام سے عشق
ہو اور وہ طلبہ کو اپنی متاعِ زیست سمجھتے ہوں۔ ایک استاد کا اچھا کردار سینکڑوں اچھے انسان پیدا کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ
ہے کہ اچھے اساتذہ کہاں سے حاصل کیے جائیں، اچھی کتاب شاید ایک دو برس میں تیار ہو جاتی ہو، لیکن ایک اچھا انسان
تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس برس درکار ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اچھے آدمی کی تلاش کوئی آسان کام نہیں، تاہم ہمیں
اپنے موجودہ وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہماری قوم میں یقیناً اچھے لوگ ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ اچھے
اور باصلاحیت افراد استاد بننا کیوں پسند نہیں کرتے؟ اس سوال کا جواب پورے معاشرے کو تلاش کرنا ہوگا۔ جہاں تک
وزارت تعلیم کا تعلق ہے، ہم ایک مرکزی تعلیمی سروس کا ڈھانچہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ تعلیم کو
اپنا پیشہ بنانا چاہیں، ان کو بھی ملازمت میں تنخواہ، عزت اور اثر کا وہی درجہ نصیب ہو جو ایک سی ایس پی یا فارن سروس کے
ممبر کو ہوتا ہے۔

”شہاب صاحب، سی ایس پی افسروں کی تربیت کے لیے حکومت نے اکادمیاں اور کالج قائم کر رکھے ہیں، لیکن
اساتذہ جن کے ہاتھوں میں پوری قوم کا حال اور مستقبل ہے، ان کی تربیت کے لیے جو سنٹرل ٹریننگ کالج موجود ہیں،
وہاں اساتذہ کی سیرت سازی کا کوئی خاص اہتمام نہیں۔ ٹریننگ کی مدت بھی صرف نو دس مہینے ہے۔ بھلا اس قلیل
مدت میں اساتذہ کے نقطہ نظر میں کیا تغیر آ سکتا ہے؟“

✓ ”آپ نے اہم مسئلہ اٹھایا ہے۔ ہمیں واقعی اساتذہ کی تربیت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ ان کے لیے بھی
اکادمیاں قائم کی جائیں جن میں ذہنی، علمی اور اخلاقی سطحوں کو بلند کرنے کے مواقع عام ہوں۔ ٹریننگ کی مدت بھی
قدرے طویل ہو اور اساتذہ کو مختلف تجربات سے گزار کر اس رنگ میں رنگ دیا جائے جو رنگ ہم اپنے معاشرے کو دینا
چاہتے ہیں۔“

شہاب صاحب کے خیالات میں الجھاؤ نام کو نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر اہم مسئلے پر برسوں غور و فکر کرتے
رہے ہیں اور اپنی ایک جچی تلی رائے رکھتے ہیں۔ پھر ان کی شخصیت میں اتنا بے ساختہ پن تھا کہ ہر بات پوچھ لینے کو جی
چاہتا تھا۔ میں نے ایک اور بات چپکے سے پوچھ لی:

124
 شہاب
 نظام تعلیم میں زیادہ اہمیت عمارت کو حاصل ہے یا اس کے اندر کے علمی ماحول کو؟ میرا خیال ہے ہم یوٹیوٹیشن اور درس گاہوں کی عظیم الشان عمارتوں پر بہت رقم خرچ کر رہے ہیں کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم سادہ سادہ عمارتیں بنائیں اور اس طرح جو رقم پس انداز ہو، وہ اساتذہ کی حالت بہتر بنانے یا اچھی تجربہ گاہیں تعمیر کرنے پر صرف کریں؟
 ”میں بھی سادگی کے حق میں ہوں۔ ہمارا تہذیبی مزاج بھی سادگی کا تقاضا کرتا ہے۔“

رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ شہاب صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی جسے میں نے بلا تکلف قبول کر لیا۔ کھانے کی میز پر سادہ کھانا چنا ہوا تھا۔ بیگم شہاب بھی اپنے شوہر کی طرح سادہ مزاج نظر آئیں۔ کھانے کی میز پر جو فکر آمیز باتیں ہوئیں انہیں سن کر یقین ہو گیا کہ سادہ رہن سہن میں فکر کی پرواز بلند رہتی ہے۔ کھانے کے کمرے میں کی بجے جمع تھے اور وہ اودھم مچا رہے تھے۔ ان کے شور و غل سے شہاب صاحب نے ناک بھوں چڑھائی نہ ان کی بیگم کے مزاج پر ہم ہوئے۔ دونوں بچوں کی کی معصوم شرارتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔

کھانے کے بعد اڑھائی گھنٹے کی نشست رہی۔ شہاب صاحب، غلام محمد مرحوم اور سکندر مرزا کی عادات و اطوار کے دلچسپ پہلو بیان کرتے رہے۔ غلام محمد کے کردار کے ایسے ایسے گوشے معلوم ہوئے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سکندر مرزا کی پراسرار باتیں بھی ہوئیں۔ لیکن کم کم۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جناب شہاب ہماری قومی تاریخ کے بیشتر بچ و خم سے آگاہ ہیں اور ان کے سینے میں راز ہائے سربستہ کے خزانے دفن ہیں۔ اس خزانے کو لٹانے میں وہ سخاوت سے کام نہیں لیتے۔

دوسرے روز شام کے ساڑھے پانچ بجے آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔
 ساڑھے پانچ بجے پہنچا تو شہاب صاحب کو لاہری میں پایا۔ میں نے کہا: ”آج ”شام ہمدرد“ ہے۔ جناب خواجہ شہاب الدین سیرت رسول پر مقالہ پڑھ رہے ہیں وہاں جانے کو جی چاہتا ہے۔“
 ”چلیے“ وہ یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اسی تقریب کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ہم چپکے سے آخری کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ منتظمین کئی بار آئے اور شہاب صاحب سے اگلی نشستوں پر بیٹھنے کی درخواست کی، لیکن وہ انکسار کے ساتھ انکار کرتے رہے۔ اجتماع کے خاتمے پر وہ حاضرین میں گھل مل گئے اور جس سے ملے اس کی عزت نفس میں اضافہ کر گئے۔ دور کھڑا، میں اسی اندازے کے مناظر دیکھتا رہا۔ جناب حکیم محمد سعید کی شرافت، انصاف اور وضع داری کی سچ دھج ماحول کو اور بھی حسین اور خوشگوار بنا رہی تھی۔

ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ انٹرویو کی نشست جمی، میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔
 ”آپ کبھی قائد اعظم سے بھی ملے ہیں؟“

ہاں! ایک بار..... اور وہ ملاقات واقعات کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے 1947ء کے آغاز کا ذکر ہے ان دنوں اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ صوبے کے وزیر اعلیٰ سری ہری کشن مہتاب کے ماتحت تھا۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے مجھے اختیار دے رکھا تھا کہ میں وزیر اعلیٰ سے براہ راست رابطہ رکھوں ہر کشن مہتاب صاحب مجھ پر جلد ہی بہت اعتماد کرنے لگے وہ اپنے اہم ترین کاغذات میرے حوالے کر دیتے اور میں پوری آزادی سے معاملات کو آگے بڑھاتا تھا۔

ایک روز دہلی کے وزیر اعلیٰ کے نام اہم پیغام آیا۔ کانگریس ہائی کمان کی ایک انتہائی اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔ شہاب صاحب چلے گئے تو جب واپس آئے تو حسب معمول اپنا کنفیڈنشل بیگ مجھے دے دیا کاغذات کو ترتیب دیتے وقت میرے ہاتھ ایک ایسی دستاویز لگی جو ہماری قومی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہونے والی تھی۔ کانگریس کی ہائی کمان نے ایک تفصیلی ہدایات نامہ تمام کانگریسی وزرائے اعلیٰ کے لیے تیار کیا تھا اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں مسلمانوں کو کلیدی آسامیوں سے تبدیل کر دیا جائے ماؤنٹڈ پولیس فورس میں جو مسلمان ہیں ان سے اسلحہ لے لیا جائے مسلمانوں کی تنظیموں پر کڑی نظر رکھی جائے پانچ چھ صفحات پر اسی قسم کے اقدامات تجویز کیے گئے تھے ان کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ ہے یہ خیال آتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ نتائج کچھ بھی ہوں مجھے قوم کے کام آنا چاہیے۔ چنانچہ اسی روز چھٹی لے کر دہلی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ قائد اعظم ان دنوں دہلی میں تھے یہ دستاویز ان تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ میں اس دستاویز کی نقل تیار کر لوں اور وہ قائد اعظم کے پاس لے جاؤں اس طرح حکومت کے احتساب سے بچ جاؤں گا لیکن سوچا قائد اعظم نقل کو کچھ بھی اہمیت نہ دیں گے خدا کا نام لیا اور اصل دستاویز لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔

ان دنوں قائد اعظم کے سیکرٹری خورشید صاحب تھے ان سے میرے تعلقات دوستانہ تھے اگر وہ اس وقت دہلی میں موجود ہوتے تو مجھے قائد اعظم سے ملنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی لیکن وہ موجود نہ تھے۔ بڑی مشکل سے دروازے تک پہنچا محافظ نے روکنا چاہا میں نے سمجھایا بھجایا تو کچھ نرم پڑا اس کا جذبہ احتیاط بھی قابل قدر تھا اس سے پہلے قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ بہر حال میں کمرے کے اندر چلا گیا قائد اعظم اس وقت کچھ لکھنے میں مصروف تھے فارغ ہوئے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گرجدار آواز میں بولے!

”کیا بات ہے؟“

”میں آپ کے لیے ایک مفید دستاویز لے کر آیا ہوں میرا نام قدرت اللہ شہاب ہے اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہوں۔“ میں نے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کی کوشش کی۔

”وہ کیا ہے؟“

میں نے آگے بڑھ کر دستاویز ان کی خدمت میں پیش کی۔ بڑے سکون سے اسے پڑھتے رہے، میں کھڑا ہوا ان کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا ان کے جذبات میں ہلکا سا بھی ارتعاش پیدا نہ ہوا، ایک بار پڑھ چکے تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فرمایا!

”ہاں یہ ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔“

یہ کہہ کر دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے تین بار پڑھ چکے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے!

”یہ تم نے کہاں سے حاصل کی؟“

میں نے ساری بات کہہ سنائی۔

”تو بھرتھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے اسے اپنا قومی فرض سمجھا۔“

”اگر تم پر افتاد چڑی..... تو.....“

”میں اس کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں۔“

”کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟“

”یہ آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

دروازے سے باہر نکلنے لگا تو قائد اعظمؒ نے آواز دی!

”تمہارا نام کیا ہے؟“

قدرت اللہ شہاب۔“

”بوائے دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔“

میں خاموشی سے واپس آ گیا۔

شہاب صاحب یک لخت خاموش ہو گئے ایک دو منٹ انتظار کے بعد میں نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آگے کیا ہوا؟“

”میرا اندازہ ہے قائد اعظمؒ نے کسی اہم موقع پر یہ دستاویز وائسرائے کو دکھائی۔ وائسرائے نے کانگریسی

لیڈروں سے بات کی، انہیں پریشانی لاحق ہوئی کہ اتنی اہم دستاویز چوری ہو کر قائد اعظمؒ تک کیسے پہنچی، ہائی کمان نے

یہ معلوم کرنے کے لیے کس وزیر اعلیٰ کی دستاویز گم ہوئی ہے ایک عجیب ترکیب سوچی تمام وزراء اعلیٰ کو لکھا کہ فلاں

ہدایت نامہ لوٹا دیا جائے، مہتاب صاحب کیا لوٹاتے؟ ہائی کمان نے انہیں سخت ست کہا وہ میرے پاس آئے اور کہا

ایک اہم دستاویز گم ہو گئی ہے میں نے پوچھا کیا وہ دستاویز اس موضوع پر تھی، کہنے لگے ہاں میں نے بتایا وہ تو میں

قائد اعظمؒ کو دے آیا ہوں، میں ہری کشن مہتاب کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے مجھے اس کے سوا اور کچھ

نہ کہا۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے بلا تامل جواب دیا!

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن کچھ تقاضے اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ لطف کی بات یہ کہ انہوں نے تقسیم کے بعد بھی مہینہ بھر مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کیا۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ جناب حفیظ جالندھری تشریف لے آئے اور پھر گفتگو کا رخ ایسا بدلا کہ ہماری اردو

زبان کی ہر آن بدلتی ہوئی حیثیت کی طرح پھر اپنے مرکز تک نہ پہنچ سکا۔ وہی آدھی رات اور وہی وعدہ سرشام۔

تیسری شام شہاب صاحب تھکے تھکے نظر آئے۔ خود ہی کہنے لگے:

”قومی اسمبلی کا بجٹ سیشن جاری ہے۔ آج وہاں حاضری تھی۔ بس تھک ہی تو گیا اور کام بھی کچھ نہ ہوا۔ کتنا اچھا

ہو ہم جو وقت بجٹ پر طول طویل بحثوں میں ضائع کرتے ہیں اسے مفید اور تعمیری انداز میں صرف کر سکیں۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بجٹ پر بحث نہ ہوا کرے؟“

”جی نہیں، بجٹ تو ہماری زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اس لیے چھان پھنگ ضروری ہے لیکن میرے خیال میں جس بات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اسے پوری اہمیت نہیں دی جاتی۔ آپ ایک سال کا بجٹ منظور کرتے ہیں اس پر خوب لے دے ہوتی ہے، لیکن جب دوسرا سال آتا ہے، تو یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ جو بجٹ پچھلے سال منظور کیا گیا تھا اس پر حقیقی سپرٹ کے ساتھ عمل ہوا بھی ہے۔ ہر نیا سال نئے بجٹ کے ہنگاموں میں ڈوبا رہتا ہے۔ بلاشبہ حساب کتاب کی ایک کمیٹی موجود ہے جو اس بات کا جائزہ لیتی ہے کہ رقوم بجٹ کے مطابق خرچ ہوئیں یا ان میں بے قاعدگیاں ہوتی رہیں مگر یہ کمیٹی صحیح معنوں میں مؤثر ثابت نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ 67ء میں بالعموم 63ء یا 64ء کی رقوم کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے 64ء کی رقوم ایک افسر نے بجٹ کے مطابق خرچ نہیں کیں۔ اس کا جائزہ آپ تین برس کے بعد لے رہے ہیں۔ اب وہ افسر کہیں اور جا چکا ہے۔ لامحالہ اصل شخص احتساب سے بچ جائے گا۔ احتساب کا کام سال بہ سال ہونا چاہیے اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ قومی اسمبلی پانچ برس کا بجٹ ایک بار منظور کرے اور اس کے بعد ہر سال صرف احتساب کا کام کرتی رہے۔ اس سے ایک طرف حکومت بھی ہر سال بجٹ بنانے کی دوسری اور اخراجات سے بچ جائے گی اور دوسری طرف عوامی احتساب کی گرفت بھی مضبوط رہے گی۔“

”خیال تو اچھا ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

بات چلتے چلاتے ادب پر آنکھیں میری پوچھا:

”ترقی پسند ادب کی تحریک سے آپ نے کس قدر اثر قبول کیا؟“

”میں اس تحریک سے کیا متاثر ہوتا، ہمارے راستے جدا ہیں میں زندگی کے بارے میں مثبت نقطہ نظر رکھتا ہوں اور وہ تحریک منفی بنیادوں پر اٹھی ہے۔ زندگی میں صرف انتشار ہی تو نہیں ہے، اس میں ایک حسین رابطہ بھی ہے۔ بالکلین اور رعنائی بھی ہے آخر میرے قلم کا موضوع یاسیت اور انتشار ہی کیوں ہو؟ میرا قلم انسانوں میں شوق تعمیر کیوں نہ ابھارے؟“

✓ ”پھر میں دینی اور اخلاقی تہذیب رات پر یقین رکھتا ہوں۔ ان تہذیب رات کے بغیر مجھے اپنی زندگی بے معنی نظر آتی ہے اور میں اپنے آپ کو حیوانِ ناطق سمجھنے لگتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک میں یہ عنصر تقریباً تقریباً مفقود ہے۔“

”اس تحریک کے علمبردار تقسیم برصغیر کا مذاق اڑاتے رہے اور خلیق پاکستان کا حیات آفریں عمل ان کے سینوں میں جوش و خروش پیدا نہ کر سکا۔“

آج رات ابنِ انشا ہماری گفتگو میں شامل رہے۔ ایک بار پھر آدھی رات کتاب زندگی سننے سننے میں گزر گئی۔

”کل پھر حاضر ہوں گا۔“ میں نے قدرے شرماتے ہوئے رکتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کا گھر ہے، جس وقت دل چاہے بے جھجک آجائیے۔“ جناب شہاب کی آواز میں وہی پیاری سی سادگی تھی۔

اس شام میں یہ جہیہ کر کے آیا تھا کہ صرف شہاب صاحب کے خاندانی حالات اور ان کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ وہ حسبِ معمول تنہا لاہوری میں بیٹھے تھے۔ میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا:

”مجھے ان تین چار دنوں میں آپ کے ارد گرد آدمیوں کا جھگڑا نظر نہیں آیا۔ ٹیلی فون کی کھنٹی بھی دو تین مرتبہ

جی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ کچھ بھی نہیں“ انہوں نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”در اصل مجھے دربارداری کا شوق نہیں اس سے

بھرتا ہے اور آدمی کوئی کام نہیں کر پاتا۔ خوشامد کرتا ہوں نہ سنتا ہوں، پھر جھگڑا کس لیے ہو؟ اس کے علاوہ میرا یہ اصول ہے کہ کسی کو جھوٹی توقعات میں مبتلا نہیں کرتا اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں کہ کسی کے اعتماد کو فریب نہ دوں۔ مجھ میں ہزار کوتاہیاں اور خرابیاں سہی، لیکن اس معاملے میں میرا ضمیر پوری طرح صاف اور مطمئن ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سنانا ہوں۔ یہ واقعہ اس لیے سنارہا ہوں کہ اس کی گواہی دینے والے ابھی ملک میں موجود ہیں۔

”غلام محمد کے آخری ڈیڑھ دو برس خاصی بدحواسی کے تھے۔ میں کابینہ کے ارکان سے ملتا تو انہیں احساس دلاتا

کہ آپ لوگ مفلوج گورنر جنرل کو کس لیے برداشت کر رہے ہیں۔ کیا قوم کی خیر خواہی کا کچھ بھی احساس نہیں؟ میں نے

یہ بات کئی بار دہرائی بالآخر ایک وقت ایسا آ گیا جب کابینہ نے غلام محمد سے نجات پانے کے لیے پرتول لئے۔ اب سوال یہ تھا کہ گورنر جنرل سے استعفیٰ کیونکر حاصل کیا جائے۔ کابینہ کے سینئر اراکین نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور کہا: غلام محمد تم

پر بہت اعتماد کرتا ہے، بس تم کسی طرح سے استعفیٰ کے کاغذ پر دستخط کراؤ۔ میں نے جواب دیا: میں فریب سے کام نہیں

لے سکتا۔ میں دستخط کرنے سے پہلے یہ ضرور بتاؤں گا کہ یہ آپ کا استعفیٰ ہے۔ انہوں نے کہا: اس طرح کام بگاڑ جائے گا اور گورنر جنرل کبھی دستخط نہ کرے گا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے۔

”مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی حضرات نے دھوکا دے کر غلام محمد سے استعفیٰ کے کاغذ پر دستخط

کروانے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ انہوں نے مجھے طعنے دیے کہ خود ہی تو ہمیں اس کے خلاف اکساتا تھا اور

جب وقت آیا، تو پیچھے ہٹ گیا۔ جواب میں ایک ہی بات کہی: میں اچھے کام کے لیے بھی جھوٹ اور فریب کو جائز نہیں سمجھتا۔ اگر آپ مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں، تو مجھے صاف گوئی اور دیانت کا راستہ اختیار کرنے دیں۔ مجبور ہو کر

انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ میں نے استعفیٰ کے کاغذات غلام محمد کے سامنے رکھ دیے اور سب کچھ بتا دیا۔ وہ

ایک لخت برہم ہو گئے اور کابینہ کے ارکان کو گالیاں دیں۔ میں نے کہا اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ اگر آپ نے

از خود استعفیٰ نہ دیا، تو کابینہ آپ کو برطرف کر دے گی۔ ایک دو منٹ سوچنے کے بعد گورنر جنرل نے اپنے استعفیٰ پر دستخط کر دیے۔“

شہاب صاحب وضو کرنے کے لیے چلے گئے اور میں ان کی باتوں پر رُک رُک کر غور کرتا رہا اور پھر اپنے دامن پر

نظر ڈالی، اس میں کھوٹے سکوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

نماز کے بعد اوپر والی منزل میں جم کر بیٹھے اور رات کے گیارہ بجے انٹرویو مکمل کر کے اٹھے۔ میں نے اس سوال سے آغاز کیا تھا:

”آپ کے والدین نے آپ کی سیرت سازی میں کیا کردار ادا کیا؟“

”کردار سازی میں میرے والدین کا اہم ترین حصہ ہے۔ ماں جی فطری سادگی، دولت سے بے نیازی اور

صاف ستھری زندگی کی منہ بولتی تصویر تھیں۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں: تین جوڑے سوتی

کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے، ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

”کھانے پینے میں وہ کپڑے لٹے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔“

”کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام اپنے ہاتھوں انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا، تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔“

”ان کی سادگی کا ایک واقعہ نہایت حیرت انگیز اور معصوم ہے۔ میرے والد عبداللہ صاحب گلگت کے گورنر تھے۔ وہاں ہر قسم کے احکامات گورنری کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا، تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا:۔

”بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں، لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ؟“ عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھرک انھی اور بے اعتنائی سے فرمایا: بھانگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے، گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن بھر میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

مذاق کی چوٹ تھی عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہوگئی، لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اسی غم میں وہ اندر ہی اندر گڑھنے لگیں۔

کچھ عرصے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ تھی، جلال میں آگئی، ہائے! ہائے! ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ کی خبر لیں۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے، تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضع دار تھے: چنانچہ مہاراجہ نے حکم کیا: ”آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت کے نام سے پکارا جائے۔“

یہ تھیں ماں جی جن کی آغوش میں میری تربیت ہوئی۔

والد صاحب کی زندگی بھی عجیب و غریب مراحل سے گزری۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا، تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد بہن پڑی ہے: چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ گئے۔ زراور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھوں گروی نہ رکھی جاسکے، چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفہ پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی میں ریکارڈ قائم کیا۔

”اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے انہوں نے اپنا

خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بکالیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھا اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وچیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے پچھرا ہو گئے۔

”سر سید نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوا دیا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

”اس حرکت پر سر سید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔“ کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیجئے ہو؟“ سر سید نے کڑک کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“ عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ نکالنا جواب سن کر سر سید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لائقوں، مکتوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخاست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا:

”اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔“

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے، اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے زیادہ اوروں، افتادہ اور دُشوار گزار مقام گلگت نظر آیا: چنانچہ وہ ناک کی سیدہ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

”والد صاحب اپنے بچوں کی زندگی میں کم دخل دیتے تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے اپنے قریب بلایا اور فرمایا: ”میں تمہیں دو ایسی نصیحتیں کرتا ہوں۔ اگر تم نے ان پر عمل کیا، تو زندگی بھر اطمینان سے رہو گے۔“

✓ ”ایک یہ کہ صرف اللہ سے ڈرو۔“

✓ ”دوسری یہ کہ کسی کی پیٹھ پیچھے وہی بات کہو جو تم اس کے منہ پر بھی ڈہرا سکو۔“

رات کے سکوت میں ان واقعات کا تاثر بہت گہرا ہو گیا تھا۔

شہاب صاحب کچھ اپنی زندگی کے حالات بتائیے؟

شہاب صاحب نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ 1920ء میں گلگت میں پیدا ہوئے سکول کے کچھ مرحلے سرینگر اور جموں میں طے کیے کشمیر میں پلٹ کر واپس آئے تو انبالہ ضلع میں اپنے آبائی گاؤں چمکور صاحب بھیج دیے گئے وہاں خالصہ ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا ایف ایس سی اور بی ایس سی کے اسی زمانے میں ایک خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ انگلستان کی ایک علمی انجمن نے انگریزی مضمون نویسی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ منعقد کیا تھا، شہاب صاحب نے بھی 85 صفحے کا ایک مضمون بھیج دیا 19 ہزار مضامین میں سے ان کا مضمون سب سے بہتر قرار دیا گیا اور انہیں اول انعام ملا اس موقع پر قائد اعظم، مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو کے علاوہ دیگر ممالک کے مشاہیر نے بھی انہیں مبارکباد کے خط لکھے۔

بی ایس سی کے بعد انہوں نے سائنس چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور 1941ء میں آئی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔

ملازمت کا آغاز صوبہ بہار سے ہوا لیکن جوہمی بنگال میں سیلاب اور قحط کی قیامت آئی شہاب صاحب نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات وہاں منتقل کر والیں اس کے بعد دو سال اڑیسہ میں رہے۔

آزادی کے بعد جب کشمیر کی جنگ شروع ہوئی تو آپ آزاد کشمیر چلے آئے اور سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھال کر آزاد کشمیر کی پہلی حکومت کی تنظیم و تشکیل میں حصہ لیا۔ کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا تو آپ مزید تعلیم وغیرہ کے لیے ہالینڈ میں چلے گئے۔ وہاں ایک برس رہ کر 1953ء میں واپس آئے راستے میں حج کا فریضہ ادا کیا اس کے بعد تین عمرے بھی کر چکے ہیں۔

1954ء کو گورنر جنرل کے سیکرٹری تعینات ہوئے اور قومی سیاست کا زیر و بم دیکھتے ہوئے 1962ء تک صدر مملکت کے پرسنل سیکرٹری رہے پھر 1963ء کے آخر میں پاکستان کے سفیر نامزد کر کے ہالینڈ بھیج دیے گئے۔

”میری زندگی پرسکون لیکن ملازمت خاصی ہنگامی رہی ہے۔“

”آپ اپنی کس تخلیق کو شاہکار سمجھتے ہیں؟“

”ماں جی۔“

آپ کو کس ادیب کا انداز نگارش سب سے زیادہ پسند ہے؟“

”انگریزی میں آرائل سٹیونسن کا اردو نثر میں غالب کے خطوط اور نظم میں اقبال کا“

”آپ اپنے نام کے ساتھ شہاب لکھتے ہیں کیا آپ کا تعلق کسی صوفی خاندان سے ہے؟“

”لفظ شہاب کے پیچھے بہت سے دلچسپ واقعات کی کڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت تفصیل سے

عرض کروں گا۔“

شہاب صاحب سے رخصت ہوتے وقت خدا جانے یہ شعر کیوں یاد آیا کبھی کبھی دل کی بے کھجیاں اور نادانیاں بڑی بھلی لگتی ہیں۔

آسودگی سوختہ جاناں ہے قہر میر

دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بکھی ہے آگ

”اردو ڈائجسٹ“۔ نومبر 1967ء

انٹرویو:

طاہر مسعود

سوال۔

پچھلے دنوں اسی شہر میں اکادمی ادبیات پاکستان نے ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس منعقد کی جو بہت کامیاب رہی۔ آپ نے اپنے زمانے میں بہت سی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ بلکہ ادبی کانفرنسیں منعقد بھی کرائی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے ایسی کانفرنسیں ادبی تخلیقات کی پیداوار یا اسے فروغ دینے میں کس حد تک معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں؟

مجھے ایسی کانفرنس کا ایک ہی فائدہ نظر آتا ہے کہ ادیبوں کی ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی کانفرنسوں کی مجھے کوئی افادیت نظر نہیں آتی۔

قدرت اللہ شہاب:

ایسی کانفرنس جس کے انعقاد پر لاکھوں روپے خرچ کیے جائیں ان کا بس اتنا ہی سا فائدہ ہے؟

سوال۔

جی ہاں! ان کانفرنسوں کا مقصد نشستہ، گفتہ، خوردند اور برخاستہ ہی ہوتا ہے۔ میں اکادمی کی چار میں سے دو کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ مجھے تو ان میں یہی فائدہ نظر آیا ہے۔

شہاب:

آپ کے خیال میں یہ کثیر رقم قومی سرمائے کے ذیل میں نہیں آتی؟ یعنی اس رقم کو کسی مفید علمی کام میں صرف کیا جائے تو کیا زیادہ بہتر نتائج سامنے نہیں آئیں گے؟

سوال۔

میں اس کا کیا جواب دوں؟ جب ہم نے گلڈ بنایا تھا تو ترستے رہتے تھے کہ اتنی رقم جو آج ایک کانفرنس میں خرچ کی جاتی ہے۔ ہمیں یکمشت مل جائے تو ہم کیا کچھ کر ڈالیں لیکن گلڈ کو پورے سال میں صرف ایک لاکھ روپے ملتے تھے جن میں سے آدھی رقم مشرقی پاکستان والے خوردند لیتے تھے اور آدھی رقم مغربی پاکستان کے حصے میں آتی تھی گو گلڈ نے بھی کوئی ایسا خاص تیر تو نہیں مارا بس کاپی رائٹ ایکٹ یا رائٹروں کی بہبود کے لیے فنڈ مخصوص کر لیا اور حقیقت یہ ہے کہ رائٹرز گلڈ نے اکیڈمی آف لیٹرز کے قیام کا منصوبہ اکیڈمی آف فرانس کی طرز پر بنا کر پیش کیا تھا لیکن وہ منصوبہ اس قسم کی اکیڈمی کا ہرگز نہیں تھا جو آج آپ کو نظر آ رہی ہے۔ یہ تو ایک ڈیپارٹمنٹل قسم کی چیز ہے۔

شہاب:

اکادمی ادبیات کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ اس کا مقصد ادیبوں اور مارشل لاء حکومت کے درمیان ایک رابطے کا قیام ہے اور بالخصوص یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ ادیب مارشل لاء کے مخالف نہیں حامی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

سوال۔

یہی الزام رائٹرز گلڈ پر لگتا تھا کہ گلڈ ایوب خاں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ لیکن گلڈ بنیادی طور پر ادیبوں کی انجمن تھا۔ اس کے عہدیدار ادیب تھے۔ اس کے انتخابات ہوتے تھے اور سب کچھ جمہوری ماحول میں ہوتا تھا لیکن اکادمی میں تو یہ صورت موجود نہیں ہے؟ جی ہاں! یہ درست ہے، اکادمی میں تو سارے نامزد لوگ ہیں جبکہ گلڈ میں انتخابات ہوتے تھے۔ گلڈ یونہی تو نہیں بن گیا تھا۔ مولوی عبدالحق، ابن انشاء، جمیل الدین عالی، عباس احمد عباسی، شاہد دہلوی وغیرہ ان لوگوں نے مل کر بنایا تھا۔ ان کی آپس میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی جس میں گفتگو ہوئی کہ حکومت زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب لانے کے دعوے کر رہی ہے لیکن ادب کے شعبے میں اب تک کچھ نہیں ہوا لہذا اس میں بھی کچھ ہونا چاہیے تو یہ سات آٹھ آدمی میرے پاس آئے۔ میں اس وقت ایوب خاں کے پرسنل سیکرٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو میں نے کہا کہ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے البتہ آپ لوگ دونوں دنگ سے رائٹرز کو اکٹھا کریں اور ان سے پوچھیں کہ کیا کرنا چاہیے میں نے کہا کہ مقصد ہمارا یہ ہونا چاہیے کہ اگر حکومت رائٹرز کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہے تو ادیب اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اس کے خلاف لڑ سکیں۔ یہ بات ہم اپنے منشور میں بیان نہیں کر سکتے لیکن ہمارے ذہن میں مقصد یہی ہونا چاہیے تو پھر بارہ رائٹرز اکٹھے ہوئے اور 160 روپے کے چندے سے تنظیم کا کام شروع ہوا۔ بعد میں جمیل الدین عالی سے کچھ لوگوں کے تعلقات تھے ان سے چندہ لیا گیا پھر ملک بھر کے ادیب ایک جگہ جمع ہوئے جن میں 62 ادیب مشرقی پاکستان کے تھے اور بقیہ مغربی پاکستان کے۔ وہ تین دن بیٹھے، بڑی لڑائیاں ہوئیں، زبانوں پر اور دیگر مسائل پر بالکل اسمبلی کا منظر تھا۔ طے یہ ہوا کہ گلڈ کو ادیبوں کی انجمن ہونا چاہیے۔ اسے ادب اور ادبی نظریات سے لاطعلق رہنا چاہیے۔

یعنی گلڈ ادیبوں کے غیر ادبی مفادات کے تحفظ کے لیے قائم ہوئی تھی؟

جی ہاں! جیسے صحافیوں کی انجمن ہوتی ہے یا جیسے ٹریڈ یونین۔

آپ اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلے میں چند ایسی تجاویز پیش کرنا چاہیں گے جس سے مفید نتائج برآمد ہوں؟

میرا خیال ہے کہ دنیا بھر کی اکیڈمیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہی خطوط پر ایک ایسی اکیڈمی بنائی جانی چاہیے جو ہمارے ماحول اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ اس اکیڈمی کا تعلق حکومت سے نہ ہو۔ گلڈ کا حکومت سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ ہم اس سی گرانٹ لیتے تھے۔ مجوزہ اکیڈمی کا درجہ اتنا بلند ہو کہ ہر ادیب کے لیے وہ مرنے سی پہلے اس کا ممبر بن جائے، ایک اعزاز کی بات ہو جیسے فرانس کی اکیڈمی آف لیٹرز ہے کہ اس کے مخصوص ممبران ہوتے ہیں اور ایک کی جگہ خالی ہو جیسی دوسرا اس میں نامزد ہوتا ہے۔

شہاب:

سوال۔

شہاب:

سوال۔

شہاب:

سوال۔

شہاب:

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے پچھلے دنوں ایک مذاکرے میں کہا کہ گلڈاڈیوں کو نقصان پہنچانے کا موجب بنا۔ ادیب جنہیں پتہ نہیں تھا کہ شہرت حاصل کرنے، بیان دینے، پریس کانفرنس کرنے کی کیا اہمیت ہے؟ گلڈاڈیوں نے انہیں اس راہ پر لگایا اور یہ کہ گلڈاڈیوں کو ایوب خان کے جال میں پھانسنے کا ایک حربہ تھا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

سوال۔

ایسی بات نہیں ہے، میں اس کا گواہ ہوں اور اپنی کتاب ”شہاب نامہ“ میں راسخ گلڈاڈی پر پورا ایک باب لکھ رہا ہوں جس میں ان سارے الزامات کی وضاحت موجود ہوگی۔ مختصر آیوں سمجھیے کہ گلڈاڈی مخالفت دو سطحوں پر تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ گلڈاڈیوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے اور حکومت کے اندر بعض افسران کا تاثر تھا کہ یہ سرخوں کی پناہ گاہ ہے اور وہ کہتے بھی تھے کہ گلڈاڈی فیض اور احمد ندیم قاسمی کے لیے بنا ہے۔ ”نوائے وقت“ گلڈاڈی کے مخالف تھا اور اس کے خلاف اکثر لکھتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں میری حکومت میں پیشی بھی ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ الزام غلط ہے کہ اس میں صرف بائیں بازو کے لوگ شامل ہیں۔ اس میں فیض اور قاسمی ہیں تو حفیظ جالندھری اور نسیم جازوی بھی ہیں۔

شہاب:

بعد میں حکومت اور گلڈاڈی کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے تھے؟ حکومت سے نہیں بلکہ چند لوگوں سے اختلافات ہوئے تھے۔

سوال۔

شہاب:

کن لوگوں سے؟

سوال۔

چھوڑیے نام کیا لینا۔

شہاب:

یہ فرمائیے کہ آپ ذاتی طور پر زندگی میں ادب کو کس حد تک اہمیت دینے کے قائل ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک ادب کوئی ایسی قابل قدر قیمتی جنس ہے کہ جس کے لیے دنیاوی آلائشوں کو نجات دیا جائے؟

سوال۔

اس کا انحصار ادیب کے رویے پر ہے کہ وہ ادب کو کس شدت سے اہمیت دیتا ہے۔ اگر وہ کل وقتی ادیب ہے تو ظاہر ہے ادب اس کا اوڑھنا بچھونا ہوگا اگر اس کا پیشہ کچھ اور ہے تو ظاہر ہے ادب اس کے لیے محض ایک مشغلہ ہوگا۔ اس لیے کوئی اصول متعین نہیں کیا جاسکتا۔

شہاب:

لیکن ذاتی طور پر آپ کا رویہ اس ضمن میں کیا رہا ہے؟

سوال۔

میں اسے WHOLE TIME نہیں بنا سکا۔ میرا زیادہ وقت دوسرے دفتری کاموں میں گزرا لیکن اس عرصے میں مجھے جن چیزوں نے متاثر کیا۔ ان کے بارے میں جتنا لکھنے کا موقع ملا میں نے لکھا۔

شہاب:

آپ کی دو حیثیتیں تھیں، ادیب کی اور افسر کی۔ آپ نے اپنے افسر ہونے کی حیثیت کو ادیب کی حیثیت پر مقدم جانا اور اسے زیادہ اہمیت دی جبکہ آپ میں ایک بڑے ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود تھیں؟

سوال۔

افسر ہونے کے تقاضے اتنے زیادہ تھے کہ حلال روٹی کمانے میں وقت زیادہ خرچ ہو جاتا تھا لہذا ادب کو میں اتنا وقت نہ دے سکا۔

شہاب:

اس بارے میں سوچتے ہوئے کبھی آپ کو کوئی افسوس، ملال یا پچھتاوا محسوس ہوتا ہے؟

سوال:

کوئی نہیں۔ اصل میں مجھ میں ادب کی اتنی ہی صلاحیتیں تھیں جتنا میں نے لکھا۔ اگر میرے پاس زیادہ وقت ہوتا تو بھی اتنا ہی لکھتا۔

شہاب:

آپ نے ادیب کے کل وقتی ادیب ہونے کی بات کی۔ یہ ہمارے ہاں کے ادیبوں کا بڑا اہم مسئلہ ہے کہ ایک طرف معاش کے مسائل ہیں تو دوسری طرف ادب کے مطالبات۔ ان دو چیزوں میں ان کے لیے توازن قائم رکھنا ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے یعنی اگر وہ معاشی معاملات میں پوری طرح الجھیں تو ادب کا دامن چھوٹتا ہے اور ادب کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں تو دنیاوی اعتبار سے ناکام آدمی کہلائیں۔ آپ کے خیال میں اس مسئلے کا کوئی حل ہے؟

سوال:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ادب کے سہارے ادیب زندگی نہیں گزار سکتا کیونکہ کتابیں بکتی نہیں ہیں۔ یورپ میں ایک ادیب اچھی کتاب لکھ دے تو زندگی سنور جاتی ہے جبکہ یہاں ہزار گیارہ سو سے زیادہ کتابیں چھپتی نہیں اور سالہا سال کے بعد دوسرے ایڈیشن کی نوبت آتی ہے۔

شہاب:

یہ تو مسائل اور اس کے اسباب ہوئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس کا حل کیا ہے۔ کیا آپ چاہیں گے کہ حکومت ادیبوں کے ماہانہ وظائف مقرر کر دے یا کوئی اور صورت ہو؟

سوال:

دیکھیے ہمارے ملک میں تعلیم عام نہیں ہے۔ پڑھنے والوں کی تعداد محدود ہے یا جو ہیں ان میں کتابیں خریدنے کی استطاعت کم ہے۔ میں نے اپنے زمانے میں کابینہ کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی کہ سرکاری افسرانہی تنخواہوں کا ایک حصہ کتابوں کی خریداری پر صرف کریں اور ان کتابوں کی فہرست حکومت کو فراہم کر دیں اور حکومت ان کی تنخواہوں میں سے رقم منہا کر کے کتابیں خرید کر انہیں فراہم کر دے لیکن میری اس تجویز کو پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ حکومت نے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور افسران نے تو سخت بُرا منایا۔ میری ذاتی رائے میں جب تک ملک میں تعلیم کے تناسب میں اضافہ نہیں ہوگا۔ ادیبوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

شہاب:

آپ وفاقی سیکرٹری تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے، اس حوالے سے آپ نے تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں کوئی پالیسی مرتب کی یا اس ضمن میں کسی ایسی مرتب شدہ رپورٹ پر عملدرآمد کرایا؟

سوال:

جب میں ایجوکیشن سیکرٹری بنا تو مجھے عملدرآمد کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اس زمانے کی حکومت کا رویہ قابل ذکر ہے۔ سرکاری سطح پر تعلیم کی اہمیت کے تو سبھی قائل تھے لیکن عملاً اس کے لیے کچھ کرنے پر کوئی تیار نہ تھا مثلاً میں ایک واقعہ بتاؤں۔ پنجاب کے کسی کالج میں طالب علموں میں جھگڑا ہوا۔ کالج بند کر دیا گیا۔ ایوب خاں نے مجھے گورنر مغربی پاکستان نواب کالا باغ کے پاس

شہاب:

بھیجا کہ جا کر ان سے کہو کہ کالج کھولیں کیونکہ کالج اگر نہ کھولا گیا تو لڑکوں کا سال ضائع ہو جائے گا۔ میں نے ان سے کہا کہ صدر صاحب پریشان ہیں کہ کالج کھلنے میں تاخیر ہو گئی ہے۔ نواب صاحب فرمانے لگے کہ اگر کالج بند ہے تو انہیں کیا تکلیف ہے؟ میں نے کہا وہ کہتے ہیں لڑکوں کا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے کیا ہوگا؟ میں نے عرض کیا کہ جی اس سے بڑا نقصان ہوگا۔ وہ بولے ”اگر لڑکے ساری زندگی نہ پڑھیں تو کیا ہوگا۔ میرے، تمہارے یا صدر صاحب کے باپ دادا کون سے ایم اے، بی اے تھے۔“ اب اگر اس رویے کے لوگ گورنر ہوں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعلیم کا کیا حال ہوگا؟ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں عبدالمنعم خاں تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ محب وطن ہیں اور قوم پرست بنگالی ہیں لیکن ان کے دور میں ٹیکسٹ بک بورڈ سے ایسی کتابیں منظور ہو کر تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی رہیں، جن میں پاکستان اور دو قومی نظریے کے خلاف مواد موجود تھا۔ تاریخ کی ایک ایسی کتاب کورس میں شامل تھی جو ایک ہندو مصنف نے کلکتہ میں بیٹھ کر لکھی تھی اور وہ ڈھاکہ میں چھپی تھی۔ ہم ڈیڑھ برس تک کوشش کرتے رہے کہ اس کتاب کو ہٹایا جائے، اسے مسترد کیا جائے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ مشرقی پاکستان ٹوٹ گیا لیکن وہ کتاب نہیں ہٹی چونکہ تعلیم صوبائی حکومت کی ذمہ داری تھی اس لیے ہم براہ راست پوچھ گچھ کرنے سے بھی معذور تھے۔

سوال۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ عوام بیوروکریسی سے کتنے بیزار ہیں۔ بیوروکریٹ طبقہ بھی عوام کے تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آپ ایک حساس ادیب ہونے کے علاوہ ایک کامیاب بیوروکریٹ بھی ثابت ہوئے۔ لوگ یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ بحیثیت ایک سچے ادیب ہونے کے آپ نے اس ظالمانہ نظام کا حصہ بننا کیسے گوارا کر لیا؟

شہاب:

میں اس نظام میں ساری عمر مرس فٹ رہا۔ میں 1941ء میں انڈین سول سروس میں مقابلے کے ذریعے داخل ہوا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا چونکہ جنگ چھڑی ہوئی تھی اس لیے تربیت کے لیے ہمیں انگلستان کے بجائے ڈیرہ دون میں رکھا گیا۔ تربیت کے بعد جو میری پہلی رپورٹ بھیجی گئی وہ یہ تھی کہ یہ شخص اس سروس کے لیے مکمل طور پر مرس فٹ ہے اور ایک دو سال سے زیادہ اس کے لیے اس سروس میں ٹکنا ناممکن ہوگا۔

سوال۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جتنے عرصے تک سول سروس میں رہے اس عرصے کو آپ نے انتہائی ذہنی کرب کی حالت میں گزارا ہوگا؟

شہاب:

ذہنی کرب کی حالت میں نہیں (I HAD MY WAY) جس کام کو میں ٹھیک سمجھتا تھا، اسے کرتا تھا۔ اوپر والے لوگ میرے اس رویے کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے میری ملازمت کا زمانہ نارمل نہیں گزرا۔ چار دفعہ میں نے استعفیٰ دیا۔

سوال۔

ایوب خاں کے زمانے کی بات ہے کہ قرۃ العین حیدر کا ناول ”آگ کا دریا“ شائع ہوا جس پر

کافی ہنگامہ آرائی ہوئی پھر وہ ملک چھوڑ کر چلی گئیں۔ آپ کے اس سے قریبی تعلقات تھے اور آپ حکومت کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ لہذا آپ کو اس واقعے کے پورے پس منظر کا علم ہوگا جمیل الدین عالی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ ایوب خاں کے مارشل لاء سے ناراض تھیں اور اسی وجہ سے انہوں نے ملک چھوڑ دیا۔

وہ ممکنہ اطلاعات کے فلم اینڈ پیلی کیشنز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھیں، مارشل لاء لگا تو ایک دن وہ صبح صبح میرے گھر آئی اور کہنے لگی کہ ”کیا اب ہمارے بھونکنے پر بھی پابندی ہے۔ میں نے کہا ”ہاں بالکل، تم لوگوں کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“ اس واقعے کے بعد جب گلڈ وغیرہ بنا تو وہ اس میں پیش پیش تھیں۔ پھر اس نے آگ کا دریا لکھا۔ اس کی اشاعت سے قبل وہ اس کا ضخیم مسودہ لیکر میرے پاس آئی اور کہا کہ اسے ”پڑھ لو“ میں نے کہا ”یہ بہت بھاری ہے جب چھپ جائے گا تو میں پڑھ لوں گا۔“ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسی کتاب ہوگی کہ جس کے چھپنے سے اتنا شور مچے گا۔ میں نے تو اب تک وہ کتاب نہیں پڑھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس ناول کے خلاف فضا بنانے میں بیوروکریسی کا بھی ہاتھ تھا اور کچھ لوگ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے؟

ہمارے زمانے سے بہتر صورتحال ہے۔ میں نقاد تو نہیں ہوں کہ اس طرح سے اپنی بات آپ کو بتا سکوں لیکن جو ادب لکھا جا رہا ہے، میں اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔

افسانے میں علامت نگاری اور تجریدیت کا رجحان وروثہ در آیا ہے؟

(بات کاٹ کر) جی ہاں! شروع میں تو وہ روایت عجیب لگتا تھا۔ سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا، ہر چیز میں نیا تجربہ شامل ہوتا ہے اس لیے ابتداء میں اجنبی محسوس ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں، لہذا علامتی افسانوں کے بھی لوگ عادی ہو گئے ہیں۔

جو افسانے آپ لکھیں گے یا جو لکھ چکے ہیں ان میں آپ نے ان رجحانات کے اثرات قبول کیے ہیں؟

یہ تو میں جب لکھوں گا تو آپ خود محسوس کر لیں گے ویسے میں نئی چیزوں کو سیکھنے کے سلسلے میں خاصا بوڑھا ہو چکا ہوں۔

آج کا ادیب جو کچھ لکھ رہا ہے وہ نئے رجحانات کے تحت لکھ رہا ہے لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ آج کا قاری انہی چیزوں کو پڑھ رہا ہے جو پرانی نسل کی تخلیق کردہ ہیں یعنی وہ نسل جس میں منہ سے لے کر آپ بھی شامل ہیں۔

ہر دور کا ادب اپنے اندر ایک خاص اپیل رکھتا ہے۔ پرانا ادب آج کے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ ممکن ہے آج کا ادب آنے والی نسلوں کو اپنی طرف راغب کرے۔

سوال - اس صورت میں ادب لمحہ موجود میں اپنے اثرات کس طرح مرتب کر سکتا ہے؟

شہاب: حال کے لوگ نیا ادب بھی پڑھتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے پچھلا ادب پڑھتے ہوں گے۔ اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ آپ جس پچھلی نسل کا حوالہ دے رہے ہیں اگر وہ آج ہوتی تو وہ صرف افسانہ نہ لکھتی بلکہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذرائع لکھتی۔ اخبارات میں اس کے کالم چھپتے۔ آج اظہار کے جتنے ذرائع ہیں اتنے ذرائع پہلے نہیں تھے (رک کر) مجھے علامتی افسانہ نگاروں سے کوئی شکوہ نہیں ہے مجھے ان کے افسانے پسند آتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ بزرگ ادیبوں میں سب سے منفرد نکلے کیونکہ بزرگ ادیبوں کی اکثریت علامتی افسانوں سے سخت نالاں ہے؟

شہاب: بچپن میں ہم سکول اور کالج کے زمانے میں نظموں اور غزلوں کی معنویت پر گھنٹوں غور کیا کرتے تھے۔ اسی طرح پچھلے دنوں میں نے رشید امجد اور مظہر الاسلام کی کتابیں حاصل کیں اور ان پر غور کیا۔ ایک مرتبہ کے مطالعے پر تو وہ افسانے سمجھ میں نہیں آئے۔ دوسری بار بھی نہیں آئے..... پھر آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگے۔ اب میں مزے میں پڑھتا ہوں۔ اصل میں یہ نیا اظہار ہے۔ اب ہم یہ سمجھیں کہ سائل اور آرٹ فارم وہی ہوگا جو ہمارے زمانے میں تھا تو یہ غلط ہوگا۔ زندگی میں ہر چیز بدل رہی ہے تو ادب میں بھی تبدیلیاں آئیں گی۔

سوال - آپ نئے افسانے کے مستقبل سے پر امید ہیں؟

شہاب: بہت زیادہ! میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے زمانے سے زیادہ ترقی کرے گا۔

سوال - آپ بحیثیت افسانہ نگار ٹیکنیک اور مواد CONTENT میں زیادہ اہمیت کسے دیتے ہیں؟

شہاب: دونوں چیزیں برابر ہیں۔ ٹیکنیک کا مطلب ہے پتے بازی۔ اگر CONTENT نہیں ہے تو ٹیکنیک زیادہ کام نہیں دے گی۔

سوال - آپ کا وہ افسانہ جو آپ کو سب سے زیادہ عزیز ہو؟

شہاب: مجھے اپنی دو ہی چیزیں پسند ہیں۔ ایک ”ماں جی“ اور دوسرا ”یا خدا“ یہ دونوں افسانے نہیں ہیں۔ یہ میرے مشاہدات ہیں جنہیں میں نے افسانوی رنگ میں لکھا ہے۔

سوال - ”ماں جی“ کے کردار سے آپ کی ملاقات کہاں ہوئی؟

شہاب: یہ میری والدہ ہیں جن سے میں بے پناہ متاثر تھا۔ ”یا خدا“ کے کردار مجھے 48ء میں جا بجا ملے۔ میں نے ان سب کو ”یا خدا“ میں جمع کر دیا۔ یہ میرا طویل افسانہ ہے جسے میں نے ایک ہی نشست میں لکھا۔

سوال - ایک معاصر ادیبوں میں کس ادیب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

شہاب: مجھے معاصر ادیبوں میں محمد خالد اختر کی کتاب ”چاکی واڑہ میں وصال“ نے متاثر کیا ہے۔ میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا۔

جی ہاں فیض احمد فیض نے بھی اسے اردو کا بھڑے ناول کہا ہے۔
مجھے بھی یہ کتاب بہت اچھی لگی۔

سوال:-

شہاب:-

سوال:-

وہ ایک خطرناک ناول ہے اور اسے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بھڑے ناول کا ترجمہ پڑھ رہے ہوں؟

شہاب:-

سوال:-

جی ہاں! اس کا سائل عجیب ہے اس کی دفعہ بھی اور چھوٹا بھی۔
اسلام آباد کے ادبوں میں ایک خبر گشت کر رہی ہے اور کچھ ماہ بعد یہ لگی کے ساتھ کہ یہاں ایسے ادبوں نے جو بیوروکریٹ بھی ہیں ”سلسلہ“ کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے۔ اس انجمن کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے ہیں اور اس میں شرکت شرط طریقے سے ہوتی ہے۔ آپ بھی ان اجلاسوں میں جاتے رہے ہیں۔ کیا آپ اس کے متعلق بتا سکتے ہیں؟

شہاب:-

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ممتاز مفتی بھی اس میں شریک ہوتے رہے۔ اور انگریزی جب یہاں تھیں تو انہوں نے اس کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے دن ڈش پارٹی ہوتی ہے۔ اس میں مختار مسعود مسعود مفتی، مختار زمان اور اسی طرح کے لوگ شریک ہوتے رہے ہیں۔ اور انگریزی اس کی بیک گراؤنڈ جنرل تھیں۔ ان کے جانے کے بعد فارغین بٹ اس کی بیک گراؤنڈ مقرر ہوئی تھیں۔ وہ بھی چلی گئیں تو آغا ناصر کی بیگم بیک گراؤنڈ بنی ہیں۔

سوال:-

شہاب:-

اس کی رکنیت اتنی محدود کیوں رکھی گئی ہے؟
یہ دوستوں کی محفل ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ سارے دوست جمع ہو کر خوش گپیاں کریں اور بات زیادہ پھیلے بھی نہیں اور لفظ فہمیاں بھی جنم نہ لیں۔

سوال:-

ممتاز مفتی اور اشفاق احمد نے اپنی بعض تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے آپ پینتے ہوئے بزرگ اور صوفی ہیں، ممتاز مفتی تو آپ کو اپنا بھائی بھی کہتے ہیں۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

شہاب:-

(پینتے ہوئے) یہ خرم تو میں نے نہیں کیا۔ ممتاز مفتی خاکہ اڑانے میں ماہر ہیں، افسانہ نگار بھی بڑے ہیں لہذا انہوں نے ”لبیک“ میں میرا خاکہ اڑایا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں بچپن سے نماز کا پابند ہوں پھر میں اچھے مہدوں پر بھی رہا ہوں۔ ممتاز مفتی صاحب نے غالباً یہ دو چیزیں اکٹھی نہیں دیکھیں کہ صدر کا سیکرٹری بھی ہو اور وقت آئے تو نماز بھی پڑھے۔

سوال:-

شہاب:-

لیکن وہ آپ سے ایسے واقعات بھی منسوب کرتے ہیں جو صرف صوفیوں سے صادر ہوتے ہیں؟
وہ صرف ان کی افسانہ نگاری ہے۔

سوال:-

شہاب:-

وہ کہتے ہیں کہ آپ کبھی مان کر نہیں رہیں گے کیونکہ صوفیوں میں اکسار بہت ہوتا ہے؟
انہیں ”لبیک“ لکھنی تھی اور اس کے لیے انہیں ایک کھوٹی چاہیے تھی، سو انہیں مل گئی۔ آپ یہ تو مانتے ہیں نا کہ وہ بڑے افسانہ نگار ہیں۔

سوال:-

جو واقعات انہوں نے آپ سے منسوب کیے ہیں وہ سارے کے سارے لفظ ہیں؟

انہوں نے واقعات تو کوئی ایسے خاص منسوب نہیں کیے ہیں۔ ویسے اگر کیے ہیں تو اس کے بارے میں وہی بتا سکتے ہیں۔

مثلاً وہ بتا رہے تھے کہ آپ صبح تین بجے اٹھ کر سارے اسلام آباد کا چکر لگاتے ہیں اور پھر مسجد میں نماز پڑھ کر گھر لوٹتے ہیں۔

شہاب: میں ایسی کوئی چوکیداری نہیں کرتا۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد نماز عموماً مسجد میں پڑھتا ہوں۔ نماز پڑھنے کے بعد سیر کرتے ہوئے گھر لوٹ آتا ہوں۔

سوال: آپ نے مفتی صاحب سے کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی؟

شہاب: میں نے ان سے کئی بار کہا لیکن وہ بہت ہٹ دھرم آدمی ہیں۔ انہیں ان کے موقف سے ہٹانا بہت مشکل ہے۔

سوال: یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ اعتراف نہیں کرتے؟

شہاب: پہنچا ہوا کوئی نہیں ہوتا، سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

سوال: آپ طویل عرصے تک حکومت کی شررگ کا حصہ بنے رہے۔ قوم کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے کے فیصلے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ بیوروکریسی کا آپ نے مشاہدہ کیا۔ آپ کے سینے میں ان گنت راز محفوظ ہوں گے۔ بے شمار بڑی شخصیتوں کی اصلیت سے آپ واقف ہوں گے تو کیا آپ اپنے ان مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر کوئی ناول یا کتاب لکھنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں جس میں ان حقائق سے پردہ اٹھائیں۔

شہاب: ناول تو نہیں، میں ایک کتاب ”شہاب نامہ“ کے عنوان سے لکھ رہا ہوں۔ آپ اسی کو ناول سمجھیں۔ اس کے لکھنے کا واقعہ یہ ہے کہ جب ابن انشاء بیمار ہو کر لندن گیا ہوا تھا، میں بھی وہاں تھا۔ یہ اس کی وفات سے چند ہفتے قبل کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی زندگی کا حساب لگا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب زندہ نہیں بچے گا۔ مذاق مذاق میں کہنے لگا کہ ہندو مذہب کی طرح اگر آواگون کا سلسلہ ہو تو میں یہ چاہوں گا، میں وہ چاہوں گا پھر مجھ سے پوچھا اگر تمہیں دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع ملے تو تم کیا چاہو گے؟ میں نے کہا کہ ”میں معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ یہی زندگی گزارنا پسند کروں گا جو میں نے گزاری ہے۔“ وہ بڑا حیران ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ میں ساری زندگی سیلف میڈ رہا ہوں۔ میں نے اپنی محنت سے سول سروس جوائن کی اور کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں پوسٹنگ چاہیے۔ مجھے ہمیشہ خود بخود ایسی پوسٹنگ ملتی رہی جو اہمیت کی حامل تھی۔ میرے دل میں کبھی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔ جب یحییٰ خان کے زمانے میں، میں مستعفی ہوا تو اپنی بیوی (جو اس وقت زندہ تھی) اور بچے کے ساتھ لندن چلا گیا۔ یحییٰ خان نے میری پنشن بھی جاری نہیں کی تھی، میں وہاں پندرہ پونڈ فی ہفتہ کی آمدنی پر اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ گزارا کرتا رہا جو مجھے حکومت برطانیہ دیگر بیروزگاروں کی طرح ادا

شہاب:
 ہمیشہ نامہ لکھ رہے
 تھیں

کرتی تھی لیکن میرے لیے کبھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ ان حالات میں بھی مجھے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا نا پڑا نہ میں نے کبھی تنہائی محسوس کی اور نہ ہی فرسٹرڈ ہوا۔ ابن انشاء میری باتیں کاغذ پر لکھتا رہا۔ آخر میں کہنے لگا کہ تم ان باتوں کو جمع کر کے کتاب لکھو۔ اس طرح میں نے ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا جو ”شہاب نامہ“ کے نام سے شائع ہوگی۔

کیا یہ آپ کی خودنوشت سوانح عمری ہوگی؟

سوال۔

بچپن سے لے کر اب تک جو واقعات میں نے دیکھے ہیں ضروری نہیں کہ وہ واقعات سب کو متاثر کریں لیکن جنہوں نے مجھے متاثر کیا میں اسے لکھ رہا ہوں۔ اس کا تعلق تاریخ سے نہ ہوگا۔ یہ شاید ناول بھی نہ ہو، پتہ نہیں یہ سوانح عمری بن پائے گی یا نہیں۔ یہ ملی جلی تحریر ہوگی۔ اس کا ہر باب اپنی جگہ مکمل ہوگا اور سارے ابواب تسلسل میں بھی ہوں گے۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ میں لکھ چکا ہوں۔ ایوب خان کے زوال کے ذکر سے آگے ابھی مزید لکھنا ہے۔

شہاب۔

کیا آپ نوٹس کی مدد سے کتاب لکھ رہے ہیں یا صرف یادداشت کے سہارے؟
میرے ذہن میں ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ میں کبھی نہ کبھی ان واقعات کو لکھوں گا لہذا میں پابندی سے نوٹس لیتا رہا ہوں۔

سوال۔

شہاب۔

اب ذرا عمومی دلچسپی کے سوالات۔ آپ ایوب خان کے نزدیک رہے ہیں اس لیے آپ بہتر جانتے ہوں گے کیا ایوب خاں ایک ادب شناس حکمران تھے۔ انہیں ادب وغیرہ سے دلچسپی تھی؟
بالکل نہیں۔ وہ ادب کے معاملے میں بالکل کور تھا۔ ایک واقعہ سناتا ہوں اس سے اندازہ ہو جائے گا۔ اس زمانے میں گلڈ کے تحت ”اداس نسلیں“ والے عبداللہ حسین، احمد ندیم قاسمی اور جعفر طاہر کو ایوارڈ دیے گئے تھے۔ جعفر طاہر فوج میں نان کمیشنڈ افسر تھے۔ تقسیم ایوارڈ کے موقع پر جعفر طاہر کو ایوارڈ وصول کرنے وردی میں ملبوس ہو کر آئے تھے۔ ایوب خان کو ایوارڈ تقسیم کرنا تھا۔ جب انہوں نے جعفر طاہر کو وردی میں ملبوس دیکھا تو سب سے پہلے ان کی طرف آئے اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پوچھتے رہے کہ کہاں کے رہنے والے ہو وغیرہ۔ میں بھی قریب کھڑا تھا۔ ایوب خاں مجھے دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دے کر کہنے لگے ”دیکھا فوج میں بھی کتنے پڑھے لکھے اور لائق فائق لوگ ہیں۔“ جعفر طاہر نے یہ سن کر دھیمے سے کہا ”جی حضور! مگر صرف نان کمیشنڈ رینک تک“ ایوب خاں نے یہ بات سن لی مگر کچھ کہا نہیں۔ اسی طرح ایک واقعہ اور ہے۔ بابائے اردو کو انجمن ترقی اردو سے ایک سازش کے تحت نکال دیا گیا۔ یہ بڑی گڑبڑی بات تھی۔ میں نے ایوب خاں کو بتایا کہ ”صاحب بابائے اردو کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے، آپ انہیں وقت دیں۔ ایوب خاں بڑا حیران ہوا کہنے لگا ”یہ بابائے اردو کیا ہوتا ہے۔ یہ آدمی ہے، کتاب ہے یا کیا ہے۔“ ”جی آدمی ہے۔“ خیر وقت دیا گیا۔ ایوب خاں سے بابائے اردو کی ملاقات ہوئی اور مسئلہ حل ہوا۔ مارشل لاء کے ہم نے دو ہی فائدے اٹھائے ایک تو کاپی رائٹ ایکٹ بنوایا اور دوسرا ڈاکٹر

سوال۔

شہاب۔

عبدالحق کو انجمن کا دوبارہ صدر بنوایا۔ ایوب خاں بابائے اردو سے ملاقات کے دوران ”بابا۔ بابا“ کہتے رہے اور یہ بالکل بھول گئے کہ ان کا اردو سے بھی واسطہ ہے یا نہیں۔

ممکن ہے ایوب خاں کا ادب سے تعلق ہوتا تو ملک کے مسائل سنجیدگی سے محسوس کرتے؟
(ہنستے ہوئے) شاید امید تو رکھنی چاہیے، ویسی گلڈ کو جتنی بھی کامیابی ہوئی اس میں ایوب خاں کی حمایت کا عمل دخل تھا۔

سوال۔

شہاب:

حکومت کے اندر گلڈ کے جتنے مخالفین تھے ان میں الطاف گوہر صاحب کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ یہاں انہوں نے گلڈ کی طرز پر ایک اور انجمن قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس چپقلش کے نتیجے میں گلڈ کو کافی نقصان پہنچا تھا اس کی تفصیلات کیا ہیں؟
میں یہاں نہیں تھا۔ ہالینڈ چلا گیا تھا۔ البتہ اس چکر میں جمیل الدین غالی کو خاصا نقصان پہنچا بلکہ انہیں نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

سوال۔

شہاب:

اس معاملے کا آپ کو علم تو ہوگا؟
میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ گلڈ کی مخالفت ادیبوں، افسروں، فوجی جنرلوں اور بعض اخباروں میں تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے۔

سوال۔

شہاب:

گلڈ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے بعض اہم کتابوں کو ایوارڈ سے محروم رکھا؟
اس میں تو ہمیشہ جھگڑا رہے گا۔ یہ تو تجویز کی صوابدید پر ہے۔ اس معاملے میں دو گروپ ہمیشہ رہیں گے۔

سوال۔

شہاب:

لیکن ”آگ کا دریا“ تو بڑی کتاب تھی۔
جی ہاں! آگ کا دریا اور علی پور کا ایلٹی بڑی کتابیں تھیں انہیں ایوارڈ نہیں ملا لیکن یہ گلڈ کی خوبی تھی کہ وہ کسی جج پر پریشردانے سے گریز کرتا تھا پھر شاہد احمد دہلوی اور وقار عظیم جیسے منصفین بھی تھے جو کسی پریشرد کو قبول نہ کرتے۔

سوال۔

شہاب:

آپ کے خیال میں گلڈ کا قیام ادیبوں کے حق میں مفید رہا؟
گلڈ نے ادیبوں کو بعض ٹھوس فائدے پہنچائے۔ انعام وغیرہ تقسیم ہوئے۔ ان کی بیماری یا وفات کی صورت میں مدد کی گئی۔ وہ سب گلڈ کے زمانے میں شروع ہوا۔ گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ساری زبانوں کے ادیبوں میں بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنا ہے۔ گلڈ سے ادیبوں کی عزت نفس میں اضافہ بھی ہوا۔

سوال۔

شہاب:

آپ اس بارے میں کس طرح سوچتے ہیں کہ ملک میں طویل عرصے تک مارشل لاء رہا۔ لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہیں رہی۔ بنیادی حقوق معطل ہوتے رہے۔ آدھا ملک الگ ہو گیا۔ ان حالات میں ہمارے ادیبوں نے جو ادب تخلیق کیا اس میں مذکورہ قومی مسائل کی جھلک بے حد کم نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں کوئی بڑا ناول یا افسانہ نہیں لکھا گیا۔ اسے آپ

سوال۔

ادیبوں کی بے حسی کہیں گے یا بے توجہی، یا اس کا کیا تجزیہ کریں گے؟

اسے بے حسی تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ادیب بے حس تو ہوتے نہیں ہیں، بس توجہ اس طرف نہیں گئی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ تقسیم ہند پر تو لکھا گیا ہے لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کوئی بڑی چیز سامنے نہیں آئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ غالباً اس کی سیاسی وجوہات ہوں گی کہ اس واقعے کے بعد ایسے حالات پیش آئے جس میں ایسی چیز کا لکھنا یا چھاپنا ممکن نہ ہوگا۔ اصل میں یہ مارشل لاء جو ہوتا ہے یہ لکھنے والے کے ذہنوں پر بندش لگا دیتا ہے۔ ہزار کہیں کہ کوئی پابندی نہیں ہے لیکن یہ از خود ہو جاتی ہے مثلاً ایوب خاں کے زمانے میں انہیں کنونشن میں بلایا گیا تھا۔ بحیثیت سیکرٹری کے میرا فرض تھا کہ انہیں بتاؤں کہ اس کنونشن میں کیا تقریر کرنی ہے؟ لیکن میں نے ان سے بہانہ کر دیا کہ وہاں آپ کو کوئی تقریر وغیرہ نہیں کرنی ہے۔ اصل میں، میں یہ سننا چاہتا تھا کہ ان کی ادیبوں کے بارے میں اصل رائے کیا ہے؟ ظاہر ہے میں بتا دیتا تو وہاں میری لکھی ہوئی تقریر پڑھتے۔ اس لیے نہ صرف میں نے ان سے جھوٹ بول دیا بلکہ چھپے ہوئے پروگرام میں بھی ان کی تقریر کا ذکر غائب تھا۔ ایوب خاں کنونشن کے آخری سیشن میں آئے۔ کنونشن کنٹرک ہال میں ہو رہا تھا۔ انہیں صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے اس عرصے میں انہیں ہر محفل میں صدر محفل بننے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس سے ہٹ کر کسی محفل میں شرکت کا تصور ان کے ذہن میں موجود نہیں تھا۔ لہذا وہ جونہی ہال میں داخل ہوئے، لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سٹیج کی طرف اوپر بیٹھنے کے لیے بڑھے۔ خیر انہیں بڑی مشکل سے میں نے روکا۔ قرۃ العین حیدر نے ان کے کوٹ کا کنارہ کھینچا۔ عالی نے راستہ آگے سے روکا، یوں انہیں ہم لوگ گھیر گھا کر اگلی صف میں لے آئے اور سامعین کے ساتھ بیٹھا دیا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو بحیثیت صدر کے سٹیج پر جگہ دی گئی۔ میرے لیے مشکل یہ پیش آئی کہ عالی صاحب سٹیج سیکرٹری تھے۔ میں گلڈ کا سیکرٹری جنرل منتخب ہو چکا تھا اور سٹیج پر ڈاکٹر صاحب کے بائیں جانب بیٹھا ہوا تھا۔ میں بڑا پریشان تھا کہ میرا باس نیچے بیٹھا ہوا ہے اور میں سٹیج پر چڑھا بیٹھا ہوں۔ خیر ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر سجاد حیدر وائس چانسلر راجستھا یونیورسٹی وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ صدر ایوب سنتے رہے۔ پھر ڈاکٹر عبدالحق نے صدر ایوب کو دعوت دی کہ اب آپ آکر کچھ فرمائیں۔ ایوب خان نے نیچے سے مجھے گھورا۔ میں بھلا کیا کرتا خاموشی سے بیٹھا رہا بلکہ میں نے ایک مقالہ ”ادیب اور آزادی اظہار رائے“ کے موضوع پر پڑھا اور اس میں نہایت سختی سے کہا کہ جو حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ادیبوں کے جسموں کو قید کر کے ان کے خیالات کو بھی قید کر لیتے ہیں۔ وہ دراصل احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر مقالہ انگریزی میں پڑھا تا کہ صدر ایوب سمجھ جائیں۔ خیر ڈاکٹر عبدالحق کی دعوت پر صدر ایوب اٹھ کر آئے اور فی البدیہہ تقریر کی۔ وہ ایک اچھی تقریر تھی۔ انہوں نے ادیبوں کے خلاف تقریر نہیں

کی۔ انہوں نے کہا کہ مارشل لاء کا زمانہ ہے لیکن آپ ملک کو نقصان پہنچائے بغیر اپنا تخلیقی کام جاری رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو چار ہفتے کے بعد مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے ان کے پاس مسودوں کے لیے ایک ریگولیشن آیا کہ جو کتاب چھپے، اس کی چھپنے سے پہلے ایک سرکاری سنسر کمیٹی منظوری دے لیکن صدر ایوب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ادیبوں سے وعدہ کر آیا ہوں لہذا ان کے زمانے میں کتابوں پر پابندی نہیں لگی۔ وہ مسودہ میرے پاس آیا اور ہدایت کے مطابق مجھے اس پر نوٹ لکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ صدر صاحب نے کنونشن میں ادیبوں سے جو وعدہ کیا ہے وہ انہیں یاد ہے یا نہیں، اس مسودے پر کوئی نوٹ درج نہیں کیا لیکن انہوں نے خود ہی اسے مسترد کر دیا۔

کہا جاتا ہے عبداللہ حسین کا ناول ”اداس نسلیں“ کو ایوارڈ دینے کے بعد ایوب خاں بعد میں بہت ناراض ہوئے تھے کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ ناول میں فوریٹز استعمال ہوئے ہیں۔

سوال۔

ایوب نہیں بلکہ کالا باغ سخت ناراض ہوا تھا۔ ایوب خاں نے ایوارڈ دے دیا۔ اس نے تو ناول پڑھا بھی نہیں تھا نواب کالا باغ نے بھی نہیں پڑھا تھا۔ اس زمانے میں ون یونٹ تھا۔ پولیس اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکموں نے اس ناول کو ضبط کرنے اور اس پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ ہمیں بھی اس کا علم نہیں تھا لیکن جب اس ناول کو ایوارڈ ملنے کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو مجھے نواب کالا باغ کا ٹیلیفون آیا، وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کس ناول کو ایوارڈ دلا دیا۔ ہم تو اس پر مقدمہ چلانے والے تھے۔ یہ کتاب نہیں کنجر خانہ ہے بالکل واہیات ہے۔ اب صدر ایوب نے اسے ایوارڈ دے دیا۔ ہم اس پر کیسے مقدمہ چلائیں۔ اس نے بڑا شور مچا رہا ہے۔ مچانے کے بعد صدر ایوب کو خط لکھا کہ آپ کے لوگ اس معاملے میں ہم سے مشورہ نہیں کرتے جس کی وجہ سے اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اس نے وہ خط میرے خلاف لکھا تھا لیکن ایوب خاں نے نظر انداز کر دیا اس نے مجھ سے بھی پوچھ گچھ نہیں کی۔

شہاب:

اس نوعیت کے کچھ اور واقعات جو آپ کو یاد ہوں؟

سوال۔

میں نے اپنی کتاب ”شہاب نامہ“ میں کرید کرید کر ساری باتیں جمع کیں اور لکھ دی ہیں۔ اس میں ایک باب ”رائٹرز گلڈ“ پر بھی ہے۔ اس باب کو لکھتے وقت میں نے ان انٹرویوز کو بھی سامنے رکھا ہے جو آپ نے کچھ عرصہ قبل مختلف ادیبوں سے کیے تھے۔

شہاب:

یہ کتاب ہمیں اگلے سال پڑھنے کو ملے گی؟

سوال۔

انشاء اللہ! اگر مجھ سے آسانی ختم ہوگئی۔

شہاب:

آپ کا شاید انگریزی میں بھی کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ تھا؟

سوال۔

جی ہاں ارادہ تھا، لیکن میں ”شہاب نامہ“ میں زیادہ مصروف ہو گیا۔ انگریزی میں کہانی وغیرہ لکھنے کا ارادہ تو تھا۔ اس کتاب میں، میں ایک کیس اسٹڈی کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان میں یکے بعد

شہاب:

دیگرے انسٹی چیوشنز فیل ہوتی رہی ہیں۔ میں ان کے اسباب کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ اس موضوع پر میں سنجیدگی سے کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ اس پر ریسرچ اور تجزیے کی بڑی سخت ضرورت ہوگی۔ دیکھیے یہ منصوبہ پورا بھی ہوگا یا نہیں۔

آپ کا شمار کبھی ترقی پسندوں میں نہیں ہوا لیکن آپ کو ان کے قریبی مشاہدے کا موقع ملا ہے۔ ان دنوں آپ حکومت میں بھی تھے اور گلڈ کے سیکرٹری بھی۔ ترقی پسند نہایت سرگرم عمل تھے گو ترقی پسند تحریک تنازعات کا شکار ہو چکی تھی۔

سوال:-

نہ صرف یہ کہ میرا شمار ترقی پسندوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ 48-49ء میں ”یا خدا“ چھپی تھی تو ترقی پسند انجمن نے (جو پاکستان میں تھی) اس کی مخالفت کی تھی اور اس کے خلاف بارہ بارہ صفحات کے تنقیدی مضامین ”ادب لطیف“ وغیرہ میں چھپوائے تھے اور فیصلہ کیا تھا کہ اس شخص کی کوئی چیز ان کے رسائل میں شائع نہیں ہوگی لیکن جب گلڈ بنا تو وہ اس میں خوشی خوشی شامل ہو گئے۔

شہاب:-

انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگنے کے پس منظر سے آپ واقف ہیں؟ پابندی کن حالات میں لگی؟

سوال:-

ترقی پسند تحریک سے میرا واسطہ ہی نہیں رہا بلکہ جب انہوں نے ”یا خدا“ پر لعن طعن کی تو میرا دل ان کی طرف سے سرد ہو گیا۔ میں نے کبھی ان کی طرف سنجیدگی سے دیکھا نہیں تھا۔

شہاب:-

سرکاری سطح پر جب یہ فیصلہ ہوا تو آپ کی اپنی اطلاعات کیا ہیں کہ اس کے اصل محرکات کیا تھے؟ میں ان دنوں آزاد کشمیر میں تھا اور مجھے کچھ علم نہیں۔

سوال:-

شہاب:-

فیض احمد فیض صاحب بہت بڑے شاعر ہیں۔ آدمی بھی نفیس طبیعت کے ہیں لیکن ان کی روس سے اس درجے سیاسی وابستگی ہے کہ وہ ان مظالم کی جانب سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو روس چھوٹے ممالک پر ڈھا رہا ہے۔ وہ فلسطین پر تو نظمیں لکھتے ہیں ان کے پڑوسی ملک افغانستان میں روسی جارحیت کے نتیجے میں جو ظلم ہو رہا ہے، اس پر وہ مہربان ہیں۔ آپ اس رویہ کو کیا نام دیں گے؟

سوال:-

فیض صاحب سے میرے مؤدبانہ تعلقات ہیں ان کی وجہ سے اس کا جواب دیتے ہوئے ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہا ہوں لیکن میں فیض صاحب کو قطع نظر کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

شہاب:-

یعنی ظلم جہاں بھی ہو اس کے خلاف ادیب کو صدائے احتجاج بلند کرنا چاہیے۔

سوال:-

ایک دفعہ جب میں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری تھا۔ روسی رائٹرز یونین کے اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں نے یہ شرط عائد کی تھی کہ آپ کے ایجنڈے میں کئی ممالک کا ذکر ہے لیکن جموں و کشمیر کے مسئلے کا ذکر نہیں ہے اگر آپ ایجنڈے میں اسے شامل کریں تو میں آؤں گا ورنہ نہیں۔ انہوں نے مجھے جواب ہی نہیں دیا۔ سخت ناراض ہوئے۔ میں نے

شہاب:-

انہیں یہ بھی لکھا کہ دنیا میں آزادی کی جتنی تحریکیں جو آپ کو پسند ہیں، وہاں تو آپ مدد کرتے ہیں اور یہاں پروٹو کرتے ہیں۔

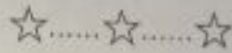
ہمارے عام ترقی پسندوں کا رویہ ہے کہ جو ادیب روس کی مخالفت کرے وہ اسے امریکہ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

سوال۔

میرے ساتھ بھی یہی ہوا جب گلڈ کا دستور بنا تو دستور میں کسی بھی غیر ملک سے مالی امداد نہ لینے کی شرط رکھی گئی۔ امریکی سفارتخانے کو شاید یہ گمان تھا کہ ان کی مدد کے بغیر پاکستان میں کوئی ادارہ نہیں چل سکتا۔ اس لیے گلڈ کے متعلق بھی انہیں توقع تھی کہ ہم بہت جلد اس سلسلے میں ان کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے لیکن جب ہم ان کے پاس نہیں گئے تو انہیں شبہ ہوا کہ شاید ہمیں روس سے پیسے ملتے ہیں اور ہم روس کی جھولی میں ہیں جبکہ روسی سمجھتے تھے کہ ہم امریکہ کی جھولی میں ہیں حالانکہ ہم تو صرف پاکستان کی جھولی میں کل بھی تھے اسی میں آج بھی ہیں۔

شہاب:

روزنامہ ”جسارت“ کراچی 4 نومبر 1983ء



انٹرویو:

انعام الحق جاوید

☆ شہاب صاحب! سب سے پہلے تو آپ ہمیں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں کہ وہ کون سے عناصر تھے جنہوں نے آپ کو علم و ادب کی طرف راغب کیا۔

میری بالکل ابتدائی زندگی تو ریاست جموں و کشمیر میں گزری لیکن جب وہاں طاعون کی وبا پھیلی تو گھر والوں نے مجھے ضلع انبالہ کے ایک گاؤں ”چمکور صاحب“ بھجوا دیا، چمکور صاحب سکھوں کا مقدس مقام تھا چنانچہ میں نے سکھوں کے سکول میں داخلہ لے لیا اور ”سنگھ سبھا“ کے تحت منعقد ہونے والے جلسوں میں گورونانک پر دو مضامین بھی پڑھے۔ چھٹی ساتویں جماعت میں پہنچا تو یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے گاؤں کے ایک ہندو حلوائی کی لائری نکل آئی، یہ لائری بازار مائی صاحبان امرتسر سے سنے کی طرز پر نکالا کرتی تھی اور اس وقت اس کی خاصی دھوم تھی تاہم ہمارے حلوائی کو لائری میں انعام کے طور پر جو چیز ملی وہ پرانی کتابوں کے دو گڈے تھے جنہیں اس نے رڈی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ایک روز میں نے اچانک اس پرانے خزانے کو کھنگالا تو پتا چلا کہ ان میں فسانہ آزاد، شرر کے ناول، تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی نادر کتب موجود ہیں میں نے یہ سب کتابیں چھانٹیں اور رڈی کے بھاؤ خرید لیں، یہ کتابیں جو تعداد میں 35 کے قریب تھیں مجھے پانچ روپے میں پڑیں اور چھٹی ساتویں کے زمانے میں ہی میں نے یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اوائل 1930ء کے قریب قریب لاہور سے نکلنے والے رسالہ ”چاند“ میں بھی میری ایک دو کہانیاں چھپیں۔ میٹرک کے بعد میں واپس جموں آ گیا اور پرنس آف ویلز کالج جموں (جسے آج کل گاندھی میموریل کالج کہتے ہیں) میں داخلہ لے لیا۔ سیکنڈ ایئر میں پہنچا تو کالج کے رسالہ ”توی“ کے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کا ایڈیٹر بنا دیا گیا تھرڈ ایئر میں، میں نے انگریزی زبان میں 80 صفحات کا ایک مضمون بھی لکھا جس پر مجھے 750 پاؤنڈ کا ورلڈ انعام ملا اگرچہ میرا ارادہ سائنس پڑھنے کا تھا لیکن طبیعت نے ساتھ نہ دیا چنانچہ بی ایس سی کرنے کے بعد انگریزی لٹریچر میں داخلہ لے لیا اور 1939ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگلش کا امتحان پاس کیا۔

☆ شہاب صاحب! تعلیم سے فراغت کے بعد جب آپ سول سروس میں آئے اور آپ کو اہم عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا تو یہ ٹھیک وہ وقت تھا جب تحریک پاکستان اپنے عروج کی طرف رواں دواں تھی۔ کیا آپ اپنے اس وقت کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

میں 1940ء میں جب انڈین سول سروس میں آیا تو سب سے پہلے مجھے اڑیسہ میں تعینات کیا گیا صوبہ بہار میں اس وقت تک تحریک نہیں پہنچی تھی وہاں صرف 'نوائے وقت' آتا تھا جو اس وقت ہفت روزہ تھا اور جسے ہم لوگ چندہ جمع کر کے خریدتے اور مل کر پڑھتے تھے۔ اسی سے ہمیں ملکی سیاست کے بارے میں آگاہی ہوتی تھی پھر جب بنگال میں قحط پڑا تو میں نے خود کو وہاں کے لیے وائٹیر کر دیا اور دو سال تک بنگال میں رہا بنگال کی حالت اس وقت انتہائی خستہ اور خراب تھی۔ بھوک اور غربت کے باعث آدلی کیزوں مکڑوں کی طرح مر رہے تھے اور بچوں کی منڈیاں لگا کرتی تھیں۔ کلکتہ میں 'دریائے ہولی' کے کنارے ایک جگہ پر گاؤں کی عورتیں اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے آتی تھیں جہاں سے امیر آدمی اپنی پسند کے بچوں کو چھانٹ کر خرید لیتے اور اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سیلاب اور طوفان بھی آئے دن آتے رہتے تھے اس حالت زار سے متاثر ہو کر میں نے 'غریب خانہ' اور 'سب کا ملک' کے عنوانات سے دو افسانے بھی لکھے اس کے علاوہ 'نفسانے' کے نام سے چھپنے والی میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ بھی اسی صورت حال سے متعلق تھا۔ تاہم یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ یہ قحط اصلی نہیں تھا بلکہ حکومت کا پیدا کردہ مصنوعی قحط تھا۔ حکومت نے دوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے کھانے پینے کی تمام اشیاء مشور کر رکھی تھیں اور دکھ کی بات یہ تھی کہ جن زیر زمین گوداموں میں ہزاروں من دھان محفوظ پڑی تھی انہی گوداموں کے دھانوں پر باہر ہر روز ہزاروں کی تعداد میں افراد بھوکے مر رہے تھے اس وقت اناج محفوظ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ پروکیورمنٹ ایجنٹ حکومت کی طرف سے اشیائے خوردنی خرید کر مشور کر لیتا تھا اور ہمیں یعنی انتظامیہ کو حکم تھا کہ اگر جاپان حملہ کر دے تو ان گوداموں کو فوراً نذر آتش کر دیا جائے۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی کرہناک تھی چنانچہ میں نے حکومت کو ایک خط لکھا کہ کیوں نہ یہ اناج ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن خاصے انتظار کے باوجود جب حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو میں نے اپنے علاقے کی تینوں تنظیموں یعنی مسلم لیگ، کانگریس اور فارورڈ بلاک سے ایک ایک نمائندہ بلوایا اور ان تینوں کی موجودگی میں اپنے زیر انصرام گودام کا تالا تروا کر دھان ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی اس پر مجھے بنگال سے نکال دیا گیا۔ ادھر بہار کی سرکار نے بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ میں اڑیسہ چلا گیا جہاں میں نے بہروردی سے گلہ کیا لیکن وہ بولے کہ ٹھیک ہے ہم نے تمہیں صرف ٹرانسفر ہی کیا ہے کوئی سزا وغیرہ تو نہیں دی بعد میں اس پروکیورمنٹ ایجنٹ نے جس کا گودام میں نے لٹا دیا تھا، میرے خلاف مقدمہ درج کرا دیا۔ میں نے بیرونی ہی نہیں کی لہذا ایک طرفہ ڈگری ہو گئی اور عدالت کی طرف سے مجھ پر کئی لاکھ روپے ہرجانہ عائد کیا گیا تاہم گورنمنٹ اس مقدمے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں تھی لہذا امیر ایچا نہیں کیا گیا۔ لاکھوں روپے کی یہ ڈگری اب تک میرے خلاف کہیں موجود ہوگی۔ جہاں تک تحریک پاکستان کا تعلق ہے تو میں نے اس میں عملاً ان معنوں میں تو حصہ نہیں لیا کہ کوئی جلوس نکالا ہو یا تقریریں کی ہوں لیکن حکومت میں رہتے ہوئے مسلم لیگ سے تعاون ضرور جاری رکھا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد فسادات کے سلسلے میں جو تحریریں سامنے آئیں ان میں ایک کلاسیک تحریر آپ کا

ناولٹ 'یا خدا' بھی تھا۔ سوال یہ ہے کہ فسادات کے ان براہ راست تجربوں سے گزرنے کا موقع آپ کو کیسے ملا اور کیا یہ سچے واقعات ہیں؟

قیام پاکستان کے بعد جب میں لاہور آیا تو حکومت نے مجھے مسٹری آف کامرس میں انڈر سیکرٹری لگا دیا اس وقت دفاتروں کی حالت یہ تھی نہ کرسی نہ کاغذ نہ پنسل، چنانچہ میں نے اپنی جیب سے کاغذ پنسل خریدے اور 17 اگست سے کام شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں ہندوستان نے کونکے اور چینی کی سپلائی بند کر دی۔ لوگ چائے میں گڑ ڈال کر پینے لگے اور کونکے سے چلنے والی گاڑیاں بند ہونے لگیں، ادھر مجھے کامرس کا نہ کوئی تجربہ تھا اور نہ علم تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے تاہم سوچ بچار سے کام لیتے ہوئے میں نے بازار سے اٹلس منگوائی اور اس میں سے معلوم ہوا کہ کونکہ کس کس مقام میں پیدا ہوتا ہے۔ دفتر خارجہ کی طرف سے ان ملکوں کو تار بھجوائے گئے کہ چینی اور کونکہ فراہم کیا جائے۔ اس وقت آئی آئی چند ریگہ ہمارے مسٹر تھے چنانچہ میں دفتر سے اجازت لے کر اپنے عزیزوں کو تلاش کرنے کے لیے والٹن کمپ لاہور اور دوسرے مہاجر کیمنپوں میں بھی چلا جایا کرتا تھا۔ وہیں مجھے مہاجرین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا چنانچہ "یا خدا" کی پیش کش کا اندازہ افسانوی ہو تو ہو لیکن اس میں درج سب کے سب واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔

یہ سلسلہ تقریباً کتنے عرصے تک جاری رہا؟

میں لاہور میں صرف تین ماہ رہا۔ اکتوبر میں کشمیر کی لڑائی شروع ہوئی تو میں نے حکومت کو کہا کہ میں کشمیر جانا چاہتا ہوں، اگر سرکاری طور پر بھیجوا یا جاسکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ استعفیٰ حاضر ہے تاہم حکومت نے سرکاری طور پر میرا تبادلہ کشمیر کر دیا وہاں جا کر میں نے آزاد کشمیر کی ساری حکومت آرگنائز کی اور اپنے آپ کو سیکرٹری جنرل کا عہدہ دے دیا، اور کشمیر افیئرز کے مسٹر مشتاق احمد گورمانی کے آنے تک وہاں رہا۔

شہاب صاحب! کہتے ہیں کہ اس وقت اگر ذرا سادھکا اور لگ جاتا تو سارا کشمیر آزاد کرایا جاسکتا تھا اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

واقعی اس وقت بہت چوک ہو گئی! اگر جموں کی طرف سے حملہ کیا جاتا تو ہم سری نگر تک پہنچ سکتے تھے، لیکن پتا نہیں کیا وجہ ہوئی کہ ہماری فوجیں بارہ مولا جا کر رک گئیں غالباً کوئی فتنہ کالم کام کر رہا تھا۔ تاہم یہ ایک اسرار ہی ہے کہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا کیونکہ فوجی معاملات سے میرا زیادہ تعلق نہیں تھا میرا کام فقط اتنا تھا کہ جو جو علاقہ آزاد ہوتا جاتا تھا میں وہاں سول حکومت قائم کرتا جاتا تھا۔

شہاب صاحب! قرۃ العین حیدر نے آپ کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ نے پہلے اس ناولٹ کا نام 'تین خدا' رکھا تھا لیکن پھر تثلیث سے اس کی مناسبت اور مولویوں کے ڈر سے اس کا نام "یا خدا" کر دیا۔ یہ پورا واقعہ کیا ہے؟

پہلے میں نے فروغی طور پر سوچا تھا اس لیے اس کا نام "تین خدا" تجویز کیا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ یہ تو شرک ہے خدا تو ایک ہی ہے لہذا خود ہی نام بدل کر "یا خدا" کر دیا اور یہی اس واقعہ کی کل حقیقت ہے۔

قرۃ العین حیدر کے جانے کے بعد ایک نقطہ نظر یہ بھی سامنے آیا کہ اسے فرسٹ کر کے اور اس کے

نتیجے میں اس کے بھارت چلے جانے میں پاکستان کی بیوروکریسی کے بعض افراد کا ہاتھ بھی تھا۔ آپ ہنگامہ
اس وقت مرکز میں ایک اہم مہم سے پر فائز تھے لہذا آپ ہمیں یہ بتائیے کہ اس مفروضے میں کہاں تک
صدافت ہے؟

قرۃ العین کے ہندوستان جانے سے مجھے ذاتی سطح پر بے حد دکھ ہوا تھا میں جس غسٹری میں ڈپٹی سیکرٹری تھے
وہاں کے ایک ڈائریکٹر صاحب خاصے مردم آزار قسم کے انسان تھے اور کوئی شخص بھی ان سے خوش نہیں تھا
یہ ان کا مجموعی مزاج تھا ممکن ہے انہوں نے بھی تنگ کیا ہو لیکن اسے آپ بیوروکریسی کا ہاتھ نہ کیے تھی
اصل نشانہ اسے 'آگ کا دریا' کی وجہ سے بننا پڑا۔ کیونکہ یہ بڑا ممتاز ناول تھا جب وہ اس کا مسودہ میرے
پاس لائی تھی تو میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ تمہاری آخری کتاب ہونی چاہیے اسے ابھی نہ چھاپو لیکن ہمارے
کتاب چھپ گئی اور اس پر تنقید بھی شروع ہو گئی تو ایک روز اچانک پتا چلا کہ قرۃ العین ہندوستان چلی گئی
ہے۔

☆ 'آگ کا دریا' کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

مجھے تو اس سے اختلاف تھا تاہم ضروری نہیں کہ قرۃ العین غیر محبت وطن ہی ہو لیکن اس کا اظہار اور اس کی
پیش کش غلط تھی۔ تاریخ کی جو توجیہ اس نے کی تھی پاکستان میں بیٹھ کر ان خیالات کا اپنانا مشکل تھا۔

☆ آپ کے زمانے میں بزم ثقافت ملتان سے ایک تنظیم بنی جو بعد میں "پاکستان فاؤنڈیشن" کا نام اختیار
کر گئی اور اس کے نتیجے میں بالآخر سرانیکی صوبے کا مطالبہ بھی اٹھا اس سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے۔

اس زمانے میں ملتان میں "جشن فرید" ہوا کرتا تھا جس کے کرتا دھرتا ریاض انور اور جسٹس عبدالجبار تھے۔

☆ میں اس جشن میں ایک دو دفعہ صرف اس لیے گیا تھا کہ وہاں شریا ملتا نیکر گایا کرتی تھی۔ "پاکستان فاؤنڈیشن"

سے میں نے صرف کے ایل گاہا کی ایک کتاب PASSIVE VOICE چھپوائی تھی جو بھارتی

مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں تھی۔ باقی میرے نزدیک سرانیکی کی حوصلہ افزائی کی ضرورت نہیں

ہے۔ اسی طرح ایک زمانے میں گلڈ کی ایک شاخ کے طور پر پنجابی ادبی گلڈ بھی بن گئی تھی۔ جو غلط لائقوں پر

سوچ رہی تھی یہ شفقت تنویر مرزا نے بنائی تھی، چنانچہ میں نے اسے DISBAN کر دیا تھا اور شفقت تنویر

مرزا کو اسی وقت ڈس مِس کر دیا تھا۔ صوفی تبسم مرحوم اس پر مجھ سے ناراض بھی ہوئے تھے۔

☆ شہاب صاحب! آپ کے زمانے میں ہی نیشنل پریس ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا جس کے نتیجے میں بہت

سے اخبارات حکومت کی تحویل میں چلے گئے آپ کے نزدیک اس سے نیشن اور پریس کے "کار" کو کیا فائدہ

پہنچا۔

☆ اس کی پلاننگ میرے زمانے میں نہیں ہوئی تھی میں اس وقت ہالینڈ میں تھا اور الطاف گوہر یہاں کام

کر رہے تھے۔ بہر حال اس کے نتیجے میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار حکومت نے لے لیے تھے۔

☆ میرے زمانے میں صرف خریدار آیا کرتے تھے کبھی سیٹھ داؤد نے خریدا، کبھی چوہدری محمد حسین (میر

لاہور) نے اور کبھی چوہدری ظہور الہی نے۔ تاہم جب یہ میاں افتخار الدین کے پاس تھا تو مارشل لا

حکومت کا خیال تھا کہ یہ ادارہ (پی پی ایل) بائیس بارہ کا ٹوکن بنا ہوا ہے اس وقت بریگیڈیئر ایف آر خاں انفارمیشن سیکرٹری ہوتے تھے جب میں ہالینڈ سے واپس آیا تو ایک روز بریگیڈیئر ایف آر خاں اور جنرل شیخ نے مجھے ساتھ لیا اور لاہور لے آئے، انہوں نے مجھے قطعاً نہیں بتایا تھا کہ لاہور جانے کا مقصد کیا ہے۔ تاہم یہاں ہم جی او سی لاہور کے گھر ٹھہرے اور یہیں انہوں نے انکشاف کیا کہ آج رات ہم پی پی ایل کو ٹیک اوور کر رہے ہیں، خیر جب ٹیک اوور ہو گیا تو ہم نے مظہر علی خان سے کہا کہ آپ بدستور کام کرتے رہیں لیکن وہ ایڈیٹری چھوڑ کر چلے گئے۔ چنانچہ ٹیک اوور کے بعد پاکستان ٹائمز کا پہلا ادارہ یہ مجھے لکھنا پڑا جو میں نے 'دی نیولیف' کے عنوان سے لکھا اور جس میں بتایا گیا تھا کہ ہم اس ادارے کو ڈی سیٹلائٹ کر رہے ہیں۔ آج بھی مظہر علی خاں اس ادارے کے بارے میں جب کوئی بات کرتا ہے تو کہتا ہے کہ پاکستان ٹائمز کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ احمقانہ ادارہ یہ کبھی نہیں لکھا گیا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ادارہ اتنا احمقانہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے احمد ندیم قاسمی کو بھی درخواست کی تھی کہ امروزی ایڈیٹری نہ چھوڑیں اور کام کرتے رہیں لیکن انہوں نے کہا تھا کہ اب یہاں کچھ اچھا نہیں لگتا۔

شہاب صاحب! اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نثری ادب کا گراف مسلسل نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ اب گذریا، یا خدا، الحمد للہ، آنندی اور برساتی جیسی کہانیاں کیوں سامنے نہیں آتیں۔

شاید اس لیے کہ اب ادب کا رخ کہانی کے علاوہ دیگر اصناف کی طرف بھی شفٹ ہو گیا ہے۔ ٹی وی ڈرامے، سٹیج ڈرامے اور ریڈیو ڈرامے بھی تو ادیب ہی لکھتے ہیں اور اس طرح سے تخلیقی جوہر اس طرف کام آ جاتا ہے۔ 1940ء میں ایک دانشور کے لیے کہانی لکھنے کے علاوہ کوئی چینل نہیں تھا، اس وقت میں سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ کہانی لکھ کر مولانا صلاح الدین کے رسالے کو بھجوادوں پھر تقسیم ملک کا تجربہ ادب میں داخل ہوا۔ یہ اتنا بڑا اور وسیع تجربہ تھا کہ اس کے تجربے کے بعد 'جہلم میں ناؤ' کون لکھ سکتا تھا یا خدا کے سامنے 'نفسانے' کے افسانے کچھ بھی نہیں میں نقاد نہیں ہوں اس لیے زیادہ رائے نہیں دے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ادب میں جمود کبھی نہیں آیا اس کی رفتار کی کبھی نہیں بلکہ اب اس کا پھیلاؤ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ آج کے نئے لکھنے والوں کا کیونس زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً مزاحیہ کالم عبدالجید سالک اور ابن انشاء سے ہوتا ہوا جب عطاء الحق قاسمی تک آتا ہے تو بڑا واضح فرق نظر آتا ہے اسی طرح آنندی کے مقابلے میں آج کی کوئی نئی کہانی رکھ کر دیکھیں تو وہ شاید آنندی سے بڑی کہانی ہوگی۔ کل کا نقاد اعلیٰ ادب کی نشاندہی کرتا تھا، آج کا نقاد بیشتر صورتوں میں خاموش رہتا ہے۔

تجربیدی اور علامتی کہانی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
مجھے تو یہ سمجھ ہی نہیں آتی، پسند اور ناپسند کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی چیز سمجھ آئے چنانچہ اس سلسلے میں میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

شہاب صاحب! آپ کے بارے میں خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ان دنوں تصوف کی طرف رجحان ہے تو کیا اس کا جواب آپ کی شخصیت میں موجود تھا یا کسی خاص تجربے کا نتیجہ ہے۔

میں تصوف میں یقین ہی نہیں رکھتا کیونکہ میرے نزدیک تصوف کوئی الگ محکمہ نہیں ہے۔
لیکن ممتاز مفتی کے حوالے سے یہ بات کئی مرتبہ سامنے آ چکی ہے۔
وہ تو افسانہ نگار ہیں۔

یہ سوال اگر آپ ان سے پوچھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔
اور اب آخر میں ایک سوال، آپ ایک طویل مدت تک ایجوکیشن اور انفارمیشن سے وابستہ رہے۔ آپ
کے خیال میں مشرقی پاکستان میں کون سا ذہن تھا جو انٹیلیکچوئل سطح پر بنگلہ دیش کے لیے کام کر رہا تھا؟
وہاں پر ایک تو ہندو اور دوسرا ہندو ذہن کا مسلمان پروفیسر تھا جو پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کر رہا تھا اور دوسرا
کیونٹ عنصر تھا جو زہر پھیلا رہا تھا۔ صحیح فکر رکھنے والے لوگ ان کے سامنے دبے رہتے تھے۔ آپ حیران
ہوں گے یہ سن کر کہ کلکتہ کے مصنفوں کی لکھی ہوئی اور کلکتہ میں چھپی ہوئی بعض کتابیں وہاں کے نصاب
میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص کلکتہ میں بیٹھ کر پاکستان کی تاریخ لکھے گا وہ کیا لکھے گا وہاں
کے اخبار "اتفاق" کے ایڈیٹر نانک میاں نے کئی دفعہ اس بارے میں لکھا اور مجھے بھی وہ کتابیں دکھائیں
چنانچہ جتنا عرصہ میں ایجوکیشن سیکرٹری رہا، کوشش کر کر مر گیا کہ ان کتابوں کو بدلا جائے لیکن دو سال کے
عرصہ میں ایک کتاب بھی نہیں بدلی جاسکی۔

اس وقت عبدالمنعم خاں مشرقی پاکستان کا گورنر تھا جو ایک قومی سوچ رکھنے والا آدمی تھا لیکن وہ بھی کچھ
کر سکا۔ جب کوئی ایسا موقع آتا اس کے یا اس کے رشتہ داروں کے مالی مفادات آڑے آ جاتے وہاں پر
ایک شخص تھا فخر الزماں بہت اچھی نعتیں لکھتا تھا لیکن وہاں کے ریڈیو نے اسے بھوکوں مروا دیا۔ صرف اس
وجہ سے کہ وہ نعتیں لکھتا ہے اسے یا تو پروگرام ہی نہیں دیتے تھے اور یا پھر پروگرام کے پیسے نہیں دیتے تھے
میں اسے اپنے ساتھ یہاں لانا چاہتا تھا لیکن وہ گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ انٹی پاکستان ذہنیت کے
پشت پناہ ایک تو وہاں کے سیکرٹریٹ میں صوبائی سیکرٹری وغیرہ تھے وہ سرپرستی کرتے رہے دوسرا کچھ اب
عنصر بھی تھا جو چاہتا تھا کہ مغربی پاکستان کو دبا کر رکھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پریش کی پالیسی سے
مراعات ملیں گی۔ تاہم ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان کے عام باسیوں میں انہوں نے زیادہ تھی یہاں
کوئی ادیب جب وہاں جاتا تھا تو بنگالی ادیب اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، اپنے گھروں میں رکھتے تھے
اور پڑوسی کے گھر سے کرسی منگوا کر اس پر بٹھاتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے بچے جو اردو نہیں جانتے تھے، غالب
اقبال اور حفیظ کی غزلیں رومن اردو میں لکھ لکھ کر سناتے تھے لیکن وہاں سے جب کوئی ادیب یہاں آتا تو
یہاں کوئی اسے بنگالی نظم نہیں سناتا تھا۔ وہ سادگی پسند لوگ تھے اور جب ادھر کا رخ کرتے ایک ہاتھ میں
کیلے اور دوسرے میں رسکے اٹھالیتے لیکن ہم نے انہیں برابری کا درجہ کبھی نہیں دیا ہمارا ایک پاکستانی وہاں
کے ڈیڑھ بنگالی کے برابر تھا اور شروع سے ہی بدظن کرنے والا معاملہ جاری رہا چنانچہ مشرقی پاکستان کی
علیحدگی میں ہم لوگ بھی برابر کے شریک ہیں۔

شہاب صاحب! عصمت چغتائی نے یہاں آ کر ایک جلسے میں جب یہ کہا تھا کہ ادب اور ادیبوں کو تقسیم نہیں

ہونا چاہیے بلکہ ادب دونوں ملکوں کا مشترکہ ورثہ ہے تو آپ نے سٹیج پر تقریر کرتے ہوئے عصمت کے اس بیان کی شدید مخالفت کی تھی اور بتایا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے ادب میں فرق کن کن سطحوں پر نمودار ہوتا ہے۔

جی ہاں میں نے اس جلسے میں کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے یہاں کے کچھ لوگ فیض یا جوش وغیرہ ایسی باتیں کرتے ہیں لیکن وہ مروت میں مارے جاتے ہیں۔ یہ ساغر و مینا کی کرامت ہوتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ملک دو ہوں اور ادب ایک ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اب کوئی پاکستانی بھی ہندوستانی نہیں ہے حتیٰ کہ ہماری وہ پرانی نسل بھی نہیں جو وہاں سے آئی ہے۔ آپ ہماری عورتوں کو ساڑھی پہنے دیکھتے ہیں اور ایک لباس کا نعرہ لگا دیتے ہیں یا ہمیں اردو بولتے ہوئے سنتے ہیں تو ایک زبان اور ایک ادب کا راگ الاپنے لگ جاتے ہیں حالانکہ پاکستان اب گھبرو ہو چکا ہے لہذا اس کے ساتھ بالغوں کی طرح بات کیجیے ابھی کچھ عرصہ قبل انڈیا کا وزیر خارجہ یہاں آیا تھا اکیڈمی آف لیٹرز نے اسے لٹچ دیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا وہ بڑا چال باز آدمی تھا کہنے لگا جالندھر ہودلی ہو یا لاہور ہوزبانیں مختلف ہوتی ہیں لیکن بات ایک ہی ہوتی ہے میرا جی چاہتا تھا کہ اسے جواب دوں لیکن موقع نہیں ملا ہمارا ملک ہندوستان کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے لیکن ان کے حواس پر سوار ہے اور مجھے اس پر فخر ہے، میرے خیال میں یہ فضا برقرار رہنی چاہیے میں انڈیا کے ساتھ نارمل ریشن کے خلاف ہوں میں پاکستانی ادب پر یقین رکھتا ہوں اور میرے نزدیک اس میں کوئی ابہام نہیں۔ ایک موضوع پر ایک کہانی ایک پاکستانی نے لکھی ہو اور یہی چیز ایک غیر پاکستانی نے لکھی ہو تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پاکستانی کی لکھی ہوئی ہے۔ ہیر رانجھے کا جو قصہ دلی میں لکھا جائے گا وہ پنڈی میں لکھی جانے والی کہانی سے واضح طور پر مختلف ہوگا۔ دونوں میں ایک نمایاں فرق ہوگا اور یہ فرق سوچ اور اپروچ کی وجہ سے ہوگا۔ تاہم یہ سب کچھ بغیر کسی پلاننگ کے وجود میں آئے گا کیونکہ اگر ہم اس بات پر زور دینا شروع کر دیں کہ پاکستانی ادب کا رنگ یہ ہونا چاہیے اور یہ نہیں ہونا چاہیے تو اس سے اس کے خلاف ری ایکشن شروع ہو جائے گا۔

آپ کے نزدیک پاکستانی ادب کی تعریف کیا ہو سکتی ہے!

کسی ملک کے ادب کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ بس پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ یہ کہانی کسی انگریز نے لکھی ہے یا پاکستانی نے یا کسی انڈین نے۔ لکھنے والا خواہ انڈین مسلمان ہی کیوں نہ ہو پھر بھی پتا چل جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کے مسلمان نے لکھی ہے۔ پاکستان ادب کے بیسیوں شیڈز ہیں۔ اس میں زیادہ تیز رنگ اسلامی ہے کیونکہ مذہب کے بغیر اخلاقی رنگ بھی نہیں آ سکتا اس کے علاوہ معاشرتی رنگ بھی ہے۔ رسم و رواج کا رنگ بھی گویا اس کی حدود ابھی پھیل رہی ہیں، ضروری نہیں کہ اس میں نظریہ پاکستان کا ورد ہی کیا گیا ہو۔ یہ تو میری نسل کی مجبوری ہے کیونکہ ہم اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتے ہیں لیکن جو لوگ یہاں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے ان کے لیے لکھنؤ کا ٹائٹل جیسا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیں البتہ بار بار زور دینا پڑتا ہے اس بات پر کہ دلی اب گئی، اسے بھول جاؤ اور یوں ایک طرح سے ہم اپنے آپ کو یقین دلارہے

ہوتے ہیں لیکن یہ نئی نسل کا مسئلہ نہیں ہے میرا بیٹا جب بار بار ریڈیو سنتا ہے کہ پاکستان ہمارا ہے پاکستان ہمارا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے یہ کیا بار بار رٹ لگا رکھی ہے کہ پاکستان ہمارا ہے پاکستان تو ہمارا ہی ہے، ہمارا نہیں تو اور کس کا ہے پھر ہمیں بار بار کیوں بتایا جا رہا ہے۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی نسل کے خیر میں ہی یہ بات شامل ہے اور اسے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ پاکستان ہمارا ہے۔

لیکن انہیں بتانے کے لیے کہ پاکستان کیسے بنا اور یہ باور کرانے کے لیے کہ اس کے لیے انہیں بے حد قربانیاں دینا پڑیں، کیا پاکستان کا ذکر ضروری نہیں؟

ضروری تو ہے لیکن پراپیگنڈے اور پبلٹی کی سطح پر نہیں بلکہ انفارمیشن کی سطح پر خالی پبلٹی یا نعرے بازی سے تو ان پر الٹا اثر ہوگا۔ ان کے لیے تو ہونا چاہیے کہ ایسے ڈرامے ہوں، ایسی فلمیں ہوں جن سے وہ غیر محسوس طور پر اثر لے سکیں نہ کہ صرف ترانوں اور تقریروں سے ہی کام چلایا جائے۔

کیا پاکستانی اور اسلامی ادب ایک ہی چیز ہیں!..... یا

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں کیونکہ جب ہم اسلامی ادب کہیں گے تو اس کا کیونس بدل جائے گا اور اخلاقیات کا تصور مختلف ہو جائے گا۔ اسلامی ادب میں ضروری نہیں کہ پاکستانی ادب بھی آئے لیکن اگر ہم پاکستانی ادب کہیں گے تو اس سے اسلامی ادب لازمی طور پر منعکس ہوگا۔ اسلامی ادب کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں ایسی بات نہ آئے جو اسلام سے متصادم ہو۔

روزنامہ ”نوائے وقت“ 15 ستمبر 1981ء

☆.....☆.....☆



سحر صدیقی

آج کل ادبی اور علمی مصروفیات کیا ہیں؟

زیادہ تر آرام کرتا ہوں۔ آنکھوں میں موٹیے کی شکایت ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ آپریشن کی ضرورت پیش آئے گی لہذا بہت کم کام کرتا ہوں۔ ایک تو ”شہاب نامہ“ مکمل کر رہا ہوں بلکہ کم و بیش مکمل ہی کیجیے دوسری کتاب

THE CAUSES OF FAILURES OF INSTITUTIONS OUR COUNTRY.

(پاکستان میں اداروں کی ناکامی کے اسباب) لکھ رہا ہوں۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے کیونکہ اس کے متعلق تمام مواد اسی زبان میں ہے۔ دوسری اس موضوع کا مزاج بھی انگریزی زبان ہی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ”شہاب نامہ“ میں کیا موضوعات قلم بند ہوئے ہیں؟

یہ دراصل ان واقعات اور حالات کی روداد ہے جو میری زندگی میں پیش آئے، میری زندگی پر اثر انداز ہوئے یا ان کا میری زندگی سے کوئی حوالہ بنتا ہے۔ اس کو آپ بیتی اور جگ بیتی کا امتزاج بھی کہا جاسکتا ہے ویسے میرے خیال میں یہ ایک تجربہ ہے جس کی کامیابی کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے پہلے ”ماں جی“ کا کردار آپ نے اردو ادب میں ایک یادگار کے طور پر تخلیق کیا تھا۔ اس میں ایسا کوئی کردار ہے؟

ماں جی کا کردار میری والدہ محترمہ ہی کا ہے۔ یہ ان کا خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن ”شہاب نامہ“ میں کرداروں کی بجائے واقعات کو زیادہ اہمیت اور اولیت دی گئی ہے۔

آپ ”ماں جی“ کا مقابلہ میکسم گورکی ”ماں“ کے ساتھ کس طور پر کریں گے؟ میں تو گورکی کے مقابلے میں بہت چھوٹا سا فنکار ہوں۔ میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ مجھے یاد ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے ”ماں جی“ پڑھ کر مجھے خط لکھا اور ”شباباش“ دی۔ اب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ادب میں آپ کا ایک اور کارنامہ رائٹرز گلڈ ہے۔ آپ کے خیال میں اس نے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کر لئے ہیں؟

یہ میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ہم نے تو اس کے ذریعہ ادیبوں کی فلاح و بہبود کا آغاز کیا تھا۔ گلڈ کے قیام کا مقصد ادب کی خدمت کرنا نہیں بلکہ ادیب کو معاشرہ میں اس کا جائز مقام دلانا تھا۔ چنانچہ گلڈ کی کوششوں سے ادیب کو سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا۔ اس کا معاشرتی درجہ بلند ہوا، مستحق ادیبوں کی مالی امداد کا

سلسلہ شروع ہوا اور یہ بھی منصوبہ تھا کہ معیاری اور اعلیٰ درجے کے مسودات کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔
 س۔ گلڈ کو لاہور میں منگلہری روڈ پر جو دفتر اور اس سے ملحقہ اراضی الاٹ ہوئی اس کے اور مسودات کے پروگرام کا
 ہیں؟

ج: میں اب ایک عرصے سے گلڈ کے امور میں دخل نہیں دیتا۔ مجھے معلوم نہیں لیکن میرے خیال میں طفل صاحب
 ضرور کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔ منگلہری روڈ کے دفتر والا سلسلہ بھی اب مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔

س۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں "سکریننگ" کا عمل آپ کے ایما پر ہوا تھا کیا آپ ادب میں بھی
 ؟.....

ج: نہیں..... نہیں یہ سکریننگ کا فیصلہ خود ایوب خان کا تھا۔ یہ مشورہ یا رائے میں نے اسے نہیں دی میں نے تو
 البتہ اسے یہ کہا تھا کہ جو سرکاری افسر اپنے فرائض ٹھیک طریقے سے انجام دے رہے ہیں انہیں کام کرنے
 دیں اگر زیادہ ہی مجبوری ہے تو ان کا کہیں تبادلہ کر دیں مگر وہ نہیں مانے۔

س۔ اور آپ نے سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے جو تعلیمی پالیسی مرتب کی تھی؟
 ج: یہ بھی درست نہیں ہے میں دو بار سیکرٹری تعلیم رہا ہوں مگر تعلیمی پالیسی مرتب کرنے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں
 رہا بلکہ بچکی خان کے دور میں تو جب میں سیکرٹری تھا تو اس وقت تعلیمی پالیسی طے کی جا چکی تھی۔

س۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو حکومت نے ایک ریسرچ ورک کے سلسلے میں لندن بھیجا تھا تا کہ قائد اعظم کی شخصیت
 کے بارے میں لارڈ لٹچفیلڈ کو کے اثرات کا جواب دیا جاسکے تو کیا آپ نے یہ کام مکمل کر لیا تھا؟
 ج: اس بات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ مجھے اس قسم کے کسی کام کے لیے لندن نہیں بھیجا گیا۔ اگر کوئی بات
 ہوتی تو میں ضرور بتا دیتا۔

س۔ آج کل ہماری ملک کے حالات کیسے ہیں؟ ان پر تبصرہ فرمائیے؟
 ج: (قدرے خاموشی اور توقف کے بعد) بھئی یہ صورتحال ہندوستان تو ہے لیکن یہ PROLONG (طویل) بہت
 ہو گئی ہے۔ اس بات کا بہر حال خیال رکھنا چاہیے کہ سیاسی عمل بھی ایک قدرتی عمل ہے جو عوام میں اچھے
 اور بُرے کی تمیز کے احساس کو جلا بخشتا ہے۔ ہر جماعت اور گروہ میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے لوگ
 ہوتے ہیں۔ انکیشن میں بھی اسی طرح کے لوگ سامنے آتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اکثریت اچھے لوگوں
 کی ہوتی ہے۔ یہ "سیاست" کا مزاج ہے کہ اس میں اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ مگر
 سیاست کی مثال ایک پھلواری کی سی ہے۔ اس میں اگر گوڑی ہوتی رہے کھاؤ ڈالی جاتی رہے، پانی منسور رہے
 اور فالٹو گھاس پھوس کو الگ کیا جاتا رہے تو چودوں پر پھول آتے ہیں، میٹھے ہیں اور اپنی بہار دکھاتے ہیں۔
 ان میں بھی پھولوں، پتوں اور غنیمتوں کی ایک فطری اور قدرتی نسبت موجود رہتی ہے لیکن اگر پہلا عمل نہ کیا
 جائے تو ظاہر ہے کہ پھلواری بہار میں کبھی بھی کھلی ہوئی نہیں ملے گی۔

اب ہمارے یہاں مسئلہ یہ بھی ہے کہ قومی سطح کے تمام سیاستدان یا تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں یا فائدہ آؤٹ
 ہو گئے ہیں اور یا پھر دل برداشتہ ہو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ وہ کام نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی حالات کا
 تقاضا اس سے یکسانیت نہیں رکھتا۔ اس صورتحال کا نقصان میرے خیال میں یہ ہوگا کہ آئندہ مستقبل میں

157 شہاب نگر
جب بھی الیکشن ہوں گے تو قومی سطح کی قیادت کا فقدان ہوگا یعنی اس سطح کا کوئی لیڈر مشکل ہی ملے گا جو لاہور میں بیٹھ کر کوئٹہ یا پشاور میں بیٹھ کر جبکہ آباد کے مسائل اور معاملات کی بات کرے۔ اس کے مقابلے میں مقامی سطح کی قیادت ابھرے گی جو صرف لوکل باؤنڈ تک رسائی رکھتی ہوگی اور ظاہر ہے کہ ایسی مقامی قیادت کے مفادات اور مسائل بھی مقامی ہوں گے خدا نہ کرے ایسے حالات میں علیحدگی کے مناصرہ پنپنے لگتے ہیں۔ اور جو ہماری سرحدوں پر خطرات ہیں اور علاقہ کی "جو پولیٹیکل" پوزیشن ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اس وقت نہایت لازم ہے کہ ہم لوگ ریشٹل خارجہ پالیسی اختیار کریں۔ اس میں ہماری سلامتی اور بقاء ہے۔ ہمارے سامنے نیپال اور سری لنکا کی مثال ہے۔ یہ دونوں چھوٹے ملک ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو نہایت استقامت اور سلیقے سے قائم رکھا ہوا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں آپ کی رائے؟
میں ذاتی طور پر NORMALISATION کے خلاف ہوں۔ یہ عمل دراصل یوں ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے ساتھ ہمارے تعلقات سفارتی سطح پر برقرار ہیں لیکن ان سے آگے بڑھ کر اگر یہ تجارت اور سیاست میں آئیں گے تو ہمیں اپنے اثر اور دباؤ میں لینے کی کوشش کرے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اگر ہندوستان کو امن کا معاہدہ پیش کیا جائے تو وہ جواب میں تجارتی کمیشن یا معاہدہ دوستی کی تجویز ارسال کر دیتا ہے پھر اس کے اس طرح کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ کشمیر کا نام لینا چھوڑ دو، NORMALISATION کی بجائے DOMINATION حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کیا آپ اردو زبان کی ترویج کے لیے ہندوستان کے ساتھ باہمی تعاون کو مناسب سمجھتے ہیں؟
جی ہاں بالکل! کیوں نہیں، میرا مقصد یہ نہیں کہ ہم ہندوستان سے بالکل خوفزدہ یا احساس کمتری کا شکار ہو کر اس سے کٹ جائیں بلکہ میرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ محدود شعبوں میں تعلقات کو آگے بڑھانا چاہیے اور ادب و ثقافت کا شعبہ ان میں بڑا نمایاں ہے۔ ہمارے ٹی وی کے پروگرام نہایت معیاری ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب امرتسرنی وی شروع ہوا تو ہمارے ہاں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اب ہم ثقافتی یلغار کی زد میں ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے محبت وطن عوام نے اس خدشہ کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اب بلکہ انڈیا میں ہمارے ادیب، فنکار اور تخلیق کی پذیرائی ہوتی ہے۔

دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے تبادلے ہونے چاہئیں، ادب اور ثقافت کی ترویج کے لیے تعاون ہونا چاہیے اس میں کوئی حرج نہیں بس ہندو ذہنیت کو سمجھ کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

آپ کا تعلق کشمیر کے ساتھ کئی حوالوں سے ہے۔ مسئلہ کشمیر پر تبصرہ کیجئے؟
میرے خیال میں IT IS DEAD NOW شیخ عبداللہ زندہ تھے تو بات اور تھی کیونکہ وہ ایسی شخصیت تھے جن کا فیصلہ کسی وقت بھی پاکستان کے حق میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا جن دنوں مسز اندرا گاندھی اپنے انتخابی دورے پر سری نگر میں تھیں مجھے لندن میں ان کی تقاریر اخبارات میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک تقریر میں

انہوں نے سری نگر کے عوام سے کہا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گئیں تو اس خوشی میں آپ کو آپ کے کشمیر کا باقی حصہ بطور تحفہ پیش کروں گی۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ باقی حصہ آزاد کشمیر ہی ہے۔ اسی طرح چند روز ہوئے جموں ریڈیو سن رہا تھا، میں یہ سیشن اس لیے سنتا ہوں کہ شاید کوئی پرانی آواز کان میں پڑے۔ بہر حال اس روز وہاں سے ہندوستان کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مہوترا کی ریٹائرمنٹ پر انہیں دی جانے والی الوداعی دعوت کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہو رہا تھا۔ یہ مہوترا میرے جموں کے ایک فزکس کے پروفیسر کا بیٹا ہے۔ اس نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک پسماندہ گاؤں سے اٹھ کر ہندوستان کی فوج کا کمانڈر بنا، اب میں اپنی ”اننگ“ مکمل کر کے جا رہا ہوں لیکن مجھے افسوس رہے گا کہ میری کمان میں کشمیر ہمیں نہ مل سکا۔ میری دعا ہے کہ یہ مشن میرے بعد آنے والے کے عہد میں مکمل ہو جائے۔“

ان حالات کی روشنی اور پس منظر میں آپ مسئلہ کشمیر کا خود تجزیہ کر لیجیے۔

س۔ 1947ء کے بعد ادب میں نظریہ پاکستان کو سمونے اور پروان چڑھانے کے لیے ادیبوں نے کیا کردار

انجام دیا؟

ج: قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان کے لیے ادب میں کچھ نہیں ہوا کیونکہ ادب اپنے ماحول میں پنپتا ہے۔ پوری سوسائٹی میں نظریہ پاکستان کے لیے کیا ہوا؟ آج ہمارا ادب ہمارے 35 برسوں کا آئینہ دار ہے اور یہی پاکستانی ادب ہے یہی ماحول کی چھاپ ہوتی ہے جو ادب کی تشخیص کہلاتی ہے۔ لاہور اور لکھنؤ میں اگر ہیر رانجھے یا سستی پنوں کا قصہ لکھا جائے تو وہ اپنے علاقے رنگ کے حوالے سے اپنی شناخت ضرور کرائے گا۔ پھر ادب میں یعنی پاکستانی ادب میں 1947ء کے بعد افسانے میں اس حوالے سے کوئی بڑا افسانہ تخلیق نہیں ہوا افسانے کا عروج 1930ء سے 1940ء کے عشرہ میں رہا۔ فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے گئے لیکن تحریک پاکستان کے حوالے سے کچھ کام نہیں ہوا۔

س۔ اور اب ہمارے ادیبوں کا کیا کردار ہونا چاہیے؟

ج: دراصل بنیادی بات یہ ہے کہ ادیب REACT کرتے ہیں۔ اگر اس کو بات کہنے اور لکھنے کی آزادی ہے سچ بولنے کا SCOPE ہے تو وہ اتنا ہی عظیم ادب تخلیق کرے گا۔ اگر گھٹن ہے، پابندی ہے اور اظہار پر قدغن ہے تو اس کے فن میں ابہام کی صورت پیدا ہو جائے گی، آزاد اور کھلے ماحول میں اظہار کرنے والا ادیب چونکہ عظیم ادب تخلیق کرتا ہے لہذا وہ بڑا ادیب بن جاتا ہے اور یوں اپنے ماحول اور سماج کو ارتقاء کے عمل میں شامل کر کے آگے بڑھاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جو دوسری صورت ہے اس کا ذکر میں نے کر ہی دیا کہ سوائے ابہام اور فراریت کے ادیب سے کچھ اور کی توقع عبث ہے۔

س۔ ہندوستان میں تخلیق ہونے والا ادب کس معیار کا ہے؟

ج: مجھے نئے لکھنے والوں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا لہذا کوئی رائے نہیں دے سکتا البتہ ان کے رسالوں، اخبارات سے احساس ہوتا ہے کہ ہمارا معیار ان سے زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے نوجوان بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

لیکن فیض احمد فیض نے تو کہا ہے نئے لکھنے والوں کے فکر اور اظہار میں گہرائی کا فقدان ہے لہذا وہ ہمارے
 فکری اور ادبی ورثے کے امین نہیں ہو سکتے ہیں؟

مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے کہا ہے یا نہیں بہر حال مجھے اصرار ہے اور تسلیم ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والے ہم
 سے زیادہ سچے، ذہین، مخفی، دانش مند اور آگے بڑھنے والے ہیں۔ مجھے نوجوانوں کی صلاحیتوں کا بے حد
 اعتراف ہے۔ وہ بڑی اچھی FORM میں ہیں۔ وہ اس دھرتی پر پیدا ہوئے۔ پیدائشی طور پر پاکستانی ہیں
 لہذا ہم سے زیادہ محب وطن ہیں۔ وہ ہماری نسل کی طرح بمبئی، لکھنؤ، امرتسر، جالندھر، دہلی اور میرٹھ کی یادوں
 میں گم رہنے اور آہیں بھرنے والے نہیں بلکہ مجھے تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم کو ان سے اپنی حب الوطنی کا
 ثبوت لینا چاہیے۔

اس سے پہلے کہ نوجوانوں اور ادب کے بارے میں مزید گفتگو ہو اپنے اسرائیل کے خفیہ مشن کی تفصیل
 بتائیے؟

میں 1969ء میں یجی خان کی حکومت سے علیحدہ ہو کر یونیسکو میں چلا گیا کیونکہ میں ذاتی حیثیت میں اس
 کے ایگزیکٹو بورڈ کا رکن تھا۔ وہاں جو میں نے سب سے پہلا کام کیا وہ یہ کہ عربی کو عالمی زبان کے طور پر تسلیم
 کرایا اور اسے اقوام متحدہ میں رائج کرایا۔ اقوام متحدہ میں بھی سب سے پہلے یونیسکو نے اسے اختیار کیا جہاں
 میں اس ضمن میں عربوں کی بھرپور حمایت اور امداد سے جدوجہد میں مصروف تھا۔

اس زمانے میں عرب ممالک اور خاص طور پر مصر، سعودی عرب وغیرہ کے نمائندوں سے گہرے تعلقات
 استوار ہو گئے۔ ان نمائندوں نے یونیسکو کے سامنے شکایت کی کہ اسرائیل نے غزہ اور یروشلم سمیت متعدد
 مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے تحت چلنے والے سکولوں کے اساتذہ کو الگ کر دیا ہے بلکہ وہاں یونیسکو کی
 منظور کردہ درسی کتب کی بجائے اپنی مرضی کا نصاب رائج کر چکا ہے اس نصاب سے مسلمان بچوں کی ذہنی
 پستی مقصود تھی۔ یونیسکو نے اس شکایت پر دوبار اپنی جماعتیں ان علاقوں کو روانہ کیں مگر اس چھاپے کے وقت
 اسرائیل نے ظاہر ہے کہ یونیسکو کے اساتذہ اور لٹرچر بطور نمائش پیش کر دیا۔

میں نے عرب نمائندوں سے کہا یا تم غلط بیانی سے کیوں کام لیتے ہو۔ انہوں نے سنجیدگی سے اصل صورتحال
 کی وضاحت کی تو میں نے خود اسرائیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ایران کا پاسپورٹ فراہم کر دیا گیا کیونکہ شاہ
 نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مجھے تل ابیب کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی ایک
 ٹورسٹ گائیڈ مصطفیٰ ملا جو دراصل فلسطینی تھا اور ”فلسطینی کا“ کے لیے کام کر رہا تھا۔ میں دس روز کے لیے اس
 کے رحم و کرم پر تھا۔

مصطفیٰ نے میری ہر طرح سے مدد کی۔ وہ میرے جوتے تک پالش کرنے کی کوشش کرتا۔ معلوم نہیں کن
 مشکلات سے اس نے میرے لیے مطلوبہ سکولوں کے دورے کا بندوبست کیا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا مگر ان
 دن دنوں میں مجھے ایک ایسا سگار اپنے منہ میں داب کر رکھنا پڑا جو گیلیا بھی تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سگار کو
 جلانے کے لیے بار بار لائٹر جلاتا پڑتا تھا اور اس لائٹر میں کیمرفٹ تھا جو حسب ضرورت فوٹو اتارتا تھا۔ مجھے
 فوٹو گرافی بالکل نہیں آتی لیکن میں نے اس عرصے میں جتنی تصویریں اتاریں وہ حیرت انگیز حد تک واضح اور

شہاب مگر

عمدہ نتائج کی حامل تھیں۔ میں نے سکولوں کے اساتذہ کے ساتھ فوٹو بنوا کر ان پر ان سے آئو گراف حاصل کیے کم و بیش 113 کتب حاصل کیں۔ سینکڑوں بچوں کے فوٹو اتارے حتیٰ کہ فلسطینی بچوں پر (جو وہ نصاب نہیں پڑھتے تھے) ہونے والے تشدد کی تصویریں اتاریں اور واپس چلا آیا۔ ان شواہد اور ثبوت کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی چنانچہ یوں اسرائیل کے سارے منصوبہ کو ناکام بنا دیا گیا۔

س۔ اس دورے میں کوئی یادگار لمحات؟

ج۔ میرا دورہ دس دن کا تھا اور میرے پاس اس حساب سے ANTISLEEP PILLS تھیں مجھے دس دن تک نیند سے ”پرہیز“ کرنا تھا کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ سوتے میں اپنا نام سنے تو دفعتاً جاگ اٹھتا ہے۔ یہ احتیاط اس لیے کی گئی تھی کہ ایسا نہ ہو کوئی میرا نام پکارے اور میں نیند سے چونک پڑوں میں نو دن تک جاگ رہا۔ دن رات جاگنے سے میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ آخری دن مجھے مصطفیٰ نے کہا اب تم سو جاؤ ورنہ COLLAPSE ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ترکیب یہ نکالی کہ وہ مجھے رات کو مسجد اقصیٰ میں بند کر دے گا اور صبح آ کر لے جائے گا۔ جب وہ دروازے بند کر کے چلا گیا تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا مگر ایک لمحہ کو جب مجھے خیال آیا کہ میں مسجد اقصیٰ میں ہوں جو قبلہ اول ہے تو یقین کیجیے میری ساری نیند اڑ گئی۔ میں اس رات بھی جاگتا رہا۔ ایک اور بات یہ کہ میرے پاس ایک بالکل ننھی سی معمولی سی گولی تھی۔ مگر یہ ہنگامی حالات کے لیے کہ اگر میں پکڑا جاؤں تو اس کو نگل لوں یہ صرف آدھے سیکنڈ میں مجھے ابدی نیند سلا سکتی تھی مگر خدا کا شکر ہے اس کی نوبت نہیں آئی۔

س۔ اس مشن کی کوئی مزید تفصیل؟

ج۔ ہے تو سہی مگر بتاؤں گا نہیں کیونکہ اس طرح وہاں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کے لیے کوئی پرابلم پیدا ہو سکتا ہے۔

س۔ آپ نے اسرائیلی اور عربی عوام میں کیا فرق محسوس کیا؟

ج۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اسرائیلی کتنے منظم اور تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی ساٹھ ستر سالہ بوڑھی بھی کم از کم رائفل چلانا جانتی ہے تاکہ جنگ میں اگر دست بدست لڑائی یا گلی کوچوں میں معرکہ کی نوبت آئے تو یہ اپنی حفاظت خود کریں۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ بہت مخفی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے زیادہ مسلم دشمن ہیں۔

ہم خود کو نظریاتی مملکت کہلاتے ہیں بلکہ میں اس کے مقابلے میں اسرائیل بھی نظریاتی مملکت کہلاتا ہے لیکن وہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پوری قوم ایک نظریہ اور نصب العین کے لیے ہر لمحہ برسرِ پیکار اور مصروفِ عمل ہے۔

س۔ ہمارے ملک میں آج کل تخریب کاری کا چرچا ہے۔ اس بارے میں فرمائیے؟

ج۔ میرے خیال میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سارا ملک تخریب کاروں کی GRIP میں ہے۔ تخریب کاری کے تین بڑے واقعات ظہور الہی کا قتل، ظہور بھوپالی کا قتل اور ایک آدھ اور قتل اسی صورت میں ہوئے اور ایک ایسی تنظیم یا گروہ کی طرف سے جو انتقام لینے پر تلی ہوئی ہو یہ تین قتل کوئی تشویشناک بات نہیں اگر عوام اور حکومت

کے درمیان فاصلے کو کم کیا جائے اور اتحاد کو مضبوط کیا جائے تو ان واقعات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ انتقام کا جذبہ پیدا کرنے کی وجوہات ختم کر دی جائیں۔ یعنی ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ لوگوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ نہ ابھر سکے لہذا میرے خیال میں تحریک کار کی کوئی مسئلہ نہیں۔ ملک تحریک کاروں کی گرفت میں نہیں ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک کارچوروں کی گرفت میں ہے ملک ملاوٹ کرنے والوں کی گرفت میں ہے تو اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔

آپ سقوط مشرقی پاکستان کے بعض ایسے اسباب سے یقیناً واقف ہوں گے جو عام آدمی کے علم میں اب تک نہیں آئے۔ ان کا بیان ہو جائے؟

ایسے بہت سے حالات، واقعات اور اسباب ہیں مگر میں ان سے چند کا ذکر آپ سے آف دی ریکارڈ کر دیتا ہوں۔

یہ آف دی ریکارڈ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی ایک تنازعہ مسئلہ CONTROVERSY شروع ہو جائے گا جو ابھی نامکمل ہے اور جو اس موضوع کا احاطہ کرے گی۔

آپ نے اسرائیل کے عوام کا ذکر کیا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ 1947ء کے بعد ہمارا نظریہ پاکستان کا سارا دلولہ اور جذبہ کیوں ماند پڑ گیا؟

میں سوشیا لو جسٹ یا سائیکو جسٹ نہیں ہوں۔ البتہ اتنا ضرور عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہم جو بات زبان سے کہتے ہیں وہ ہمارے عمل اور کردار کا حصہ نہیں بنتی ہم ذہنی طور پر مادہ پرست ہو گئے اور یوں پیسہ ہی ہمارا مقصد زندگی اور مٹھیم نظر بن گیا اس رویہ نے ہم میں منافقت کو جنم دیا اور آپ جانتے ہیں کہ منافقت کو کفر سے زیادہ بُرا قرار دیا گیا ہے اب اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

تصوف کے حوالے سے ممتاز مفتی نے "لبیک" میں آپ کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟
میں نے کبھی بھی خود کو صوفی یا تصوف کے حوالے سے پیش نہیں کیا۔ ممتاز مفتی صاحب بڑے افسانہ نگار ہیں وہ کہانی بنا سکتے ہیں۔ یہ سوال وہی بنا سکتے ہیں۔

کوئی ایسی کہانی جو آپ لکھ نہ سکے ہوں؟

ایسی بہت سی کہانیاں ہیں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (سوچ کر) جب میں جموں میں کالج کا سٹوڈنٹ تھا تو اتفاق سے ایک عالمی مقابلہ مضمون نویسی میں مجھے اول انعام کے طور پر گولڈ میڈل اور ساڑھے سات سو پونڈ ملے۔ اخباروں میں اس کا چرچا ہوا تو مہاراجہ ہری سنگھ نے مجھے چائے پر مدعو کیا۔ میں محل میں پہنچا مہاراجہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس وقت نشہ میں بری طرح دھت تھا۔ میں وہاں محض تماشا دیکھنے کے لیے چائے پینے کے وقت تک رکا رہا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا واپس گھر آ کر اسے "بیت الجمن" کے نام سے ایک کہانی میں بیان کر دیا۔ اتفاق سے چوہدری غلام عباس بھی آگئے وہ میرے بڑے خیر خواہ تھے۔ میں نے یہ کہانی انہیں سنائی تو وہ بولے تم کچھ دنوں بعد آئی سی اے (ICS) کے امتحان میں بیٹھو گے پھر پولیس تہبہاری انکوائری کرے گی اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا تو سوچو کیا ہوگا بہتر مستقبل کے لیے میں نے ان کی بات مان لی لیکن بعد میں زندگی میں ہری سنگھ کے رویہ اور حالت کا شکوہ جاتا رہا کیونکہ بہت بڑے بڑے بیت الجمن نظر

سے گزرے۔

جی ہاں! ایک واقعہ تو مجھے گورنر جنرل غلام محمد کے حوالے سے یاد آ رہا ہے کہ انہوں نے مولانا احتشام الحق

تھانوی کو.....؟

ج: ہاں، ہاں وہ کچھ نازیبا کلمات ادا کرنے کا، مگر وہ مولانا احتشام الحق نہیں تھے وہ کراچی کے ایک بزرگ (سوفی کر) اس وقت ان کا نام یاد نہیں آ رہا اب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہاں ایک واقعہ میرے سامنے ہوا تھا مگر وہ تھانوی صاحب نہیں تھے۔

س: آپ ادیب اور بیوروکریٹ میں سے کون سا حوالہ اپنی شناخت کے لیے پسند کرتے ہیں؟

ج: شناخت اور حوالے کی کیا بات ہے؟ نوکری بس مل گئی، کرتے رہے جیسی بھی کی اور ادب میں اتنا نہیں لکھا کہ کوئی معتبر حوالہ بن سکے۔ ویسے میں ملازمت سے جلد ریٹائر ہو گیا۔ یعنی ابھی آٹھ سال ملازمت باقی تھی کہ میں نے استعفیٰ دے دیا۔

س: تو گویا پھر ادیب کا حوالہ زیادہ مناسب رہے گا؟

ج: ہاں..... بس یوں ہی سمجھ لیں۔

س: آپ کے خیال میں نوجوانوں کو کس حد تک ملکی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے؟

ج: نوجوان اللہ کے فضل سے بہت ذمہ دار اور محب وطن ہیں۔ ہمیں ان پر اعتماد کرنا چاہیے انہیں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ ان کی سرگرمیاں اگر یونیورسٹی کیمپس اور کالج گراؤنڈ تک رہیں تو صحت مند اور مثبت رہتی ہیں اگر اس احاطے سے باہر آ جائیں تو اس میں دوسرے عوامل شامل ہو جاتے ہیں اور پھر مسئلہ بن جاتی ہیں لہذا انہیں اچھی زندگی بسر کرنے کے مواقع اور عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ماحول فراہم کیا جانا چاہیے۔

س: ادب میں کوئٹہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: میرے خیال میں صرف ادب کے ساتھ ہونی چاہیے۔

ہفت روزہ "حرمت" 1986ء

☆.....☆.....☆

شہاب صاحب سے مڈھ بھیسٹر

.....انتظار حسین

ولی راوی می شناسد۔ شہاب صاحب کو اگر کسی نے پہچانا تو ممتاز مفتی نے پہچانا، پہچانا اور اعلان کیا کہ یہ شخص جو افسر کے بھیس میں پھرتا ہے اصل میں ولی اللہ ہے۔ مفتی صاحب نے جو کہا ہم نے نقل کر دیا مگر جب شہاب صاحب سے مڈھ بھیس ہوئی تو وہ مسکرائے اور بولے کہ مفتی صاحب تمہیں چکادے گئے۔

میں نے اسے اشارہ سمجھا کہ اب شہاب صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے وہ حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں سو میں خوش خوش شہاب صاحب کے پاس پہنچا اس گمان میں کہ اب مفتی صاحب کے سب بیانات کی تردید ہو جائے گی۔ مگر شہاب صاحب نے صاف کہہ دیا کہ میں مفتی صاحب کا بہت احترام کرتا ہوں ان کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ چونکہ مفتی صاحب میرے بارے میں کچھ باتیں کہہ چکے ہیں تو میں اب یہ کوشش کرتا ہوں کہ انہوں نے جو میری تصویر پیش کی ہے اس کی مطابق بنوں تاکہ مفتی صاحب کا بھرم رہ جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مفتی صاحب نے آپ میں آخر کچھ تو دیکھا ہوگا کہ آپ کے بارے میں ایسے بیانات دیے۔ بولے کہ مفتی صاحب نے مجھ سے اقوال زریں سنے اور عقیدت مند بن گئے ان کا عقیدہ ہو یا نہ ہو عقیدت کا مادہ ان میں ضرور ہے۔

ان اقوال زریں کی صورت یہ ہے کہ فرمایا قدرت اللہ شہاب نے ممتاز مفتی سے کہ آدمی کو چاہیے کہ نفرت سے پرہیز کرے، عداوت سے باز رہے، غصہ پر قابو پائے اور اے عزیز میں نے اس پر آدھا عمل کیا ہے پھر فرمایا سن اور گرہ میں باندھ کہ آدمی کے لیے تعریف اور تنقیص کی حیثیت یکساں ہونا چاہیے اور میں نے اس نصف پر عمل کیا ہے تنقیص سن کر رنجیدہ نہیں ہوتا۔

سوچ لیتا ہوں کہ اپنی خرابیاں جتنی میں جانتا ہوں اتنی یہ شخص نہیں جانتا مگر یہ کہ تعریف سن کر خوش ہوتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ آدمی کسی کے پیٹھ پیچھے وہی کہے جو اس کے منہ پر کہہ سکتا ہے اور واضح ہو کہ اس پر بھی میں نے نصف عمل کیا ہے۔

گویا شہاب صاحب اپنے حساب سے بھی آدمی صوفی تو ضرور ہیں، میں نے سوچا کہ تھوڑا اور کرید و ممکن ہے آدھا صوفی بھی کس نفسی کی وجہ سے یہیں کہیں چھپا پڑا ہو۔ کریدنے پر بولے کہ اصل میں دعا میں میرا بہت ایمان ہے اور میری کوئی دعا کبھی رو نہیں ہوئی دعا اگر پوری نہیں ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی مصلحت ہوگی اور اسے بھی قبولیت ہی کے خانے میں ڈال لیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ آپ کے بارے میں اب تک جتنا کچھ سنا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ تصوف سے آپ کی دلچسپی محض ذہنی قسم کی نہیں ہے کچھ واردات سے بھی آپ کی شناسائی معلوم ہوتی ہے۔ بولے کہ میں یہ اعتقاد ضرور رکھتا ہوں کہ

ایک باطنی دنیا بھی ہوتی ہے اس دنیا کے واسطے سے اکا دکا تجربہ ہوا بھی ہے مگر بس ایسے جیسے کسی کے نام لاری کھول رہا ہے
میں نے اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہی تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ان کی صورت واقعات کی نہیں احساسات کی ہے اس لیے
انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔

اب مجھے یہ جاننے کی خواہش ہوئی کہ شہاب صاحب کون سے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں پتا چلا کہ سب سلسلوں کا
ماننے ہیں بولے کہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے زیادہ متاثر ہوں جن کے بیان میں مختلف سلسلوں کا احاطہ
نظر آتا ہے اور جنہوں نے تصوف کو وہ بنا دیا ہے جسے MADE EASY کہتے ہیں۔

میں شہاب صاحب کے تصوف کی بات کیے جا رہا ہوں حالانکہ میں نے سوچا یہ تھا کہ صرف ان کی افسانہ نگاری
سے غرض رکھوں گا ان کی دوسری حیثیتوں کو دوسرے جانیں۔ پہلے تو وہ افسانہ نگار ہی تھے۔ 40ء کے آس پاس سے ان
کی افسانہ نگاری شروع ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کا افسانہ چالو انداز فکر کے خلاف بنیاد کا نشان بن
گیا۔ یہ 48ء کا واقعہ ہے اس وقت ترقی پسند تحریک نے ادب میں یہ انداز فکر چلا رکھا تھا کہ تقسیم نے کہ ایک سامراجی
سازش ہے، یہ گل کھلایا ہے کہ ہندو اور مسلمان انسانیت کو بھول گئے ہیں اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلا گھونٹ
رہے ہیں۔ شہاب صاحب نے شعر اور افسانہ لکھنے کے اس چالو نسخہ سے انحراف کیا اور ایک سیدھے سچے پاکستانی بن کر
فسادات میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا اس کی کہانی لکھ ڈالی یہ کہانی ”یا خدا“ کے نام پر چھپی، پس پھر کیا تھا ترقی
پسند شہاب صاحب ٹوٹ پڑے وہ تو یہ کہتے کہ محمد حسن عسکری نے اور ان سے بڑھ کر ممتاز شیریں نے دفاعی کارروائی کی
ورنہ شہاب صاحب ادب میں درجہ شہادت حاصل کر چکے تھے۔ اصل میں شہاب صاحب کو درجہ شہادت کسی اور طاقت
کے ہاتھوں حاصل کرنا تھا۔

ترقی پسندوں کا حملہ بھی سخت تھا مگر آگے چل کر ان پر دو حملے اور ہوئے اور وہ زیادہ سخت تھے، ایک حملہ افسری کا،
ایک حملہ تصوف کا، دو تو پٹون کے بھی بڑے ہوتے ہیں اور یہ تو دونوں فولادی طاقتیں تھیں، افسانہ نگار، افسر اور صوفی کے
بیچ میں آخر پھس گیا میں نے شہاب صاحب سے یہ بات کہی تو انہوں نے صوفی کو بُری کر دیا۔ کہا کہ ہاں ملازمت کی
مصروفیات نے میری افسانہ نگاری کو ضرور نقصان پہنچایا اور 58ء کے بعد تو ایسا زمانہ آیا کہ افسانہ لکھنے کی نوبت ہی نہیں
آتی تھی۔ سارا وقت خطبے لکھنے پر صرف ہو جاتا تھا۔ اب مجھے اس کا افسوس بھی ہے کہ میں ان قصوں کی وجہ سے اس ملامت
سے محروم ہو گیا جو افسانہ لکھ کر حاصل ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا ”اب واپسی کی کوئی صورت ہے؟“ بولے کہ ”اب واپسی
مشکل ہے۔“

شہاب صاحب بتانے لگے کہ میں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ یہ سوچ کر لی ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام کمپنوں
سے کروں۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آیا چاہتا ہے مگر شہاب صاحب نے جب اپنے پڑھنے لکھنے
کا منصوبہ بنایا تو اس میں افسانہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ انہوں نے تو اور ہی قسم کی کتابیں لکھنے کا منصوبہ بنایا ہے مثلاً ایک تو ”
پاکستانی افسر شاہی کا تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ اس زاویے سے کہ اس نے پاکستان کے بنانے بگاڑنے میں کتنا حصہ لیا۔ کہنے
لگے کہ عنایت اللہ مرحوم کی برسی کے موقع پر شورش کشمیری نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ بے کم و کاست
لکھ ڈالوں تو اب میں لکھ رہا ہوں، جھوٹ تو نہیں لکھوں گا مگر سچ کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ کس حد تک نا
لکھتا ہوں۔ ہم عصر تاریخ لکھنا مشکل کام ہے میں ڈرتا ہوں مگر میری آنکھ میں مروت ضرور ہے بہر حال جو جانتا ہوں

واضح ہو کہ شہاب صاحب بہت کچھ جانتے ہیں وہ پاکستان کے وہ نامی گرامی افسر ہیں جنہوں نے کئی سربراہانِ مملکت کو یکے بعد دیگرے بھگتایا ہے۔ جن لوگوں نے ان کا صرف نام سنا ہے ان کے لیے تو وہ بہت رعب داب والے افسر ہیں مگر دیکھو تو وہ ویسے نظر نہیں آتے بلکہ افسر ہی نہیں لگتے۔ بات یہ ہے کہ سی ایس پی افسر کی چال ڈھال اور ٹوپی اور ہی ہوتی ہے شہاب صاحب کم از کم اپنی چال ڈھال سے افسر ہونے کی پُغلی نہیں کھاتے باتوں میں بھی وہ طنطنہ نہیں۔ سٹیج پر آ کر جب تقریر کرتے ہیں اس وقت بھی افسرانہ بلند آہنگی سے نہیں بولتے کم اور آہستہ بولتے ہیں اور ادیبوں کو نصیحتیں نہیں کرتے ہاں 1958ء کے بعد ایسا زمانہ ضرور آیا تھا جب انہوں نے لکھ لکھ کر لمبے خطبے دیے تھے اور ادیبوں کو نصیحتیں بھی کی تھیں مگر الحمد للہ کہ وہ زمانہ جلد گزر گیا۔

اس زمانے کی یاد کے ساتھ مجھے رائٹرز گلڈ یاد آنا ہی تھا۔ شہاب صاحب تو یہی کہتے ہیں کہ مرحوم عبدالحق مرحوم، شاہد احمد دہلوی اور جمیل الدین عالی نے انہیں یہ راہ بھائی تھی مگر بہر حال رائٹرز گلڈ کے خالق شہاب صاحب ہی ہیں میں نے پوچھا کہ اب جبکہ گلڈ سارے گرم و سرد دیکھ چکا ہے آپ کو اپنا یہ تجربہ کیسا لگتا ہے بولے کہ جب تک گلڈ کے سامنے مقاصد تھے وہ ٹھیک رہا جب صاحب جائیداد ہو گیا تو بگڑ گیا۔

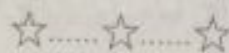
میں نے کہا کہ ادیبوں کی ایسی تنظیم قائم کی جائے تو ایک شک سا ہوتا ہے کہ یہ ادب کے REGIMENTATION کا کوئی منصوبہ ہے۔ بولے کہ ہماری ذہن میں ہرگز یہ بات نہیں تھی اور گلڈ نے کبھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اس لیے مجھے اپنے اس کام پر کوئی افسوس نہیں ہے اس نے اچھے کام ہی کیے ادیبوں کو قید سے چھڑوایا ان کے لیے انعامات اور وظائف کا اہتمام کیا سب ادیب اس میں شامل ہوئے ماسوا جوش کے۔

”ونیزن۔م۔ راشد اور محمد حسن عسکری کے“

”ہاں! وہ بھی شامل نہیں تھے۔“

یہ تو خیر مختصر گفتگو تھی۔ شہاب صاحب کو ایسے سب قصوں کو جن میں ان کا قدم رہا ہے پنپانے کے لیے ایک پورا تذکرہ لکھنا پڑے گا اور وہ لکھ رہے ہیں۔ افسر شاہی کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ایک خودنوشت بھی لکھی جا رہی ہے اس کا نام ہوگا ایک کامیاب آدمی کی خودنوشت۔

”ملاقاتیں“۔ مکتبہ عالیہ 1988ء



انٹرویو:

تیموری۔ رضا عباس

رضا عباس: آپ نے اپنی تحریروں میں زیادہ تر قیام پاکستان اور اس سے پیدا شدہ حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

شہاب: میں نے قیام پاکستان کو اس لیے اپنا موضوع بنایا ہے تاکہ وہ لوگ جو پاکستان بننے کے بعد پیدا یا بڑے ہوئے ان کو پاکستان بنانے کے مقصد کا پتہ چلے، ان کو معلوم ہو کہ مسلمانوں کو آزادی سے پہلے ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں کتنی مشکلات درپیش تھیں تاکہ ان کو غلامی کے ماحول کا اندازہ ہو سکے۔

خالد: قیام پاکستان پر لکھنے والے اکثر ادباء کے نزدیک برصغیر کی تقسیم ایک المیہ ہے آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟

شہاب: اصل میں جو لوگ قیام پاکستان کو المیہ سمجھتے ہیں دراصل وہ پاکستان پر یقین ہی نہیں رکھتے جو لوگ پاکستان کو پسند ہی نہیں کرتے انہیں اس ملک سے چلے جانا چاہیے جس طرح قرۃ العین حیدر وغیرہ پاکستان سے چلی گئی ہیں۔

تیموری: آپ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی رہے ہیں اور ادیب بھی۔ آپ کی شخصیت پر آپ کے خیال میں کس چیز کا زیادہ اثر ہے؟

شہاب: مجھ پر حکومت کا کوئی اثر نہیں التبتہ ادب کا تھوڑا بہت اثر ہے۔

رضا عباس: کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بہت کم ادیب ایسے ہیں جو اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہے ہوں تو آپ پر اس ملازمت نے آیا کوئی اثر ڈالا یا نہیں؟

شہاب: میں نے سرکاری نظام میں کافی طنزیہ تحریریں لکھیں مثلاً ”سرخ فیتہ“ دوسرے افسانوں میں بھی میں نے دفتری معاملات پر طنز کیے۔

تیموری: دوسرے باشعور ادباء کی طرح آپ نے اپنی تحریروں میں ظالم اور مظلوم کی نشاندہی کی ہے لیکن آپ میں اور ایک عام ادیب میں یہ فرق ہے کہ آپ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے عہدیدار بھی رہے تو آپ نے اپنے اختیارات کے ذریعے مظلوم طبقہ کی فلاح کے لیے کیا اقدامات کیے؟

شہاب: بہت کام کرنے کا تو دعویٰ نہیں کر سکتا البتہ جتنا مجھ سے ہو سکا میں نے کیا۔ جن دنوں میں ڈپٹی کمشنر تھا تو اکثر کسی قریبی گاؤں میں جا کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور لوگوں کی شکایات سنتا۔ پولیس کے تھانیدار اور پنواری کو بھی ساتھ بٹھالیتا اور موقع پر ہی فیصلے صادر کر دیتا تھا۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ

جب میں پریڈیٹری میں تھا تو میں نے عام طبقہ کو یہ موقع فراہم کرنے کی کوشش کی کہ وہ براہ راست صدر سے مل سکے۔

ادبی شخصیات میں آپ سب سے زیادہ کس سے متاثر ہیں؟

کلاسیکی نثر میں رتن ناتھ سرشار اور جدید نثر میں محمد حسن عسکری سے میں بہت متاثر ہوں نظم میں غالب اور اقبال نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔

آپ نے ابھی جن شخصیات کے اسمائے گرامی لیے ہیں ان سے آپ کس وجہ سے متاثر ہیں؟

غالب اور اقبال کو تو سب ہی جانتے ہیں مگر محمد حسن عسکری زیادہ مشہور نہیں ان کا اسٹائل مجھے بہت پسند ہے۔ اسلوب بیان پر خصوصی توجہ دیتے تھے ان کا موضوع ہمیشہ ماحول سے مطابقت رکھتا ہے۔

متنازع مفتی آپ سے بہت متاثر ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

ان کی بد قسمتی ہے کہ وہ مجھ سے متاثر ہیں (قبیحہ) سیدھے سادے آدمی ہیں۔ میری ان سے ملاقات قریباً 25 سال قبل ہوئی تھی۔ اس زمانے کے اعلیٰ افسرانِ نماز روزے کے پابند نہیں ہوتے تھے اگر کوئی تھا بھی تو ظاہر نہ کرتا تھا انہوں نے محسوس کیا کہ میں مذہب سے لگاؤ رکھتا ہوں۔ چنانچہ وہ مجھ سے متاثر ہوں گے۔

مگر ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہب سے دُور ہیں۔

وہ ذہنی طور پر مذہب سے قریب ہیں اگرچہ تحریری طور پر دُور ہیں۔

مذہب کے سلسلے میں آپ تصوف کی طرف مائل ہیں حالانکہ تصوف کے منفی رجحانات نے اسلام کو بہت ضعف پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں آپ کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

میں اس قسم کے تصوف کی طرف قطعی مائل نہیں جس قسم کے تصوف کی اقبال نے مذمت کی ہے۔ تصوف کوئی غلط شے نہیں۔ تصوف تو دینِ عملی ہے میں اس تصوف کے خلاف ہوں جس میں عملی زندگی سے کٹ کر خانقاہوں میں بیٹھ جانے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

یہ پالیسی اچھی ہے مگر کوئی پالیسی اس وقت تک اچھی ثابت نہیں ہو سکتی جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔

تو کیا آپ کے خیال میں یہ پالیسی نافذ ہو جائے گی؟

بائثر لوگ چونکہ کہتے ہیں کہ اس پالیسی پر عمل ہوگا اس لیے ہمیں ان کی بات پر یقین رکھنا چاہیے۔

آج کل آپ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں آپ کا وقت کن مشاغل میں گزرتا ہے؟

میں اتنا ہی مصروف ہوں جتنا ملازمت کے دوران تھا میں نے دو تین کتابیں لکھنی شروع کی ہیں جو تکمیل کے مراحل میں ہیں۔

آپ ان کتابوں کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

ان میں سے ایک کتاب میری اپنی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ”شہاب نامہ“ ہے۔

دوسری کتاب پاکستان پر ہے۔

اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں طلباء کو آپ کیا پیغام دینا پسند فرمائیں گے۔

خالد:

پیغام تو نہیں دوں گا البتہ ان سے درخواست ہی کروں گا کہ تعلیمی نقطہ نظر سے موجودہ حالات پہلے حالات سے بہتر ہیں طلباء کو آج جو آسائشیں میسر ہیں ان کے بزرگوں کو میسر نہ تھیں چنانچہ جب بھی انہیں اپنے حقوق یاد آئیں ان باتوں کو مد نظر رکھیں اور دوسری بات جو کبھی کہتے ہیں کہ وہ خوب پڑھیں۔

شہاب:

آج کل جو کچھ ادب میں لکھا جا رہا ہے آپ اس سے مطمئن ہیں کہ نہیں؟

رضا عباس:

آج کل ادب میں جس انداز سے لکھا جا رہا ہے وہ موجودہ حالات کے بالکل مطابق ہے اور ٹھیک ہے کیونکہ لوگوں کا ماحول بدلتا رہتا ہے جس کے ساتھ ساتھ ادب کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے۔

شہاب:

آپ اپنی تعلیمی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بتانا پسند کریں گے جو طلباء کی دلچسپی کا باعث ہو؟

رضا عباس:

جی ہاں! میں جموں کے کالج میں پڑھا کرتا تھا، وہاں کے میگزین کا میں ایڈیٹر تھا اس زمانے میں ہم نے

شہاب:

ایک صاحب سے ایک انٹرویو کی درخواست کی تو انہوں نے مسترد کر دی میں نے ایک فرضی انٹرویو بنایا

جس میں ان کے نظریات سے قطعی مختلف باتیں لکھیں اور یہ انٹرویو شائع کروا دیا، وہ صاحب اس انٹرویو

کو پڑھ کر بہت ناراض ہوئے اور پرنسپل پر ہر جانے تک کا نوٹس دے دیا بعد میں پرنسپل نے مصالحت

کروادی۔

قدرت اللہ شہاب کی باتیں

جنا ب سب سے پہلے تو اپنی زندگی کے ابتدائی حالات اور تعلیم کے بارے میں کچھ بتا دیتے؟
(شہاب صاحب نے چند لمبے وقفے کیا یوں جیسے ماضی کے درجوں میں جھانک کر اپنے آپ کو گزرے کے میں دیکھ رہے ہوں) پھر گویا اس نے پوری زندگی کی داستان حرف بہ حرف تو نہیں سنا سکتا کیونکہ اتنی ہنگامہ پر درگزر ہی ہے کہ کچھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ بہر حال جنوں کے ایک پرائمری سکول سے تعلیم کی ابتدا کی۔ خالصہ ہائی سکول جنوں سے میٹرک پاس کیا اور پھر پرنس آف ویلز کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ (قارئین آپ کو بتاتے ہیں کہ شہاب صاحب نے اپنے تمام امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے اور دوران تعلیم وظائف حاصل کیے۔)

جب میں قمری ایئر میں تھا تو اخبار میں ایک اشتہار چھپا۔ انگریزی مضمون لکھنے کا مقابلہ تھا جو پاکستان کا کوئی اور روکر رہا تھا۔ مذاق مذاق میں نہیں لے بھی ہوئی مضمون لکھ دیا تمام دنیا سے لوگوں نے مضامین جیسے اور کل انیس ہزار لوگوں کے مضامین شامل تھے اور ان انیس ہزار میں سے مجھے پہلا انعام ملا۔ (بہتے ہوئے ویسے آج تک کچھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے مجھے انعام کیسے دے دیا) خیر اخباروں میں اس کا تذکرہ کیا گیا اور کالج والوں نے تو میری بی بی حوصلہ افزائی کی (اتنا کہہ کر شہاب صاحب خاموش ہو گئے۔ مسز نذر نے کہا کہ وہ تصویر والا معاملہ بھی تو بتائیں نا، گو یا شہاب صاحب کھڑا ہے تھے اور میڈیم نذر اس کا ساری قصیں کچھ دیر بعد فرمائی) کالج والوں نے میری ایک فلر سائز تصویر کالج ہال کے درمیان لٹائی جو آج تک موجود ہے اس کے بعد میں نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔

بچپن کا کوئی واقعہ جو اب تک یادوں میں محفوظ ہو؟

بچپن کے تو بہت سے واقعات ہوتے ہیں مگر ایک واقعہ ایسا ہے جو مجھے آج تک یاد ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعے کی برکتیں اب تک میرے ساتھ ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک برہمن رہتا تھا وہ اسلام کے سخت خلاف اور متعصب ذہن کا مالک تھا۔ اذان کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتا تھا۔ جب میں لٹل میں تھا تو ایک دھیلے کا امتحان ہوتا تھا امتحانی سینٹر گاؤں سے گیارہ میل دور تھا۔ صبح صحت سندی میں منہ اندھیرے جاتا چتا تھا بہت خوف محسوس ہوتا تھا،

اس برہمن کی عادت تھی کہ وہ صبح پوجا کرنے سے پہلے ندی میں نہانے جاتا تھا مجھے شرارت ہو گئی اور میں نے بلند آواز سے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ برہمن نے کانوں میں انگلیاں ٹھکرائیں لیں اور ڈبکیاں کھانے لگا خیر یہ تو ایک شرارت تھی لیکن درود شریف پڑھنے کی مشق جاری رکھی اس کی برکت سے تمام ڈر خوف دور ہو گیا یوں وہ مشق آج تک جاری ہے۔

آپ زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے؟

قرآن۔

اپنی والدہ سے ان کے بعد مجھے کسی نے متاثر نہیں کیا۔

شہاب صاحب:-

مفتی صاحب نے آپ کی روحانی زندگی پر بہت کچھ لکھا اس بارے میں کچھ بتائیے؟

فوزیہ:-

شہاب صاحب نے بڑی ملائمت اور دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ میری روحانی زندگی وہیں سے شروع ہوتی ہے جب آٹھویں جماعت کا امتحان دیتے وقت میں نے درود شریف کی برکات دیکھی تھیں۔ اس کے بعد میری والدہ میری آئیڈیل شخصیت تھیں میری روحانی زندگی انہی کی مرہون منت ہے۔

☆

اسی حوالے سے ایک اور سوال کہ ممتاز مفتی نے اپنی کتاب ”لبیک“ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ حج کے موقع پر عبادات سے پہلے آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی جسے ڈاکٹری زبان میں ”انجائنا“ کہتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ وہ کیا کیفیت تھی؟

فوزیہ:-

اس وقت جو کیفیت طاری ہوتی میں ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا بس OVER-WHELMING کیفیت تھی۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی اور 1953ء کا زمانہ جب میں مسجد نبویؐ میں داخل ہوا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ایک شفاف شیش محل میں کوئی غلیظ سا کنا گھس آیا ہے۔ بس ایسی کیفیت میں مجھ پر عرشہ طاری ہو جاتا تھا۔

شہاب صاحب:-

شہاب صاحب مصطفیٰ کے بارے میں بھی تو بتائیے۔

مسز زاہدہ نذیر:-

ہاں مصطفیٰ! اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کا کردار مثالی تھا شروع سے آخر تک وہ میرے ساتھ رہا وہ میرا احسان مند تھا کہ ان کی خاطر میں اتنے دور سے آیا وہ میرے جوتے تک صاف کر دیتا تھا اور کچھ نہیں تو میرے بریف کیس کی گرد صاف کرتا رہتا۔ میں اس کے جذبہ حب الوطنی سے بہت متاثر ہوا۔ نیند کی وجہ سے میری حالت بہت خراب تھی بے شک میں گولیاں کھاتا تھا مگر میری حالت بہت دگرگوں ہو گئی تو ایک دن مصطفیٰ مجھے مسجد اقصیٰ میں لے گیا اس کے لیے بھی مجھے بھیس بدن پڑا چنانچہ عشاء کے بعد میں وہیں رک گیا وہاں میں نے ایک خواب دیکھا جس ایسا معلوم ہوا تھا کہ میں قرون اولیٰ اور وسطیٰ کے زمانے میں چلا گیا ہوں۔ بہر حال اس طرح میری نیند پوری ہو گئی جب میں واپس آ گیا تو کافی عرصے کے بعد ایک رات ٹیلیفون آیا کہ میں مصطفیٰ بول رہا ہوں میں بڑا حیران ہوا کہ انگلینڈ کے ایک دور دراز قصبے میں اس نے میرا پتہ کیسے حاصل کیا بہر حال میں نے کہا کہاں سے بول رہے ہو، کہنے لگا ہسپتال سے مجھے بلڈ پریشر

شہاب صاحب:-

ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے کہنے لگا بالکل ٹھیک، بہت جلد اپنے خدا سے ملنے والا ہوں بے حد خوش ہوں۔ کہنے لگا میری موت کے بعد میرے والد آپ کو خط لکھیں گے آپ انکارِ موت کیجیے گا۔ چھ ماہ بعد اس کے والد کا خط ملا (مصطفیٰ کا انتقال ہو چکا تھا) انہوں نے مصطفیٰ کے نام پر کینسر کے مریضوں کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا اور مجھے بطور ٹرسٹی شامل ہونے کے لیے کہا تھا۔

مصطفیٰ ایک بہت امیر باپ کا بیٹا تھا مگر مجاہدانہ جذبے کے تحت وطن کی خدمت کرنے کے لیے ایک معمولی گائیڈ کے فرائض انجام دیتا رہتا۔ فلسطین کا نام ایسے ہی جانثاروں کی وجہ سے قائم ہے۔

خاموش ہوئے تو سانحہ فلسطین کی مشکلات نے ہمیں بھی اداس کر دیا جانے مصطفیٰ جیسے ہمارے کتنے بھائی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں (قارئین ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ شہاب صاحب اسرائیل جانے سے پہلے ایک وصیت لکھ کر گئے تھے کہ اگر وہاں وہ پکڑے گئے (جس کے 99 فیصد چانس تھے) تو ان کو یقینی طور پر شہید کر دیا جائے گا چنانچہ ان کے بیٹے کو بیروت کے سکول میں داخل کر دیا جائے اور ان کی جائیداد کو بیچ کر پیسے فلسطینی ٹرسٹ میں جمع کروا دیے جائیں۔)

شہاب صاحب:

جناب بات اسرائیل کی ہو رہی ہے تو میرے ذہن میں ایک سوال گردش کر رہا ہے کہ آج دنیا میں 90 کروڑ مسلمان ہیں اور بیالیس حکومتیں ہیں تمام مادی وسائل بھی مسلمانوں کے پاس موجود ہیں۔ اس کے باوجود غیر کے دستِ نگر ہیں کہیں بنی اسرائیل کی تاریخ تو نہیں دہرائی جا رہی یا یہ کوئی عذابِ الہی ہے؟

فرزانہ:

میرے خیال میں عذابِ الہی ہی ہے کیونکہ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کے حصول میں سرگرداں ہے یہ مسئلہ اجتماعی صورت اختیار کر گیا ہے۔ منافقت بے انتہا پڑ چکی ہے کوئی بھی ایک دوسرے سے مخلص نہیں نہ اتحاد ہے نہ یگانگت۔

شہاب صاحب:

جناب ایک سوال ہمیشہ میرے ذہن میں کھلتا رہتا ہے۔ جس کا تسلی بخش جواب کبھی نہ ملا سوال یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں پہلے چند سال چھوڑ کر ہمیشہ اندرونی خلفشار کا شکار رہیں اور اسی سبب رو بہ زوال ہوئیں۔ ہسپانیہ، بغداد، ترک عثمانی اور آخر میں مشرقی پاکستان کا سانحہ اگر غور کیا جائے تو تمام کی وجوہات ایک ہی تھیں۔ مسلمانوں نے بار بار ایک ہی غلطی کی آخر تاریخ سے سبق حاصل کیوں نہیں کیا جاتا؟

فرزانہ:

اس کا جواب صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مؤرخ کا قول ہے "تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ تاریخ سے کبھی سبق حاصل نہیں کیا جاتا"۔ شہاب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ آج کی نوجوان نسل کو باغی، گمراہ اور اسی طرح کے دوسرے خطابات سے نوازا جاتا ہے کیا آپ

شہاب صاحب:

فرزانہ:

کے ذریعہ پرانے جگہ ہے اور اگر ہے تو جو ان نسل کی گمراہی کی کیا وجہ ہے؟

مجھے اس رائے سے شدید اختلاف ہے (انہوں نے فوراً جواب دیا) جو ان نسل نے تو گمراہ ہے اور نہ ہائی اور گستاخ۔ میرے خیال میں آج کا نو جوان ہم سے زیادہ ہاشمور ہے، ہم سب زیادہ حب الوطن بھی کیونکہ انہوں نے پاکستان میں جنم لیا، پاکستان ہی ان کے لیے سب کچھ ہے ہم تو ابھی تک پرانی یادوں میں کھوئے ہوئے لکھنؤ اور دلی کی سحر سے نہیں نکل سکے لیکن نو جوان نسل اس سے آزاد ہے ان میں منافقت نہیں وہ اپنا حق لینا جانتے ہیں (ہم نے فخر سے ایک دوسرے کو دیکھا)

لیکن جناب آج کے نو جوان کی روحانی زندگی کا شکار ہے اس بارے میں کچھ فرمائیں گے۔
(کچھ سوچتے ہوئے) ہاں۔ یہ بات تو ہے لیکن اس کے لیے بھی نو جوان نسل قصور وار نہیں ہے۔ بزرگوں کو ان کے لیے مثال بننا چاہیے تاکہ وہ مذہب کے قریب آئیں اور اپنی روحانی زندگی کے لیے بھی کچھ کریں کیونکہ

ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مطالعہ انسان کی شخصیت کی تشکیل میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟ اور آپ نے اس سے کس حد تک کام لیا؟

مطالعہ بہت ضروری چیز ہے ویسے آج کا نو جوان ہم سے زیادہ مطالعہ کرتا ہے۔ میں جب سکول میں پڑھتا تھا تو ایک دفعہ ایک کھاڑیے سے 36، 37 کتابیں 5 روپے میں خریدیں۔ ان کتابوں میں "فسانہ آزاد"، "قصہ چار درویش" اور اسی طرح کی کچھ دوسری کتابیں تھیں جو میں نے پڑھیں ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک کمرہ مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا ذرا الگ تھلگ تھا میں سکول سے چھٹی کرتا۔ میرا بھائی مجھے اس کمرے میں بند کر کے باہر تالا لگا دیتا اور میں اندر بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا بھائی جب سکول سے آتا تو مجھے نکال لیتا اس طرح میں نے دو کتابیں ختم کیں۔ انگریزی میں P.G WOOD HOUSE کے فکشن بہت پڑھے، مطالعہ بہت اچھی چیز ہے، سوچ کو جلا بخشتا ہے مگر عمل زیادہ ضروری چیز ہے صرف مطالعے سے کچھ نہیں ہوتا ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میری اردو کی استعداد بہت بڑھ گئی مگر انگریزی کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ میرے ذہن میں خیال پہلے انگریزی میں آتا ہے اور بعد میں، میں اسے اردو میں منتقل کرتا ہوں۔

آپ سیاست سے بھی منسلک رہے تو اس سلسلے میں کچھ بات ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے سابق صدر ایوب خان مرحوم کے ساتھ کافی عرصہ کام کیا آپ کو ان کی کس چیز نے متاثر کیا؟
ان کی تین باتوں نے مجھے متاثر کیا (کچھ سوچتے ہوئے) پہلی تو یہ کہ وہ فوجی حکمران تھے انہیں حکومت کے بارے میں کچھ زیادہ پتہ نہیں تھا مگر انہوں نے کاپی پنسل لے کر اپنا کام سیکھا اور اس

شہاب صاحب:-

فرزاد:-

شہاب صاحب:-

شہاب:-

شہاب صاحب:-

فرزاد:-

شہاب صاحب:-

میں انہوں نے کوئی شرم محسوس نہیں کی جو نہیں آتا تھا بلا تھک پوچھ لیتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ مشورہ مان لیا کرتے تھے اور تیسری بات یہ کہ وہ غلط دعویٰ نہیں کرتے تھے جتنا کر سکتے تھے، اتنا ہی کہتے تھے جھوٹ نہیں بولتے تھے کہ یہ کروں گا وہ کروں گا۔

جناب اب کچھ آپ کی تخلیقات کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔ آپ کی کتاب "یا خدا" میں آپ نے تصویر کا ایک رخ پیش کیا ہے صرف بدی ہی بدی دکھائی ہے اس منفی رویے کی وجہ؟

نیرہ

(مسکراتے ہوئے) دراصل یہ کتاب میں نے DEPRESSION کے موڈ میں لکھی تھی۔ میں اس وقت آئیڈیلزم کا شکار تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جب ہم پاکستان جائیں گے بنی بنائی اسلامی مملکت ہمارے سامنے ہوگی لیکن یہاں آ کر میرے تصورات کے محل دھڑام سے گر گئے تھے۔ مہاجرین کے کیمپوں اور لوگوں کی حالت زار کا مشاہدہ کیا، وہی کچھ لکھا، سرحد کے پار ایک چشمہ تھا جہاں سے لوگ پانی پیتے تھے اس میں نیلا تھو تھا ملا دیا گیا۔ مہاجرین پیاس سے مڑ حال ہوتے تو چشمے سے پانی پیتے سرحد پار کرتے ہی زمین کو بوسہ دیتے اور وہیں مر جاتے۔ یہ تمام واقعات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے مجھے بے انتہا صدمہ پہنچا صبح میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی اور شام تک ختم کر لی۔

شہاب صاحب:-

اس مادی دور میں ہم کس طرح اپنی زندگی کو سیٹ کریں کہ مذہب اور مادیت دونوں متاثر نہ ہوں خاص کر دین کے ساتھ کس طرح چلیں؟

علیہ

سب سے ضروری چیز دین اور ایمان ہے یعنی خدا پر کامل یقین اور اعتماد ہو۔ بندہ خدا کے ناموں کی صفات کو اپنانے کی کوشش کرے دوسروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے تو یہ کام آسانی کر سکتا ہے۔

شہاب صاحب:-

آپ تعلیم کے شعبے سے بھی وابستہ رہے تو آج کل نظام تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیے دوسرا یہ کہ کیا وجہ ہے کہ ہم سے بعد میں آزاد ہونے والے ممالک کی شرح خواندگی 70 فیصد یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہے اور ہمارے ہاں اتنی کم جبکہ وسائل بھی تقریباً یکساں ہیں؟

شاہد

پہلے حصے کا جواب تو یہ ہے کہ نظام تعلیم بالکل خراب نہیں ہے ہم وہی نصاب تعلیمی اداروں میں پڑھاتے ہیں جو ساری دنیا میں پڑھایا جاتا ہے۔ شرح خواندگی میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف دو فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں سب سے بڑی غلطی یہ کہ تعلیمی اداروں کو قومیا لیا گیا اس طرح وہ معیار نہیں رہا تعلیم اور صحت پر ایک ٹیکس ہونا چاہیے اور انہیں قومی تحویل میں نہیں لینا چاہیے۔ برطانیہ میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے اسی طرح ہم کچھ کر سکتے ہیں۔

شہاب صاحب:-

جن اغراض و مقاصد کے تحت آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا کیا آپ اس سے مطمئن ہو سکے ہیں؟

علیہ

شہاب

شہاب صاحب: کوئی خاص مقصد تو تھا نہیں اگر تھا تو یہی کہ خاتمہ بالخیر ہو جائے درمیان میں جو آثار چھوڑ آتے گئے بس آتے گئے وہ میرا دل نظر نہ تھے۔

شہاب صاحب: بعض اوقات انسان کی زندگی میں کچھ کمزور لمحات آ جاتے ہیں ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

شہاب صاحب: بس اللہ سے لو لگانی چاہیے خدا پر اعتماد اور یقین ہی سب سے بڑی دولت ہے اگر کمزور لمحوں میں دو ٹول ہی پڑے تو یہی کافی ہے۔

عطیہ: زندگی گزارنے کے بہترین طریقے جو آپ نے برتے کیا تھے؟

شہاب صاحب: (وجہیں وجہیں لہجے میں آواز کی نرمابٹ کے ساتھ یوں گویا ہوئے) دو تین باتیں ہیں جو میں تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو پھر دل سے اس کا یقین کریں اور قائم رہیں۔ سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈریں البتہ طبعی خوف یعنی سانپ یا دوسرے اسی قسم کے جانوروں سے ڈر کے علاوہ کسی کا خوف نہیں ہونا چاہیے یعنی کسی قسم کا قلبی خوف۔ دوسری بات جو کافی کام آئی وہ یہ کہ کسی کے پیٹھ پیچھے وہ بات کہی نہ کہو جو سامنے نہ کہہ سکو۔ تیسری بات یہ کہ کسی کے خلاف دل میں..... (کچھ سوچتے ہوئے) بھی کیا لفظ ہے اردو میں، جناب کدورت نہ رکھیں، میں نے کہا) ہاں ہاں بالکل یہی دل میں کدورت نہ رکھیں، معاف کرنے والے کو اللہ بھی پسند کرتا ہے۔ یہ باتیں بہت کام آئیں میں نہیں کہہ سکتا کہ پوری طرح ان پر عمل کیا لیکن جہاں تک ہو سکا

کیا۔

فرزانہ: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

شہاب صاحب: پچھلے پانچ سالوں سے میں اپنی یادداشتیں ”شہاب نامہ“ کے نام سے لکھ رہا ہوں۔ آج کل کتابت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد لکھنا چھوڑ دوں گا کیونکہ آخرت کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہے وہاں کی تیاری بھی تو ضروری ہے۔

نہیرہ: جناب آپ نے صوفیا کا کوئی سلسلہ ”شہابیہ“ بھی تو شروع کیا ہے اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟

شہاب صاحب: (چونکتے ہوئے) بھئی یہ آپ سے کس نے کہا۔

منیرہ: اخبار میں پڑھا تھا۔

شہاب صاحب: نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں میں تو بڑا گنہگار بندہ ہوں میری اتنی حیثیت کہاں کہ ایسا کام کر سکوں یہ غلط بات ہے۔

مسز اعظم۔

شہاب صاحب کیا کسی پیر کے ہاتھ بیعت کرنا لازمی امر ہے روحانیت کے لیے۔

شہاب صاحب: دیکھیے بیعت کا مطلب ہوتا ہے کسی بتائے ہوئے راستے پر چلنا یعنی جو راستہ یا طریقہ پیر یا روحانی استاد بتائے اس پر چلنا جب ہمارے سامنے ایک راستہ موجود ہے یعنی رسول اکرم کا بتایا ہوا راستہ

تو پھر بیعت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ شہاب صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں دھیرے دھیرے سمجھایا۔

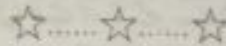
نو جوان نسل کے لیے کوئی پیغام؟

بھئی نو جوان نسل میں تو لڑکیاں اور لڑکے دونوں آتے ہیں اور دونوں کا الگ الگ مقام ہے۔

آپ لڑکیوں کے لیے کچھ فرمادیتے ہیں؟

لڑکیوں کے بارے میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ آج کل کی بچیاں زندگی میں توازن نہیں رکھتیں، یعنی اگر تعلیم حاصل کرتی ہیں تو دوسری باتوں کو پس پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ شادی کو بھی بھلا دیتی ہیں یہ بہت غلط بات ہے لڑکی کی شادی کے لیے ایک مناسب عمر ہوتی ہے اس میں شادی ہو جانی چاہیے میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے لیکن ہر کام میں توازن رکھنا چاہیے۔ بس یہی میری نصیحت ہے۔

”سبقت“ میگزین مئی 1986ء



تین سوال

علامہ اقبالؒ کے کلام میں کئی جگہ ایسے مقام آتے ہیں جن میں بظاہر کسی قدر تضاد محسوس ہوتا ہے کیا واقعی ان کے ذہنی اور فکری ارتقاء میں کسی قسم کا تضاد تھا؟
یوں تو علامہ اقبالؒ نے خود ہی فرمایا تھا کہ ”ہے عجب مجموعہٴ تضاد اے اقبالؒ تو“ اور غالباً اسی احساس کے زیر اثر یہ بھی تسلیم کیا تھا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

لیکن شاید یہ محض شاعرانہ کسر نفسی ہے ورنہ میرے خیال میں اقبالؒ کی شخصیت دراصل ایک کثیر العباد MULTIDIMENSIONAL شخصیت تھی۔ عالم اسلامی میں وہ اپنی سطح کے پہلے شاعر اور فلسفی تھے جنہیں مشرق و مغرب کے علوم و فنون، فکر و فلسفہ، تاریخ و تمدن کے روایتی اور ماڈرن پہلوؤں پر صرف مطالعہ کے طور پر ہی نہیں بلکہ عملی مشاہدہ کے طور پر بھی بڑا عبور حاصل تھا۔ اتنے بڑے سمندر میں خیال اور بیان کی لہریں کسی خاص منظم ترتیب کے ساتھ نہیں ابھر سکتیں۔ یہ لہریں آڑی ترچھی بھی ہوں گی۔ متقاطع متحارب اور معارض بھی۔ علامہ اقبالؒ کا کمال یہ ہے کہ کھنوروں اور گردابوں کے ان ریلوں میں بھی ان کے فکری بہاؤ کے دو واضح اور متوازن رخ برقرار رہتے ہیں۔ مادی دنیا کے معاملات میں وہ بڑی حد تک PRAGMATIC ہیں۔ یہاں پر ان کے فکر کا رجحان اور اظہار کا اسلوب اپنے مطالب کو بطور نفس الامر بیان کرتا ہے اور یہ نفس الامر یا امر واقعہ کبھی حتمی نہیں ہوتا بلکہ وقت، ماحول اور دیگر عوامل کے ساتھ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق اُلٹا بدلتا بھی رہتا ہے۔ لیکن جہاں تک داخلی یا روحانی یا اسلامی افکار و بیان کا تعلق ہے علامہ اقبالؒ کی شاعری اور نثر دونوں یکساں طور پر مستقیم مسلسل اور یک رنگ ہیں۔
تضاد اگر کہیں ہے تو وہ علامہ کے فکر میں نہیں بلکہ خارجیت و داخلیت، مادیت و غیر مادیت کے درمیان ہے۔

ایک قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ مفکر ہونے کے علاوہ، علامہ اقبالؒ کی ذات میں کیا ایسے تجربات کے آثار بھی نظر آتے ہیں جنہیں عام طور پر روحانی کہا جاتا ہے؟
علامہ اقبالؒ کا ایک دعائیہ مصرع ہے ع

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

یوں تو اقبالؒ نے انگلستان بھی دیکھا تھا، جرمنی، فرانس، سپین اور مصر وغیرہ بھی لیکن غالباً اس دعا میں ان کا

اشارہ ان ممالک کی سیر کی طرف نہیں ہے۔ انہوں نے کیا دیکھا تھا جسے اوروں کو دکھانے کے بھی وہ آرزو مند ہیں؟ اس کا سراغ لگانا بڑا مشکل ہے۔ یوں تو آہ سحر گاہی، عشق و نظر، ذوق و شوق کے پردے میں انہوں نے اسرار و رموز کی نشاندہی کی ہے لیکن صاف طور پر پردہ کہیں نہیں اٹھایا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ باطن میں انہیں خود آگاہی کا ضرور کوئی بڑا ”حادثہ“ پیش آیا ہوگا ورنہ اس قسم کی روایت رواج نہ پائی کہ عالم جوانی میں وہ اپنے لنگوٹیں یار مرزا جلال الدین کے ہاں بیٹھے تھے، بے تکلف دوستوں کی محفل عروج پر تھی، علامہ اقبالؒ فی البدیہہ مزاحیہ اشعار کہہ کہہ کر اپنے ہم جلیسوں پر پھبتیاں گس رہے تھے یکا یک ان کا موڈ بدلا، آنکھیں نیم وا ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے زانو پر ہاتھ مارا اور زبان پر بے ساختہ ”یار ب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے“ والی نظم یوں جاری ہو گئی جیسے سوکھی زمین سے اچانک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔

سنا ہے وفات سے ایک یا دو ماہ قبل علامہ اقبالؒ مرحوم نے بڑی محنت سے اپنے تمام ذاتی کاغذات کا تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی یادداشتوں وغیرہ کی ایک کثیر تعداد نذر آتش کر دی۔ شاید ان کا یہی مقصد ہو کہ ان کے باطنی احساسات، قلبی واردات و تجربات کا یہ گوشہ چشم ظاہر سے پوشیدہ رہے۔ کیا آپ خود کبھی علامہ اقبالؒ سے ملے ہیں؟

ملا تو نہیں، لیکن زیارت نصیب ہوئی ہے۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کا طالب علم تھا وہ علامہ اقبالؒ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ چند بار ہمت کر کے میں ان کی محفل میں پہنچا تو سہمی لیکن ان کے قریب نہ پھٹک سکا۔ علامہ مرحوم کی زندگی میں یار ان اقبالؒ کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا جو ان کی طویل علالت اور علی بخش کی چوکیداری کے باوجود اس بطل عظیم کو وقت بے وقت گھیرے رہتا تھا۔ میرے جیسے نووارد کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اس بزرگ حصار کو توڑ کر علامہ کا قرب حاصل کرنے کی جرأت کرتا ہوں دور بیٹھ کر چند نادرا باتیں سننے کا موقع ضرور ملا۔

ایک روز کسی نے پوچھا کہ نماز میں آخر کیا حکمت ہے کہ دل لگے یا نہ لگے لیکن پڑھنا فرض ہے۔ علامہ نے جواب دیا ”حکم میں حکمت کا کیا کام؟“ سائل قدرے بے تکلف تھا اس کے مزید اصرار پر علامہ نے یہ مثال دی کہ گانے بجانے کی محفل میں دیکھا ہوگا کہ سازندے بڑی دیر تک ایک ایسے عمل میں مصروف رہتے ہیں جو بظاہر بیکار اور بے مزہ نظر آتا ہے۔ سارنگی، ستار، طبلے والے عرصہ تک اپنے سازوں کو ٹھوک بجا کر ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ یہ وقفہ سامعین کے لیے بڑا بے رنگ اور صبر آزما ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر موسیقی میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ نماز بھی ایک طرح کی TUNING ہی ہے۔ ذوق ہو یا بے ذوق، شوق ہو یا کسلندی، اس امید پر پڑھتے رہو کہ شاید کوئی ایسا لمحہ بھی نصیب ہو جب سر اور تال ٹھیک بیٹھ جائیں۔

ایک دوست نے بزم اقبالؒ کا اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی سنایا کسی نے پوچھا کہ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف حرفا حرفا الہامی نازل ہوا ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ ہاں یہ میرا پختہ ایمان ہے۔

سوال کرنے والے نے کہا کہ کیا ہمارے جیسے دنیا داروں کے لیے اس کی کوئی دلیل مل سکتی ہے؟

علامہ نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”کیا آپ مجھے انسان سمجھتے ہیں؟“

”بے شک۔۔۔۔۔ بہت بڑا انسان“۔۔۔۔۔ جواب ملا۔

”سچا بھی؟“ علامہ نے دریافت کیا۔

”جی ہاں سچا بھی“

”شاعر بھی؟“ علامہ نے پوچھا۔

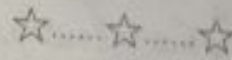
”جی ہاں عظیم شاعر بھی“۔

”تو خدا کی قسم یقین کرو۔“ علامہ نے فرمایا۔ ”کبھی کبھی اس گناہ گار انسان اور شاعر کو بھی یوں محسوس ہوتا

ہے کہ میرے ذہن پر شعر کا تخیل ہی نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی یوں اتر رہے ہیں جیسے ٹین کی چھت پر

بارش کے قطرے گر رہے ہوں۔“

اقبال، فلروفن، مرتب و انتخاب رشید امجد، فاروق علی، ندیم بھٹی کی شہزادہ



اردو کا مستقبل

قدرت اللہ شہاب
ڈاکٹر عاشق حسین بنالوی
انعام عزیز متعلق بی بی سی لندن

پاکستان کی کوئی بھی سرکاری زبان نہیں بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو ان میں سے کوئی زبان سرکاری حیثیت نہیں رکھتی البتہ بنگالی بہ حیثیت مجموعی مشرقی بنگال پر ضرور حاوی ہے۔ گو دفتری زبان تو انگریزی ہی ہے لیکن کاروبار مملکت کا زیادہ حصہ بنگالی زبان میں ہی روا ہوتا ہے۔ بنگالی ہی اس ملک کی بولی بھی ہے اور علمی زبان بھی اس لیے وہ حصہ ملک کا بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہے جہاں بنگالی کو ہمہ گیر خصوصیت حاصل ہے۔

لیکن مغربی پاکستان کی حیثیت بڑی دلچسپ ہے۔ مغربی پاکستان کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے یہاں زبانوں کا مسئلہ چھیڑا جاتا ہے۔ سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی زبانوں کے علیحدہ علیحدہ مرکز بنائے گئے ہیں ان زبانوں میں رسائل و اخبارات نکالے جاتے ہیں اور انہیں تقویت دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک حد تک اس طریق عمل سے اتفاق اور ہمدردی ہے اور ہم اسے بھی ایک قومی ضرورت تصور کرتے ہیں لیکن اگر اس چیز کو ملک میں پھوٹ، صوبائی دشمنی، باہمی جنگ و جدل کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ صورتحال المناک، شرمناک اور ملک دشمنی ہوگی۔ ہماری یک جہتی کے پُرزے پُرزے اڑا دے گی ہماری قوم ضعیف ہو جائے گی اور ہمارا بھرم کھل جائے گا اور ہیبت جاتی رہے گی۔ غیر ملکی اثر و رسوخ ان مختلف سمتوں سے ریٹکتا ہوا بڑھے گا اور ہمارے مرکز کو اپنے بد اثرات سے مجروح و کمزور کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم سب کا فرض ہے خواہ ہم سندھی ہوں یا پنجابی، بلوچی ہوں یا پٹھان یا مہاجر ایسی صورتحال ملک میں پیدا ہونے نہ دیں اور صوبوں میں منافرت اور دشمنی کے زہر پیلے جراثیم پھیلنے نہ پائیں بلکہ اسلام دوستی اور اسلامی رواداری کا ہم ایک اچھا نمونہ پیش کر دیں۔ اردو کی قسمت مغربی پاکستان سے وابستہ ہے۔ مغربی پاکستان کا علم دوست طبقہ محیرِ محب وطن اسلام دوست پنجابیوں سے عبارت ہے۔ مغربی پاکستان میں مقامی زبانوں یا بولیوں میں جو قومیت اور برتری پنجابی کو حاصل ہے وہ سندھی، بلوچی یا افغانی کو حاصل نہیں ہے پنجابی زبان کا لٹریچر بھی کافی شاندار ہے اس کے باوجود کہ تمام پنجابی، پنجابی بولتے ہیں۔ پنجابی میں خواب دیکھتے ہیں پنجابی میں سوچتے ہیں لیکن لکھتے اردو میں ہیں۔ حسب موقع پنجابی کو چھوڑ کر اردو بولنے لگتے ہیں۔ قرآن کی زبان عربی کے بعد پنجابی کو سب سے زیادہ اردو سے محبت ہے وہ اردو پڑھتا، اردو لکھتا اور ادب کی سرپرستی کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اگر پنجاب میں اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے تو پنجابی اپنی

سلسلہ دشمنان کے باوجود فوراً اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا۔ اردو کو مغربی پاکستان میں پنجابی سے کوئی حریفانہ مقابلہ نہیں پڑے گا پنجابی کے بڑے بڑے علامہ اور ادیب اردو کے دلدادہ اور شیدائی ہیں۔

اردو کو مغربی پاکستان میں خطرہ انگریزی سے پیدا ہو گیا تھا بچہ اب اردو کی جگہ انگریزی حروف کا دلدادہ ہے۔ انگریزی معاشرہ اور انگریزی ادب آداب کی نقالی کر رہا ہے۔ تیسری جماعت کا طالب علم حساب بھی انگریزی میں کرتا ہے اور جواب انگریزی میں لکھتا ہے اس خطرناک صورتحال کا کچھ ذکر اس مذاکرہ میں بھی ہے۔ یہ مذاکرہ بے حد مفید نتائج کی نشاندہی کرتا ہے جس پر غور و فکر کرنا حکومت کے مفکرین کا فرض ہے اور اردو کی حفاظت اور ملکی معاشرہ کو اس بے راہ روی سے بچانا بھی ضروری ہے۔ آج کے بچے کل کے باپ ہوں گے اور یہ بچے اس کے بعد ان کے مسائل ان رجحانات اور ان حقائق سے لاعلم ہوں گے جو اسلام پاکستان، اقبال اور اردو ادب سے متعلق ہیں اور جن کے اثرات سے اس مملکت کی تولید اور تشکیل ہوئی۔ حکومت کی عظمت شوکت اور قوت کا راز ان قومی کو زندہ رکھنا ہے جو مسلمانوں کے لیے لازمی ہیں۔

شہاب صاحب اردو زبان پاکستان کی قومی زبان ہے نہ صرف یہ بلکہ کروڑوں افراد اس زبان کو سمجھ اور بول سکتے ہیں ویسے بھی اردو زبان غالباً دنیا کی سب سے کم سن زبان ہے تو سب سے پہلے آپ یہ فرمائیے کہ اردو کا مستقبل کیا ہے اور کیا آپ اسے تابناک مستقبل کہہ سکتے ہیں۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں دو باتیں میرے ذہن میں آتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کا مستقبل پاکستان میں کیا ہے دوسرا یہ کہ اس کا مستقبل زبان کے طور پر بغیر کسی زمین کی قید کے کیا ہیں اس میں میرا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا محور مستقبل کے متعلق رفتہ رفتہ قدرے تبدیل ہوتا جا رہا ہے جب تک بزرگ صغیر کی سیاست آزادی سے پہلے زوروں پر تھی، اس وقت ہندی ہندوستان کی اور اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پا گئی تھی لیکن جب آزادی مل گئی تو پاکستان میں گھر کی مرغی وال برابر ہو گئی اور اب جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں اردو کے مستقبل میں ایسے مقامات کا مثلاً لندن کا جو کردار ہے بہت اہم ہے یہاں سے اردو کے جو رسالے نکلتے ہیں وہ ہر لحاظ سے ایک ایسے ماحول میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں جو غالباً ہر وقت پاکستان میں میسر نہ آ سکتا تھا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اس کے متعلق کیا فرمائیں گے۔

اس کے بارے میں تو مجھے شہاب صاحب سے اتفاق ہے کہ جہاں تک دنیا کے وسیع خطے کا تعلق ہے اردو کا مستقبل بلاشبہ روشن ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں امریکا ہو، روس ہو، انگلستان ہو یا ہمارے ایشیائی ممالک ہوں اردو میں براڈ کاسٹنگ کی جاتی ہے۔ اس لیے جہاں تک براڈ کاسٹنگ کی دنیا کا تعلق ہے اردو ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے یہاں تک کہ گذشتہ عالمگیر جنگ میں جب دنیا کی رائے عامہ کو استوار کرنے کی نوبت آئی تو روس، امریکا، اٹلی، جرمنی، انگلستان اور جاپان جیسے ملک سے اردو میں نشریات کا سلسلہ شروع ہوا اور دنیا نے لفظانہ سہی معنی تسلیم کر لیا کہ ہندوستان کی زبان اردو ہے اس لحاظ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو کو معنوی طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ وہ ہندوستان کی زبان ہے لیکن

جیسا کہ شہاب صاحب نے فرمایا جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس میں اردو کا مقام کیا ہے اس بارے میں میں اتنا روشن خیال نہیں ہوں جتنا کہ شہاب صاحب ہیں اس لیے کہ پاکستان کی زبان بلاشبہ کاغذ پر سرکاری زبان اردو تسلیم کر لی گئی ہے لیکن عملاً میں نے جو کچھ دیکھا ہے پاکستان میں اردو کی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے اور لڑکوں کو انگریزی زبان پڑھانے کا شوق بدرجہ جنون ترقی کر گیا ہے۔

شہاب صاحب اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے مثلاً یہ کہ پاکستان کے سکولوں میں زیادہ تر توجہ انگریزی زبان کی طرف دی جاتی ہے خاص طور پر جو پرائیویٹ سکول قائم ہوتے ہیں ان میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کو شروع سے انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ بچے اردو بولتے ہیں لیکن جہاں تک اردو پڑھنے اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تعلق ہے اس میں ہم لوگ کیوں پیچھے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ آزادی سے پہلے جو حکمران ہندوستان یا پاکستان میں تھے انہوں نے سول لائسنز آباد کر دی تھیں ان لوگوں کی جوانی کے ساتھ وابستہ تھے، اسی طرح اب رفتہ رفتہ زبان اور ثقافت کی سول لائسنز بھی آباد ہو رہی ہیں مثلاً میں ابھی ایک ماہ پیشتر تک پاکستان کی وزارت تعلیم کا سیکرٹری تھا۔ پاکستان میں تین قسم کے سکول ہیں ایک تو پبلک سکول ہیں جن کی تمام تر تعلیم ان بنیادوں پر ہوتی ہے جن کا ہمارے ملک کی معاشرت سے یا ہمارے ملک کی ثقافت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ دوسرے وہ سکول ہیں جنہیں انگلش میڈیم سکول کہتے ہیں ان میں اردو کو وہی حیثیت دی جاتی ہے جس طرح کسی ہسپتال میں چھوت چھات کے مریضوں کو دی جاتی ہے اور تیسرے اردو میڈیم سکول ہیں جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہے لیکن بہت آگے نہیں بڑھتا بلکہ ایک سال ہوا ایک کمیٹی بنی تھی جسے اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ یونیورسٹی کی سطح تک اردو اور بنگالی دونوں میں تعلیم دینے کے لیے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں لیکن بات کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کی وجہ ایک خاص قسم کی ذہنی، سماجی، نفسیاتی، احساس کمتری ہے جو ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر ہم نے اپنے ذریعہ تعلیم کو اردو قرار دے دیا تو شاید ہم دنیا میں ایک قدم بھی آگے خاطر خواہ ترقی نہ کر سکیں گے۔

ڈاکٹر بنا لوی صاحب یہ شہاب صاحب نے جو بات کہی ہے ثقافت کی سول لائسنز کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تین قسم کے سکول بتائے ہیں تو اس میں اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو مستقبل کچھ زیادہ تابناک تو نظر نہیں آتا۔

انعام صاحب میں نے پاکستان میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ بالکل وہی ہے جو شہاب صاحب نے بطور محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کے دیکھا تھا۔ وہاں بچوں کو پہلی جماعت سے اوسط درجے کے جو گھرانے ہیں۔ امراء کی بات چھوڑیے میں اپنے جیسے متوسط لوگوں کی بات کرتا ہوں۔ اوسط درجے کے گھرانے کے بچے کو پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے ہم نے انگریزی پانچویں یا چوتھی جماعت سے شروع کی تھی۔ ابتداء ہماری اردو سے ہوئی تھی الف ب سے۔ اب وہ بچے جو اوسط درجے کے گھرانے سے ہیں وہ بھی اپنی تعلیم انگریزی سے شروع کرتے ہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر انگریز ڈیڑھ سو سال کی حکومت کرنے کے باوجود ہماری زبان انگریزی نہ کر سکا تو انگریز کے

رخصت ہو جانے کے بعد ہم محض لکیر پینے کی فکر میں اپنی قوم کی زبان انگریزی کیونکر کر سکیں گے اور انگریزی اگر اپنی زبان ہم نہیں کر سکیں گے تو اس خلا کو کون سی زبان پُر کر سکے گی۔ یہ دُور کی باتیں ہیں لیکن سوچنا ہمیں آج چاہیے۔ دوسری بات میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر انگریزی ذریعہ تعلیم بنے کھاتے پیتے گھرانوں کا تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اقبال کا اس ملک میں کیا مقام رہ جائے۔ اب پچھلے دنوں پاکستان میں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی۔ اگر آپ کے بچے اردو سے ناواقف رہیں گے تو مجھے یقین ہے کہ انگریزی میں شاعری تو وہ نہیں کر سکیں گے۔ دوسرے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ماضی اچھا ہے یا بُرا کوئی قوم یا کوئی فرد ماضی سے اپنا تعلق منقطع کرنے کے بعد ایک دن زندہ نہیں رہ سکتا آپ کا ماضی کیا ہے یہ تین چار چیزیں بڑی اہم ہیں جن کا تعلق صرف فلسفے یا ادب کے ساتھ نہیں بلکہ قوم کی مجموعی زندگی کے ساتھ ہے اور اس کا محور ہے زبان۔ اس لیے شہاب صاحب کی رائے درست ہے کہ ہم احساس کمتری میں مبتلا ہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ احساس کب ختم ہوگا 22 سال تو گزر چکے ہیں۔

لیکن شہاب صاحب جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سکولوں میں ابتدائی درجے سے انگریزی شروع ہوتی ہے اور پھر کالجوں میں بھی ہم نے اب تک جو دیکھا ہے انگریزی کو اولیت حاصل ہے تو کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہی لوگ جب حکومت میں آئیں گے تو ان کا رویہ بھی اسی شخص کی طرح نہیں ہوگا جس نے یہ پوچھا کہ غالب نے کتنی کتابیں لکھی تھیں یا غالب نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا؟ ظاہر ہے ان کے ذہن بھی محدود ہو چکے ہوں گے۔

انعام صاحب آپ نے بالکل درست فرمایا کیونکہ ایک انگریزی زبان میں جسے VICIOUS CIRCLE کہتے ہیں وہ چل رہا ہے اور اب ضرورت ہے ایک ایسے مرد مجاہد کی جو اس دائرے کو VICIOUS CIRCLE کو توڑے مجھے تو امید ہے کہ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی اور کسی نہ کسی دن اس دائرے کو توڑنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب شہاب صاحب کہتے ہیں کہ یہ دائرہ کسی نہ کسی دن ضرور ٹوٹے گا تو آپ کی توقعات کیا ہیں آپ نے اب تک جو کچھ سنا ہے اس سے آپ کا اندازہ کیا ہے۔

انعام صاحب انسان کی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا قومی امید پر قائم ہے اگر شہاب صاحب کا یہ اشارہ صحیح ہے کہ یہ سرکل ٹوٹے گا ایک نہ ایک دن، تو میں اس میں شک کیوں کروں خدا کرے یہ سرکل ٹوٹے اور ہماری زندگی میں ٹوٹے لیکن مجھے کچھ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

لیکن یہ ہمیں جس مرد مجاہد کا انتظار کرنا چاہتے ہیں اس کی آمد کی توقعات آپ کی نظر میں کیا ہیں؟ صاحب یہ تو عالم غیب کی بات آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مرد مجاہد کب پیدا ہوگا اور کیونکر پیدا ہوگا اقبال نے بھی مرد مجاہد کی تعریف کی ہے۔

لیکن ہوگا ضرور انشاء اللہ ڈاکٹر صاحب۔ مجھے اور آپ کو امید رکھنی چاہیے جہاں اور مایوسیاں رفع ہو گئی ہیں یہ مایوسی بھی رفع ہو جائے گی لیکن ایک

بات میری اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ پچھلے بائیس برس میں انگریزی کا اتنا چرچا کرنے کے باوجود ہم نے انگریزی کا کوئی ادیب پیدا نہیں کیا یا کوئی انگریزی کا شاعر پیدا نہیں کیا۔ اب بھی سال کے سال اقبال کی ہی برسی منائی جاتی ہے۔ کسی انگریزی شاعر کی برسی نہیں منائی جاتی اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر انگریزی ہمارے یہاں اتنی مقبول ہے تو اقبال کی برسی کیوں منائی جاتی ہے کسی انگریز شاعر کی برسی کیوں نہیں منائی جاتی؟

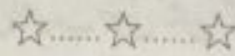
سب سے پہلے تو ہمیں احساس کمتری کے اس خول سے باہر نکل آنا چاہیے جو انگریزیت نے (انگریزی زبان نے نہیں) ہم پر مسلط کر رکھا ہے جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک باقی کوششیں پوری طرح بار آور نہیں ہوں گی۔

اس میں آپ قوم کے کس شعبے کو قصور وار ٹھہراتے ہیں؟

وزارت تعلیم کو اور میں اعتراف جرم کرتا ہوں۔

بہر حال ہماری آج کی بحث کا موضوع بڑا دلچسپ تھا ہم بھی اس مرد مجاہد کا انتظار کریں گے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔

ماہنامہ ”نیرنگ خیال“، گولڈن جوبلی نمبر 1978ء



تصوف

اشفاق صاحب نے سوال کیا۔ عمر بھر کے تجربے اور مشاہدے کے بعد آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں، کوئی ایسا نتیجہ جسے آپ دوسروں تک بھی پہنچانا چاہتے ہوں۔

شہاب صاحب! دشمنی اور رنجش اور ناراضگی کسی کے ساتھ عارضی ہونی چاہیے اور دوستی اور محبت اور مروت یا رواداری مستقل، دشمنی ختم نہ ہونے والی ہو تو بھی ختم کر دینی چاہیے یہ تو پہلی بات ہے دوسرے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے وہ بات نہ کہی جائے جو اس کے سامنے نہ کہی جاسکے، لیکن عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے زیادہ اس پر عمل کرنا چاہیے کہ وہی بات کسی کی غیر حاضری میں کہوں جو اس کی موجودگی میں دہرا سکوں یہ اگرچہ ٹھیک سے لگتے ہیں۔ ان پر عمل کرنے کی توفیق نہیں نصیب ہوئی لیکن کبھی ایسی توفیق ملی ہے تو زندگی بڑی آسودہ اور آسان محسوس ہوئی ہے اور میرا کوئی ذاتی فلسفہ نہیں بس یہی ایک دو نتیجے مجھے نصیب ہوئے ہیں بالکل معمولی سے اور COMMON PLACE لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو پہاڑ نظر آتے ہیں۔

وارث میر نے بڑا دلچسپ نکتہ اٹھایا اور کہا: شہاب صاحب! عام طور پر ہم پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کرتے ہیں اب اگر ہم نے عادت اپنائی کہ بات منہ پر بھی وہی کی جائے تو اس طرح دوستی قائم نہیں رہے گی۔

شہاب صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ پھر ہم پیٹھ پیچھے بھی وہی بات کریں گے جو سامنے کہی جاسکے تاکہ دوستی قائم رہ سکے۔ سہیل احمد خان نے پوچھا کہ یہ باتیں جو آپ نے اخذ کی ہیں ان کو آپ نے اپنے افسانے کا موضوع اب تک کیوں نہیں بنایا۔ شہاب صاحب نے جواب دیا یہ باتیں جب میری سمجھ میں آئیں تو افسانہ لکھتا میرا تقریباً بند ہو چکا تھا لیکن ان باتوں کو میں اب اور فارم میں یعنی ایک کتاب کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ وارث میر نے پوچھا سچائی کے اس رویے کو کیا قوموں کی سطح پر بھی رواج دیا جاسکتا ہے؟

شہاب صاحب نے جواب دیا چونکہ قومیں افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہیں اگر افراد میں یہ چیز پیدا ہو جائے تو میرے خیال میں اس قوم میں بھی مجموعی طور پر رویہ اسی قسم کا ہوگا۔ افراد جیسا PRECISE تو نہیں ہوگا لیکن اس کا رویہ، اس کا رخ ایسا ہی ہوگا۔ بین الاقوامی سطح پر مجھے پتہ ہے کہ بین الاقوامی ڈپلومیسی جسے ہم کہتے ہیں وہ آج تک منافقت اور فریب پر ہی مبنی ہے یہ چانکیہ اور اس کے فلسفے کا نتیجہ ہے آج کل بھی وہی چلتا ہے۔

اس گفتگو میں شہاب صاحب کی تصوف سے دلچسپی کے موضوع پر بات آگئی اس میدان میں ان کی عملی دلچسپی کی نوعیت اور پھر ممتاز مفتی کے بیانات کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔ ہمارے بعض کالم نگاروں نے تو اپنے ہی طور پر ایک سلسلہ شہابیہ بھی تخلیق کر رکھا ہے اور ممتاز مفتی اور اشفاق احمد اور بعض دوسروں کو اس کا رکن مشہور کر رکھا ہے ان کو ان

سارے بیانات، دعویٰ، داستانوں اور روایتوں سے اتفاق نہیں اس محفل میں جب ان سے براہ راست سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا:-

میں دراصل صوفی صافی تو کچھ نہیں ہوں لیکن یہ ہے کہ مجھے کافی عرصے سے دینی کتابیں پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ اس میں زیادہ کتابیں ایسے بزرگوں کی تھیں جن کے درجات لوگوں کی نظروں میں بہت اونچے تھے مثلاً سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی اس کا نام تھا ”عوارف المعارف“ حضرت شہاب الدین سہروردی کی مشکل کتاب تھی لیکن تھوڑی بہت سمجھ میں آئی۔ پھر ”کشف الخجوب“ داتا صاحب کی۔ پھر حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات ایسی کتابیں پڑھنے کا شوق رہا لیکن مجھے سب سے زیادہ جس کتاب نے کھینچا وہ کتاب نہیں تھی وہ مکتوبات تھے۔ 76 کے قریب امداد المشتاق، جو تریب دی ہوئی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر کی زندگی کے واقعات پر، یہ ان کے خطوط ہیں 76 کے قریب۔ حضرت اشرف علی تھانوی بھی ان کے مرید تھے۔ انہوں نے کوئی ایک ہزار کے قریب کتابیں لکھی ہیں اور انہوں نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ حاجی امداد اللہ پڑھے لکھے نہیں تھے انہوں نے کافی تک پڑھا تھا یعنی کافی کا جو بھی LEVEL ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کے لحاظ سے مولانا کہتے تھے کہ:-

ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ہم میں ”کافی“ نئے لکھ دیں لیکن حاجی صاحب کے ایک ایک فقرے کی میں نے ایک ایک کتاب لکھی ہے یہ ایک ایک کتاب ان کے ایک ایک فقرے کی تشریح ہے لیکن وہ بھی پوری نہیں۔ (امداد المشتاق) حاجی صاحب کی زندگی کے تھوڑے سے حالات ہیں۔ مجھے ان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ باقی پریکٹیکل کچھ بھی نہیں ہے۔ مثلاً یہ سلوک کی منزلیں طے کرنا وغیرہ۔ اس سے مجھ پر ایک چیز واضح ہوئی کہ اصلی شاہراہ شریعت ہے۔ باقی تصوف کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ پگڈنڈیاں ہیں جو اس شاہراہ کے ساتھ جا کر ملتی ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو وہ تصوف باطل ہے کیونکہ وہ پگڈنڈیاں اس کے لیے پیدا ہوئی ہیں کہ اس شاہراہ کے ساتھ ملانے کے لیے قرون اولیٰ کے بعد یعنی حضور ﷺ کے زمانے میں تو ضرورت نہیں تھی کسی ترغیب کی، لوگوں کو کہنے کی کہ یہ کرو وہ کرو، اخلاق ایسے ہوں۔ حضور ﷺ کی ذات مبارکہ میں ایسا اثر تھا، خود ہی لوگوں پر مقناطیس کی طرح اثر ہوتا تھا اس کے بعد سو برس بعد دوسرے لوگ جو حضور کے تابعین تھے ان میں بھی ایک ہی کشش تھی، ان میں بھی ایسا اثر تھا کہ کسی اور بات کی ضرورت نہیں تھی لوگوں کو شریعت کے اوپر قائم رکھنے کی لیکن جوں جوں فاصلہ بڑھتا گیا اسی طرح ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ شریعت پر پابندی رکھنے کے لیے وہی ترکیب استعمال کرنی چاہیے جو بچوں کو، جو عام سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے سے ڈرتے ہیں، گھبراتے ہیں اس میں کامیاب نہیں ہوتے، ان کے لیے کنڈرگارٹن سکول کھولے گئے تو تصوف، شریعت کے لیے کنڈرگارٹن سکول کی مانند ہے وہاں مٹھائی، یہاں ذکر، بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ اگر ذکر میں یا عبادت میں حجاب نظر آئے یعنی بہت لطف آئے تو وہیں چھوڑ دو۔ یہ لطف کے لیے نہیں ہے خیر تو کنڈرگارٹن کو بھی انہوں نے PROTECTED سارکھا۔ کچھ لوگ اسی میں ٹوہو گئے اسی میں پھنس گئے کیونکہ جب کوئی اس طرف کا علم حاصل کرتا ہے تو CONFIDENCE بڑھ جاتا ہے، علم بڑھ جاتا ہے کچھ اور طرح کا علم بڑھ جاتا ہے۔ کچھ یہ چیزیں پڑھنے سے کچھ تھوڑی سی قوت تصرف آ جاتی ہے اس کی وجہ سے۔ پھر وہ اس پگڈنڈی پر چلتا چلتا شریعت تک پہنچتا، اسی پر چلتا رہتا ہے۔ اسی پگڈنڈی پر رک جاتا ہے اسی میں خوش رہتا ہے، نہ ادھر کا رہتا ہے نہ ادھر کا رہتا ہے۔ پھر وہ بڑا صوفی بن جاتا ہے اس کے لاکھوں مرید بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ اصلی شاہراہ تک نہیں جاتے۔

✓ پھر ایک سوال کے جواب میں شہاب صاحب نے ہالینڈ میں صوفی عنایت کے صوفی سلسلے کے اجراء سے بارہا میں بتایا کہ کس طرح ہندوستان سے وہ تین بھائی مغرب میں گئے اور ایک بڑے سلسلے کی بنیاد رکھی صوفی عنایت مونیکی کے بڑے ماہر تھے اور ستار بہت اچھی طرح بجاتے تھے۔ باقی دو بھائی ان کی سنگت کرتے تھے۔ وہ سورہ فاتحہ کو ایک خاص دھن میں ستار پر پیش کرتے تھے اور سننے والوں پر وجد طاری کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ ہالینڈ میں اور یورپ میں مقبول ہوا۔ شہاب صاحب نے ان میں سے بعض کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال بھی سنایا۔

اجمل نیازی نے دلچسپ سوال کیا اور شہاب صاحب سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بڑے سے بڑے عالم دین کی وفات کے بعد لوگ اسے بھول بھال جاتے ہیں جبکہ صوفیاء اپنی زندگی میں بھی اور اپنے وصال کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے مزار مرجع خلأقی بنے رہتے ہیں۔ زندگی میں بھی زندہ ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد زندہ تر ہو جاتے ہیں اور ان کی کشش لوگوں کے لیے قائم رہتی ہے۔

شہاب صاحب نے اس کے جواب میں بڑی اچھی بات کہی: ”قرآن شریف میں ایک آیت ہے جس کا ترجمہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپ کے زمانے اور آپ کے بعد سب تک آپ کا فیض پہنچے گا۔ تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ آپ کے زمانے میں اور اس زمانے میں جو پیدا نہیں ہوئے اور ابد تک جو پیدا ہوں گے سب پر حضور ﷺ کا فیض پہنچے گا۔ تفسیر میں یہ لکھا ہے تو صوفیہ جو ہیں وہ اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کے راستے پر زیادہ ڈالتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو کامیاب ہو جاتے ہیں یعنی ان پگڈنڈیوں پر چل کر اس شاہراہ کی ایک خاص منزل تک پہنچ جاتے ہیں ان کا فیضان بھی ان کے مرنے کے بعد جاری رہتا ہے، اسی طرح۔“

تحریر..... ذوالفقار احمد تابش، روزنامہ ”امروز“ لاہور، 29 مارچ 1985ء

☆.....☆.....☆

لب تشنہ تقریر

(خطبات)

- ☆ — یونیسکو سے خطاب
- ☆ — اقبال کا جشن صد سالہ
- ☆ — ادیب اور آزادی تحریر
- ☆ — حکومت کا مزہ بیان طنز
- ☆ — گلڈ کی پہلی سالگرہ پر تقریر
- ☆ — گلڈ کے تین سال
- ☆ — سالانہ خطبہ
- ☆ — تن کی مٹری من کے جالے
- ☆ — آزادی کے ثمرات
- ☆ — ادب لطیف کی پچاسویں سالگرہ پر خطاب
- ☆ — ٹیڈی یا ٹیڈی
- ☆ — مولوی عبدالحق
- ☆ — پس چہ باید کرو
- ☆ — خطبہ صدارت

.....

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
 بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
 (غالب)

یونیسکو سے خطاب

(پندرھواں اجلاس)

میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے ولیم ایٹکی مہموآ کے جنرل کانفرنس کے 15 ویں اجلاس کے صدر کے طور پر منتخب ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کانفرنس کے اجلاسوں کو جس صبر و تحمل، مہارت، تجربہ اور کامیابی سے وہ چارے ہیں اس پر ہمیں انتہائی مسرت ہوئی۔

یہ وفد جناب اینی ماہیو کے بطور ڈائریکٹر جنرل دوبارہ انتخاب پر مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی آئندہ چھ سالوں پر مشتمل مدت ملازمت کے دوران اپنی ذہنی توانائیوں، جوش و جذبہ سے نہ صرف یونیسکو کے مقاصد کو آگے بڑھائیں گے بلکہ ان مقاصد کی تکمیل میں حامل رکاوٹوں کو بھی اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے ذریعہ دور کریں گے تاکہ یونیسکو کو زیادہ موثر اور شمر آور بنایا جاسکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیسکو کی بعض میدانوں میں نمایاں کامیابیوں کے باوجود اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے جسم اور روح کا مکمل طور پر طبی معائنہ کیا جائے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ایک ایسی تنظیم جو اچھے انتظامی ڈھانچے پر 50 فیصد سے زائد رقم اپنے بجٹ سے خرچ کرتی ہے۔ اس میں انتظامی سطح پر بعض بدنما چیزیں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کا سائز جو بڑھ گیا ہے وہ چلنے سے لاغر ہو گئی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ نہ تو خرگوش کے ساتھ بھاگ سکتی ہے اور نہ کتوں کے ہم رکاب ہو سکتی ہے۔

اس کی بیجانی مشکلات کے علاوہ یونیسکو کے رو بہ عروج انتظامی ڈھانچے نے پارکنس کے قانون کو دعوت دیدی ہے، ایک طرف چھپا ہوا مواد ہے جس کو حوالہ جات اور برعکس حوالہ جات کے لفافوں میں ڈھانپ دیا گیا ہے کہ اس کی کارکردگی بالخصوص عمل کی رفتار متاثر ہو کر رہ گئی ہے اس کی راہ عمل مسدود ہو کر رہ گئی ہے یہ ایک پیچیدہ بد نما اور الجھانے والی صورت کو جنم دے رہی ہے جو لوگ یونیسکو سے متعلق ہیں وہ اس کی بیوروکریٹک مشکلات کی وجہ سے اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یونیسکو کی انتظامی چیر پھاڑ کے ساتھ ساتھ اس کے سیکرٹریٹ کے کام کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ وہ چارٹ جس میں اس کی روداد جنرل کانفرنس میں ہر سال سنی جاتی ہے ایک ڈھکی چھپی دستاویز ہے جس میں زیادہ مواد کو مخفی رکھا گیا ہے۔

یہ بات جاننے کے لیے آنکھوں پر زیادہ دباؤ کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کا سیکرٹریٹ ایکوڈیما کے مرض کا

خکار ہو کر رہ گیا ہے یہ مرض لاعلاج ہرگز نہیں۔ بہر حال اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو پھر یہ ایک مستقل عارضہ بھی بن سکتا ہے جس سے نہ صرف اس کا دوران خون متاثر ہوگا بلکہ اس خون میں خرابی بھی پیدا ہوگی یہ ایک اچھی تنظیم ہے مگر انسدادی تدابیر کے فقدان سے پڑا مردہ ہو کر رہ گئی ہے۔

جب میں جغرافیائی طور پر اس چارٹ پر نمائندگی کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد یہ نہیں کہ کتنی روٹیاں کتنی مچھلیاں کس کے حصہ میں آئیں۔ درحقیقت ممبر ممالک کے درمیان ذمہ داریوں کے احسن اور مادی طریق کار کی تقسیم سے میری پہلی درخواست جو کہ میں ڈائریکٹر جنرل صاحب سے کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے۔ اپنی تازہ مدت ملازمت کے دوران اپنی مخصوص صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے انتظامی ڈھانچے کا نئے سرے سے جائزہ لیں اور اس کو ایسا بنائیں کہ اس کو آسانی سے سمجھا اور پرکھا جاسکے۔ اس میں آسانی سے کام کیا جاسکے اور اس کا دفاع کیا جاسکے۔ اس کام کی تکمیل کے دوران یونیسکو کے کیڈر کا بھی جائزہ لیا جائے تاکہ ان کی شرائط ملازمت سے متعلق قوانین اور ضوابط میں محکمہ ترقیاں اور دوسرے امور بھی بہتر ہو سکیں۔ میری دوسری درخواست مقابلہ تازہ آسان ہے جو بے شک زیادہ اہم ہے۔

کانفرنسوں کے بعد کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ چین کو نمائندگی دینے پر غور ہوتا ہے بحثیں ہوتی ہیں مگر آخر کار اس مسئلہ کو دبا دیا جاتا ہے اور ایک فرسودہ قرارداد پیش کی جاتی ہے کہ یونیسکو کے سیاسی سرپرست اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اس لیے جنرل کانفرنس کو اس مسئلہ پر اپنا منہ بند رکھنا چاہیے۔ یہ رسم فرسودہ، بے معنی ہو کر رہ گئی ہے یہ ان لوگوں کی ذہانت کی توہین ہے جو یہاں کوئی تازہ اور تعمیری بات کہنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ بے شمار راہ اختیار کر کے یونیسکو ایک خطرناک مثال پیدا کر رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں بہت سی کاوشیں ہوئیں کہ انسانوں کی سوچوں کو سیاسی مصلحتوں کے عبوری، لمبائی اور غیر مستقل مفادات کے تابع کر دیا جائے۔

انسانی تاریخ میں اس قسم کی کاوشوں کی ناکامی کی داستان رقم ہے۔ بہت خون خرابہ بھی ہوا مگر کامیابی نہ ہوئی کیونکہ ان اقدامات نے اپنے غیر اخلاقی پس منظر کے حوالے سے ناکام ہی ہونا تھا۔ اگر یونیسکو کو عالمی ضمیر کے محافظ کے طور پر قائم رہنا ہے تو پھر اسے آئین کو مادہ پر فوقیت کے اصول کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس کے لیے اسے نئی راہ عمل متعین کرنا ہوگی۔ یونیسکو دنیا کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی سیاسی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی مگر ہمیں ان سے حقیقتوں کے آگے سرنگوں نہیں ہونا چاہیے۔

ایک دیانتدارانہ فورم کے طور پر یہ یونیسکو کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اس امر کا جائزہ لے کہ دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کو علیحدہ رکھ کر وہ انسانوں میں سائنس اور ثقافت کے میدان میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتی ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے کہ جس کے ذریعہ آج کے علماء اور مفکرین اپنے سیاسی ہم عصروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں ڈائریکٹر جنرل صاحب کو یہ تجویز کروں گا کہ وہ اس مسئلہ پر ایسے اقدامات اٹھائیں جو عالمی سیاست کے مفادات اور اس کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے ماوراء ہوں۔

اس فورم میں نوجوانوں میں سمجھان کی اس کیفیت کا بہت ذکر کیا گیا ہے جو آج کے نوجوانوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے یہ صورت حال پرانی نسل کے دواہرے اور منافقانہ کردار کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے جو اپنے سماجی رویوں، سیاسی کاموں اور اقتصادی حکمت عملیوں میں روار کھے ہوئے ہے۔

نوجوانوں میں بے چینی کی یہ روشن ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں معاشروں میں محسوس کی جاسکتی ہے اس کا تعلق نہ

تو سکول کی تعلیم سے ہے اور نہ سکول سے باہر کی سرگرمیوں سے، اس کی وجوہات اور ان کا علاج کہیں اور ہے، بد قسمتی سے آئندہ دو سالوں کے لیے ڈرافٹ پروگرام ان مسائل کی نزاکت ان کے الجھاؤ کا بہتر طور پر احاطہ نہیں کرتا۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نوجوانوں کو محض وعظ و نصیحت، اقوال و زریں متاثر نہیں کریں گے وہ اس مسئلہ سے پریشان ہیں انہیں ان مسائل کا حل چاہیے صریح و مستقیم الفاظ نہیں۔

نوجوان بھی وقت اور طوفان کی طرح کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ آج جن چیلنجوں سے ہم کو مقابلہ کرنا ہے وہ ہمیں بڑے مواقع دیتا ہے تاکہ ہم فکر و نظر کی قدیمیں جلا کر اس سارے مسئلہ کا جائزہ لیں اور عملی طور پر ایسے اقدامات اٹھائیں کہ جس سے یہ مسئلہ حل ہو سکے۔

جناب صدر پاکستان کا وفد ان کوششوں کا دلچسپی سچے جائزہ لے رہا ہے جن کی وجہ سے انتظامی بورڈ کو وسیع کیا جائے گا تاکہ ایشیا اور افریقہ کو نمائندگی مل سکے ہم ان اقدامات کی حمایت کر رہے ہیں کیونکہ فی الحال یہی بہتر ہے کہ بڑے سودے سے اچھے نتائج حاصل کیے جاسکیں ورنہ یہ تجویز تو صرف قنوطیت اور مایوسی کا ایک مشورہ ہی ہے۔

ایشیاء اور افریقہ کے انتظامی بورڈ میں بہت ہی کم نمائندگی ہے ایسا کیوں ہے سب جانتے ہیں جو لوگ اس صورتحال پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں ان کے پاس اب ایک اور موقع آیا ہے کہ وہ اپنی اس تند و تیز گفتگو کو مثبت اعمال کی شکل میں ڈھال سکیں۔

جناب صدر! انتظامی بورڈ کے انتظامات کے نظام میں بہت سے سقم ہیں سب سے بڑا سقم تو یہ ہے کہ اس کا انتخاب سیکرٹریٹ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اعتقادات جرات کا تقاضا کرتے ہیں، پوشیدہ باتوں کا نہیں، رازدارانہ باتیں ہوں جنگ کے سامان کی مگر امن کی نہیں، مکاری کی مگر سچائی کی نہیں، یہ امر یونیسکو کے اصولوں کے عین مطابق ہوگا اگر وہ سیکرٹریٹ کے نظام کو ترک کر دے اور اپنے ادارہ میں انتخابات کھلے عام کرائے۔

جناب صدر یونیسکو کے بجٹ سے اور پروگرام سے جو تاثر میرے ذہن پر مرتسم ہو رہا ہے اس سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ یہ تنظیم آہستہ آہستہ مرکز گریز ہو جانے کی بجائے مرکز کی طرف رواں دواں ہے۔

ساری کائنات کو علم اور مفاہمت کے گلابوں سے اکٹھا رکھنے کی بجائے اس تنظیم نے اپنی کارکردگی میں ذات پات کی دیواریں حائل کر رکھی ہیں جس کے ذریعہ اس کے پروگرام چند مخصوص علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں، اس صورتحال کا جلد سید باب کیا جائے۔

جناب صدر! یونیسکو نے شاندار کوششیں شروع کر رکھی ہیں تاکہ آثار قدیمہ کو بچایا جاسکے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری منقسم دنیا میں ابھی تک ایسے مشترکہ مقاصد ہیں کہ جن کے ذریعہ عالمگیر امداد اور تحسین حاصل کی جاسکتی ہے آئیے اس مثال کو اور بھی بہت سے علاقوں میں اپنائیں۔

فیلے کے مندروں کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جائے، افغانستان میں ہیمیان اور یورو بدر جو انڈونیشیا میں ہے اور منچو ڈارو بھی یونیسکو کے تعاون سے محفوظ کیا جائے۔

علاقائی طور پر منچو ڈارو پاکستان میں ہے مگر درحقیقت یہ ساری انسانیت کی ملکیت ہے اندازہ ہے کہ یہ تقریباً پانچ ہزار سال پرانا ہے اور اس سے پہلے صرف میپوٹانیہ اور مصر کی تہذیب ہی موجود تھیں۔ یہ وقت کی دست برد سے ابھی تک محفوظ ہے منچو ڈارو مگر اب سیم اور تھوراس کو کھارہی ہے اگر ہم یونیسکو کی مدد سے اس کو بچا سکے تو یقینی طور پر یہ ایک مثبت کام ہوگا۔

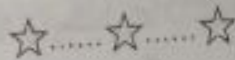
جناب صدر! وقت اور فطرت کی چیرہ دستیوں کے علاوہ پرانے پہاڑوں کا بھی برا حال ہے یورو شلم اور وہ عرب علاقے جن پر آج اسرائیل کا قبضہ ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ اسرائیل میں جو لوگ اس مہم کی سرپرستی کر رہے ہیں ان کو انسانی اقدار کے تقدس کا احساس تک نہیں چنانچہ وہ یورو شلم اور عرب علاقوں کو کسی جواز کے بغیر تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسرائیل کو ان وحشیانہ اقدامات سے روکنے کے لیے غیر سیاسی اقدامات اٹھائے جائیں تاکہ وہ مقدس عمارتوں کو پامال نہ کرے۔

جناب صدر! اب میں آپ کی توجہ اس اپیل کی طرف مبذول کراتا ہوں جو اس پلیٹ فارم سے پاکستان کرتارہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ایسا فنڈ بنایا جائے جو ریڈ کراس کے اداروں SCIENTIFIC AND CULTURAL HISTORY OF MANKIND کی بنیادوں کی طرح ہو جو ان تعلیمی اداروں کو بحال کر سکے جو قدرتی آفات، زلزلے، سیلاب اور بارشوں کی وجہ سے پامال ہو گئے ہوں اس مسئلہ کا تعلق صرف پاکستان سے نہیں یہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ درخواستیں عام طور پر تھکے ہوئے کانوں پر پڑتی رہیں۔ جب تک یہ بہرے کانوں پر نہیں پڑیں گی ہم اس وقت تک امید کے ساتھ انتظار کریں گے۔

جناب صدر! اب آخر میں کانفرنس کی توجہ یونیسکو کے زیر انتظام شائع ہونے والی کتاب کی جانب مبذول کراتا ہوں اس میں شامل بعض نقشہ جات میں یو این او کے فیصلوں کو خاطر میں نہیں لایا گیا کہ جو بعض متنازعہ علاقوں کے بارے میں اور اس طرح اپنے طور پر یونیسکو نے ان نقشہ جات کی مدد سے ایک فریق کو یہ علاقے دے دیے ہیں۔ میں اس شکایت کا ذکر اس فورم میں اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ پاکستان کو یونیسکو کو کی جانے والی عرضداشتوں کا جو اس ضمن میں ماضی میں کی گئیں کی وصولی کی رسید بھی موصول نہیں ہوئی۔

25 اکتوبر 1968ء کو خطاب، مترجم: عامر میر



اقبال کا جشن صد سالہ

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک ایسے سال سے گزر رہے ہیں جس میں عالم اسلام کے ایک بطل جلیل علامہ اقبال کا صد سالہ یوم پیدائش پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی شایان شان طور پر منایا جا رہا ہے۔

اس ایک سال میں علاقہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفے پر اتنا کچھ لکھا، پڑھا اور بیان کیا گیا کہ اس کے بعد میرے جیسے کم عقل اور کوتاہ عمل بندہ ناچیز کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ہاں اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس سارے سال کی گہما گہمی، محفل آرائی، قلم کاری اور شعلہ بیانی کے بعد قوم کا انفرادی اور اجتماعی شعور کیا دیر پا اثرات قبول کرتا ہے؟۔ علامہ اقبال کا سال منانے کا مقصد اقبال کی عزت افزائی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نام اور کام اور پیغام کو سر بلندی کی ان حدود میں پہنچا دیا ہے جہاں انسان کی کوشش نہ اسے بڑھا سکتی ہے نہ گھٹا سکتی ہے۔ ایسی تقریبات سے اگر کسی کو شرف حاصل ہوتا ہے تو وہ خود ہمیں کو ہے لیکن شرف برائے شرف بے معنی رہے گا اگر اس کے دامن میں اس کو ہر مقصود کی تھوڑی بہت جھلک نہ ہو جو اقبال کے سارے کلام اور پیغام کا نچوڑ تھا۔ اگر یہ تقریبات نشست و برخاست تک ہی محدود ہو کے رہ گئیں تو یہ ولولہ انگیز سال بھی یوں ہی نکل جائے گا جیسے سگلاخ چٹان پر پانی کا ریلا گزرتا ہے اور اپنے پیچھے گھاس کا ایک تنکا بھی سرسبز نہیں کرتا۔ اس کے بعد مزید ایک سو برس کون انتظار کرے گا کہ ایسا ہی مبارک سال ہمیں دوبارہ نصیب ہو۔ کون جیتا ہے تری زلف کے اسیر ہونے تک!

یوں تو علامہ اقبال کے کالم میں دینی، روحانی، مادی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور آفاقی قدروں کے بے شمار پہلو ہیں لیکن آج کے ماحول میں اگر اقبال کی یاد خلوص نیت سے ہمیں ایک اور صرف ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے کی طرف مائل کر دے تو یہ اس سال سعید کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ یہ سوال یوں تو ابجد کی طرح بالکل سیدھا اور سادہ ہے لیکن ہمارے بیچ در بیچ معاشرے نے اس میں سمندروں جیسی اتھاہ گہرائی پیدا کر رکھی ہے۔ جواب دینے پر آئے تو ایک طفل کتب بھی اس کا جواب بڑی آسانی سے بنوک زبان دے سکتا ہے لیکن سوچ میں پڑ جائے تو بڑے بڑے اہل علم و فن، ادیب عقل و دانش، صاحب تجارت و ثقافت و سیاست و ذکاوت سالہا سال اس کے گرداب میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ کم از کم پاکستان میں تو ہم تیس برس سے اس کے گرداب میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔ وہ سادگی و پُر کاری کا سوال جس کے سمندر کو علامہ اقبال نے ایک لافانی مصرع کے کوزے میں بند کر دیا ہے، یہ ہے:

تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہوا
اگر قیام پاکستان کے وقت علامہ اقبالؒ بقید حیات ہوتے تو شاید وہ بانگ درا سے اپنے اس مصروع کو عذف
کر دیتے کیونکہ مملکت خدا داد میں اللہ کے فضل و کرم سے ہم سب کلمہ گو مسلمان ہیں، صرف ہم ہی نہیں بلکہ ہم نے تو ایک
عظیم مملکت کو کلمہ طیبہ کی پکار پر حاصل کیا تھا یہ دوسری بات ہے کہ جب برا وقت آیا تو اگر کچھ ٹوٹا تو فقط پاکستان ٹوٹا اور
ہماری کلمہ گوئی پر ذرا بھی آنچ نہ آئی۔

پورے تیس برس سے ہم امور سلطنت میں سازش، نظم و نسق میں ظلم و ستم، خدمت میں خیانت، سیاست میں
رقابت، ثقافت میں کثافت، سچ میں جھوٹ، دودھ میں پانی، آٹے میں ریت، مرچوں میں پیسی ہوئی اینٹوں، ہلدی میں
گل زرد، چائے کی پتی میں سڑے ہوئے چمڑے کا برادہ، نمک میں کنکر، معاشیات میں طبقاتی کشمکش، قومی یکجہتی میں
علاقائی عصبیت اور نصب العین میں ذاتی مصلحتوں کی ملاوٹ کرنے میں بڑی تن دہی سے مصروف ہیں لیکن اس سے نہ
ہمارے ایمان میں لغزش آئی ہے نہ ہمارے مسلمان ہونے پر کوئی ضرب پڑی ہے۔ ہمارے یقین محکم کی مضبوط چٹان پر
نہ شراب ناب کے پے در پے ریلوں نے کوئی چھینٹے اڑائے ہیں، نہ چنگ و رباب نے اسے غافل کیا ہے، نہ رقص و سرور
نے اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکایا ہے۔ ہم بچوں کے ٹوں مسلمان کے مسلمان ہی ہیں۔ نماز پڑھیں نہ پڑھیں نماز کی تلقین
ضرور کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیں نہ دیں زکوٰۃ دینے کی نیت نیک رکھتے ہیں۔ دنیا میں کسی جگہ ایسے مسلمان نہیں ملتے جو
ہماری طرح صبح و شام، دن رات، باہ نماہ، سال بسال اس قدر بلند آواز سے اسلام، اسلام، اسلام کا نعرہ لگاتے ہوں یہ تو
ٹھہری ہماری مسلمانی، باقی رہا پاکستان، اس کا حال بھی ماشاء اللہ برا نہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ملک اکثر بنتے اور
گڑتے ہیں، پھیلنے بھی رہتے ہیں، سکڑتے بھی رہتے ہیں۔ اب اگر پاکستان بھی پہلے سے نصف رہ گیا ہے تو اس جرم
عظیم کو بھی ہم نے تاریخی عمل کا نام دینا شروع کر دیا ہے۔ اس سے نہ ہماری حب الوطنی پر کوئی حرف آتا ہے نہ ہماری
غیرت چیلنج ہوتی ہے نہ ہمارے جذبہ ایمان کا کچھ گڑتا ہے۔

ہمارے ان کارناموں کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ اگر ان سب کو ایک ایک کر کے گنوائے بیٹھیں تو قصہ بہت
طولانی ہو جائے گا لیکن ابھی تو:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اگر ہمارے ماضی کے کارناموں کا سلسلہ لامتناہی ہے تو ہمارے مستقبل کے عزائم، دعویٰ اور منصوبوں کی لسٹ
بھی کچھ کم طویل نہیں۔ ان سب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بے اختیار علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد یاد آتا ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

آج کے پاکستان میں ہماری سب سے بڑی ضرورت اپنے آپ کو بدلنے کی، اپنے چاروں ماحول کو بدلنے کی اور اپنی آرزوئیں بدلنے کی ہے۔ افراد میں ذاتی طور پر اس تبدیلی کے بغیر نہ جماعتوں میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے، نہ قوم میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے نہ ماحول میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے۔

انسان کے لیے اپنے انفرادی وجود میں تبدیلی پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوکھ دبا کر کھٹ سے بجلی کا بلب روشن کرنا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ کرنٹ آرہی ہو۔ اس کرنٹ کو پیدا کرنے والی مشین ہر اچھے اور بُرے، نیم اچھے اور نیم بُرے انسان کے اپنے سینے میں لگی ہوئی ہے۔ وہ اس کا دل ہے اگر یہ کمپیوٹر ایک رخ پر چلے تو انسان احسن التقویم کا درجہ پاتا ہے۔ دوسرے رخ پر چلے تو وہ اسفل السافلین بن جاتا ہے۔ اس عجیب و غریب مشین کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہمیں دو چیزیں عنایت ہوئی ہیں ایک نماز، دوسرے قرآن حکیم۔

ایک بار ایک لابیال قسم کے آزاد منش نوجوان طالب علم نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ نماز پڑھنا فرض تو ضرور ہے لیکن اکثر اوقات نماز میں نہ حضوری حاصل ہوتی ہے نہ خضوع و خشوع میسر آتا ہے ایسی بے کیف و بے سرور نماز بار بار پڑھنے سے کیا فائدہ؟

علامہ اقبالؒ نے پوچھا، کیا تم کبھی کسی گانے کی محفل میں شریک ہوئے ہو؟
نوجوان نے تسلیم کیا کہ وہ کئی بار رقص و سرود کی محفلوں میں بیٹھ چکا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ گانا شروع ہونے سے پہلے سازندے بڑی دیر تک ٹوں ٹاں کر کے ساز ملاتے رہتے ہیں۔ کبھی سارنگی والا تار ڈھیلے کرتا یا کستا ہے، کبھی طبلے کو آزما تا ہے۔ شائقین کے لیے یہ مرحلہ بڑا بے کیف اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر موسیقی کا تال اور سر ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ نماز بھی ایسی ہی ڈرل ہے۔ اس امید پر کہ شاید کبھی دل کا سر کسی سرمدی تان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ یوں بھی فرض تو صرف نماز کا پڑھنا ہے، دل لگنا فرض نہیں۔

اسی طرح ایک بار علومِ مشرقی کے ایک غیر ملکی عالم نے علامہ اقبالؒ سے سوال کیا کہ آپ واقعی یہ مانتے ہیں کہ قرآن حکیم ایک تخلیقی وجدان کے طور پر ظہور میں نہیں آیا تھا، بلکہ اس کا ایک ایک لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا؟

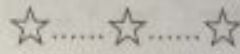
✓ علامہ نے جواب دیا، میرا پختہ ایمان ہے کہ قرآن حرفا حرفا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ سوال کرنے والے نے اس یقین کے متعلق کوئی دلیل مانگی تو علامہ اقبالؒ نے جواب دیا، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تو بڑی عظیم ذات ہے۔ میں ایک گناہ گار انسان اور شاعر ہوں۔ لیکن کبھی کبھی تو مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے اشعار کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر یوں اتر رہا ہے جیسی ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔

یہ بھی ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہدایت و حکمت کی ایسی عظیم الشان کتاب پڑھنے اور نماز کے ذریعہ علم و عرفان کی سیڑھیاں چڑھنے پر ہمیں پورا اختیار اور آزادی ہے۔ اس کے لیے نہ تو ہمیں کسی کی خوشامد کرنا پڑتی ہے، درخواست دینا پڑتی ہے نہ کوئی پر مٹ حاصل کرنا پڑتا ہے، نہ کسی افسر کی اجازت مانگنی پڑتی ہے، نہ کسی پیر فقیر کے حکم کا انتظار کرنا پڑتا ہے، نہ ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے، نہ فیس ادا کرتے ہیں، نہ چلہ کاٹتے ہیں۔ اگر ان نعمتوں کی ارزانی کا احساس عام ہو جائے، تو جس طرح کے کیواب سینما گھروں کے باہر نظر آتے ہیں، اس سے بھی زیادہ لمبی قطاریں مسجدوں کے سامنے لگنا شروع ہو جائیں گی۔ اگر کبھی پاکستان میں ایسا ہوا، تو اس ارضِ پاکستان میں صرف تیل ہی نہیں بلکہ قناعت کے دودھ اور فضیلت و طہانیت کے شہد کی نہریں بھی بہنے لگیں گی۔ کیونکہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا وعدہ ہے کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

”نقوش“ لاہور (اقبال نمبر)، 1977ء



ادیب اور آزادی تحریر

اس سے پہلے کے ادیب اور اس کی آزادی تحریر پر گفتگو کی جائے یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے..... وہ ذمہ داریاں یہ ہیں۔

- 1- ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔
 - 2- وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔
 - 3- کسی ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔
- یہ حدیں تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں لیکن ان کا اطلاق زیادہ شدت سے ادیب پر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر لمحے عوام کی نظروں میں رہتا ہے، جو کچھ وہ لکھتا ہے ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے۔ جتنا زیادہ مقبول کوئی ادیب ہوگا اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ ہوگا اور عام لوگوں کی طرح آزادی سے کوئی بات کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے سامعین ہوتے ہیں اور اسے بڑی آسانی سے غلط سمجھا جاسکتا ہے۔ اثر انداز ہونے کی اہلیت ادیب کے لیے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسے غیر معمولی فرد کو عام ترازو میں تولنا جاتا ہے اگر آپ کو ادیب میں کچھ کی محسوس ہوتا ہے تو ادیب کا قصور ہے نہ آپ کی ترازو کا بلکہ ممکن ہے یہ آپ کے جائزے یا آپ کی نظر کا قصور ہو۔

ادیب آپ سے برداشت کی نہیں فہم کی بھیک مانگتا ہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں بلکہ ایک باشعور پڑھنے والے کا فہم..... ایک اعلیٰ اقدار میں یقین رکھنے والے کا فہم..... ایک سچائی کے پرستار کا فہم..... آپ چور کو پکڑنے کے لیے کسی دوسرے چور کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں لیکن ادیب کو سمجھنے کے لیے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش ہوگی۔ سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری مشلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی کتابوں کی قسمت میں نہیں تو وہ ہمیشہ ادیب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حقارت سے دیکھیں گے۔ یہ سرکاری افسر کبھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ جسمانی سزائیں ضروری نہیں کہ روج کے لیے بھی عذاب ہوں اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی کی وہ زنجیر دریافت کرنے سے قاصر رہی ہے جو علم اور سچائی کو جکڑ سکے۔

ادیب کی آزادی کے لیے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدود سے ماورا ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ انسانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو چھوٹا ہے اور اس کے گل کے جواب ممکن ہے کہ آج کی زندگی کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار..... بات صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر زیادہ گہری اور اس کے

شہاب مگر
جہاں ادیب ہیں وہاں آپ سے زیادہ شہید ہیں۔ کوشش کیجیے کہ آپ ان بلندیوں تک پہنچ جائیں جہاں ادیب ہیں ورنہ آپ اس سے کبھی انصاف نہیں کر سکیں گے۔

ادیب کی آزادی کو تیسرا بڑا خطرہ اس کی اقتصادی پسپائی سے ہے۔ ہمارے ملک میں کتابیں اس لیے نہیں بکھیں کہ وہ سستی نہیں، جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں، جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ خرید نہیں سکتے۔ اس تمام تضاد میں صرف ایک شخص فائدہ اٹھاتا جاتا ہے اور وہ ہے ناشر۔ وہ ادیب کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتا ہے اور پھر بھی اسے شکایت رہتی ہے کہ خون میں مناسب گرمی نہیں تھی۔ وہ ادیب کی صلاحیتوں کو اپنے تجارتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

ادیب کی آزادی کے لیے ایک اور بھی خطرہ ہے اور وہ خطرہ بیرونی ہے۔ ہمارا ملک ایک چھوٹا سا ملک ہے، ہم غریب ہیں، ہم نے اپنے معاملات کو الجھا دیا ہے، ان الجھنوں کی وجہ سے ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے۔ مدد دینے والے ہمدرد، مذاق اڑانے والے ہمدرد اور ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے ہمدرد، چلیے یہ بھی ٹھیک ہوا لیکن جو سب سے زیادہ خطرہ کی بات ہے وہ یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی بد حالی کی وجہ سے ہم نے بحیثیت قوم اپنے آدرشوں کو بھلا دیا ہے اور جب ہم نے خود ہی اپنے آدرشوں کو پس پشت ڈال دیا تو خلا کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ہر خطے کے رہنے والے اور ہر قسم کے لوگ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

کوئی ہمارا ذہنی مکہ واشتاتن بتاتا ہے کوئی ماسکو اور کوئی کلکتہ، ہر ایک کے ارادے مختلف ہیں۔ ماسکو اور کلکتہ والے ہمارے نظریات کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ واشتاتن والے اپنی راہ لگانا چاہتے ہیں لیکن یاد رکھیے کہ ہمارا ذہنی مکہ صرف پاکستان میں ہے اور کہیں نہیں۔ پاکستان کے ادیب عالمی سیاست کی بساط پر مہرے نہیں بننا چاہتے ہم غریب ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ہمارا اپنا ذہنی اور ثقافتی افق ہے کچھ دیر ہمیں اپنے چمن کی سیر کرنے دیجیے۔

اس قوی لامرکزیت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ ہماری تخلیقی قوتوں میں تعطل پیدا ہو گیا ہے دوسری زبانوں کی منوں معمولی کتابیں ہمارے ادیبوں کے سروں پر اچھی اجرت کے لالچ میں لادی گئی ہیں۔ ہمارے اچھے سے اچھے ادیب کی تخلیقی کاوش دس آنے بھی وصول نہیں کر سکتی لیکن اگر وہ ایک دوسرے درجے کے غیر ملکی ادیب کی ایک گھٹیا کتاب کا ایک صفحہ ترجمہ کرتا ہے تو اسے دس روپے مل جاتے ہیں۔ آخر ہمارے ادیبوں کو بھی زندہ رہنا ہے اور اسی لیے سائبریا کے جنگلوں اور کیلیفورنیا کے باغوں سے ہمارا ادب معمور ہے جب کہ گھلنا کے دھان کے کھیتوں کے گیت کوئی نہیں گاتا۔ لاہور کی بڑے وقار عظمتوں کا ترانہ کوئی نہیں سناتا۔

آخر میں..... میں ادیب کی آزادی تحریر اور حکومت کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تین مہینے پہلے تک سیاستدانوں نے ہر آزادی کو ترقی دی۔ خصوصاً لوٹے اور کھسوٹے کی آزادی تو فن کا درجہ حاصل کر گئی تھی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس ماحول میں میرے لیے ایسا مقالہ پڑھنا ممکن تھا لیکن آج جبکہ مارشل لاء کی 69 دفعات میرا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میرے سامنے بیٹھے ہیں، میں محسوس کرتا ہوں کہ آزادی سے وہ کچھ کہہ دوں جو کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔

(یہ مقالہ قدرت اللہ شہاب جنرل سیکرٹری پاکستان رائٹرز گلڈ نے

گلڈ کے کنونشن منعقدہ جنوری 1959ء کے آخری اجلاس میں پڑھا۔)

حکومت کا مرنے کا بیانہ طنز

خطبہٴ صدارت ”یومِ منٹو“

زیر اہتمام بزم افکار کراچی منعقدہ 16 فروری 1957ء

اپنی زندگی میں منٹو ایک ادیب تھا لیکن مرنے کے بعد وہ ایک ادارہ بن گیا ہے۔ غالباً ہم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کے خطوط کا وقت پر جواب نہیں دیا کرتے تھے یا اسے ملنے سے کئی کتر آجایا کرتے تھے۔ اگر یہ اس کے بس کی بات ہوتی تو آج اس مجمع پر خشت زنی کر کے منٹو کا جی بہت خوش ہوتا۔

اگر جس زمانے میں ریڈیو پاکستان نے منٹو کو بلیک لسٹ میں ڈال کر اس پر اپنے دروازے بند کر دیے تھے اس وقت منٹو نے بڑے وثوق سے یہ پیش گوئی کی تھی کہ دیکھ لینا ایک روز یہی ریڈیو والے میری برسی پر پروگرام بھی نشر کیا کریں گے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ زندگی میں صرف منٹو کو یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے اور موت کے بعد اب دوسروں کو بھی یہ خیال ستانے لگا ہے کہ منٹو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ قبر پرستی کے ماحول میں زاویہ نگاہ کی یہ کجی بھی ایک فن کا مقام حاصل کر لیتی ہے چنانچہ استاد بندو خان کے انتقال کے فوراً بعد ساری دنیا کو یکا یک یہ کشف حاصل ہوا کہ بیچارا استاد تو لا لو کھیت کی ایک معمولی سی جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ احساسِ عامہ کے اس نازک شعور نے رفتہ رفتہ حکومت کے ضمیر کو بھی جگا دیا ہے اور جیسا کہ آپ نے نوٹ فرمایا ہوگا نئے سال کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کی رقم اس مقصد کے لیے رکھی گئی ہے کہ جب ادیب اور فنکار اللہ کو پیارے ہوں تو یہ روپیہ ان کے بہنندگان میں صبر جمیل کے طور پر تقسیم کیا جائے۔

موت کے ساتھ یہ ترجیحی سلوک ادب اور فن دونوں پر ایک مرنے کا بیانہ طنز ہے۔ حکومت اور معاشرے کا جو نظام ادیبوں اور فنکاروں کی زندگی کو نظر انداز کر کے ان کی موت پر خیراتی سرپرستیوں کے مقبرے تعمیر کرنے پر آمادہ ہوا، اس ٹھنڈے دل سے اپنے بیمار نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اس موقع پر مجھے ایک بہت بڑے سیاسی رہنما کی تاریخی بات یاد آتی ہے جو انہوں نے ایک بار ایسے ہی سلسلے میں فرمائی تھی۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آرٹ اور ادب مصیبت اور تنگ دستی کے سائے میں پھلتا پھوتا ہے اگر ادیب اور فنکار فکرِ معاش کی جدوجہد سے بے نیاز ہو جائیں تو قوم کی INTELLECTUAL ترقی پر جمود چھا جائے گا۔ یہ وہی ذہنیت ہے جس کی شکایت منٹو نے خود بھی ایک اور طریقے سے کی تھی۔ منٹو کو لگتا تھا کہ اس کے کئی پہلے اسے گھر بلا کے اچھی اچھی شراب پلاتے ہیں تاکہ وہ نئے نئے شاہکار تصنیف کرتا جائے جب کتاب مکمل ہو جاتی ہے تو وہ شراب کی قیمت رائٹوں سے کاٹ لیتے ہیں۔

اگر آرٹ اور ادب کا مقصد محض ذہنی عیاشی نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ فنکار کو اپنی محنت کا صلہ پانے کے لیے لازماً

موت ہی کا انتظار کرنا پڑے؟ ارباب سیاست نے کبھی اس خیال سے نعرے نہیں لگائے کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی وزارت اور سفارت کی کرسیاں نصب کی جائیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے کبھی اس مقصد سے بھاگ دوڑ نہیں کی کہ ان کے چالیسویں کے بعد امپورٹ لائسنس جاری کیے جائیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد سرکاری ملازم جب تک زندہ رہتا ہے اسے پنشن ملتی ہے اور جب مر جاتا ہے تو پنشن بند ہو جاتی ہے۔ اس بندھے بندھائے بچے کے نظام میں فنکار ہی ایک عجیب و غریب مخلوق رہ جاتی ہے جس کی پنشن مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

پچھلے نو سال کے عرصے میں ہمارے ہاں کئی طرح کے خوشگوار تجربے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اگر آپ کے پاس پلاٹ ہے اور پیسہ نہیں تو ہاؤسنگ کارپوریشن آپ کو مکان تعمیر کرنے کے لیے قرضہ دے دیتی ہے۔ اگر آپ کے پاس صنعت ہے اور سامان نہیں تو انڈسٹریل کارپوریشن آپ کی مدد کرتی ہے۔ زمین والوں کے لیے بل اور ٹیل فراہم کرنے کے لیے تقاوی کا امدادی سسٹم جاری ہے، یہاں تک کہ مضبوط گھلے اور بلند آواز رکھنے والے نعرہ زن عناصر بھی خسارے میں نہیں رہتے لیکن اگر کسی کے پاس محض علم، تخیل، قلم اور رنگین برش ہے تو اس کے مداح تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان کے ذاتی مسائل پر توجہ دینے کے لیے کوئی ذریعہ میسر نہیں ہوتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسی کارپوریشن یا ادارہ بھی قائم ہو سکے جو منظم طور پر مکمل خودداری کے ساتھ آرٹ اور ادب کی سرپرستی کا بیڑا اٹھالے؟

پچھلے سال سے پاکستان کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کی رقم اس لیے رکھی جا رہی ہے کہ ملک میں اچھے ادب، آرٹ، نرسنگ اور فارمنگ پر انعامات دیے جائیں یہ اقدام بہت خوشگوار ہے لیکن یہ پہلا قدم اب آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ آرٹ اور ادب کی سرپرستی میلہ مویشیاں کے انعامات سے مختلف طور پر ہونی چاہیے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے عوام اور حکومت کے تعاون سے ایک مستقل نیم آئینی فنڈ قائم کیا جائے جس کا نظام سویڈن کے نوبل پرائز فنڈ کے مشابہ ہو۔ اس فنڈ سے ہر سال بہترین ادب، فنون لطیفہ، سائنٹفک ریسرچ اور خدمتِ خلق پر ایسے انعامات دیے جائیں جو نہ صرف مالی اعتبار سے قابل قدر ہوں بلکہ ان کا حصول بھی ہمارے قومی معاشرے میں ایک ذی وقار طرزِ امتیاز کا درجہ رکھتا ہو۔ اس فنڈ میں ایسی صلاحیتیں بھی پیدا کی جاسکتی ہیں جن سے معذور فنکاروں کی اور مرحوم فنکاروں کے لواحقین کی نگہداشت کا باعزت انتظام ہو سکے۔ غالباً ایسے فنڈ کا قیام ہماری حکومت اور دیگر صاحبِ ثروت عناصر کے وسائل سے بعید نہیں ہے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ فنڈ خود اپنی آئینی حیثیت کا مالک ہو اور اس کا وجود دفتری لال فیتوں، نظریاتی فرقہ بندیوں اور سیاسی اڈھیڑوں سے قطعی آزاد ہو۔

معزز حاضرین! مجھے اعتراف ہے کہ نوبل پرائز کی طرح پاکستان پرائز قائم کرنے کی تجویز کوئی نئی یا عجیب تجویز نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارباب علم و ادب کی نظر میں اس سے بہتر اور بھی بہت سے منصوبے ہوں گے لیکن اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی مؤثر آواز اٹھائی جائے۔ فنکار کے پاس صرف ایک پلیٹ فارم ہے اور وہ اس کا فن ہے لیکن فن بذاتِ خود اس قسم کی انضباطی جدوجہد میں مبتلا ہونا گوارا نہیں کرے گا چنانچہ یہ ذمہ داری بالآخر انہی صاحبِ ذوق حضرات پر پڑتی ہے جو ادب اور آرٹ میں دلچسپی لینا تصحیح اوقات نہیں سمجھتے۔ ہر کتاب کے پیچھے مصنف اور ہر تصویر کے پیچھے مصوّر ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ ان کی وجود کا احساس اس وقت ہو جب وہ ہم میں نہ رہیں۔

”ساقی“ کراچی مارچ 1957ء

گلد کی پہلی سالگرہ پر تقریر

مرکزی سرگرمیوں پر ایک رپورٹ چھاپ کر تقسیم کر دی گئی ہے جس کا مطالعہ آپ آرام سے کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں آپ سے گلد کے تصور کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب پچھلے سال آج کے دن گلد کے تصور نے عملی شکل اختیار کی بشمول میرے بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ایس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔

مگر ادیب کے بعد ادیب اپنے مرمریں برج سے اتر کر جماعت میں شامل ہوتے گئے اور ہم نے مل جل کر کمرہ نمبر 20 ہوٹل ایکسیلیئر میں تھوڑا سا وقت گزارنا شروع کر دیا جہاں گذشتہ سال سے ہمارا دفتر قائم ہے۔ یہ ایک تاریک اور ٹھنکا ہوا کمرہ ہے جہاں چائے کی قیمت ریستوران سے زیادہ لی جاتی ہے اور جہاں کے پیرے ہم سے گریزاں گریزاں رہتے ہیں کیونکہ ہم انہیں مسافروں کی طرح معقول انعام نہیں دے سکتے۔ ہوٹل کا مالک بھی کبھی کبھی ہم کو تھکانہ نظروں سے دیکھتا ہے کیونکہ اب تک ہم نے اس کو مناسب کرایہ ادا کیا ہے نہ اس کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ بہر حال ہماری استطاعت سے زیادہ پڑتا ہے۔

ہوٹل کے کمرے کے باہر بھی بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے ہمیں ایسی ہی سرد مہری دکھائی ہے جیسے ہوٹل ہمیں ٹھنڈی چائے دیتا ہے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس ہوٹل کے بیروں کی طرح ہم سے کم تو جہی برتتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو مالک ہوٹل کی مانند یہ چاہتے ہیں کہ ہم بہت جلد ختم ہو جائیں۔ میں ان مثالوں کو بڑھانا نہیں چاہتا کیوں کہ اس سے مجھے زیادہ تلخی کا احساس نہیں ہوگا۔

آج مجھے ایک لمحے کے لیے ماضی کی طرف مڑ کر یہ دیکھنے سے نہایت فرحت ہو رہی ہے کہ اسی چھوٹے سے کمرے میں ایک سال کے اندر کیا کیا دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں۔ میں جزئیات پر تبصرہ نہیں کروں گا مگر مجھے کہنے دیجیے کہ میں نے گلد کے تصور کو اس نرمی اور آہستگی سے پھیلنے دیکھا ہے جیسے ایک کنواری کی بڑھتی ہوئی چمکیلی زلفیں۔ آج کوئی بھی خیبر پاس سے کا کس بازار تک چلا جائے ناممکن ہے کہ آٹھ گھنٹے کے سفر کے اندر اندر ہمارا نشان (قلم) لگائے ہوئے کوئی ادیب اس کی پیشوائی کو موجود نہ ہو۔ جماعتی تانا بانا صرف ایک سال کا ہے۔ مدت اہمیت نہیں رکھتی بلکہ جو چیز اہم ہے وہ یہ کہ جو لوگ یہ نشان لگائیں اور جو لوگ یہ نشان نہ لگائیں دونوں اس نشان کا یکساں احترام کرتے ہیں۔

میں اس دن کے لیے جیتا ہوں جب ایک کسٹم انسپکٹر آپ کے اسباب کی تلاشی اس لیے نہ لے لے اور ایک ریلوے ٹکٹ کلکٹر آپ کا ٹکٹ یہ دیکھ کر چیک نہ کرے کہ آپ اعتبار اور تکریم کا ایک نشان لگائے ہوئے ہیں وہ دن جب ایک

بدماغ افسر آپ کو انتظار کی زحمت اس لیے نہ دے کہ آپ کے کارڈ پر یہ نشان لگا ہوا ہے وہ دن یہ نشان نظروں کو ظہور کر کے محبتوں کی علامت بن جائے اور شبہات کی جگہ اعتماد اور حقارت کی بجائے مودت باہمی کی روایات قائم کر دے۔ یہ وہ آدرش ہے جس کے لیے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں مگر اس ضمن میں میں تین شبہات بھی گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں۔

پہلی تنبیہ خود میرے لیے ہے اور ان کے لیے بھی جو میری طرح ہیں۔ ہمیں ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ گلڈ صرف ایک ٹریڈ یونین ہے یہ انتظامی ادارہ ہے ایک نظریاتی تنظیم نہیں ہے۔ گلڈ کا واحد نظری نصب العین ہے (اگر یہ اصطلاح استعمال کی جائے) دانشورانہ ایمانداری اور اس کے استعمال کی آزادی اور ہمت۔ اس کے علاوہ ہر ادیب اپنی مملکت خیال کا بادشاہ ہے چنانچہ اگر ہم میں سے کوئی فرد ادبی سطح پر کوئی بات کہتا یا لکھتا ہے تو خواہ گلڈ میں اس کا کوئی عہدہ ہو یا نہ ہو اپنی ذاتی حیثیت میں کہتا اور لکھتا ہے۔ یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے تاکہ غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔

میری دوسری تنبیہ عمال حکومت کے اس طبقے کے لیے ہے جو اس شک میں مبتلا ہیں کہ گلڈ سیاسی سطح پر "میمینٹ" یا "یہاریت" کا آلہ کار بن جائے گا۔ یقیناً ہم ایک سیاسی جماعت نہیں ہیں اور گلڈ صرف ہماری لاشوں پر ہی سیاسی عمل اختیار کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی یہ بتائے کہ کیا یہ گناہ ہے کہ کوئی دائیں طریقے سے بائیں یا بائیں طریقے سے دائیں بازو میں شامل ہو۔ تخلیقی قوتوں کو مضطرب رہنا ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کسی نہ کسی چیز سے غیر مطمئن رہیں کیونکہ انہیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔

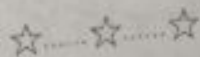
جب تک یہ دانشورانہ بے اطمینانی اندرونی یا بیرونی اشارے پر تخریبی صورت اختیار نہ کر لے ادب میں نہ یقین کوئی چیز ہے نہ یہاریت۔ ادب کی سمت صرف ایک ہے اور وہ سمت سیدھی ہی ہے۔ دانشورانہ یقینیت یا یہاریت پر پابندی لگانے کی ہر کوشش صرف ایک نتیجہ پیدا کر سکتی ہے جو یہ ہوتا ہے کہ ادبی یقینیت یا یہاریت سیاسی یقینیت یا یہاریت میں بدل جاتی ہے۔ ان میں سے شاید کوئی شیریں اور کوئی تلخ لگے مگر دونوں انسانی زندگی کے توازن کے لیے زہر ہیں۔

میری تیسری تنبیہ ملک کے دولت مندوں کے لیے ہے۔ وہ بہت سے ہیں اور اس کے جسم اور روحیں سونے کے بوجھ سے پھٹی جاتی ہیں۔ ادھر ہم طبقہ دانشوراں کی بہبود کا ایک انوکھا منصوبہ لے کر چلے ہیں اور چونکہ ہمارے ادارے کے دستور میں غیر ملکی امداد منع ہے اس لیے ہمیں ملکی ذرائع پر ہی بھروسہ کرنا ہے۔ ہمارے دولت مندوں نے رفاد مار کے لیے بہت سے کام کیے ہیں اب یہ ایک اور میدان عمل ان کے سامنے حاضر ہے۔

میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے فرانسیسی خوشبویات کی بیس ہزار بوتلوں میں ایک ایسی لڑکی کو غسل کر لیا تھا جس کے لیے اس کے دل میں محبت نہیں تھی بلکہ صرف ہوس تھی میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس نے اس کی نصف رقم گلڈ پر خرچ کی ہوتی تو پورا ملک شعرونثر کی خوشبوؤں سے اور بھی مہک اٹھتا۔

خواتین و حضرات! آئیے ہم دعا کریں کہ گلڈ کی دوسری سالگرہ پر حالات اتنے بہتر ہوں کہ گلڈ کے نئے سیکرٹری جنرل کو یہ تنبیہات نہ دہرائی پڑیں کہ یہ کوئی خوشگوار فرض نہیں ہے۔

(ترجمہ) ماہنامہ "ہم قلم" کراچی سالگرہ نمبر 1961ء



گلڈ کے تین سال

جناب صدر!

تین سال پہلے جب آپ نے پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن کو اپنی شرکت سے نوازا تھا اس وقت نہ ہم اپنے اور نہ ہی آپ کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہہ سکتے تھے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ادیبوں کا یہ طبقہ جس میں ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتا ہے، کس حد تک ایک ایسی تنظیم کو چلا سکے گا جس کی بنیاد افہام و تفہیم، خیر سگالی، رواداری اور اپنی مدد آپ کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے، ہم آپ کو ایک قابل قدر اور لائق فوجی لیڈر کی حیثیت ہی سے جانتے تھے لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا کہ ایک فوجی رہنما کی حیثیت سے آپ کتنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ حال ہی میں دوسرے کئی ملکوں میں بھی فوجی کمانڈروں نے حکومتیں سنبھالی ہیں لیکن دوسروں کی یہ مثالیں زیادہ حوصلہ افزا نہ تھیں چنانچہ بہت سے لوگوں اور خاص کر ادیبوں کے ذہنوں میں ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوا تھا۔

بہت سارے ادیب ایسے بھی ہیں جو سال بھر نظم یا نثر کی ایک سطر تک نہ لکھنے کے باوجود اس احساس کے لیے بے چین رہتے ہیں کہ انہیں جب چاہے جو جی میں آئے لکھنے کی آزادی حاصل رہے۔ شکوک و شبہات اور تشویش کی اس فضا میں امید کی پہلی کرن اس وقت نمودار ہوئی جب آپ نے اپنی ناسازی مزاج کے باوجود ہمارے کنونشن میں شرکت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ آپ کے ذاتی معالج اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور انہوں نے انتہائی سخت الفاظ میں مجھ پر آپ کی زندگی سے کھیلنے کا الزام لگایا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب کہ میں آپ کے سٹاف کے رکن کی حیثیت سے ایک بار اور صرف ایک بار اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام رہا اور میں نے گلڈ کے اس کنونشن میں آپ کی شرکت کو روکنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس طرح آپ نے طبیعت ناساز ہونے کے باوجود کنونشن میں شرکت کی تھی۔ آپ نے عام حاضرین کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی۔ ہمارے بزرگ ادیب ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کنونشن کی صدارت کر رہے تھے آپ نے ہماری باتیں بڑے تحمل سے سنی تھیں پھر اچانک سٹیج پر آ کر آپ نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا تھا اور ایک مذہب، ایک باکمال مقرر اور نظریاتی دیانتداری، دوراندیشی اور غیر معمولی بصیرت رکھنے والے انسان کے روپ میں آپ نے ہم سے دل کھول کر باتیں کی تھیں۔ آپ کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی ہمیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم نے صدر مملکت، سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی اس شخصیت میں ایک سچا دوست پالیا ہے۔

مگر جناب والا! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یہیں سے ہمارے لیے چند مصیبتوں کی ابتداء بھی ہوئی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں شبہ ہوا کہ انقلابی حکومت کے اشارے پر گلڈ کو معرض وجود میں لایا گیا ہے تاکہ فکر و فن کی صلاحیتوں پر پھر سے

بٹھا دیے جائیں اور پوشیدہ اغراض کو پورا کیا جائے چند اور لوگ ایسے تھے جن کے خیال میں تمام ادیبوں اور دانشوروں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا اور مارشل لاء حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سراسر احمقانہ حرکت تھی۔ یہی نہیں بعض سرکاری حلقوں نے بھی ہمیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ وہ سرکاری افسروں کے لکیر کے فقیر ہیں جو کو پسند کرتے ہیں اور اگر اس جہود کو توڑنے کی کوشش کی جائے تو نہ صرف اس کوشش کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ اس کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ رنگ برنگ کے سطید، بہن، سرخ، گلابی، بھورے، پیلے، کالے اور مختلف زبانوں کے ادیب پہلی مرتبہ ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے ہیں تو ان افسروں کو سخت تشویش ہوئی اور وہ خوفزدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج نے نوکر شاہی کو جس قسم کی تربیت دی ہے اس کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ ہر نئی چیز کو مشکوک سمجھا جائے۔ میں خود سرکاری افسروں کی اس برادری کا ایک رکن ہوں اور میں یہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ادیب اس وجہ سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گلڈ کے دامن میں غلامان پران چند ادیبوں کو پناہ دی گئی ہے جن کے نام بامیں بازو والوں کی مستند فہرست میں شامل ہیں اس انداز سے سوچنے والے بڑی آسانی سے یہ بھول گئے تھے کہ گلڈ کے ایسے گیارہ سوار بھی ارکان ہیں جن کے نام کبھی بھی کسی پولیس رجمنٹ میں درج نہیں ہوئے۔ میں آج یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ گلڈ کا کوئی دایاں یا بایاں راستہ نہیں اس تنظیم کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے سیدھا سادہ راستہ۔

جناب صدر! ہمارے ملک میں غلط یا صحیح طور پر لیفٹ ازم کی اصطلاح کے کئی معنی لیے جاتے ہیں عام طور سے اس اصطلاح کو دانستہ یا نادانستہ طور پر ان لوگوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے جو سیاسی، علاقائی یا ایسی ہی دوسری وجوہ پر کسی فرد یا فریق کے مفاد کے مطابق نہیں سمجھے جاتے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ تخلیقی صلاحیتوں کو فطری طور پر مضطرب رہنا ہی پڑتا ہے اور اضطراب کی کیفیت ان کے لیے لازمی امر ہے۔ انہیں کسی مقررہ راہ کا پابند نہیں کیا جاسکتا اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں خوب تر نصب العین کی جستجو میں سرگرداں رہنا چاہتی ہیں۔ لہذا بہترین مقررہ وقت یا موقع بھی کسی حقیقی تخلیقی ذہن کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے کافی نہیں۔ یہی اضطراب، بے چینی اور خوب تر کی تلاش زندگی کو رواں دواں رکھتی اور اسے ساکت و جامد کی بجائے متحرک بناتی ہے اگر اسی کا نام لیفٹ ازم ہے تو پھر ایک خوبی کے طور پر اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے اور قومی تعمیر نو کے کام کی طرح اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ لیفٹ ازم ایک گناہ اور جرم کی صورت صرف اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ بیرون ملک کہیں سے رہنمائی حاصل کرتا اور اندرون ملک گڑبڑ پیدا کرتا ہو اور ایسی صورت میں آپ کے پاس بے شمار قوانین موجود ہیں جنہیں آپ کسی رورعایت کے بغیر ذرا سختی سے بھی استعمال کریں تو ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

گلڈ کے قیام کے بعد ہماری تیسری بڑی مشکل مالی دشواری تھی اور یہ دشواری فنڈ کی کمی کے سبب نہیں بلکہ کئی گوشوں سے متعدد پیشکشوں کو قبول کرنے سے احتراز کے باعث پیدا ہوئی۔ ہمارے ذہنوں پر پیسہ سوار نہیں، تعلیمی اخراجات کے لیے جو کچھ درکار ہوتا ہے وہ ہمیں آپ کی حکومت سے امداد کی صورت میں مل جاتا ہے جس کے لیے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ جب گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو بین الاقوامی سیاست کی منڈی کے بہت سے تاجروں نے یہ سمجھا کہ بازار میں ایک ایسی اور جنس بھی آگئی ہے جسے خریدا جاسکتا ہے چنانچہ ہمیں کئی عام اور کئی خاص بیرونی حلقوں سے خفیہ اور علی الاعلان امداد کی متعدد پیشکشیں موصول ہوئیں ہم نے بڑی شائستگی کے ساتھ انہیں مسترد کر دیا کیونکہ گلڈ کا

آئین کسی غیر ملکی حکومت یا تنظیم سے مالی امداد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

کس قدر حیرانی کی بات ہے کہ اپنے ملکی وسائل پر ہی زندہ رہنے کی ہماری اس خواہش نے ان تمام بیرونی حلقوں کو سخت ناراض و برہم کر دیا۔ ہمارے پاس یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ ہم میں سے مایوس ہو جانے والے ان غیر ملکیوں نے چند ناقابل ذکر افراد، تنظیموں اور ملک کے کم از کم دو اخباروں کو گلڈ کے خلاف مہم چلانے کے لیے مالی امداد دی ہے۔ اس اندرونی و بیرونی دباؤ کا ہم نے صرف ایک جواب دیا ہے اور وہ ہے ہمارا کام۔ ہم کسی بڑے کارنامے کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ذہنی اور نفسیاتی سطح پر ایک مؤثر قومی یکجہتی اور اتحاد کی کم از کم بنیادیں تو ڈال دی ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ زبان اور لباس کے فرق کے باوجود ہم متحد رہ سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ جوادیوں کے مقابلے میں کم حساس ہیں اور کم انفرادیت پسند ہیں اگر متحد نہیں رہ سکتے تو اس کی وجہ ان کی خود غرضی ہے۔ ہمارے وطن عزیز میں پہلی مرتبہ ادیب کو اپنے نظریات کی بھینٹ چڑھائے بغیر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور اس کے عوض اس سے کچھ طلب نہیں کیا گیا، طرح طرح کے دباؤ اور رکاوٹوں کے باوجود اسے اس سطح پر لانے میں سب سے زیادہ مدد ایک اور صرف ایک شخص نے دی ہے اور صدر مملکت! وہ آپ کی ذات گرامی ہے جس کے لیے ہم اپنی غلوں کے ساتھ آپ کے شکر گزار ہیں۔

صدر محترم!

آخر میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ امید رکھتے ہیں کہ ایک دن آپ کو رائٹر گلڈ کا رکن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے فی الحال تو آپ تاریخ بنانے میں مصروف ہیں اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ ایک دن آپ تاریخ لکھ بھی ڈالیں گے۔ جب آپ لکھ لیں تو گلڈ پبلشنگ ہاؤس اسے شائع کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ ہمارے معاوضے کی شرائط کافی دلکش ہیں۔ مصنفوں کو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ رائلٹی دیتے ہیں۔ ہماری طباعت کا معیار بھی بہت بلند ہے اور ہماری مطبوعات کی قیمت بہت کم ہے۔

جناب صدر! ہمیں امید ہے کہ جب آپ کی کتاب تیار ہو جائے گی تو ہم سے رجوع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

پاکستان رائٹر گلڈ کے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے یہ تقریر گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر 31 جنوری 1962 کو ڈھاکہ میں کی تھی۔ اس اجلاس میں فیلمہ مارشل محمد امجد خاں بھی موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

سالانہ خطبہ

چار سال قبل اسی دن اور تقریباً اسی وقت پاکستان رائٹرز کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہمیں اس وقت اس بات کا ہلکا سا احساس بھی نہ تھا کہ ہم کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔
1959ء میں آج کے دن جب ہمارا پہلا انتخاب ہو رہا تھا تو ادیبوں نے حد درجے کی صوبائیت اور شدید علاقائی

گروہ بندی اور جانبداری کا ثبوت دیا تھا۔
ایک سال بعد ہمارے دوسرے انتخاب کے موقع پر یہ تعصب، علاقائی وفاداریوں سے ہٹ کر لسانی ہو گیا۔
لیکن اب تیسرے انتخاب کے وقت یہ صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔ اب ایک شاعر دوسرے شاعر سے، ایک ناول نویس دوسرے ناول نویس سے اور ایک قنوطی دوسرے قنوطی سے ساز باز کر رہا ہے اور اس میں وہ اپنے علاقے اور تحریر کی زبان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس طرح ایک چھوٹے پیمانے پر یہی سبھی، گلڈ نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کی علاقائی خصوصیات کو اتحاد کی قوس قزح میں پرویا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ اپنی جگہ اپنے اصولوں کے درمیان باہمی تعاون بھی برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک حقیر سی خدمات ہے جو ہم نے پاکستان کی عوامی زندگی کے تصور کے لیے پیش کی ہے۔

دوسری خدمت ہم نے یہ انجام دی ہے کہ ہم نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ذہنی، جذباتی اور شاید قلبی تعلق قائم کر لیا ہے۔ یہ ایک ایسا کھلا راستہ ہے جس پر خیر سگالی اور دوستی کی آمد و رفت ہر موسم میں برابر جاری رہتی ہے اور اس راستے پر کسی قسم کے سیاسی اور معاشی اور دیگر امتیازات کی تخصیص نہیں ہے۔
آج جب سندھ کا 80 سالہ شاعر مولائے گدائی لاڑکانہ کے ایک دور دراز گوشے میں بیمار پڑتا ہے تو شائقِ فکر ڈھاکہ سے کوئی غلام مصطفیٰ کی مدد کا مطالبہ کرتا ہے اور تار پر تار بھیجتا ہے۔

آج جب جیسیم الدین کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو حفیظ جالندھری یا لاہور یا پشاور میں کوئی اور شاعر اس کے لیے بیرونی ممالک میں علاج کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔

آج جب اردو شاعر ڈھاکہ جاتے ہیں تو منیر چوہدری ہے جو وہاں ان کے لیے مشاعرہ کا انتظام کراتا ہے۔ مین اس جگہ پر جہاں اب سے چند سال قبل ایک اردو مشاعرہ اینٹوں اور پتھروں کی بارش میں منتشر ہو جاتا ہے۔ منیر چوہدری، جس نے آج ہمارے پہلے جلسے کی صدارت کی، ہنگامہ خیز ایک کالیڈر تھا اور کچھ برس جیل میں رہا تھا۔

ہماری تیسری خدمت یہ ہے کہ ہمارے گیارہ سوارکان میں سے کوئی بھی جب جی چاہے بیمار ہو سکتا ہے یا مر سکتا ہے۔ دیوانگی یا خودکشی تک سے، اور اس مکمل یقین و ہانی کے ساتھ کہ ایک قدر شناس معاشرت میں اس کی پوری قدر

201
 کی جائے گی۔ وہ معاشرہ جو زندہ افراد پر غرانا اور مردوں کی عزت کرتا ہے۔ شہاب مگر

اپنی قسم کے قوانین میں سب سے زیادہ ترقی پسندانہ ہے۔ اس شاندار دستوری کام کا سہرا جمیل الدین عالی کے سر ہے جنہوں نے اپنے روایتی جوش و خروش کے ساتھ اس مسودے کو تصنیف کیا اور کئی بین الاقوامی ماہرین سے اس سلسلے میں تعاون حاصل کیا۔ اس کے بعد اس کو دفتر شاہی کی قباحتوں سے نکال کر کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ہمیں امید ہے کہ اس سال فروری تک کاپی رائٹ ایکٹ پر عمل کرنے کے لیے کئی ادارے اور ریفرنل پورے ملک میں کام شروع کر دیں گے۔ ہمارا پانچواں کارنامہ گلڈ کے مطالبے پر ایک قومی مرکز کتب کو قائم کرنا ہے۔ اس کا مقصد ملک کے دونوں حصوں میں طباعت کتب کے فن اور اشاعت کو ترقی دینا ہے۔ گلڈ کے ایک رکن ابن انشاء نے جو گلڈ کے ایک سخت خازن ہونے میں مشہور ہیں۔ یہ کام سنبھال رکھا ہے۔

کاپی رائٹ قانون کے نفاذ اور قومی مرکز کتب کے قیام کے لیے ہم صدر محمد ایوب خاں کے لیے احساس تشکر رکھتے ہیں۔ جو پورے ملک میں واحد ہستی ہے جو ہمیں سب کچھ دیتی ہے اور اس کے بدلے میں ہم سے کچھ نہیں چاہتی ہے۔

گلڈ کا اس سال کا یہ آخری کارنامہ کیا کم ہے کہ قومی اسمبلی کو ہم نے پانچ ارکان دیے ہیں۔ ہمارا ایک رکن سرکاری حزب موافق کا چیف وہپ ہے اور باقی چار حزب اختلاف کی سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زندگی ہمارے لیے پھولوں کا بستر ہے جو صرف کامیابیوں سے سجا ہوا ہے بلکہ ہماری ناکامیوں اور الجھنوں کی فہرست اس سے زیادہ طویل ہے۔ میں یہاں صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ پہلی الجھن یہ ہے کہ ہم ابھی تک سب کو یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ رائٹرز گلڈ صرف ادیبوں کا ایک فلاحی ادارہ ہے اس سے زیادہ نہ اس سے کم، گلڈ کے باہر ایک طرف ایسے بھی لوگ ہیں جو اس بات کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ گلڈ حکومت کی طرف سے حکومت کے لیے کام کر رہا ہے اور حکومت کا ادارہ ہے۔ دوسری طرف ایسے بھی عناصر ہیں جو ہم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ گلڈ پورے ملک کا واحد ادارہ ہے جو ہر ملک خیال کے اراکین کو سمیٹے ہوئے ہے اور اس کے باوجود ایک تعمیری اور مثبت پروگرام رکھتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے متضاد لوگ منفی منصوبوں کے لیے متحد ہو سکتے ہیں، لیکن متضاد گروہوں میں تعمیری اتحاد ہمارے ملک میں ایک نئی بات ہے۔ ہر نئی بات پھونکاتی ہے شہات پیدا کرتی ہے، یہاں تک کہ مخالفت بھی پیدا کرتی ہے، اگر ہم کو کچھ لوگ اس وجہ سے غلط سمجھتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، لیکن پھر بھی ہمارا یہ حق ہے کہ ہمیں صحیح سمجھا جائے۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا۔

اب تک ہم کو جتنا اعتماد اور خیر سگالی حاصل ہوئی ہے وہ پہلے تو ہمارے اپنے کام کی وجہ سے ہے دوسری وجہ قومی اخبارات کا تعاون اور خوش اخلاقی ہے خاص طور پر عامل صحافیوں کی عنایت..... یوں تو صحافیوں اور ادیبوں میں پیشہ ورانہ چپقلش ہوتی ہے، کیونکہ یہ طے نہیں ہو سکتا کہ آیا خبریں اور نظریات کی اشاعت زیادہ نیک کام ہے یا خبریں بنانا۔ یہ ایک دائمی مسئلہ ہے لیکن گزشتہ چار سال سے ہم باہمی تعاون کی ایک خوشگوار صورتحال سے گزر رہے ہیں اور اس کا سہرا قومی صحافت کے سر ہے، ہم ان کے دل سے شکر گزار ہیں۔

ہماری دوسری اور اصل ناکامی اور الجھن کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں چھاپے خانے لگانے کا مسئلہ ہے۔ یہ

ایک گراں قدر منصوبہ ہے اور کسی بھی دوسرے ملک سے تھوڑا سا قرض اس کو پورا کر سکتا ہے۔ ہم نے ان ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، لیکن ہمارے ساتھ وہی معاملہ ہے، جو ایک زمانہ میں متحدہ عرب جمہوریہ میں اسوان ڈیم اور آج کل پاکستان میں تربیلا ڈیم کی تعمیر میں درپیش آیا ہے۔ یوں ہم کو ایسی پیشکش بھی ملی ہے جس میں ضرورت کی تمام مشینری تقریباً مفت دینے کو کہا گیا ہے مگر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ ہم غیر ملکی عطیات و امدادوں کو قبول نہیں کرتے۔ اب ہم آخر کار اپنے داخلی ذرائع پر غور کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ کہاں تک اپنے منصوبوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

صدر پاکستان، گلڈ سے اپنی خصوصی محبت کے ساتھ ذاتی طور پر ہمارے خواب کی تکمیل کے لیے مدد کر رہے ہیں، جس طرح وہ کہتے ہیں کہ تربیلا ڈیم لازمی ہے، اسی طرح ہم بھی اس اعتماد سے کہتے ہیں کہ ہمارا اچھا پیہ خانہ بھی قائم ہوگا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

آخر میں، ہمیں اپنے ساتھی ادیبوں سے چند باتیں کہوں گا۔ ہم میں سے بہت سے ساتھی گلڈ کی تنظیمی الجھنوں میں اس قدر گھر گئے ہیں کہ ہم لکھنے لکھانے کے اصلی فرض سے ذرا دور ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے گلڈ قائم ہو چکا ہے، اب ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ براہ مہربانی اب آپ جو چاہتے ہیں اور جو سوچتے ہیں وہ لکھیے۔ لیکن خدا ارالکھیے ضرور..... شکریہ!

31 جنوری 63ء کو گلڈ کے چوتھے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔

☆.....☆.....☆

تن کی مکڑی من کے جا لے

یہ شام منانے والی حرکت میرے ساتھ پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکی ہے۔ جو نہیں مجھے خبر ملی کہ یہ ابتلاء آپ حضرات پر بھی نازل ہونے کو ہے، تو مجھے آپ سب پر بڑا ترس آیا۔

کسی بندہ خاکی کو سامنے اسٹیج پر بٹھا کر اس کے حق میں پے درپے توصیفی کلمات سننا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مقالہ نگار تو خیر اپنی شوخی تحریر اور حسن بیان کی رو میں گفتنی و ناگفتنی سب باتیں بڑے آرام سے کہہ جاتے ہیں اور صاحب شام بھی دل ہی دل میں ہل من مزید کا ورد کرتا ان کا ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرہ بڑے ذوق و شوق سے سنتا اور مردھنٹا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کرتا ہے کہ اس کے چہرے پر خاکساری کی ہوائیاں اڑیں، یا اسکی پیشانی پر عجز و انکساری کے پسینے چھوئیں لیکن خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ اندر ہی اندر اس کے سینے میں فخر و انہساط کی کلیاں ہی کلیاں چٹکتی ہیں اور اس کے پیٹ میں خوشی کے لڈو ہی لڈو پھوٹتے ہیں۔ انسان کا خیر تو معمولی سی جائزی تعریف سن کر پھول کر ٹپتا ہو جاتا ہے لیکن اگر اس تعریف میں حقیقت بہت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہو تو پھر اس کی لذت کے کیا کہنے۔

پہلے زمانے میں جو دال جوتیوں میں بنا کرتی تھی، اب وہ بڑی خیر سگالی کے ساتھ تنقیدی مقالوں کے پیالوں میں تقسیم ہوتی ہے لیکن اس عمل میں اگر کسی کا دلایا ہو جاتا ہے تو وہ بیچارے سامعین کرام ہیں پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں میں جو کچھ آپ حضرات پر گزری ہے، اس کا مجھے پورا پورا اندازہ ہے کیونکہ میں بھی کئی بار مروت کے ڈوروں اور خوش اخلاقی کی زنجیروں میں بندھا بندھا یا شام منانے والی محفلوں میں شریک ہوا ہوں اور آپ کی طرح ایک ہی کروٹ بیٹھ کر اپنے منہ پر دوسروں کی تعریفیں سن چکا ہوں۔ جب مقالہ نگار حضرات کا غز پر اپنا نہیں، بلکہ صاحب شام کا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں اور سامعین کرام اس کے دل، گردے اور پیچھے پڑے اور سری پائے تول تال کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مال تازہ نہیں باسی ہے اور وزن پورا نہیں بلکہ قصاب نے ڈنڈی مار رکھی ہے تو محفل پر بکرا پیڑھی کا ساما حول چھا جاتا ہے۔ سامعین تو ادیب کی پسلیاں گن کر یا اس کی ران ٹول کر یا اس کی گردن ناپ کر فقط چائے پی کر اور پیٹری کھا کر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ لیکن بیچارہ ادیب اپنے چہرے پر کسر نفسی کا غازہ ملے دل ہی دل میں پکار پکار کر التجا کرتا رہ جاتا ہے۔

صاحبو! ابھی سے تم کہاں چلے؟ ابھی تم نے بھلا دیکھا ہی کیا ہے؟ ذرا ٹھہرو تو سہی۔ میں ابھی تمہیں اپنے اندر سے بارہ من کی دھو بن اور پنجوں کا بادشاہ اور پھر سے اڑ جانے والے کبوتر نکال کر دکھاتا ہوں۔

لیکن چائے کے بعد کوئی بھی مائی کا لال ادیب کے بھڑے میں نہیں آتا اور سامعین کرام خوش کھامی سے ادیب کو گالیاں دیتے اور خیر سگالی سے ادب کا منہ چڑاتے ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔

اند اور شوت ستانی کی طرح اس بے ذوقی اور بے حسی کی روک تھام کا بھی بس ایک ہی علاج ہے۔ وہ یہ کہ کام تمام ہونے سے پہلے ہی پورے پورے دام کھرے کر لیے جائیں۔ چنانچہ جب یہ شام منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تو میں نے بھی یہ جہت کر لیا کہ آپ ہزار رے تڑا کر بھاگنے کی کوشش کریں، میں یہ جلسہ برخاست ہونے سے پہلے اپنے اندر چھپی ہوئی وہ بارہ من کی دھو بن ضرور دکھاؤں گا، جسے کسی کی دور بین نگاہ بھی تک نہیں پاسکی۔ وہ جنوں کا بادشاہ تخت پر بیٹھاؤں گا جو کبھی کسی سلطنت کو نصیب نہیں ہوا۔ وہ پریوں کی شہزادی بلاؤں گا جو کبھی کسی کے خواب میں بھی نہیں آئی اور اپنے اندر سے ایسے ایسے کبوتر نکال کر پھر سے اڑاؤں گا جو کبھی کسی اور کے لیے نامہ بر نہیں بنے۔

چنانچہ اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر غور سے جھانکا، یہ میری پرانی عادت ہے لیکن گریبان اب تک دوسروں کے ہوا کرتے تھے۔ اب جو اپنے اندر تاک جھانک کی تو دل دھک سے رہ گیا کیونکہ وہاں نہ کوئی کوہ قاف تھا، نہ کوئی پریاں۔ نہ طلسمی باغ تھے نہ جادوگر شہزادے۔ وہاں پر اگر کچھ تھا تو بس ایک تن کی مکڑی جو شب و روز من کے جالے بیٹھی بنا کرتی ہے۔

میں نے اپنے ان تہہ در تہہ جالوں کا خاصا عمیق جائزہ لیا ہے، ایک ایسا جالا دیکھا جو مصنوعی سلک یارن کی طرح رنگ برنگے تاروں سے بنا ہوا تھا۔ غالباً برس ہا برس سے یہ جالا اُمید کی لو لگائے بیٹھا تھا کہ نہ جانے اس میں کس وقت کوئی چھیل چھیلی مکھی آن پھنسے۔ یا کوئی قوس قزح کے پروں والی تتلی لمحہ دو لمحہ کے لیے اٹک کر اپنا رنگ و نور پھیلا جائے، لیکن جب اسے چھان پھٹک کر دیکھا تو اس جالے میں ایک طرف تو غریب مکڑی خود اُلٹی مٹی ہوئی نظر آئی اور دوسری طرف لے دے کے ایک بے چارہ ممتاز مفتی لٹکا ہوا دیکھا، چنانچہ اسی کی پاداش میں آج آپ کو مفتی کا وہ مقالہ سننا پڑا، جس میں نام میرا ہے، بیان مفتی کا ہے، لیکن داستان نہ جانے کس کی ہے۔ شاید کہانی بھی اس مکڑی کی ہے، جو ممتاز مفتی کے وجود کے اندر چھپی بیٹھی ہے اور اس کے لاشعور کو خیالی جالوں کے تار و پود میں جکڑے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ اور جالے ہیں جنہیں میرے تن کی مکڑی ساری ساری رات بڑی تندہی سے بیتی رہتی ہے اور صبح ہوتے ہی صفائی کے داروغے ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں فیناگل کی پچکاری لیے انہیں دم بھر میں ملایا میٹ کر دیتے ہیں۔

اُن صفائی کے داروغوں میں سب سے بڑا درجہ میرے دفتر کے فزاش کا ہے۔ وہ صبح شام بڑی جاں فشانی سے میرے کاغذ، پنسل، قلم و دوات کو چکا دمکا کر انہیں دل و دماغ کی ہر آلائش سے پاک صاف کر دیتا ہے اور پھر انہیں فاکول کے انبار میں یوں چھپا دیتا ہے جیسے عقل و حکمت کے دعویٰ دار گنجے کے ناخن تراش دیا کرتے ہیں۔

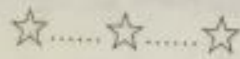
حفظانِ صحت کی اس مہم میں دوسرا مقام گھر والی کو حاصل ہے، وہ جس سلیقے سے میری جیب کی صفائی کرتی ہے، اسی ہنرمندی کے ساتھ خفیہ جالوں کے اس جھاڑو جھنکار کو بھی صاف کرتی رہتی ہے، جو میرے تن کی مکڑی زندگی کے چھوٹے چھوٹے چور دروازوں پر اس لیے بیتی رہتی ہے کہ کسی کو یہ شک نہ گزرے کہ اندر بلیک کا مال چھپا رکھا ہے۔

اسی طرح دوست احباب، عزیز و اقارب، افسر و ماتحت، امیر و فقیر، رند و صوفی بھی سب حسبِ توفیق وقتاً فوقتاً

میونپل کمیٹیوں کی طرح میرے باطن کا ہفتہ صفائی منانے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ فلاح و بہبود کے اس کاروبار میں عجیب عجیب نادر جالے فانوس خیال سے اتر کر روڈی کی ٹوکری میں جا پڑتے ہیں۔ ان میں ریاست کے جالے بھی ہوتے ہیں اور ریاست کے بھی۔ افسروں کے جالے بھی ہوتے ہیں اور دفاتروں کے بھی۔ وزیروں کے جالے بھی ہوتے ہیں اور سفیروں کے بھی۔

جس طرح ہفتہ صفائی کے دنوں میں صفائی کم اور رگڑائی زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح میرے تن بدن اور دل و دماغ کی تطہیر کے عمل میں بھی جالے تو ضرور اتر جاتے ہیں، لیکن کثافت بھوں کی ٹوں اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ یہ اسی خودکشی کا صدقہ ہے کہ جب کوئی ادبی انجمن جھوٹے منہ بھی مجھے مدعو کرتی ہے کہ آئیل تجھے ماریں، تو میں بلا کسی جیل و جت کے فوراً اپنی ڈفلی اور اپنا راگ سنانے حاضر ہو جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح اس گناہگار پر اس خودنمایی اور خودستائی کا عذاب ہوگا، اسی طرح ان کٹھن لمحات کو صبر و شکر سے برداشت کرنے پر آپ کو بھی تزکیہ نفس کا ثواب ضرور ملے گا۔

”اردو بیچ“ پنڈی، شمارہ 6، 5



آزادی کے ثمرات

(رٹڈ یو تقریر)

ہر سال 14 اگست کی صبح جب آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنیں ان نعمتوں کا نور بکھیرتی ہیں جو ہمیں آزادی..... اور صرف آزادی..... کی بدولت نصیب ہوئیں۔ اس روز اگر ہم صبح سے شام تک اپنی نعمتوں کا شمار کرنے لگیں، تو بے شک ہماری زبان پر بے اختیار یہی جملہ بار بار آئے گا، کہ اے عزیزان وطن! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

1947ء میں ہمیں آزادی کے وہ اولین ایام یاد ہیں جب چاروں طرف لٹے پٹے، تھکے ماندے، زخمی اور نڈھال مہاجرین کے قافلے قطار در قطار پاکستان کی سرحدوں کی طرف ریگ ریگ کر سکتے بسکتے بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ان کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ کسی کا مال و متاع۔ کسی کی عزت و ناموس۔ کسی کے ماں باپ۔ کسی کے بہن بھائی۔ کسی کی بہو اور بیٹیاں۔ لیکن یہ سب کچھ کھو کر بھی وہ صرف اس امید پر زندہ تھے کہ سرحد عبور کرنے کے بعد وہ آزاد فضا میں سانس لیں گے۔ آزاد وطن میں جنیں گے اور آزاد سرزمین میں دفن ہوں گے۔ باہر سے آنے والے مہاجرین اور مقامی انصار کے تعاون، محنت اور کوشش سے جس قوم کی تعمیر ہوئی اس کی عمر آج فقط 37 برس ہے، جو آج کل کے زمانے میں ایک فرد کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ بنتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہ عرصہ پلک جھپکنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس قلیل عرصے میں بلاشبہ ہماری ناکامیوں، محرومیوں اور بدتمیزیوں کی فہرست بھی طویل اور دلخراش ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی خوش نصیبیوں کو فراموش یا نظر انداز کرنا بھی کفرانِ نعمت کے مترادف ہوگا۔

ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہماری نئی نسل پیدائشی طور پر پاکستانی ہے اور جلی طور پر جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہے۔ ان کے دل اور دماغ پاکستان سے الگ کسی اور سرزمین، کسی اور وطن، کسی اور شہر، گاؤں، گلی کو چھ یا ملے کی یادوں سے آلودہ نہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت وہ زیادہ بہتر، زیادہ پکے اور زیادہ سچے پاکستانی ہیں۔ ان کا وجود ہمارے حال اور مستقبل کی حفاظت کا ضامن ہے۔

ہماری دوسری خوش نصیبی یہ ہے کہ دنیاوی اور مادی سطح پر ہمارا ہر قدم ترقی کی شاہراہ پر نہایت ثابت قدمی اور استحکام سے آگے کی جانب رواں دواں ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دنیا کے گوشے گوشے میں ہمارے لاتعداد ہم وطن ہر شعبے میں اپنی محنت، علم و ہنر اور مہارت کا لوہا منوار ہے ہیں۔ دنیا کی کوئی۔ انسی یا ٹیکنیکل ایجاد یا اختراع ایسی نہیں ہے سمجھنے والے، چلانے والے اور کسی حد تک بنانے والے ماہرین بھی دیکھتے ہی دیکھتے خود پاکستان کے اندر تیار نہ

ہو جائیں۔ ہمارے کارخانوں میں پاکستانی کارمگر وہی مشینیں چلاتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا کے دوسرے ممالک میں چلاتے ہیں۔ ہماری فضا میں ہمارے پاکسٹ، وہی جہاز اڑاتے ہیں جو دنیا بھر میں کہیں اور اڑائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہسپتالوں میں ہمارے اپنے ڈاکٹر، وہی علاج اور آپریشن کا میاں ہی سے کر رہے ہیں، جو دنیا کے دوسرے ہسپتالوں میں رائج ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں ہم باقی دنیا کے ساتھ قریباً قریباً ہم قدم نہ ہوں۔ بلاشبہ آبادی اور رقبے میں ہم پہلے ہیں، لیکن ہمارا نام اور ہماری ساکھ بڑی ہے یہاں تک کہ ہم سے کئی گنا بڑے اور مضبوط ممالک بھی پاکستان کو بد نظر رکھ کر اپنی بعض داخلی اور خارجی پالیسیوں میں رد و بدل کرنے پر اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے رہتے ہیں۔

ہر اس مقاصد کے لیے ایسی توانائی حاصل کرنے کے واسطے ہمارا ایک معمولی سا غریبانہ پروگرام ہے۔ ایسی تعمیر بنانے کے لیے ہمارے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ ہی ایسی کوشش یا خواہش ہے۔ لیکن آئے دن دنیا بھر کے دارالافتاؤں میں پاکستان کے حوالے سے ”اسلامی بم“ کا دھماکہ ہوتا رہتا ہے۔ گو یہ افواہ پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے اڑائی جاتی ہے لیکن بین الاقوامی نفسیات پر اس کی اہمیت، صلاحیت اور اہمیت کی غمازی کرتی ہے۔

پاکستان کا ایک خاص طرز امتیاز یہ ہے کہ ترقی کے باوجود ہمارا رشتہ اپنے نظریاتی، دینی اور روحانی مرکز سے کبھی متقطع یا کمزور نہیں ہوا۔ بیسویں صدی کی فیشن پرست اور جدیدیت نواز دنیا میں ہم چودہ سو برس پرانے قرآن و حدیث کی احاطت بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فخر و انبساط کے ساتھ کرتے ہیں۔ جدید ترین علوم و فنون کی روشنی کے اس زمانے میں ایک انہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غلامی بصد عجز و نیاز قبول کرنے پر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ ہم موجودہ دور کی دونوں سپر پاورز میں سے کسی کے ساتھ بھی ٹکڑ لینے کی خواہش یا سکت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود ہم نے تیس لاکھ سے اوپر افغان مہاجرین کو اپنی سر زمین پر پناہ دینے میں کسی حیل و نکت یا مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا اور مسئلہ فلسطین کے حق میں اپنا بھرپور ساتھ دینے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔

یہ سب ہماری آزادی کے ثمرات ہیں۔ جب تک ہم خلوص، سچائی اور ایمان داری سے ان ثمرات کا حق ادا کرتے رہیں گے، اس وقت تک ہماری آزادی پر انشاء اللہ کوئی آنچ نہیں آسکتی۔

14 اگست 1984ء

ادب لطیف کی پچاسویں سالگرہ پر خطاب

صدیقہ بیگم کا ذاتی خط اور ادب لطیف کی پچاسویں سالگرہ منانے کا دعوت نامہ مجھے پرسوں شام ایک ہی ڈاک سے موصول ہوئے۔ چھپے ہوئے دعوت نامے کے کارڈ پر مہمان خصوصی کے طور پر اپنا نام دیکھ کر بڑا حیران اور پریشان ہوا اور پیشانی پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے ابھر آئے۔ میرا بیٹا جو حال ہی میں ایم بی بی ایس کے امتحان سے فارغ ہوا ہے، پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے کر پڑھا اور مسکرایا۔ اس نو آموز ڈاکٹر نے یہی سمجھا کہ مجھے پڑا شادی مرگ کا دورہ پڑا ہے۔ وہ کسی قدر طنز یہ انداز سے بولا..... ”بات تو ضرور عزت افزائی کی ہے لیکن اتنا خوش بھی نہیں ہونا چاہیے کہ پریشانی کا رنگ چڑھ جائے۔“

اب میں اس طفل ہمہ دان کو کیسے سمجھاتا کہ اس نے اپنے پہلے مریض کی تشخیص ہی غلط کر ڈالی۔ کیونکہ میں وفور مسرت سے نہیں، بلکہ شرم و ندامت سے پانی پانی ہو رہا تھا اگر اسے کسی رسمی یا نمائشی کسر نفسی کا نام نہ دیا جائے تو میں صدق دل سے آپ کے سامنے اپنی ندامت کا اقرار کرتا ہوں۔ اس شہر بے مثال میں ایسے ایسے عزت والے، عظمت والے، قد آور ادیب اور دانشور موجود ہیں کہ ان کے سامنے مجھ جیسے جزوقتی نیم ادیب کو مہمان خصوصی بنا کر بٹھانا، میرے منہ پر جوتے مارنے کے مترادف ہے۔ اگر یہ تقریب ادب لطیف کی نہ ہوتی تو میں اپنی ضعیفی اور دوسرے کئی بہانوں کی آڑ لے کر معذرت کر لیتا لیکن دو وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ ایک یہ کہ یہ رسالہ چودھری برکت علی کی یادگار ہے، جن کا اردو ادب اور ادیبوں پر بے حد احسان ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کوئی 38 برس پیشتر میری ایک چھوٹی سی کتاب ”یا خدا“ پر کسی وجہ سے ناراض ہو کر اس عالی ظرف رسالے کے کرتے دھرتوں نے یہ فتویٰ لگا دیا کہ اس مرد نادان اور کف درودہ بن مسلمان کی کوئی تحریر اس رسالے میں شائع نہ ہوگی۔ اس فتوے پر میں نے بھی چین کی ہنسی بجا کی کہ چلو بیٹھے بٹھائے مُقتنمُفت لکھنے پڑھنے سے بھی جھٹی ہوئی۔ بھلا ہوا، میری منگی ٹوٹی میں پنیا بھرن سے چھوٹی۔ لیکن سونے پر سہاگہ یہ کہ سال بھر انہوں نے ادب لطیف میں بھگو بھگو کر میرے سرائے جوتے مارے کہ سر تو گنجانہ ہوا البتہ کھوپڑی پھلپی ہوگئی۔ آج کی اس تقریب کا بلا نوٹس حکم نامہ پا کر مجھے یہی خیال آیا کہ پہلے تو سر پر جوتے مارے تھے اب وہ منہ پر جوتے مارنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں، تو چلیے وہ یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ دوپٹاں دووتر گنیاں یاراں دیاں دُور بلائیاں۔ چنانچہ میں بلا چون و چراں سر کے بل یہاں حاضر ہو گیا ہوں۔ معلوم نہیں یہ میری ڈھٹائی ہے یا برداشت۔ البتہ مار پیٹ کے بعد زخموں پر ہنسی خوشی مرہم پنی کرنے کا یہ نایاب نسخہ میں نے ہم سب کے محترم فیض احمد فیض سے سیکھا ہے۔ خدا انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری بات تو یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اب شرافت کا تقاضا تو یہ ہے کہ

ہیں آپ حضرات کا شکر یہ ادا کر کے یہ تقریر ختم کر دوں لیکن اگر ایسا کروں تو مہمان خصوصی کے اعزاز کا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اس خصوصی کرمِ فرمائی کا نمک حلال کرنے کے لیے آپ کو میری چند ایک بے تکلیفی باتیں اور بھی سننے کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔

میرے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے، البتہ چند برس سے دو تین باتیں لگا تار سننے میں آرہی ہیں، ایک تو یہ کہ موجودہ دور میں غیر تخلیقی دلدل میں جھنس کر جمود کا شکار ہو گیا ہے، دوسرے یہ کہ نئی نسل کی تحریروں میں وہ چاشنی باہنچارہ نہیں ملتا جو پرانے ادب کا طرزِ امتیاز تھا۔ تیسرے یہ کہ کیا..... پاکستانی ادب واقعی کوئی حقیقت ہے یا محض تنگ دلی اور تعصب کا وسوسہ؟ ان سوالوں کا جواب تو نقاد ہی دے سکتے ہیں لیکن حسن اتفاق سے ہم عصری تنقید کا پیانا اکثر و بیشتر ذاتی ہوتا ہے۔ اصلی صفاتی پیانا تو فقط تاریخ کی بے رحم بھٹی سے گزر کر ہی ظہور میں آتا ہے۔ فی الحال ایک عام قاری کی حیثیت سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ چند محترم استثنات کو چھوڑ کر، نیا ادب پرانے ادب کے مقابلے میں زیادہ وزنی، زیادہ وسیع اور زیادہ گہرا ہے۔ نئے ادیب کے سامنے احساسات، تجربات، مشاہدات اور تحریکات کا ایک بے پایاں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آج ٹرانزسٹر ہے، ٹیلی ویژن ہے، وی سی آر ہے، سیٹلائٹ ہیں، جمبو جیٹ ہے، کنکارڈ ہے، SPACI ہے آؤٹریسپیس ہے، روایتی رسالے ہیں، غیر روایتی ڈائجسٹ ہیں، اخبارات کے اپنے اپنے ادبی صفحات اور ہفت روزہ ایڈیشن ہیں، چھوٹے بڑے شہروں میں ادبی محفلوں پر محفلیں جمتی ہیں..... تخلیق کی ان رنگا رنگ شاہراہوں اور پگڈنڈیوں پر ادب کے ٹریفک کا پہیہ کبھی جام نہیں ہوا بلکہ تخیل کے نئے نئے دھارے، سوچ کے نئے نئے زاویے، نم اور ٹھن، آس اور یاس کے نئے نئے تیور، اسلوب کے نئے پیرائے اور اظہار کی نت نئی ART FORMS جنم لے رہی ہیں۔ اگر ہم ان سے مانوس ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو ممکن ہے یہ ہماری اپنی ذہنی حد بندی اور ”ہچکچو مادِ دیگرے نیست“ سمجھنے کا نتیجہ ہو۔ اس کے باوجود اگر کوئی اس حال کو جمود کا نام دینے پر مُصر ہے تو میرے نزدیک یہ جمود قابلِ رشک ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ پچاس برس قبل جب لاؤڈ سپیکر عام ہوا تھا تو مسجدوں میں اس کے استعمال پر کفر تک کا ٹوٹی لگ جایا کرتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ مسجد تو بعد میں مکمل ہوتی ہے اور لاؤڈ سپیکر پہلے نصب ہو جاتا ہے اگر ہماری تفہیم اور تحقیر کا مارا ہوا کٹھنٹلا لاؤڈ سپیکر کو اپنانے میں اس قدر وسیع القلب ہو سکتا ہے تو ادب میں نئی نئی آرٹ فارمز پر ہنسنے لکھنے، حساس ادیب اور دانشور کیوں ناک بھوں چڑھاتے ہیں؟۔

جہاں تک پاکستانی ادب کا تعلق ہے، یہ بڑا سیدھا مسئلہ ہے اگرچہ ہم اپنی بد تدبیری سے پاکستان کے مشرقی نصف کا بوجھ سنبھالنے میں ناکام رہے، لیکن رشید امجد اور ان کے رفقاء کار کی ہمتِ مردانہ اور خوش تدبیری نے ”پاکستانی ادب“ کا انتخاب چھ جلدوں میں شائع کر کے پاکستانی ادب کے وجود کو اتنا وزن عطا کر دیا کہ ہچکچائے نہ چھپے اور اٹھائے نہ اٹھے۔ اگر یہ وزنی مجموعہ پاکستانی ادب کی شناخت کا مظہر نہیں بلکہ تنگ دلی اور تعصب کے مارے ہوئے الزہان کا سُراب ہے تو میں اس سُراب کو بھی نخلستان ہی سمجھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اگر ایک ہی کہانی مثلاً ہیرا پھانجی کی داستان ایک پاکستانی ادیب کراچی یا کوئٹہ یا ملتان یا لاہور یا پشاور میں بیٹھ کر لکھے اور اسی معیار کا ایک ہندو مسلمان ہندوستانی ادیب دہلی یا لکھنؤ یا پٹنہ یا کلکتہ یا بمبئی میں بیٹھ کر لکھے تو دونوں کی تخلیق پر الگ الگ چھاپ ہوگی یعنی ٹیلی ویژن کے ایک اشتہار کے الفاظ ”فرق صاف ظاہر ہے“ یہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ فطرتی عمل کا مظہر ہے۔

شہاب نگر

اسی حوالے سے مجھے یہ خیال سوچھا کہ ادب میں نفاذِ اسلام کا موضوع بھی وقتاً فوقتاً زیرِ بحث آتا رہتا ہے لیکن اس پر لبِ کشائی سے خوف آتا ہے۔ آج کل بات بات پر چوتھے مارشل لاء کی تلوارِ نیام سے سرِ نکال کر لشکارے مارنے پر غلی ہوئی ہے۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو حضرت موسیٰ کی تقلید میں ادب کے کوہِ طور پر کھڑا ہو کر ”لن ترانی“ کا نعرہ ضرور لگاتا، کہ ذرا سامنے تو آؤ ہم بھی رخِ زیبا دیکھیں۔ لیکن تین مارشل لاؤں سے گزر کر اب یہ سکت باقی نہیں رہی کہ پرل انٹرکونٹی نیشنل کے اس خوشگوار اور پُر بہار ہال سے اٹھ کر چوتھے مارشل لاء میں بجلی اور پانی کے بغیر مجھ جیل کی کسی کال کوٹھڑی میں داخل ہونے کا خطرہ مول لوں۔ چنانچہ اپنے اس اقبالِ جرم کی ایف آئی آر، لکھوا کر اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں کیونکہ اصلی تھانیدار تو آپ ہی ہیں۔

8 مئی 1986ء کو لاہور ”ادب لطیف“ کی پچاسویں سالگرہ پر مہمانِ خصوصی کا خطاب

☆.....☆.....☆

ٹیڈی یا ٹیڈی

اس کا نوو کیشن کا دعوت نامہ میرے لیے کچھ خوشی، کچھ تعجب اور چند مسائل لے کر آیا۔ خوشی اس بات پر ہوئی ایک نوہجرات، دوسرے کا نوو کیشن، تیسرے کا لُج اور وہ بھی زنانہ تعجب کی یہ وجہ ہوئی کہ اس کا نوو کیشن کی خبر پا کر میری اہلیہ نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ بھی میرے ساتھ ضرور تشریف لے جائیں گی۔ جلسہ ہائے تقسیم اسناد کے موقع پر مجھے ہر سال ایک دو کالجوں میں جانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ہر بار میں اپنی بیوی کی خوشامدیوں کیا کرتا ہوں کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں تاکہ اگر مجھے داد ملے تو اُن کا سر فخر سے اونچا ہوا اور اگر داد نہ ملے تو مجھے ان کی ہمدردی حاصل ہو۔ لیکن ہر بار وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتی تھیں۔ کبھی بچے کے لیے گرمی ہے کبھی سفر زیادہ طویل ہے کبھی یہ ہے کبھی وہ ہے۔ چنانچہ اس بار جب انہوں نے خود بخود میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا تو مجھے ایسا تعجب ہوا جسے بے کس اور بے بس شوہروں کی زبان میں منرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ پرنسپل صاحبہ سے پوچھ لوں کہ بیوی کو ساتھ لانے کی اجازت ہے یا نہیں لیکن اس میں یہ خطرہ تھا کہ ایسا سوال سن کر شاید مراد دعوت نامہ ہی منسوخ نہ کر دیں، چنانچہ اب صورتحال یہ ہے کہ نہ صرف میری بیوی سامنے بیٹھی ہیں بلکہ احتیاطاً وہ اپنے ساتھ ایک عدد سہیلی بھی لے آئی ہیں، ان دونوں معزز خواتین کو ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے میں پورا پورا کمال حاصل ہے، خاص طور پر جب موضوع بحث یہ خاکسار ہو۔ یہ صورت حال میرے لیے ایک نازک مرحلہ ہے کیونکہ اب مجھے ادیب یا خطیب کے طور پر نہیں بلکہ خاص احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ بات چیت کرنی پڑے گی۔

آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے، مجھے لاہور کے ایک گرلز کالج میں چند ماہ کے لیے پارٹ ٹائم لیکچرر کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں لاہور کی لڑکیوں میں چند نئے فیشن رواج پارہے تھے۔ مثلاً پال کٹوائے جارہے تھے دو پٹاسر سے پھسل کر گلے میں آ پڑا تھا اور یوں بھی قمیص اور شلوار میں نئی نئی تراش خراش پیدا ہو رہی تھی۔ یہ وضع قطع دیکھ کر مجھے صرف ایک فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ اب مشرقی ادب کے اُس سرمایہ عزیز کا کیا حشر ہوگا جس کی بنیاد ہی گیسوئے تابدار، چلمن، آئچل، حیا اور حجاب کے تصورات پر مبنی تھی۔ میرا اندیشہ کچھ زیادہ غلط نہیں تھا کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ اردو میں بلینک ورس اور مصوری میں جدید آرٹ کا رواج اس فیشن کی پیداوار ہے۔ جب حُسن خود ہی قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے تو بے چارہ عشق کب تک اس جیل خانہ میں رہ سکتا ہے۔

آج بیس بائیس سال کے بعد جب میں پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ زمانہ مجھے پھر بھی غنیمت نظر آتا ہے۔ ہزار آرائشوں کے باوجود عورت پھر بھی عورت تھی اور لباس پھر بھی لباس تھا لیکن آج کل کچھ ایسی حالت ہو گئی ہے کہ کبھی کبھی یہ شک گزرتا ہے کہ عورت تو شاید کہیں نہ کہیں کسی قدر موجود ہو لیکن لباس، ہر چند کہیں کہیں ہے اور اگر ہے بھی تو عورت نے لباس کو نہیں بلکہ لباس نے عورت کو پہنا ہوتا ہے۔

حال ہی میں خبر ملی ہے کہ کراچی میں ایک صاحب فوت ہو گئے۔ تجھیز و تکلفین کا انتظام ہونے لگا تو مولوی صاحب نے کفن کے لیے ساڑھے بائیس گز لٹھے کی فرمائش کی اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ نہیں صاحب ان کے لیے تو ڈھائی گز لٹھا کافی ہوگا کیونکہ مرحوم ٹیڈی تھے۔

مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ لفظ ٹیڈی دراصل ہے کیا اور کہاں سے نکلا ہے لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ ٹیڈی اور ٹیڈی میں کوئی گہرا رشتہ ثابت کرنے کی کوشش کروں اس کی تین وجوہات ہیں۔
ایک تو یہ کہ لفظ ٹیڈی اور ٹیڈی میں ایک خاص صوتی ہم آہنگی ہے۔

دوسرے یہ کہ ان میں ایک طبعی ہم آہنگی بھی ہے مثلاً ٹیڈی فصلوں کو تباہ کرتی ہے ٹیڈی نسلوں کو تباہ کرتی ہے۔
اس کے علاوہ ان میں ایک تیسری مناسبت بھی ہے، ٹیڈی دل دُور دراز کے بے آب و گیاہ ریگستانوں سے اٹھتے ہیں اور بھری آبادیوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اسی طرح ٹیڈی دل بھی ایسے ویرانوں سے اٹھتے ہیں جہاں انسان تو ہیں لیکن انسانیت پامال ہو چکی ہے۔ جسم زندہ ہیں، روح مر چکی ہے، ذہن چلتے ہیں لیکن ضمیر خاموش ہے مردہ انسانیت کے یہ زندہ قبرستان ٹیڈی دل کی اصلی جہنم بھونی ہیں۔ وہاں سے یہ عذاب چل کر پاکستان جیسی معصوم آبادیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جہاں کہ جسمانی اخلاقی اور روحانی کھیتیاں ابھی تک سرسبز ہیں۔

لباس کی رنگینیاں اور نگاریاں عورت کا حق اور نسوانیت کا تقاضا ہیں لیکن کچھ لباس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اثر صرف صورت پر ہی نہیں بلکہ سیرت پر بھی پڑتا ہے۔ کچھ عرصہ سے دنیا کے چند مادہ پرست معاشروں میں نفسیاتی الجھنیں اور اخلاقی بغاوتوں کے طفیل ایک خاص قسم کا کردار پیدا ہو رہا ہے اس کردار نے اپنے لیے ایک خاص قسم کا لباس بھی منتخب کر لیا ہے جسے ہم عام طور پر ٹیڈی بوائے یا ٹیڈی گرل کا لباس کہتے ہیں۔ اپنی شان نزول اور پس منظر کی وجہ سے یہ لباس ایک مخصوص کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے جو کوئی بھی ایسا لباس پہنتا ہے وہ بذات خود اچھا ہو یا بُرا اس پر لیبل اس کردار کا چسپاں ہو جاتا ہے جس کے ساتھ یہ وضع قطع مخصوص ہو چکی ہے۔ مثلاً اگر چند بچے تنگ پتلونیں نوکیلے بوٹ اور پخت بوشرٹ پہن کر نہایت معصومیت کے ساتھ بازار میں کتابیں خریدنے نکلیں تو جہاں جہاں سے وہ گزرتے ہیں وہاں کے راہ گیر بے اختیار اپنے بوٹوں، اپنی سائیکلوں اور اپنی موٹر سائیکلوں کی حفاظت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ شک و شبہ کا یہ رد عمل ان بچوں کے ذاتی کردار سے کم تعلق رکھتا ہے لیکن اس لباس کی شہرت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے جو کہ انہوں نے پہن رکھا ہے۔

چنانچہ اس مخصوص لباس کی ساکھ اٹھ چکی ہے اور اس کی شرافت پر داغ لگ چکا ہے اور اب اسے زبردستی پہنے پھرنا ایسا ہی ہے جیسے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کو نکال کر باہر نہ پھینکنا۔

درحقیقت ٹیڈی ازم کا دائرہ کچھ لباس تک ہی محدود نہیں ہے جس طرح تنگ نظری تنگدلی اور تنگ نظری تنگ کپڑوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس طرح بچوں اور بچیوں کے ٹیڈی ازم سے بہت زیادہ زہرناک وہ ٹیڈی ازم ہے، جو معاشرے کے ہر شعبے میں تقریباً ہر وقت بڑی شدت سے جاری و ساری رہتی ہے۔

ہمارے یہاں رفتار کے ٹیڈی بھی ہیں اور گفتار کے ٹیڈی بھی لیکن سب سے زیادہ تعداد ان کی ہے جو وطن اور قوم کے معاملے میں کردار کے ٹیڈی ہیں۔

جب کتابی فلسفوں کی اندھا دھند تقلید میں ذات کو نظریات پر اور انفرادی مفاد کو قومی استحکام پر ترجیح دے کر جماعتی یا طبقاتی یا صوبائی تعصبات کو ہوا دی جائے تو سیاست کی ٹیڈی ازم شروع ہو جاتی ہے۔

ثقافت کی ٹیڈی ازم وہ ہے جن کے اشتہار زندہ ناچ گانوں کی صورت میں ہر روز چھپتے اور تقسیم ہوتے ہیں۔

صحافت کی ٹیڈی ازم وہ ہے جو رائے عامہ میں ہمواری کی جگہ ناہمواری، امن کی جگہ انتشار، امید کی جگہ یاس اور تعمیر کی جگہ تخریب کے جذبات ابھارنے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔

تجارت کی ٹیڈی ازم چور بازاروں کی منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں اور لالچ کے زرخیز فلاموں کی محنت اور کوشش سے وجود میں آتی ہے۔

جس طرح ادب کے ٹیڈی، بے ادبی، علم کے ٹیڈی، بے علمی اور ضمیر کے ٹیڈی، بے ضمیری کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور جنس دین کے ٹیڈیوں کی ہے جو روحانی ٹیڈی ازم کی تبلیغ کا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین فطرت کی آسانوں کو دشواریوں کا ہوا بنا کر پیش کرنا یا مذہب کی جائز حدود و قیود کو مسخ کر کے تن آسانوں کے سانچے میں ڈھالنا دونوں ایک ہی طرح کے خطرناک جرم ہیں یہی وہ جرائم ہیں جن کے زہر سایہ ہمارے معاشرے میں روحانی ٹیڈی ازم کا سیلاب روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

زندگی کی اس ہمہ گیر ٹیڈی ازم کو ختم کرنے کا ایک اور صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ انسانیت کے وجود سے تنگ نظری، تنگ دلی اور تنگ فطرتی کا جائزہ اتار کر پھینک دیا جائے۔ یہ علاج سب سے زیادہ ان کے ہاتھ میں ہے جو آج بینیاں اور بنیائیں ہیں اور کل بیویاں اور مائیں بننے والی ہیں۔

رسمی یا قانونی یا سماجی طور پر بیوی اور ماں بننا بڑا آسان ہے لیکن حقیقی طور پر اس رول کو نبھانا بے حد مشکل اور کٹھن ہے۔ دراصل خدا کی ساری مخلوق میں عورت ہی ایسی مخلوق ہے جس پر سب سے زیادہ ایثار، قربانی، مروت اور خدمت کا بوجھ ڈالا گیا ہے لیکن اسے بوجھ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ فطرت کے اصولوں اور ماحول کے تقاضوں کا نتیجہ اور کارخانہ ہستی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

زندگی کا تجربہ آپ کو بتائے گا کہ بیوی بنتے ہی آپ کو ایک نئی شخصیت اختیار کرنی پڑے گی۔ عام طور پر خاوند اپنے آپ کو بدلائیں کرتے وہ جیسے ہوتے ہیں تقریباً ویسے ہی رہتے ہیں۔ یہ بیویاں ہی ہوتی ہیں جو اپنا گھر چھوڑ کر، پرانے گھر جاتی ہیں اپنے ماحول سے نکل کر بیگانے ماحول کو اپناتی ہیں اور اپنی زندگی کے ہر زاویے کو برضا و رغبت نئے تقاضوں اور نئے سانچوں میں ڈھالنے پر آمادہ رہتی ہیں۔

اس منزل کے بعد جب بیویاں مائیں بنتی ہیں تو وہ بے اختیار ایک نئی غلامی میں گرفتار ہو جاتی ہیں وہ بے محبت مادری کی غلامی۔

یہ عورت کی عظمت ہے کہ وہ ایثار، مروت، خدمت اور محبت کی اس غلامی کو آزادی کا درجہ دے کر اپناتی اور نبھاتی ہے۔ اپنے گھروں میں تعلیم حاصل کریں یا سکولوں اور کالجوں میں ایک طرح کی آرائش جمال کریں یا دوسری طرح کی ایک طرز کا لباس پہنیں یا دوسری طرز کا۔ جب تک آپ نے اپنی عظمت کا مقام سلامت رکھا اس وقت تک عورت زندہ رہے گی اور اگر عورت اپنی عظمت کے ساتھ زندہ رہی تو انشاء اللہ وہ دن بھی ضرور آئے گا جب مرد اور کچھ نہیں تو صرف شرمندہ ہو کر مجبور ہو جائے گا کہ آپ کے وہ سب حقوق آپ کو دے دے جو اللہ نے اپنی کتاب اور اللہ کے رسولؐ سے اپنی شریعت میں آپ کو عطا کیے ہیں۔

مولوی عبدالحق

علم و حکمت کے سر سے ایک بزرگ مشفق کا سایہ اٹھ گیا جو لوگ کچھ سیکھنا اور کچھ کرنا چاہتے تھے مولوی عبدالحق ان کے لیے پورے ایک دور کا تجربہ پیش کر سکتے تھے۔ اگر اردو کے مقصد کو کسی طرح بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا تو اس مقصد کی راہ میں وہ نہ تو کسی چیز کو معمولی سمجھتے تھے اور نہ کسی کمترین حیثیت کے شخص کو ناقابل توجہ سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت منفرد تھی۔ علم و فن کی حیرت ناک صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان میں حد درجہ بذلہ سخی اور علمی فراست بھی تھی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رجسٹر پر انہوں نے سب سے پہلے دستخط کیے جو ہمارے لیے ہمیشہ ایک قابل فخر یادگار رہیں گے۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی انتھک محنت کا جذبہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پورے ادب و احترام کے ساتھ انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ علم شمع بلند رکھنے کی توفیق دے جسے انہوں نے اس قدر بہادری اور جرأت کے ساتھ روشن کیا تھا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نواب شاہ کے ادب دوست بابائے اردو کی یاد میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ بابائے اردو ہمارے درمیان سے اٹھے ابھی ایک سال ہوا ہے لیکن ہماری احسان ناشناسی کا عالم یہ ہے کہ کراچی میں ان کا یوم اگر منایا بھی تو اسکول کے بچوں نے مولوی عبدالحق ہر معنی میں بڑے آدمی تھے۔ وہ آسان اور بول چال کی اردو کو رواج دینے کے قائل تھے۔ وہ اسے پٹاری کا انگوٹھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی نظر اردو کے ماضی اور حال پر بھی تھی اور مستقبل پر بھی۔ وہ پاکستان بھی فقط اردو کے لیے آئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب دلی اور لکھنؤ میں اردو کا خط پڑھنے والا مشکل سے ملے گا، کوہاٹ اور کوئٹہ، ملتان اور نواب شاہ اردو کی نیکال ہوں گے۔ پاکستان میں جو لوگ اردو کو باہر کا پودا کہتے ہیں وہ یا تو متعصب ہیں یا بے علم یادوؤں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اردو کا مولد یہی کناری رو سندھ ہے یہی دیہل اور منصورہ۔ یہی نواب شاہ اور ڈوگری۔

مولوی عبدالحق ادب میں برہمنیت کے خلاف تھے۔ محمد شاہ نے جب نادر شاہ کا نسب پوچھا تھا تو اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ نادر شاہ، ابن شمشیر، ابن شمشیر، ہمارے ہاں جو ادب کے بچے کچھے صاحب عالم ہیں ان کو بھی قلم اور محض قلم کی سیادت کا اعتراف کرتے ہی بنے گی۔ بابائے اردو کی ایک بڑائی ان کی خاکساری اور فروتنی تھی، اور کسی معاملے میں نہیں، ادب اور اردو کے معاملے میں۔ وہ نئے لکھنے والوں کی تحریر میں کیڑے نہیں نکالتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے..... 1959ء میں جب پاکستان کے ادیبوں کا اجتماع ہوا تو انہوں نے عہدے اور صدارت کی شرط عائد کیے بغیر اس میں شرکت کی اور معمولی اراکین کے رجسٹر پر دستخط کئے۔

اردو، اب گملے کا پودا نہیں ایک تناور درخت ہے۔ یہ کسی کی مٹرو کہ جائیداد نہیں، ہم لکھنے والوں کی میراث ہے اگر ہم بابائے اردو سے اتنی بات بھی نہ سیکھ سکے تو ہم پر حیف ہے۔

ماہنامہ ”قومی زبان“ کراچی (مولوی عبدالحق نبرا)

پس چه باید کرد

پاکستان میں آج کل ہماری زندگی اور ہمارے کردار کا سب سے نمایاں پہلو فرسٹریشن ہے یہ احساس ایک انتشار، بے زہر، ایک زبردست بے بسی کی طرح ہمارے ذہنوں اور ہمارے اعصاب پر چھایا ہوا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ اس کا اثر کمزری کے جالے کی طرح روز بروز پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے فرسٹریشن کو اردو میں کبھی مایوس کہا جاتا ہے کبھی احساسِ ارسائی، لیکن یہ دونوں ترجمے اس فرسٹریشن کے اظہار کے لیے ناکافی ہیں جو ہمارے ملک کے طول و عرض پر بڑی شدت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ مایوسی تو وہاں ہوتی ہے، جہاں کوئی امید بر نہ آئے اور نارسائی کا احساس وہاں پیدا ہوتا ہے نہاں منزل تک پہنچنا دشوار نظر آئے اس کے برعکس ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ ہماری امید کیا ہے اور نہ ہم یہی جانتے ہیں کہ ہماری منزل کا مقام کیا ہے اور کہاں ہے اگر امید کے بغیر ناامیدی اور منزل کے بغیر نارسائی کا تصور پیدا ہو سکتا ہے تو بے شک ہماری فرسٹریشن کا ترجمہ بھی یہی ہونا چاہیے، لیکن جب آپ کالج اور یونیورسٹی کی دنیا سے باہر قدم رکھیں گے تو آپ کا استقبال ایک ایسی فرسٹریشن کرے گی، جس کا ذکر نہ شیکسپیر کے ڈراموں میں ہے نہ ڈکنز کے ناولوں میں جس کا حل نہ ریاضی اور الجبرے کے فارمولوں میں ملے گا۔ نہ اقتصادیات اور معاشیات کے مفروضوں میں، آپ دیکھیں گے کہ اس ماحول میں آپ خودی کو خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ کریں۔ خدا آپ سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ خدا کی ذات تو بڑی ذات ہے خود بندے آپ سے آپ کی رضا پوچھنا گوارا نہ کریں گے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ اس ایٹمی دور میں سپاہی کتنا ہی مومن کیوں نہ ہو بے تیغ لڑنا اس کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو، آپ کو اس رزق سے موت بہتر نظر نہ آئے گی اور جمہوریت کا یہ دعویٰ کہ اس میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی مقصود ہے اتنا ہی عجیب دکھائی دے گا جتنا کہ حضرت عیسیٰ کا مشورہ کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اپنا دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو۔ زندگی کے ہر موڑ پر آپ اپنا مقصد تلاش کریں گے، میں کون ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟..... آپ کا ضمیر بار بار آپ سے یہ سوالات پوچھے گا اور ہر بار آپ کا ماحول آپ کو یہی جواب دے گا کہ تم کوئی کام کاج کرو جہاں تک ہو سکے خوب کماؤ اپنے خاندان کی پرورش کرو اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے خاطر خواہ وراثتیں چھوڑ کے مرو، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے خواہ آپ سڑک کوٹنے والے مزدور بن جائیں خواہ آپ کلرکی کا پیشہ اختیار کر لیں، خواہ وزارت یا سفارت کی کرسیوں پر بیٹھ جائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی لمحے سے آپ فرسٹریشن کا شکار بن جائیں گے اور پھر خواہ آپ کافی ہاؤس میں جا کر چھپیں یا قصبہ گاہ میں، خواہ کوٹھنوں میں یا پناہ لیں یا کوٹھنوں پر۔ یہ فرسٹریشن ہر قدم پر ایک خونی بھیڑیے کی طرح آپ کا تعاقب کرتی رہے گی۔ آج سے دس چودہ سال پہلے جب ہم انہی کالجوں اور اسی یونیورسٹی سے باہر نکلتے تھے تو ہمارے سامنے تلخیاں بھی ہوتی تھیں اور ناکامیاں بھی، غم و غصہ بھی ہوتا تھا اور بغاوت بھی، یا اس بھی ہوتی تھی اور آس بھی۔ ہمارے سامنے سب کچھ ہوتا تھا لیکن

شہاب
اس قسم کی فرسٹریشن نہ ہوتی تھی جیسی کہ آج کل ہوتی ہے۔ ہم میں کچھ لوگ بیروزگاری کا شکار بنے تھے کچھ کا مگر بس باسٹ
لیگ میں شامل ہو کر جیل جاتے تھے، یا چندے اور گولیاں کھاتے تھے، بعض سرکاری ملازمتوں کے سنہری جال میں گرفتار
ہو جاتے تھے، بعض ساری ساری عمر "حسن یار کی باتیں" کیا کرتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی ہوتے تھے جہاں کہیں بھی ہوتے
تھے ان کا ایک خاص مقصد ہوتا تھا، وہ مقصد کتنا ہی چھوٹا، کتنا ہی بھٹوٹا، کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو، آخر ایک مقصد ہوتا تھا جس
کے حصول کے لیے وہ لوگ اپنی خودی کی اکائی سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آج جب آپ اس چار دیواری سے
باہر نکلیں گے تو آپ کو ایک زبردست بے مقصدی کا سامنا کرنا پڑے گا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی طور پر
ہمارے سامنے کوئی آئیڈیل نہیں ہے یا اگر ہے تو وہ نصب العین ثابت نہیں بلکہ منفی ہے۔

زندگی کی منفی قدروں کا یہ سلسلہ پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں کارفرما ہے چنانچہ آج جمہوریت پر
ممالک کی پہلی کوشش یہ نہیں ہوتی کہ جمہوریت کو فروغ دیا جائے بلکہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ کمیونزم کو شکست دی
جائے اسی طرح کمیونسٹ ممالک کمیونزم کی تبلیغ کم کرتے ہیں اور جمہوریت کو تباہ کرنے کے درپے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ
انہی نیز سے زاویوں کا نتیجہ ہے کہ انسانیت میں روز بروز تعمیری صلاحیتیں کمزور اور تخریبی صلاحیتیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں
۔ تعمیر کا مقصد یہی نہیں ہوتا کہ زمین پر سو سو منزلیں عمارتیں کھڑی ہوں یا پانچ چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار والے ہوائی جہاز
پر اوڑھ کر یا پلاسٹک سرجری کا رواج عام ہو یا برقی شعاعوں سے مصنوعی بارش پیدا کی جاسکے۔ یہ سب انسان کی آسودگی
کے لوازمات ہیں، انسانیت کی تعمیر کے نہیں، انسانیت کی تعمیر کا راز یہی ہے کہ ایک انسان اپنی بقا کے لیے دوسرے
انسان کی فنا کا محتاج نہ ہو ایک انسان اپنی ترقی کے لیے دوسرے انسان کے تنزل کا منت کش نہ ہو۔ جب تک انسان کی
بنیاد ان اصولوں پر تعمیر نہیں ہوتی اس وقت تک دنیا ایک ایسی تخریب کے پنجے میں گرفتار رہے گی جس کے لیے ایک طرف
ہائیڈروجن بم ہے، دوسری طرف ایٹم بم، ایک طرف امریکہ ہے، دوسری طرف روس، پاکستان کے پاس نہ تو ایٹم بم کے
راز ہیں نہ ہائیڈروجن بم کے۔ اس لیے ہمارے ہاں نصب العین کا فقدان یا زندگی کی منفی قدروں کی موجودگی دنیا کے
لیے کسی تباہی کا باعث نہیں بن سکتی لیکن اس کا جو اثر ہمارے ملی شعور، ہمارے قومی کردار اور ہماری بنیادی انسانیت پر پڑ
رہا ہے وہ بڑا مہلک اور خطرناک ہے۔

✓ ہم سا اہل سال سے سنتے آئے ہیں کہ پاکستان اسلام کی خدمت اور اسلام کے عروج کے لیے ظہور میں آیا ہے
اسی بلند مقصد کے لیے زندہ ہے لیکن اپنے سامنے ایک اجتماعی نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے ہم جس طرح اسلام کا نام
بلند کر رہے ہیں، خود اسلام کی پیشانی پر ایک بد نما داغ ہے، سچ پوچھیے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم مذہب کی خدمت نہیں
کر رہے بلکہ ہم مذہب کو ایک بے بس لونڈی بنا کر اس سے عجیب و غریب خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ہماری سیاست
ہماری صحافت، ہماری تجارت، ہماری ملازمتیں، ہمارا سماج، یہ سب دکانداریاں اسلام کے نام پر چل رہی ہیں۔ اگر ہم
مہاجر بنے ہیں تو ہم سنت نبوی کو پورا کرتے ہیں۔ اگر ہم جائز یا ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو یہ "ہندو
فضل ربنی" ہے اگر ہمارا ہمسایہ رات کو بھوکا سو جاتا ہے تو یہ فقر و غنا کی پیروی ہے اگر ہم سفارشوں کے ذریعے کامیاب
ہوتے ہیں تو یہ تدبیر الہی ہے اگر سفارش نہ ہونے کی وجہ سے ناکامی ہو تو یہ تقدیر الہی ہے جس انداز سے ہم زندگی کے قدم
قدم پر مذہب کی آڑ لے رہے ہیں اس سے اسلام ایک زندہ اور ترقی پسند فلسفہ حیات نہیں رہتا بلکہ ایک ایسے بزرگ کا
مزار بن جاتا ہے جہاں چور، ڈاکو، قاتل اور پارسیک وقت اپنے اپنے مقاصد میں برکت حاصل کرنے جایا کرتے ہیں۔
اگر ہمارے سامنے کوئی آئیڈیل ہوتا پھر بھی یہ کمزوریاں کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود رہتیں۔ لیکن اب تو ڈر یہ ہے کہ کہیں

زندگی کا یہ انداز ہی ہمارا نصب العین بن کے نہ رہ جائے۔ یہ ماحول ہماری روحانی فرسٹریشن کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ اسی طرح ہماری ذہنی اور سماجی فرسٹریشن کی وجہ بھی ایک اجتماعی نصب العین کا فقدان ہے، تقسیم کے بعد برصغیر کے کونے کونے سے ایک ایسے تمدنی اور صحت مند کلچر کی تخلیق ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا خاص طور پر شہروں میں ان عناصر کا ہار و پود بڑی طرح بکھر رہا ہے اور ہم آہنگی کی وجہ سے ہمارا سماج بڑی سرعت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گوشوں میں بٹ رہا ہے اس انتشار کی پہلی کڑی زبان کا مسئلہ ہے اردو اور بنگالی کا مسئلہ تو اب سیاست کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اس لیے میں اس کے متعلق کچھ کہنے سے معذور ہوں۔ لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ دوسری صوبائی زبانوں کو ترقی دینے کا شوق بھی انگڑائیاں لینے لگا ہے۔ یہ صورت ہماری وحدت قومی کے لیے کوئی نیک فال نہیں ہے جب تک صوبوں کی جغرافیائی حدود قائم ہیں اور اس وقت تک صوبائی رسوم و رواج، اطوار و آداب اور زبان میں مقامی امتیازات ناگزیر ہیں۔ لیکن جب یہ امتیاز تعصب کا رنگ اختیار کر لے تو حب الوطنی کا جذبہ سسک سسک کر دم توڑنے لگتا ہے۔ اس خطرناک رجحان کی روک تھام کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ ہمارے سامنے ایک ایسا آئیڈیل ہو جو انفرادی اور صوبائی حدود سے بالاتر ہو، یہ تو شہروں کی حالت ہے جہاں مختلف طبقوں کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد اخبار پڑھتی ہے، ریڈیو سنتی ہے، جلسے جلوسوں میں شرکت کرتی ہے اور اپنے ماحول کے زیر و بم سے کئی قسم کے تاثرات قبول کرتی ہے اس کے برعکس ہمارے دیہات میں جو فرسٹریشن پرورش پا رہی ہے وہ ہنگامی کم ہے لیکن مہلک زیادہ ہے وہ ایک خارجی ناسور کی طرح نہیں جو کچا رہتا ہے تو ٹیسس مارتا ہے اور پک جاتا ہے تو پھوٹ بہتا ہے دیہات کے عوام کی فرسٹریشن امتزایوں کے کینسر کی طرح ہے جس کے آثار بہت دیر تک ظاہر نہیں ہوتے اور جب ظاہر ہوتے ہیں تو اکثر لاعلاج ہوتے ہیں۔

تقسیم کے ساتھ جب مہاجرین کا ایک طوفان اس طرف اٹھ آیا تو شہروں اور دیہاتوں کے مقامی باشندوں نے جس جذبے، جس ایثار اور جس گرم جوشی سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اس کی مثال انصار مدینہ کی روایات سے کم نہیں ہے اس جذبے کا اثر تین چار برس بڑی شدت سے طاری رہا، یہ بھی غنیمت ہے کیونکہ اکثر جذبات کی زندگی اس سے بھی بہت کم ہوا کرتی ہے اگر اس دوران میں ہمارے عوام کے شعور میں ایک ایسا آئیڈیل بھی سمو دیا جاتا جو زمینوں اور مکانوں کی الائنٹ سے بلند ہوتا تو آج ہمارے ہاتھ میں ایک صحت مند اور مضبوط قوم ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اب جیسے جیسے ہنگامی جذبات مدھم پڑتے جاتے ہیں ویسے ویسے دیہاتی عوام میں بھی مہاجرین اور انصار کا امتیاز ذات پات کا رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے چنانچہ آج کل دیہاتی گفتگو میں ”لوکل“ اور ”پناہ گیر“ کے الفاظ تکیہ کلام کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ امتیاز ان کے سماجی اور نجی تعلقات پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کی آباد کاری ایک مربوط اور ہم آہنگ قوم پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنی بلکہ بذات خود ایک مقصد بن گئی ہے۔ اس کی ذمہ داری کا الزام محض حکومت پر عائد کرنا غلط ہوگا۔ حکومت جیسی بھی رہی ہے اس کے کل پرزے اسی تنگ و دو میں مصروف رہے کہ کسی طرح کسی کو کسی جگہ آباد کر دیں اس سے زیادہ نہ وہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ ہی ان سے کوئی اور توقع رکھنی چاہیے تھی اس کی اصل ذمہ داری ان بر خود غلط سیاستدانوں پر ہے جو لوکل اور مہاجر کے پردے میں اپنے ووٹ بڑھاتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری بہت سے ایسے مضافاتی اور صوبائی اخباروں پر ہے جو سیاسی اور غیر سیاسی پارٹی بندیوں کی وجہ سے اس مسئلہ پر طرح طرح کے رنگ چڑھاتے ہیں اور سب سے زیادہ اس کی ذمہ داری ان لاکھوں تعلیم یافتہ لوگوں پر ہے جنہوں نے دس دس بیس بیس سال سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گزارنے کے بعد بھی اپنی قوم میں ملی شعور پیدا کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا اور آج تک یہی کچھ ہوتا آ رہا ہے کہ تعلیم، پڑھے لکھے اور ان پڑھ لوگوں کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل ہو جاتی ہے اور یہ

رے شعور اور ہماری تعلیم کی سب سے بڑی ہتک اور سب سے بڑی شکست ہے اس کے علاوہ ہمارے دیہات کے وام میں ایک اور قسم کی فرسٹریشن بھی بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے یہ فرسٹریشن ذاتی بھی ہے اور نفسیاتی بھی اس کی مدداری کچھ ملازمت پیشہ طبقہ پر ہے کچھ خود عوام پر اور کچھ اس ماحول پر جس کی ہم سب مشترکہ پیداوار ہیں۔

آزادی کا مفہوم ہماری آپ کی نظر میں یہ بھی تھا کہ شاید اب روزمرہ کے مسائل کے الجھاؤ اور سلجھاؤ کا سلیقہ بھی تلف ہو جائے گا شاید ان کے دل میں یہ خیال بھی ہو کہ آزادی کے بعد ان کے پٹواری ان کے تھانیدار ان کے تحصیلدار اور ان کے ڈپٹی کمشنر عام انسان نہیں ہوں گے بلکہ دودھ میں دھلے ہوئے فرشتے ہوں گے۔ اس بات سے بحث نہیں کہ یہ توقع غلط تھی یا صحیح لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ایک کسان کا تیل گم ہو جاتا ہے تو یہ مسئلہ اس کے لیے اتنا اہم ہوتا ہے جتنا کہ امریکہ کے لیے کوریا اور پاکستان کے لیے کشمیر کا مسئلہ۔ جب وہ کسان دیکھتا ہے کہ اپنے گمشدہ تیل کی تلاش کے لیے اسے بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے، رشوت دینی پڑتی ہے تو اسے ایک عجیب سا احساسِ ناکامی ہونے لگتا ہے۔ اگر وہ کسان مہاجر ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے لیے میں نے اپنے مال اور بال بچوں کی قربانی دی تھی۔ اگر وہ کسان مقامی ہے تو اس وقت خیال آتا ہے کہ کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے لیے میں نے نعرے لگائے تھے اور آنے والے مہاجرین کو پناہ دی تھی رفتہ رفتہ ایک چھوٹے سے معاملے میں اس نئی اس کی ذاتی شکست نہیں رہتی بلکہ پاکستان کی شکست بن جاتی ہے۔ ایک بے چارے کسان پر ہی کیا موقوف ہے، شکست کا یہ خود غرضانہ مسلک نیچے سے اوپر تک ہر جگہ بڑی شدت سے چھایا ہوا ہے اگر کسی سیاست پسند آدمی کو الیکشن میں ناکامی ہو تو اسے اپنی ذات پر نہیں بلکہ پاکستان پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اگر کسی افسر کی ترقی رک جائے تو وہ اپنی نااہلی کو نہیں بلکہ پاکستان کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ کسی کو خسارہ ہو تو وہ بھی پاکستان کو ہی گالیاں دیتا ہے۔ پاکستان میل کا حادثہ ہو جائے تو بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں آخر یہ پاکستان ہی تو ہے حادثہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی سوسائٹی میں ذاتی نفع و نقصان کا تصور پاکستان کے بنیادی تصور کے ساتھ بڑی طرح غلط ملط ہوتا رہتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے سامنے ذاتی اور انفرادی خواہشات کے علاوہ کوئی اور خواہش یا آئیڈیل موجود نہیں اور اس وجہ سے ہماری زندگی میں ذاتی اور نفسیاتی الجھاؤ اور فرسٹریشن اور ان مختلف اقسام کی فرسٹریشن کے علاوہ علاج تو بہت ہوں گے لیکن ان کا ایک بنیادی علاج یہ ہے کہ ہم اپنی ذات اپنے ماحول اور اپنی حکومتوں کو اپنے ملک کا مترادف نہ ٹھہرائیں۔ MY

COUNTRY RIGHT OR WRONG

ایک سنہری اصول ہے اگر ہم اس اصول کو اپنائیں تو ہمارے سامنے ایک ایسا نصب العین آ جائے گا جو ہماری ذات کی کمزوریوں، ہمارے ماحول کی گندگی ہماری سیاست کی کجکلاہی اور ہماری حکومتوں کے زیر و بم سے بہت زیادہ بلند ہوگا یہ ضروری نہیں کہ اس آئیڈیل کی وجہ سے ہمارے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں چلنے لگیں گی اور نہ ہی یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اس سے ہمارے اقتصادی اور معاشی نظام میں کوئی فوری انقلاب آ جائے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر ہمارا ملک ہمارا نصب العین بن جائے تو اجتماعی طور پر ہماری قوم کا شیرازہ بکھرنے سے بچ جائے گا اور انفرادی طور پر ہم اس سے بھی محفوظ رہیں گے جو اس وقت ہمارے دل و دماغ پر ایک زہرناک غبار کی طرح چھائی ہوئی ہے۔

دیال سنگھ کالج میں خطبہ اسناد، روزنامہ "نوائے وقت" 2 مارچ 1954ء

خطبہء صدارت

ناشرین کی محفل میں کتابوں کا میلہ منعقد کرنے کی طرح جو پیشکش بک سینٹر نے ڈالی ہے اور جس میں آج انجمن
بہران و تاجران کتب بھی شریک ہے، اس میں بہت سے فائدے اور ایک خطرہ ہے۔

خطرہ یہ ہے کہ نمائش میں اچھی اچھی دیدہ زیب کتابیں بھی دیکھ کر خواہ مخواہ بی لچانے لگتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو ایک
نور کتاب ہی خرید لی جائے۔ کتاب میں ایک تو مفت کی زیر باری ہے اور پھر یہ اندیشہ بھی ہے کہ شاید کسی وقت اسے
بھٹکا بھی پڑ جائے۔

اس ایک خطرے کو چھوڑ کر کتاب میلے میں بس فوائد ہی فوائد ہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس بہانے کتاب
لکھنے والوں، کتاب چھاپنے والوں، کتاب بیچنے والوں اور کتاب پڑھنے والوں کو چند لمبے مل بیٹھنے اور آپس میں کچھ سننے،
سوچنے کے موقع نصیب ہو جاتا ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں آپ کی خدمت میں صرف ایک دو گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں،
میں کہ آپ اس میلے میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہماری پرنٹنگ اور پبلشنگ انڈسٹری ترقی کے بہت سے مدارج طے کر چکی
ہے اور حسن طباعت اور نفاست میں ہماری یہ صنعت بین الاقوامی معیار سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔
اب ضرورت اس امر کا جائزہ لینے کی ہے کہ نفس مضمون کے اعتبار سے بھی ہماری کتابیں اپنے ظاہری رنگ و
روپ کا کس حد تک ساتھ دے رہی ہیں۔

یہ ناشرین اور ادیبوں کے لیے رہنمائی اور قومی رجحانات کی تعمیر و تفسیر کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔
ایک وقت جو وقتاً فوقتاً ہم سب کے سامنے آتی رہتی ہے، یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ٹھوس اور دقیق قسم کی خالص
علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کے امکانات کافی کم اور محدود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی کتابوں کی فروخت تعداد
میں کم اور رفتار میں سست ہوتی ہے اور تجارتی نقطہ نظر سے یہ کاروبار زیادہ سود مند نہیں ہوتا لیکن یہی کتابیں ہماری علمی
ثقافت کا سرمایہ ہیں۔ ان کی نشر و اشاعت میں تجارتی پہلو کے ساتھ قومی اور اخلاقی تقاضے بھی خاص توجہ کے محتاج ہیں۔
اس مسئلے میں ایک نہایت روشن مثال لکھنؤ کے نول کشور پریس کی ہے۔ اس ادارے نے جس پیمانے پر اردو،
عربی اور فارسی کے کلاسیکی، علمی اور تحقیقی اور مذہبی ادب کو چھاپ چھاپ کر محفوظ کیا۔ اس کا اندازہ لگا کر حیرت ہوتی ہے۔
قیمت کے لحاظ سے بھی نول کشور پریس کی کتابوں کا ایک بندھا بندھا نظام تھا، میرا خیال ہے کہ شاید آٹھ صفحات کے
ایک نثر کی قیمت دو پیسے ہوا کرتی تھی۔ پاکستان کو بھی کچھ ایسے اداروں کی ضرورت ہے جو ہمارے علمی اور ادبی ورثے کو

سکیں۔

محفوظ کر کے ہر سطح پر اور ہر آمدنی کے طبقوں تک پہنچانے کا فرض سرانجام دے سکیں۔ معاشرے میں کتابوں کی اہمیت انسان کی دوسری بنیادی ضروریات سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اپنے کلام کی ابتداء اقرا سے ہوئی اور دنیا کے ہر دین کی اساس بھی آسمانی صحائف ہی پر قائم رہی ہے۔ کتابیں دینی ہوں یا دنیاوی وہ اس دنیا میں رہنمائی اور اس دنیا میں نجات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اخلاق کی آراستگی، معاشرے کی شائستگی، تنہائی کی یاد دہانی وہ اس دنیا میں رہنمائی اور اس دنیا میں نجات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اخلاق کی آراستگی، معاشرے کی شائستگی، تنہائی کی یاد دہانی وہ اس دنیا میں رہنمائی اور اس دنیا میں نجات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اخلاق کی آراستگی، معاشرے کی شائستگی، تنہائی کی یاد دہانی وہ اس دنیا میں رہنمائی اور اس دنیا میں نجات کا ذریعہ بنتی ہیں۔

جائے۔ تاکہ اس کے ساتھ وابستہ ہر طبقے کی مشکلات، ذمہ داریوں اور حقوق کا تعین کر کے انہیں اپنے نظریاتی، قومی، معاشرتی، ثقافتی اور بین الاقوامی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں اگر آپ نیشنل بک سینٹر کے تعاون سے کوئی عملی منصوبہ بنائیں تو مرکزی وزارت تعلیم اس کا بڑے شوق سے خیر مقدم کرے گی۔

ماہنامہ ”کتاب“ جولائی 1964ء

☆.....☆.....☆

خُلد کا اک دَر

(افسانے)

☆.....چندر اوتی

☆.....سردار جسونت سنگھ

☆.....صنم پلکیت

☆.....فراز ونی

☆.....ماما

☆.....جال

☆.....پہلی تنخواہ

☆.....غریب خانہ

☆.....سب کا مالک

☆.....نجمی کے بال

☆.....ڈاگی

☆.....دوتارے

ہے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
 خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھلا
 (غالب)

چندراوتی

چندراوتی سے میری محبت کا جب آغاز ہوا اسے مرے ہوئے تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اسے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر شعلوں میں رکھ دیا گیا تھا اور بہت دیر تک ہمیں چرمر، چرمر کی سی آواز آتی رہی تھی۔ پھر اس کی راکھ بھی گنگا کی لہروں میں گھل مل گئی اور دو تین دن چندرا کی ماں کے سوا جیسے ساری دنیا نے اسے بھلا دیا ہو..... لیکن پھر مجھے اس سے محبت ہو گئی اور رات دن اس کی یاد ستانے لگی۔

اس کہانی کے اہم کرداروں میں ایک چندراوتی ہے۔ دوسرے شیا ما اور تیسرے یہ خاکسار..... یعنی اندر بی اے اگر آپ چندراوتی کو اس افسانے کی ہیروئن سمجھیں تو محض آپ کا حسن ظن ہوگا۔ ورنہ اس بے چاری میں خود اس قسم کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ یہی دیکھ لیجیے کہ فقط ہیروئن کی زندگی پر کہانی کا مدار ہوتا ہے اور اس کے سانس کی گرمی اس میں روح پھونکتی ہے لیکن جس وقت میری محبت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے تین چار دن پہلے چندرا کی زندگی کی جوت بجھ چکی تھی اور اس کا جسم چتا کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو چکا تھا..... اور پھر وہ ایک معمولی غریب سی لڑکی تھی۔ نہ اتنی معمولی کہ اس کی بے مائیگی کا کائنات کی وسعتوں کے سامنے ایک عام انسان کی زندگی سے مقابلہ ہو اور اسے امتیازی نشان حاصل ہو اور نہ اس قدر غریب کہ وہ بھوک اور افلاس کی ملکہ کھلا سکے یا کسی مرتے ہوئے جفاکش فاقہ زدہ مزدور کی جیون ٹانگ میں ہیروئن کا پارٹ کھیل سکے۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح محض ایک لڑکی تھی جسے ایک بیوہ ماں کے ساتھ کسی ٹک وٹاریک گلی میں رہنا پڑتا تھا اور جس کی زندگی میں گھر کی چار دیواری کے سوا اور کسی ماحول کا سایہ نہ پڑا تھا۔ وہ اچھی خاصی خوبصورت تھی..... جس طرح عام نوجوان لڑکیاں خوبصورت نظر آتی ہیں لیکن نہ تو اس کے گالوں میں قوس قزح کی گلابی پتنگیں تھیں اور نہ اس کی آنکھیں شراب کی مستی سے بھرے ہوئے پیمانے۔ جب وہ ہنستی تھی تو صرف ہنستی تھی اور اس کی مسکراہٹ پر ساری کائنات رقص کرتی ہوئی نظر نہ آتی تھی اور پھر اس کے بال بھی صرف سیاہ بال تھے۔ سورج کی کرنیں اس کے بالوں میں چاندی اور سونے کے تار نہ پڑتی تھیں..... میرے مطالعے کے کمرے کی کھڑکی سے سب سے پہلے چندرا کے گھر میں نگاہ پڑتی تھی۔ میں نے بی اے کا امتحان دے دیا تھا اور اب میں اس ذہنی کشمکش کو دور کرنے کی کوشش میں تھا جو امتحان اور نتیجے کے درمیان وقفے میں ہر طالب علم کا پریشان ترین خواب بن جاتی ہے۔ ایک جوانی، دوسرے فرصت، ضروری تھا کہ حسن اور عشق کے جذبات بیدار ہو جاتے۔ چنانچہ میں نے اپنے تخیل میں ایک علیحدہ رومانی دنیا بنائی تھی۔ جس کی سب رنگینیوں اور مسرتوں کا مرکز عورت تھی سینما کے پردے پر تھر تھرائی ہوئی نازک بدن عورتیں؟ بازاروں اور پارکوں میں چھپھانے والی خوش نما عورتیں؟ اور پھر عشقیہ ناولوں کی جاذب نظر ہیروئنیں جو چلنے کی بجائے ہوا میں تیرتی ہیں اور بولنے کی بجائے گاتی ہیں..... لیکن جب میری نظر کمرے کی چار دیواری سے گھبرا کر آسمان کی وسعتوں

میں کھو جاتا چاہتی تھی، تو کھڑکی سے سر نکالتے ہی سب سے پہلے چند راوتی دکھائی دیتی تھی۔ جو پھکنی منہ سے لگائے گئی تھیں۔ لکڑیوں سے دھوکے کے بادل اڑاتی نظر آتی تھی یا دھوپ میں بیٹھی ہوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں ٹانگے لگانے میں مصروف۔ یہ کیٹیف نگارہ مجھے روحانی بلند یوں سے گھسیٹ کر زمین پر پٹک دیتا تھا اور میرا طلسمی دنیا کا تھوڑا سا عکس کی طرح ٹوٹ جاتا تھا۔ اور اس وجہ سے رفتہ رفتہ مجھے چندرا سے نفرت ہو گئی!

چنانچہ ایک دن میں نے ماں سے کہا کہ چندرا کی ماں نے چار ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ اس لیے اسے نوٹس دینا چاہیے کہ اگر دس دن کے اندر حساب بے باق نہ ہوا تو مکان خالی کر لیا جائے گا۔

ماں نے حیران ہو کر اپنی بھنویں اٹھائیں اور بولی
”جی جی، بیٹا ایسا نہیں کیا کرتے۔ تو نے آج یہ سبق کہاں سے سیکھ لیا۔ بے چاری و دھو تو ہے جب ہو سکے؟
کرایہ دے دے گی اور اگر نہ بھی دیا تو چار روپے مہینے سے کونسا ہمارا.....“

میں نے فوراً بات کاٹ دی اور کہا ”لیکن اصولاً انہیں ہمارے مکان.....“

”چل چپ رہ“ ماں نے غصے سے کہا ”آیا بڑا مکان والا.....“

”مکان کی بات نہیں ماں، میں تو اصول کی بات کہتا ہوں۔“

”مجھے زیادہ وکالت نہیں آتی..... لیکن میرے جیسے جی ایسا نہ ہوگا بعد میں جو جی میں آئے کرنا..... اور کیا“

لیکن میں بھی تہیہ کیے ہوئے تھا کہ آج اپنی بات منوا کے رہوں گا۔ اس لیے میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔

”لیکن ماں چندرا اور اس کی ماں کی شہرت بھی تو اچھی نہیں ہمارے محلے میں شریف بہو بیٹیاں.....“

ماں نے آنکھیں اٹھا کر مجھے مسکرا کر گھورا اور الفاظ خود بخود میرے گلے میں اٹک گئے جیسے ایک بھاگا ہوا بچہ

استاد کے سامنے بہانہ تراشتے ہوئے بھول جائے کہ اب آگے کیا کہنا چاہیے.....

ماں کی تنی ہوئی پلکوں میں خدا جانے کیا چیز پوشیدہ تھی کہ میں دل ہی دل میں سخت نادام ہوا اور اس کے بعد کئی روز

تک مجھے اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہوئی۔

ماں کے سامنے میری اس ندامت کا باعث چندرا کے سوا اور کون تھا؟ میں کھڑکی میں کھڑے ہو کر بہت دیر تک

اسے گھورتا رہا۔ میرے دل میں غم و غصے کی آندھی چل رہی تھی۔ میں اسے چوٹی سے پکڑ کر کسی تاریک کنوئیں میں دھکیل

دینا چاہتا تھا۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے میری نظر سے اوجھل ہو جائے۔ وہ چار پائی پر بیٹھی ہوئی دھوپ میں بال سکھارتی

تھی۔ مجھے گھورتے دیکھ کر کچھ جھینپ سی گئی اور اپنی کمر میں سلوٹیں پیدا کر کے میری طرف سے پیٹھ موڑ لی..... مغرورانہ

عورتوں کو اپنی ذات کے متعلق کیا کیا خوش فہمیاں ہوتی ہیں..... خواہ مخواہ! میں اسی سوچ میں تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”یار اتنے ہی مصروف ہو تو چلا جاؤں؟“

”اوہو، کما تم ہو؟ آؤ بیٹھو“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ تم چوروں کی طرح آئے کھڑے ہو.....!“

”ہاں دوست، چور نے آ کر تمہاری چوری پکڑ لی!“

”میری چوری؟“

”سچ ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔“

”میں نہیں سمجھا کما؟“

”میرا تھا تو پہلے ہی ٹھک کا تھا لیکن.....؟“

”؟؟؟“

”اب اتنی بات کرو، اندر..... کہ شیا ما کو میرے لیے چھوڑ دو۔ میں اسے دل سے چاہتا ہوں۔“

”؟؟؟“

”جی ہاں“ آپ بیک وقت دو بازیاں نہیں کھیل سکتے!“

کمار میرا ہم جماعت تھا اور کتاب عشق کا زبردست عالم۔ شیا ما کے معاملے میں میری اس کی نہیں بنتی تھی اور وہ خود بھی میری طرف زیادہ ملتفت تھی کالج میں شیا ما کی مسکراہٹوں کے پھول سب سے زیادہ میرے حصے میں آتے تھے۔ جب وہ میری بات سننے کے لیے اپنی گردن میں ایک ہلکا سا خم پیدا کرتی یا جب چھٹی ملنے پر ہم دونوں ایک دوسرے کے ہائیکل کا ہینڈل پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلتے تو کمار کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے جنہیں بجھانے کے لیے وہ مس لوسی یا پرتیا یا مس کپور کی ہائیکلوں کا بے تحاشا تعاقب کرتا تھا اور پھر شام کے وقت دو چار جام پی کر کسی کثیف بالا خانے پر پوڈر زدہ چہروں اور صابن کے بلبلوں میں بجھائے ہوئے حسن میں اپنی تلخیوں کو بھلانے کی ناکام سعی کرتا تھا۔

”جی ہاں، بے شک“ کمار نے دوبارہ کہا۔ ”آپ ایک وقت دو بازیاں نہیں کھیل سکتے“ اور پھر وہ فاتحانہ انداز

سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔

ان دنوں دیوالی کی آمد آمد تھی۔ کالج میں ہم اس تہوار کا بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے..... روشنی کے سیلاب میں تیرتی ہوئی رنگ برنگ ساڑھیاں؟ خلق خدا کا بے پناہ جھوم؟ دھکے؟ ریل پیل؟ ہنسی مذاق؟ اور پھر یکا یک ہماری ٹھوڑیوں کا مشک بار زلفوں سے مس کرتے ہوئے گزر جانا۔ یا ہمارے بازوؤں کا نرم نرم، گداز گداز شانوں سے گرنا..... اوہ! لیکن مجھے سب سے زیادہ یہ خوشی تھی کہ اس بار شیا ما نے میرے ساتھ دیوالی دیکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خوشگوار خیالوں کی پن چکیاں چل رہی تھیں جب شیا ما فروالا کوٹ پہن کر میرے ساتھ نکلے گی تو دوسرے لڑکے میری طرف کس حسرت سے دیکھیں گے۔ کمار کے سینے پر تو زہریلے سانپ لوٹیں گے اور جب ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے مسکراتے مسکراتے.....

لیکن دیوالی آئی۔ دنیا بھر کے چراغ روشن ہوئے اور میرا دل بجھا رہا۔ کمار کے چلائے ہوئے تیر اپنے نشانے پر ٹھیک بیٹھے تھے اور اس روز وہ شیا ما کے ساتھ دیوالی دیکھنے گیا۔ انہوں نے ”نیولائف“ ریسٹوران میں چائے پی اور پھر ”الیکزینڈر یا ہوٹل“ کے شاہانہ تکلفات میں گم ہو گئے.....

مجھ پر چندرا کا یہ تیسرا وار تھا۔ وہ ہمیشہ سے میرے روحانی تخیلات میں دھوئیں کے بادل اور پرانے کپڑوں کے چھتھرے بکھیرتی آئی تھی۔ پھر ایک بار وہ ماں کے سامنے میری سخت ندامت کا باعث بھی بنی اور آج اس نے میرا دل دکھایا تھا۔ دنیا میں سب کچھ سہا جاسکتا ہے لیکن دل کے نشانے پر لگائی ہوئی چوٹ برداشت نہیں ہو سکتی۔ خدایا! میرے سر پاؤں کا بھوت سوار تھا میں چاہتا تھا کہ میں چندرا کی آنکھیں نکال کر شیا ما کے پاس لے جاؤں اور کہوں، لو میری جان، انہیں اپنے پاؤں سے مسل ڈالو.....! کیا شہر بھر کے بالا خانوں میں ایک چندرا کے لیے جگہ نہ تھی؟ کیا دنیا بھر کے مجرموں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے جرم کی قیمت حاصل کرنا چاہتا ہو؟.....

لیکن پھر خود ہی مہربان قدرت میری مدد کے لیے تیار ہو گئی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے چندرا کو نمونیہ ہوا اور تیسرے روز وہ مر گئی..... میں نے خود شیاما کے پاس جا کر خوشی سے ناچ کر خوش خبری سنائی اور اس نے فوراً اپنی نازک نازک پچیلی بانہیں میرے گلے میں لٹکا کر مجھ سے اپنی غلط فہمی کی معافی مانگ لی.....

میری کھوئی ہوئی شیاما مجھے واپس مل گئی تھی اور اب میرے رومانی تصورات کی رنگینیاں پھر سے آباد ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو درست کیا اور کھڑکی کے پردے اٹھا کر کائنات کی وسعتوں کے پٹ کھول دیے..... دور دور تک اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے خشک خشک مکان؟ گلیوں میں آدمی، بچے، کتے؟ پھیکا پھیکا میالا سا آسمان دور کارخانے کی چیمنیوں سے بھک بھک کر کے نکلنے والا بدبودار دھواں.....؟ مری نگاہیں دہشت کھا کر خود بخود واپس آ گئیں۔ جیسے میں نے پہلے کبھی انہیں دیکھا ہی نہ تھا.....! سامنے چندرا کا مکان تھا چندرا کی چار پائی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا اور کوٹھے کی منڈیر پر پیوند لگے ہوئے چندرا کے کپڑے پڑے ہوئے تھے..... نہ معلوم میں کب تک یوں ہی کھڑا رہتا لیکن ماں نے آ کر مجھے جگا دیا۔

”اب یہ کھڑکی بند کر دو، بیٹا، چندرا وتی تو ہمیں چھوڑ گئی“

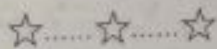
ماں ساڑھی کے پٹو سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی اور پھر اس نے رومال اٹھا کر میری آنکھوں پر پھیرا..... مجھے محسوس تک نہ ہوا تھا کہ میں بھی رو رہا تھا۔

”جی سنبالو، بیٹا“ ماں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری ہر روز کھڑکی میں کھڑے رہنا لوگوں کو اچھا نہ لگتا تھا لیکن مجھے بڑی خوشی تھی، غریب اور امیر کا ملاپ دنیا کو منظور نہ تھا۔ اس بیاہ پر سماج ضرور انگلیاں اٹھاتا لیکن بیٹا جہاں پریم ہو.....“

نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہ رہا تھا اور ماں کی آنکھوں سے بھی..... اس بہتے ہوئے پانی میں بھی مجھے گیلی لکڑیوں سے اٹھتے ہوئے دھوکیم کے بادل نظر آتے تھے..... اور ان کی چادر میں لپٹی ہوئی ایک معمولی سی، ایک غریب سی لڑکی.....

”شاہکار“ لاہور نومبر 1940ء



سردار جسونت سنگھ

رجہ بازار کے عقب میں گوردوارہ دمدہ صاحب کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ اندرونی دالان میں دسویں پادشاہ سری گورو گوہند سنگھ کفنی والے کا گر پر بھ منانے کے لیے دیوان لگا ہوا تھا، اور بیرونی صحن اور گوردوارہ کے آس پاس ساری کھلی جگہوں میں راوِل پنڈی اور راوِل پنڈی کے مضافات کی بیشتر خالصہ آبادی سنگھ سہا منار ہی تھی۔ کہوٹہ، مری، گوجر خان، چکوال اور پنجاب تک سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے اور صبح سے راوِل پنڈی کے کوچہ و بازار چوڑی چوڑی چھاتیوں والے کڑیل جوانوں اور رنگ برنگ دوپٹوں والی خوبصورت، صحت مند عورتوں کی ٹولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی الگ ٹولی تھی اور برادری کا کوئی بڑا بوڑھا اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی ایک ٹولی میں ماں باپ تھے، میاں بیوی تھے، بھائی بہن، عاشق معشوق تھے اور پھر بچے تھے۔ خوبصورت، صحت مند، چاق و چوبند بچے جو راہ چلتے چلتے چوکڑیاں بھرتے تھے، قلا بازیاں لگاتے تھے، بکرے بلاتے تھے، چھٹی گاتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لائٹیاں ہوا میں اچھال کر ”جو بولے سونہال، ست سری اکال“ کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔

جوانوں نے سفید، نسواری اور نیلے لٹھے کے تہ بند پہنے ہوئے تھے، گھٹنوں تک لمبی بوکی کی دھاری دار قمیض۔ اس پر ٹلی، ریشمی یا گبرون کی سرخ واسکٹیں، سیپ کے بنٹوں کی قطاریں، جیبوں میں سے دودو بالشت باہر لٹکتے ہوئے رومال، سر پر رنگ برنگے صافے، آنکھوں میں سرمہ، ہاتھوں میں لمبی لمبی چمکتی ہوئی سمدار لائٹیاں، کسی نے تہ بند کی گانٹھ میں چھپائی ہوئی شراب کی بوتل یا ٹھڑے کا اڈھا۔ عورتوں نے اخروٹ کے چھلکے مل کر اپنے ہونٹ کبوتر کے خون کی طرح سرخ کیے ہوئے تھے، ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی لکیریں اور دھوپ میں پایادہ چلنے کی وجہ سے گالوں میں متمتاتے ہوئے سرخ سرخ انگارے ان کے لباس کی زرق برق بھڑک کے ساتھ مل کر رنگ اور نور کی پھلجھڑیاں کی پیدا کر رہے تھے۔

گوردوارہ دمدہ صاحب کے باہر سنگھ سہا میں پہنچ کر گاؤں کی ٹولیوں کی دستہ بندی قائم نہیں رہتی تھی۔ جھولے، چنڈول، گشتی کے اکھاڑے، دو پیسے میں بارہ من کی دھوبن اور بنگالے کا جادو دکھانے والے مداری، ایک آنے میں ”جوان عاشق عرف بہرام“ دکھانے والے تھیٹر، دو آنے میں تین تصویریں کھینچنے والے فوٹو گرافر، چار آنے میں پچھڑے اوسے محبوب سے ملانے والے نجومی، گنگھیوں، آئینوں، رومالوں، حلوائیوں، دہی بڑوں اور چاٹ والوں کی دکانیں۔ یہ سب اپنی کشش سے گاؤں کی بندھی بندھائی ٹولیوں کو بٹر بٹر کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ کے لیے اس ہجوم میں سے پانی کی ہر پاشان لہر اپنی سطح کو پالیتی تھی..... اور پھر رفتہ رفتہ یہ ساری بکھری ہوئی لڑیاں اپنے مرکز پر اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ یہ مرکز گوردوارہ دمدہ صاحب کے اندرونی دالان میں تھا جہاں ایک زرکار شامیانہ کے نیچے گرنتھ صاحب مخملی غلافوں اور تکیوں

شہاب مگر
کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ گرنہ تھی انوپ سنگھ برابر کبھی دائیں کبھی بائیں ہاتھ سے سفید گھوڑے کی دم سے بنائی ہوئی پوری

جھل رہا تھا اور سامنے ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں دیوان میں سنگت سجائے بیٹھی تھیں۔
عورتوں کی سنگت میں گاؤں کی بھری بھری، گدري گدري لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے کچے ناریل کے ٹودے کی طرح نکھرے ہوئے تھے اور جن کے تن بدن سے سینٹ یا عطر کی جگہ صرف جوانی کی مہکار آتی تھی۔ کالجوں میں پڑھنے والی شہر کی چھو کرپاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے رخساروں پر غازے اور پاؤڈر، سرخی اور سرے کی نوکدار پینسلوں کی مدد سے عجیب غریب سنگار کیے ہوئے تھے۔ ان کے اجسام سے جوان خون کی جگہ مصنوعی عطریات اور سینٹوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں اور انہوں نے اپنی زلفوں کی سیاہ ناگنیں کٹوا کر ان کی جگہ مشینوں کے کاڑھے ہوئے گنڈل بنوائے ہوئے تھے، اسی شان میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور کہنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد اس کی چاروں لڑکیاں تھیں انہوں نے الگ الگ رنگ کی بناری ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کی انگوٹھیاں، کانوں کی بالیاں، کلائی گھڑیوں کی پٹیاں، سینڈل اور ہینڈ بیگ بھی ساڑھیوں کے ہم رنگ تھے۔ رات کے آٹھ بجے بھی انہوں نے آنکھوں پر تازہ فیشن کے سیاہ چشمے آویزاں کیے ہوئے تھے تاکہ کالے شیشوں کے مقابلے میں ان کے گورے رنگ اور بھی زیادہ نکھرے ہوئے نظر آئیں اور پنڈال میں جگمگاتی ہوئی بجلیوں کی روشنی ان کی نازک آنکھوں پر گراں نہ گزرے۔ جب یہ لڑکیاں لاہور میں ہوں تو انہیں بلا ناندہ گانے، ناچنے، بندوق کا نشانہ لگانے، تیرنے اور پڑھنے لکھنے کے سوا باقی تمام فنون لطیفہ کے مقابلوں میں اول انعام ملا کرتے تھے۔ جب وہ چھٹیاں گزارنے حسن ابدال آتیں تو راولپنڈی، کوہ مری اور ایبٹ آباد سے سہیلیوں کو اکٹھا کر کے دیہات سدھار کے پروگرام بنتے تھے۔ کہیں نائٹ اسکول کھل رہا ہے، کہیں بچوں کو نہلانے کا دن منایا جا رہا ہے، کہیں صفائی کا ہفتہ، کہیں پھولوں، پھلوں یا سبزیوں کی نمائش ہے، ان گونا گوں مشاغل سے تھک کر کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مون لائٹ پک تک ہوتی تھی اور یہ نازک اندام خواتین سیاہ چشمے لگائے ہلکی پھلکی خوبصورت چھتریاں تان کر اپنے جسم کو چاند کی کرنوں سے بچائے چہل قدمی کو نکلا کرتی تھیں۔

گوردوارہ دمد صاحب کے دالان میں نہ تو لاہور کی رقص گاہوں کی نفاست تھی اور نہ ہی چاندنی رات میں حسن ابدال کے مرغزاروں کی پاکیزہ لطافت، بلکہ یہاں تو ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے اجسام سے بہتے ہوئے پسینے کی بُو چھائی ہوئی تھی اور اس فضا میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کا دم بڑی طرح گھٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑی سردارنی اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے بکس سے کبھی الاپچی، کبھی سپاری، کبھی پیپر منٹ کی ٹکیاں اور کبھی روح کیوڑہ اور عرق گلاب میں بھگوئے ہوئے مُتھے نکال کر چاروں بیٹیوں میں تقسیم کرتی تھی لیکن ان مفرح اشیاء سے کوئی چیز بھی ان کو تسکین پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی تھی بڑی سردارنی خود اپنے ہاتھ سے باری باری ان کے چہروں پر صندل کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے پکھلے سے ہوا کرتی تھی یہ پکھا میسور سے اس نے خاص طور پر بنوایا تھا اور اس کی ہر جنبش کے ساتھ فضا میں صندل کی مشام نواز مہک پھیل جاتی تھی لیکن بڑی سردارنی کی نازک اندام بیٹیاں جس تکلیف میں مبتلا تھیں، اس میں صندل کی مسیحائی بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

عورتیں تو خیر نازک مزاجی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھانے کے علاوہ اور کیا کرتیں لیکن مردوں کے دل اس تکلف کو دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ گیانی ترلوچن سنگھ اور اس کے ساتھی بڑے سوز و گداز سے ایک الم ناک شہد الاپ رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ ”اے گرو کے بیٹو! اپنے سارے دکھ مجھے دو اور میرے سارے سکھ تم لے لو اگر تمہیں کاٹنا

ولایت سے آنے کے بعد وہ خالی شربت یا لیمونڈیا آئس کریم پر عشق لڑانے کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس معاملہ میں اب وہ ضرورت سے زیادہ ترقی پسند ہو گیا تھا چنانچہ جب کبھی اس کا کسی لڑکی سے سامنا ہوتا تو اس کے دل میں پہلی امنگ یا حسرتی کہ ہاتھ جوڑ کر ”ست سری اکال“ کہنے کی بجائے وہ اس کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملائے۔ سینما لے جا کر شانہ سے شانہ بھڑا کر بیٹھے اور پھر کسی ریستوران میں کھانا کھلائے، ڈانس کرے۔ راولپنڈی میں سینما تو تھی لیکن شانوں کی کمی تھی اور ریستوران تو گویا نہ ہونے کے برابر تھے۔ ابھی چند برس کی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہی ریستوران پیرس کی نقل کرتے تھے۔ شراب ڈنر اور تمبولا کے کوپنوں کے ساتھ ڈانس کے پارٹنر بھی مہیا ہوتے تھے اور ایک ایک کوپن کو حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں کیو، کی حالت میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن اب چاروں طرف اُلو بول رہا تھا۔ شراب کی جگہ ”سری رام مارک“، لیمونڈ اور جگا دھر سنگھ گجا دھر سنگھ کے کارخانے کی بنی ہوئی آئس کریم پک رہی تھی، آرکسٹرا کی جگہ فلمی گانوں کی گھسے ہوئے ریکارڈ بجتے تھے اور ناچ کا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

اس ذہنی اور اعصابی تشنگی کو بجھانے کی کوشش میں وہ کئی بار پٹے پٹے بچا تھا کیونکہ اس کے والد سردار گوردیال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کسی حالت میں بھی اس کے روادار نہ تھے کہ ان کا بیٹا پرانی لڑکیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ”ست سری اکال“ کہنے اور حیا داری سے آنکھیں جھکا لینے کی جگہ ہاتھ ملانے یا شانہ سے شانہ بھڑانے کی کوشش کرے اور ڈانس تو خیر بہت دور کی بات تھی۔

سردار جسونت سنگھ دل ہی دل پر پریشان ہو رہا تھا کہ ہائے اب کے بھی بہار یونہی بیت جائے گی! حسن ابدال کی بڑی سرداری کی چاروں لڑکیاں کوئی ہر روز تو راولپنڈی آتی نہیں ہیں تو صد حیف کہ انہیں ایک ڈانس پر بھی نہ لے جاسکے۔ یہ احساس اس کے زخموں پر بڑی شدت سے نمک پاشی کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے راولپنڈی اور راولپنڈی کے بے کیف ریستورانوں کے مالکوں اور منیجروں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بڑی بڑی ثقیل گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ غصے سے بل کھا کھا کر وہ اندر ہی اندر گالیاں دیتا تھا اور دایاں ہاتھ زور زور سے اپنی ران پر مارتا جاتا تھا۔ سردار جسونت سنگھ کے والد بزرگوار سردار گوردیال سنگھ قریب ہی بیٹھے شہد الاپ رہے تھے، بیٹے کی وارنٹی دیکھ کر جی باغ باغ ہو گیا اور دل ہی دل میں انہوں نے واگوروجی مہاراج کو تعظیم دی کہ ولایت سے ہو آنے کے بعد بھی ان کا فرزند دلپذیر مذہب کے جذبات سے بدستور سرشار ہے اور گورو کے صاحبزادوں کی شہادت کے شہد پر بھری محفل میں بے اختیار گریہ وزاری کر رہا ہے۔

شہد ختم ہوا تو عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے تھوڑات کی بھول بھلیوں سے نکل کر زور زور سے ناک صاف کیے اور بلند آواز سے ”جو بولے سونہال۔ ست سری اکال“ کا نعرہ لگایا، شہد کے بعد گورو گرنٹھ صاحب اور جپ جی کا پانٹھ ہوا پھر ارداس ہوئی اور اس کے بعد لاگری سنتو کہ سنگھ دو نہنگ سیوا کاریوں کے ساتھ نمودار ہوا اور سنگت میں پرشاد تقسیم ہونے لگا۔

نہنگ سیوا کاریوں نے سوچی کے حلوے کی بڑی بڑی بالیاں اٹھائی ہوئی تھیں اور وہ خطہ مستقیم میں لاگری سنتو کہ سنگھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ لاگری سنتو کہ سنگھ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اور وہ غڑاپ سے کہنیں تک بازو بائیں میں ڈبو ڈبو کر مٹھی بھر تر بتر حلوہ برآمد کرتا تھا اور بڑی چابک دستی سے اسے ہوا میں اچھال کر گیند کی صورت بنا بنا کر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ اس عمل میں اس کا بازو سرگودھا کے گھی میں بڑی طرح لتھڑا جاتا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں

سے بازو پر لگا ہوا کھی اکٹھا کر کے واپس بالٹی میں نچوڑتا جاتا تھا اور پھر وہ اپنی گھنی داڑھی کو انگوٹھ کی طرح رگڑ کے اپنے بازو، ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کر لیتا تھا۔ ساہا سال سرگودھے کا خالص گھی پی پی کر لاٹگری سنتو کھنگھ کی داڑھی پچاس برس کے سن میں بھی کاجل کی طرح سیاہ، ابرک کی طرح چمکیلی اور پرانے بڑے کے تنے کی طرح گھنی اور چمبے دار تھی۔ داڑھی میں جا بجا بڑے بڑے پیچیدہ کنڈل تھے جیسے تالاب میں بانس گھما کر بھنور در بھنور پیدا کیے گئے ہوں۔ پرشاد بانٹے وقت لاٹگری سنتو کھنگھ کے ہاتھ اور پاؤں یکساں برق رفتاری سے چلتے تھے ہاتھوں سے تو وہ حلوے کی گولیاں بنا بنا کر تقسیم کرتا تھا لیکن پاؤں کے انگوٹھے کی داب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں اپنا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اس جستجو میں کبھی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کسی کی رانوں میں گدگدی کرتے تھے، کبھی ان کا تصادم پنڈلیوں کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی وہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ایسی پگڈنڈیوں پر بھی جا بھٹکتے تھے جو شارع عام نہیں ہوتیں! خاص طور پر جب لاٹگری سنتو کھنگھ عورتوں کی سنگت میں پرشاد بانٹ رہا ہو تو بھٹو لے بھٹکنے کے یہ حادثات بڑی شدت سے رونما ہوا کرتے تھے۔

پرشاد ہو چکا تھا سب نے کھڑے ہو کر بڑے جوش و خروش سے ”راج کرے گا خالصہ“ کا مٹی ترانا گایا اور پھر ”ست سری اکال“ کے نعروں کے درمیان دیوان برخاست ہوا، اس موقع پر گوردوارہ دمدہ صاحب کے اندرونی صحن سے بیرونی صحن تک آتے آتے بہت سے یاران تیز گام نے منزل کو چالیا۔ لیکن سردار جسونت سنگھ کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ولایت میں اس نے ”لیڈیز فسٹ“ کے آداب بڑی محنت سے سیکھے تھے اب وہ ریل پیل دھکم دھکا میں شامل ہو کے عورتوں کی ٹانگوں، چھاتیوں اور کولہوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کلچر پر اگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سلیقے سے ایک طرف کھڑا رہا اور اس کے سامنے عورتوں اور مردوں کے ہجوم سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے گزرتے رہے جب بھیڑ چھٹ گئی تو سردار جسونت سنگھ گوردوارہ سے باہر آیا جہاں تین تانگے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے ایک تانگے میں اس کا باپ، اس کی ماں اور حسن ابدال کی بڑی سرداری آنند کور سوار تھی۔ دوسرے تانگے میں سرداری کی تین بیٹیاں تھیں۔ تیسرے تانگے میں بڑی سرداری کی چوتھی بیٹی اور سردار جسونت سنگھ کی بہن کو شلیا تھیں، جسونت سنگھ کے پاس اپنا موٹر سائیکل تھا اس نے شارٹر پر زور سے پاؤں مار کر انجن چلایا پہلے تانگے والے نے جو پکوال کا ہندو کھتری تھا ”دیوی ہیرے والی تیری سدا ہی ہے“ کا نعرہ لگا کر گھوڑے کو چابک مارا، دوسرے تانگے والا کو ہلے کا مسلمان سید تھا جواب میں اس نے ”بیچ نعرے بیچ تن کے ایک نعرہ حیدر یا علی“ کی صدا لگائی۔ تیسرا تانگے والا نہتا جوان تھا اس لیے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ منہمک تھا اپنی بغل والی خالی جگہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ سالوٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور کہا:

”ایک بی بی آگے آ جائے۔“

”کیوں جی! ہم ٹھیک ٹھاک بیٹھے ہوئے ہیں یہاں۔“ کو شلیا نے جواب دیا۔

”بیچے بوجھ زیادہ ہے تانگہ ہلکا ہو رہا ہے اس لیے ایک بی بی آگے آ جائے۔“

کو شلیا بڑی جبر بڑ ہوئی لیکن بڑی سرداری کی چھوٹی لڑکی نے ایک ہاتھ سے کو شلیا اور دوسرے ہاتھ سے تانگے والے کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور اچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی ”گوری گوری اور باکی چھوری کچی میری گلی آیا کرو.....“ اب اس تانگے والے کے منہ سے بھی نغے پھونکنے لگے اس کا چابک بار بار ہوا میں لہراتا تھا

اور وہ حسن و جوانی کے قرب سے سرشار ہو کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا دوسرے تانگوں سے آگے نکل آیا۔ سڑک پر لوگ
 اور اصرار بھاگ کر اسکی زد سے بچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے کہ ”پکڑنا، پکڑنا گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے“ لیکن رحمان
 تانگے والا اپنے گھوڑے سے واقف تھا، یہ اس کا گھوڑا نہیں بلکہ اس کا دل تھا جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ کوشلیا دونوں ہاتھوں
 سے چھت کو پکڑے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ بڑی سرداری کی چھوٹی بیٹی ڈر کرتا ننگے والے کے قریب آگئی تھی۔ اس کی انگلیوں
 تانگے والے کے شانے کے بالکل قریب لہرا رہی تھیں اس کا نیشا تنفس تانگے والے کے بائیں بازو پر شعلے سے برسا رہا
 تھا۔ گھوڑے کی برق رفتاری میں نئی سرعت کے ساتھ وہ سہم کرتا ننگے والے کے اور بھی قریب آ رہی تھی جو کئی فلمی دھنیں ختم
 کرنے کے بعد اب گارہا تھا۔

”ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آ جائے“

خدا خدا کر کے محلہ موہن پورہ آیا اور محلے کے سرے پر سردار گوردیال سنگھ کی حویلی۔ سردار جسونت سنگھ باہر
 کھڑا تانگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سب پہنچ گئے تو سردار گوردیال سنگھ نے رحمان کو ڈانٹا۔ ”کیوں بے انارڈی گھوڑا نہیں
 سنبھال سکتے تو ماں کے پاس گھر بیٹھو، تانگہ کیوں ہانکتے ہو؟“
 رحمان نے اپنی ترچھی ٹوپی کا زاویہ بدلا۔ ”سردار جی یہ گھوڑا بجلی ہے بجلی، کبھی بے قابو نہیں ہوتا جاؤ اپنے ہیرے
 لیکن لوموتیوں کی طرح سنبھال کر لایا ہوں..... ہاں۔“

”موتیوں کا بچہ“ سردار گوردیال زیر لب بڑبڑائے وہ اس وقت خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتے تھے
 کیونکہ کھانا کھانے کے بعد حسن ابدال کی بڑی سرداری اور اس کی بیٹیوں کو لاہور کی ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی پکڑ لی
 تھی۔ چنانچہ انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چکوال کے ہندو کھتری تانگے والے کو دیا۔ ”جاؤ تینوں برابر بانٹ
 لینا۔“

رحمان نے چکوال کے ہندو کھتری اور کوہالے کے مسلمان سید تانگے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ ”جاؤ بنا
 دونوں بانٹ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا یاروں نے تو اپنی فیس وصول کر لی ہے۔ چل میرے شیرچم
 چھم چھم۔“ اس نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور چشم زدن میں یہ جاہ وہ جا۔

حویلی پہنچ کر گوردوارہ دمدہ صاحب کے دیوان کی ریل پیل کی صدائے بازگشت ایک بار پھر بلند ہوئی حسن ابدال
 کی بڑی سرداری کی بڑی لڑکی نے دیکھا کہ اس کے بائیں کان کی بالی غائب ہے اور ساتھ والے رخسار پر ایک کھردری
 سی انگلی کا نشان یوں نمودار ہے جیسے قندھاری انار کو تیز ناخن سے چھیل دیا گیا ہو۔ دوسری کی گردن پر چنگیوں کے سرخ
 سرخ دھبے خوں کی طرح جھلک رہے تھے، تیسری کے سینے کا بروج عنقا تھا اور چوتھی کا بلاؤ زرتار تار ہو کر پس پردہ کے
 مرمریں اور مہتابی رموز کو افشا کر رہا تھا۔ خود بڑی سرداری پر بھی کوئی من چلا کھسیانی بلی کی طرح کھسکا نوج گیا تھا اور اب
 ان کی کمر میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا۔ سردار جسونت سنگھ نے دیکھا کہ ان اس کی بہن کوشلیا کی انگلی بھی موجود نہیں
 جو اس نے لندن سے خاص طور پر اس کے لیے بیس پونڈ میں خریدی تھی۔ اگر اس انگلی پر بھیڑ میں کوئی جیب کتر ہاتھ
 صاف کر گیا ہے تو بے شک بڑے قلق کی بات ہوگی لیکن اگر خود کوشلیا نے آج چوری چھپے اپنی انگلی تر لوچن سنگھ کی ہڈ
 کر دی ہے تو کوئی بات نہیں، سردار جسونت سنگھ کو کوشلیا اور ترلوچن کے عشق کا حال معلوم تھا وہ دونوں گورڈن کا
 راولپنڈی میں تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے اور آپس میں شدت سے محبت کرتے تھے اگر دو تین برس پہلے سردار جسونت سنگھ

یہ راز افشا ہوتا تو وہ گنڈا سا اٹھا کر کوشلیا اور ترلوچن سنگھ دونوں کے سر قلم کر دیتا لیکن ولایت سے آکر وہ کوشلیا کو بہن کے علاوہ ایک ہمدرد اور رفیق کی حیثیت سے بھی چاہنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے ہم راز بن گئے تھے اور جب کبھی سردار جسونت سنگھ کے اعصاب پر راولپنڈی کے بے کیف ریسٹورانوں اور ویران ہوٹلوں کا احساس بری طرح حملہ آور ہوتا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے مغربی موسیقی کے ریکارڈ لگا کر کوشلیا کو رہا، واٹر اور فاکس ٹروٹ کے ڈانس سکھاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کا اصرار تھا کہ حسن ابدال کی بڑی سرداری اور اس کی چاروں بیٹیوں کے کھانے کا انتظام میز، کرسی، کانٹے اور چھری کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کوشلیا نے بھی حسبِ توفیق اس کی تائید کی لیکن دستور کے مطابق سردار گور دیال سنگھ کی رائے کا پلہ بھاری رہا، دالان میں دری بچھا کر اس پر مرزا پور کے دو قالین لگائے گئے تھے۔ مہمانوں میں محتہ موہن پورہ کے بہت سے سردار اور سرداریاں شامل تھیں۔ لائمری سنتو کہ سنگھ بھی موجود تھا۔ گوردوارہ میں پرشاد بانٹ کر اس نے دن بھر کی تکان دور کرنے کے لیے بھنگ کے تین چار گلاس چڑھالیے تھے اور اب وہ نشے کی رنگ میں بڑی سرداری کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگائے بیٹھا کفنی والے دسویں پادشاہ کے شجاعانہ کارناموں پر گورکھی کے پُراثر اشلوک سنا رہا تھا اس کے دوہنگ سیوا کاری بھی بڑے بڑے مورچھیل سنگھے اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور حتیٰ الوسع کوشش کرتے تھے کہ پنکھے کی ہرجنہش کے ساتھ بڑی سرداری کی بیٹیوں کے بالوں اور کپڑوں کی ساری مہک ان کے پاس کھنچ کر آجائے۔

کھانے کے بعد بڑی سرداری کی بیٹیوں نے یکے بعد دیگرے سردار جسونت سنگھ کے ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر تیسری بار اپنے چہروں کو آراستہ کیا۔

جسونت سنگھ اور کوشلیا دونوں انہیں رات کے ساڑھے بارہ بجے والی گاڑیوں پر سوار کرانے پر مامور ہوئے۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد سردار جسونت سنگھ نے کوشلیا کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھالیا اور پوچھا۔

”کوشلیا..... تم نے آج اپنی انگوٹھی نہیں پہنی کیا بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں بھراتا جی! پہنی تو تھی شاید کہیں بھیڑ بھاڑ میں گر گئی ہو“ کوشلیا نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”گرتی کیسے؟ تمہاری انگلی پر تو وہ بہت پھنس کے آتی تھی نا؟“

سردار جسونت سنگھ کا منہ سامنے کی طرف تھا اس لیے وہ قمری رنگ کے اس غبار کوند دیکھ سکا جو شفق شام کی طرح کوشلیا کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں پر چھایا جا رہا تھا۔

”بھراتا جی“ کوشلیا کی آواز کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا، جیسے تیر نکل جانے کے بعد کمان اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔

”چلو اس کی طرف چلیں میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”بھراتا جی؟“ کوشلیا حیرت اور احسان کے جذباتوں میں گڈمڈ ہو گئی۔

”ذرا میں بھی دیکھوں کہ وہ جانور ہے کس ڈھب کا۔ ولایت میں لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کی بڑے فخر سے نکال کر لیتی ہیں۔ میں تمہیں مارگریٹ براؤنی کا قصہ سناتا ہوں جو میرے ساتھ ہندوستان آنے پر جان دے رہی تھی۔“ سردار جسونت سنگھ یہ کہانی سنانے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ کئی جگہ راگبیروں، چھکڑوں، بلیوں، کتوں اور بکلی کے کھبوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ ”بھلا سوچو تو کوشلیا اگر میں اسے لے آتا تو بھائی جی جوتے مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا

دیتے دونوں کے۔ معلوم نہیں بے چاری کس حال میں ہوگی کل یا دو لانا میں اسے ضرور خط لکھوں گا۔“
 کوشلیا نے نہ تو مارگریٹ براؤنی کے حال زار پر کوئی خاص توجہ دی، نہ ہی سردار جسونت سنگھ کے خط لکھنے کی یاد دہانی کرائی کیونکہ اس کے دماغ میں اول تو ترلوچن سنگھ ہی بسا ہوا تھا اور اب اس کے علاوہ بھائی جی کے جو توں کا خیال بھی دوش بدوش ابھرا آیا تھا یوں سردار گوردیال سنگھ بڑے شفیق اور ہنس مکھ باپ تھے لیکن جہاں بچوں کی تعلیم یا تربیت یا چلن میں کسی قسم کا رخ نظر آئے وہ وہاں ان کا ہاتھ بے اختیار جو توں کی طرف لپکتا تھا۔ تنبیہ و سرزنش کا یہ فن انہوں نے اپنے پام تحصیلداری میں حاصل کیا تھا اور ان کے تجربہ کے مطابق یہ طریق کار بہت مؤثر تھا۔ گورڈن کالج کے ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر کوشلیا مونٹر سائیکل سے اتری اور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر اس نے ایک پتھر سے کئی بار اپنے مخصوص انداز میں ٹن ٹن کی، جیسے تار گھر کا بابو گر گر گٹ گٹ کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں نشر کیا کرتا تھا، ٹن ٹن کی آواز سن کر اوپر والے ایک کمرے میں روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ترلوچن سنگھ کھڑکی میں نمودار ہوا اور قریب لگے ہوئے پانی کے پائپ کو پکڑ کر اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ اس عمل میں اس کے دونوں ہاتھ اور گھٹنے زنگ آلودہ فل سے رگڑ کھا کر بری طرح شل ہو گئے تھے۔ نیچے پہنچ کر وہ لپکا کہ اپنی زخمی ہتھیلیوں کو کوشلیا کی خنک اور مشام نواز زلفوں میں چھپالے لیکن یکا یک اس کی نظر سردار جسونت سنگھ پر پڑی جو اپنی مونٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ترلوچن سنگھ کے قدم من من جیسے بھاری ہو گئے جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اچانک اسے منجمد کر دیا ہو حفظہ ما تقدم کے طور پر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور گرتے کے نیچے لگی ہوئی کرپان پر جا کے رک گیا۔
 ”ترلوچن آ جاؤ۔“ کوشلیا نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ میرے بھرا تا جی ہیں۔“
 ترلوچن سنگھ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار جسونت سنگھ کوشلیا کے برادر بزرگوار ہیں لیکن جو چیز اس کے دل میں بڑی طرح کھٹک رہی تھی وہ اس وقت ان کی یہاں موجودگی تھی کیونکہ ترلوچن سنگھ کے وہم و گمان میں یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کوئی بھائی رات کے ایک بجے اپنی بہن کو اس کے عاشق سے ملاتا پھرے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے سوچا چنانچہ کرپان پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی گئی۔ ”گھبراؤ مت“ اب سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”اگر تمہارے پاس چھانچ کی کرپان ہے تو میرے پاس 32 بور کا جرمن ریوالور ہے۔ لیکن میں تمہاری طرف بزدل یا گنوار نہیں ہوں۔ تم بے خوف و خطر یہاں آ جاؤ۔“
 ترلوچن آگے بڑھنے لگا لیکن کرپان پر اپنی گرفت نہ چھوڑی۔

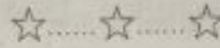
سردار جسونت سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ ”میرا نام جسونت سنگھ ہے ہاؤ ڈویوڈ مسٹر۔“
 ترلوچن سنگھ حیرانی، پریشانی اور تذبذب کے جال میں ایسا گرفتار تھا کہ اس وقت اسے ان رکی تکلفات کا ہوش نہ تھا۔ سردار جسونت نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی میں کوشلیا کا بھائی ہوں، مجھے دیکھا شاید تمہیں پہلے پہل یہ خیال آیا ہو کہ میں تمہارا سر قلم کرنے آیا ہوں اب ہمارے جانے کے بعد شاید تم سوچو گے کہ آدھی رات میں بہن کی دلائی کرتا پھر رہا ہوں دونوں خیال اس ملک میں بڑی آسانی سے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی کے بھی ذہنی تانے بانے کو بدل کر رکھ دوں۔ ہاں اگر تم ایک شریف آدمی کی طرح واقعی میری بہن سے محبت کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم یہاں چاندنی میں جی کھول کر باتیں کر سکتے ہو۔ میں گیٹ کے باہر اٹھا

کروں گا۔“ سردار جسونت موٹر سائیکل کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔
”تزلو چن!“ کوشلیا نے کہا۔

”کوشل!“ تزلو چن نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

چاندنی بھی چھائی ہوئی تھی اور قریب ہی پمپل کا وہ دانائے راز درخت تھا جس کی کہنہ سال آنکھ نے سال بہ سال نئی کوشلیاؤں اور نت نئے تزلو چنوں کے رومان پروان چڑھتے دیکھے تھے۔ اسی درخت کے سائے میں پیمان باندھتے اور ٹوٹتے تھے، یہیں حسن و محبت کی طلسماتی روایتیں اپنا سحر پھیلاتی تھیں۔ اس کی چھاؤں میں شاعری جنم لیتی تھی افسانوں کے جال بٹتے تھے۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں کو حیات جاودانی نصیب ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت کوشلیا اور تزلو چن کوئی اور بات نہ کر سکے انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سکول کے دور وٹھے ہوئے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا گیا ہو کہ گھنٹی کے فتم ہونے سے پہلے پہلے آپس میں صلح کر لو اور دروازے پر ماسٹر صاحب چھٹری لیے منتظر بیٹھے ہوں!

”نقوش“ لاہور افسانہ نمبر (جلد دوم)



صنم پلکیت

چپے کی بستی رات کے سکوت اور نیند کے خمار میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس گھٹی خاموشی میں صنم پلکیت ہولے ہولے، دبے پاؤں، سفیدے کی ایک نازک سی ٹہنی ہاتھ میں اٹھائے، ادھر ادھر دیکھتی جا رہی تھی۔ سرد ہوا کے تیز تیز جھونکوں میں اس کا ابھرا ہوا شباب اور نکھرا ہوا حسن اور بھی دمک اٹھا تھا۔ اس کی ایڑیوں تک لگی ہوئی سیاہ چوٹی ٹھوم ٹھوم کر برسات کی کالی بدلیوں کی طرح لہرا رہی تھی۔ آسمان پر چتکبرے ابر پارے پھریریاں لے رہے تھے۔ چودھویں رات کا نور سے لبریز چاند جلدی جلدی بادلوں کی اوٹ میں جا رہا تھا۔ جیسے وہ چپے چپے کی بھرپور دوشیزہ کے سامنے شرم رہا ہو۔

صنم پلکیت کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک دھیمسا نغمہ ناچ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی تان سوئی ہوئی ندی کے پُر سکون گیت کی طرح ہوا میں منتشر ہو کر گرم ہو جاتی تھی۔ مُعبد پیوس میں ابھی تک روشنی نظر آ رہی تھی اس کے بند دروازوں سے، موسم بہار کی ننھی ننھی پھوار کی طرح، پجاری کی پُرسوز، لرزتی ہوئی آواز پھوٹ کر فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ صنم پلکیت نے ایک لمحہ ساکت کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور پھر مُعبد کے ساتھ والے حجرے میں چلی گئی۔ حجرے میں ایک مدھم سا دیا ہولے ہولے دم توڑ رہا تھا۔ مُعبد پیوس کے بوڑھے پجاری کی رفیقہ حیات کلرانگ ڈولما دہ تین مندے اوڑھے مدھوش سو رہی تھی۔ صنم پلکیت نے سمجھتے ہوئے چراغ میں مکھن ڈال کر اسے تازہ زندگی بخشی اور پھر کلرانگ ڈولما کو آہستہ سے ہلا کر جگایا۔

”ماں..... مقدس ماں.....“

”تم؟ صنم پلکیت؟“ بڑھیا اپنی خوابیدہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی، نوخیز حسینہ کا سینہ زور زور سے ہانپ رہا تھا اور اس کی وحشی آنکھوں میں ایک عجب سی بے قراری تھی۔ کلرانگ مسکرانے لگی ”اچھا ہوا بہت اچھا ہوا، چپے چپے پر چمکنے والے تاروں کی قسم، مجھے معلوم تھا کہ تم کسی رات ضرور مجھے جگاؤ گی۔ مجھے معلوم.....“

”ماں..... مقدس ماں.....“ صنم پلکیت پجارن کے کندھے پر سر رکھے کپکپا رہی تھی۔ اس کی مست مست تیرنی ہوئی آنکھوں کی وحشت لُختہ لُختہ بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا..... چپے پر برسنے والے بادلوں کی قسم..... کلرانگ اپنی دھن میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم تھا..... نو جوان لڑکیاں ضرور گھبراتی ہیں۔ احمق چھو کر یاں! خواب سے بے تاب ہو جاتی ہیں..... ہی ہی ہی..... بیٹی تیرے شباب کی راتیں محبت کے تاروں سے ٹٹمنا میں مجھے بتا تو سہی مقدس لھانے تجھے کس خواب کی عروس بنایا ہے؟“

”ماں میرے دل میں میٹھی میٹھی خوشی تڑپتی ہے، جیسے.....“

”مجھے معلوم ہے..... سب کچھ معلوم ہے..... لیکن وہ خواب کیا ہے بیٹی؟“

صنم پلکیت نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانپتے ہوئے سینے کو سنبھالا پھر اس نے دھیمی آواز میں رک رک کر، رازدارانہ لہجے میں اپنا خواب سنایا..... یہ وہ خواب تھا، جس کی جھنجھوڑ تہت کی معصوم دوشیزاؤں میں جوانی کا پہلا احساس بگاتی ہے۔ عمر کے پندرہویں سال تک خداوند لہا ہڑکی کے دل کو جنسی محبت کے آتشیں جذبات سے خالی رکھتا ہے۔ اس عمر کے بعد جب بڑھتی دوشیزہ کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تیز ہونے لگتی ہے اور اس کی رگوں میں خون تازہ حرارتوں سے گرم مانے لگتا ہے تو ایک لطیف رات، جبکہ چاند سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتا ہے۔ خداوند لہا کسی تمثیلی خواب کے ذریعے اس کی جوانی کی لہروں کو متلاطم کر دیتا ہے۔ نو دمیدہ دوشیزہ کے لیے یہ سہاگ کی پہلی رات ہوتی ہیں کیونکہ اس شب خداوند لہا کے حکم سے وہ خواب میں کسی فوق الفطرت روحانی طاقت کی عروس بنتی ہے لیکن صنم پلکیت کا خواب سن کر کلرانگ انسرہ ہو گئی کیونکہ صنم کے خواب کا دولہا آسمان سے مضطرب لہروں کی کوئی ضیا پاش جلی نہ تھی بلکہ ایک حسین، بے حد حسین نوجوان تھا جس کا کشادہ سینہ گرتی ہوئی آبشار کی شفاف آبی چادر کی طرح خوبصورت تھا جس کی پیشانی چودھویں کے چاند سے بھی پُر نور تھی صنم پلکیت کے شرمائے ہوئے گالوں پر اس نوجوان نے گرم گرم بوسوں کا مینہ برسایا اور پھر اس کی لہرائی ہوئی چوٹی کو اپنی گردن میں ڈال کر ناپنے لگا..... لیکن جب بادلوں کے فرش پر بجلی کے تاروں سے بنی ہوئی عروسی سچ عشق بیتاب کو حسن کی سکوں پر ور چاندنی میں سلانے والی تھی تو آہ! وہ دلربا نوجوان پلکیت کے پہلو سے غائب ہو گیا..... ”ماں“ جس طرح چاند کی کرن بادلوں میں کھوئے..... مقدس ماں! جیسے پانی کی لہر پھل کر مٹ جائے..... پھر نہ ملے۔“ کلرانگ ڈولما دونوں ہاتھوں سے اپنا کپکپاتا ہوا سر تھامے متکبرانہ سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔ کمرے کا چراغ پھر اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا اور..... صنم پلکیت کے لمبے لمبے بے قرار سانس میں لپٹی ہوئی ایک دھیمی سی آواز کہہ رہی تھی۔ ”معبود بیوس کی اچھی ماں! یہ میٹھی میٹھی خلش کیا ہے؟ جس طرح ننھی ننھی بوندیں تالاب میں گر کر بلبلوں میں گر کر بلبلوں کی ہلکی ہلکی لہریں بناتی ہوں.....“ ”تم جا کر سو جاؤ، بیٹی“ آخر کار ڈولما نے صنم پلکیت کی طرف حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا..... ”گھر جا کر سو جاؤ..... دو روز کے بعد گوپہ ماٹھو کا نغرا نگ ہوگا وہاں جا کر مقدس لہا سے پوچھنا کہ تمہارا خوبصورت نوجوان کہاں ہے.....“

گوپہ ماٹھو کا سالانہ میلہ نغرا نگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس روز تین ریاضت چلہ کش عاملوں پر لھا یعنی دیوتا کا حضور ہوتا ہے اور وہ زائرین کے سوالوں کا جواب دیتے اور ان کی مرادوں کا نتیجہ بتاتے ہیں.....

گوپہ کے دروازے کے سامنے ایک کھلا صحن تھا جس میں برآمدے بنے ہوئے تھے ایک برآمدہ میں کو شوک گوپہ کے سب سے بڑے لامہ کا لقب) اور دوسرے لامہ درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے تھے دوسری طرف ڈھول تری، جھانچ اور سرنائی بجانے والے لامہ قطار در قطار بیٹھے تھے۔ پوسینیوں اور چوغوں میں لپٹے ہوئے زائرین کا ہجوم، گردن جھکائے، خاموش اور ساکت بیٹھا تھا لیکن زنانہ برآمدے میں دھیمی دھیمی باتوں کا ہلکا سا شور ہو رہا تھا۔ ضعیف العمر، بوڑھی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اپنی اپنی خواہشوں اپنی اپنی مرادوں کو سینے میں چھپائے لہا کے ظہور کے لیے بے تاب تھیں۔ کالے رنگ کی خوشنما پیشواؤں کے اوپر انہوں نے بکری کا چمڑا، بالوں کو اندر کی طرف رکھ کر، اوڑھا ہوا تھا۔ ان کے سر پر قسم قسم کے جواک نئی بہار دکھا رہے تھے۔ پیرا کوں میں چاندی، سونے کے زیورات اور فیروزے جڑے ہوئے تھے ان کی نوک پیشانی کے اوپر تھی اور یہاں سے کانوں سے لپٹی ہوئی پیٹھ تک چلی جاتی تھی۔ لیکن صنم پلکیت کے سر پر کوئی پیراک نہ تھا

چے چے کی آبادی حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی..... صنم پلکیت کا پتھر بن جانا اور ایک روحانی نو جوان کا رات دن اس کے سامنے رقص کرتے رہنا..... یہ کیا تھا؟ بوڑھی کھڑا نگ دولما خود بھی حیران تھی لیکن مُعبد پیوس کے پجاری کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے کچھ معلوم تھا! ”یہ سب ضد ہے“ وہ اپنا کانپتا ہوا سر ہلا کر پُراسرار لہجے میں کہا کرتی تھی..... یہ ”سب ضد کا نتیجہ ہے“..... ہی ہی ہی..... خداوند لہا سے ضد! جب تک روحانی نو جوان نے ضد کی کہ وہ صنم پلکیت کے حسن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا کر لے اس وقت تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں تشنہ کام و تشنہ روح تڑپتا رہا..... ہی ہی ہی..... اور جب صنم پلکیت نے ضد کی کہ اس کے پہلو والا خوبصورت جوان اسے مل جائے تو وہ پتھر بن گئی اور روحانی جوان انسان بن گیا..... ضد؟ بے وقوف لڑکی..... مجھے معلوم تھا..... مُعبد پیوس میں جلنے والے چراغ کے مکھن کی قسم..... آسمان سے ضد.....

یہ افسانہ ”نفسانے“ سے لیا گیا جو 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی

☆.....☆.....☆

فرازونی

قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مصر کی انقلابی حکومت نے حاجیوں کی آمد و رفت کے لیے نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے ہوئے ہیں۔

قاہرہ سے ہر روز ایک یا دو ہوائی جہاز طور اور مدینہ کے راستے پرواز کرتے تھے اور ہر تیسرے روز ایک سمندری جہاز بھی جدہ کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ وزارت داخلہ کا جو افسر حاجیوں کی دیکھ بھال پر مامور تھا اسے انگریزی نہیں آتی تھی میری درخواست دیکھ کر وہ ہنسا۔

میں نے معذرت کی کہ ”مجھے عربی زیادہ نہیں آتی اس لیے درخواست انگریزی میں لکھنا پڑی۔“

”آپ کی اپنی زبان کیا ہے؟“ افسر نے پوچھا۔
”اردو“۔

افسر نے ایک سادہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ”اگر زحمت نہ ہو تو آپ اس کاغذ پر اپنی درخواست اردو میں لکھ دیں۔“

میں نے لکھ دی، درخواست لے کر افسر نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے ایک مصری جہاز ’السوڈان‘ میں جدہ تک سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت نامہ بنا کر اس نے میرے لیے کافی منگائی۔
کافی پی کر میں نے اس سے پوچھا..... ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔“
”بڑی خوشی سے“ افسر نے۔

میں نے دریافت کیا کہ وہ اگر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں سے ناواقف ہے تو میری درخواست اردو میں لے کر اسے کیا سہولت ہوئی۔

”سوال سہولت کا نہیں۔“ افسر نے جواب دیا۔ ”سوال دراصل اصول کا ہے۔“ اصول کی وضاحت اس نے ٹھنڈے دل سے کی۔

یہ افسر عربی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن زبان سے بھی واقف تھا۔ اپنے مصری بھائیوں کے ساتھ وہ جس زبان میں چاہے بات کر لیتا تھا لیکن غیر ملکوں کے ساتھ وہ خالص عربی میں بات کرتا تھا۔ اس دستور کو نبھانے میں بعض اوقات اسے کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اپنے عہدے کی رعایت سے اسے غیر ملکی سفارت خانوں کی اکثر تقاریب میں شامل ہونا پڑتا تھا اور بسا اوقات

وہ کئی کئی گھنٹے ان پارٹیوں میں بغیر بات چیت کیے گزار دیتا تھا حالانکہ وہ ان کی باتیں سمجھتا تھا اور اکثر ان کی زبان میں جواب بھی دے سکتا تھا لیکن اپنے اصول کے مطابق وہ عربی بولنے پر مجبور تھا۔ عام طور پر کوئی عربی دان غیر ملکی وہاں موجود نہ ہوتا۔

اس افسر نے بڑے جذبہ سے ایک دلچسپ واقعہ سنایا:-

میں نے کئی فرانسیسی کتابوں کا ترجمہ مصری زبان میں کیا ہے ایک روز فرانسیسی سفیر اور اس کی بیگم نے مجھے چائے پر مدعو کیا۔ چائے پر کوئی گھٹنا بھر گفتگو ہوتی رہی سفیر اور اس کی بیگم فرانسیسی زبان بولتے رہے اور میں عربی، بد قسمتی سے اس وقت کوئی ترجمان بھی موجود نہ تھا چنانچہ وہ میری ایک بات بھی سمجھ نہ پائے۔

”اب وقت آ گیا ہے“ افسر نے بڑے ولولے سے کہا کہ ”مشرقی اقوام بھی اپنے تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی زبان پر زندہ قوموں کی طرح فخر کریں۔“

جذبہ قومیت کی یہ عجیب شدت مختلف سطحوں پر مختلف روپ دھار لیتی ہے۔ اس افسر کی طرح ایک ماہر السنہ کے ہاں یہ جذبہ عربی زبان کی فضیلت سے عبارت تھا۔

حاجی رضا علی موسیٰ کی دکان میں یہ جذبہ ایک اور رنگ میں نمایاں تھا۔ یہ دکان قاہرہ کے ایک بے حد تنگ اور گنجان بازار میں واقع تھی۔ اس بازار میں چٹائیاں، جوتے، اچار، ہلدی، مرچ، مسالہ، شربت، کباب اور تر بوز کی کئی ہوئی قاشیں برسر عام ساتھ ساتھ فروخت ہو رہی تھیں۔

حاجی رضا علی موسیٰ کی دکان کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ پرانی اور بوسیدہ کتابوں کے انبار بھی لگے تھے ایک کونے میں قدیم مصری نواد کا مجموعہ بھی تھا۔ پھلوں میں ایک ٹوکری آموں کی بھی تھی۔

”یہ میوہ ہندوستان سے آیا ہے یا پاکستان سے“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں“ حاجی موسیٰ نے براہمان کر کہا۔ ”یہ پھل مصر میں پیدا ہوا ہے پھر اس نے بڑی محنت سے باری باری مجھے وہ پھل اور سبزیاں دکھائیں جو وادی نیل کی خاص پیداوار ہیں۔ ان پھلوں اور سبزیوں میں انار بھی تھے، انگور بھی، آلو، لوکی اور چندر بھی اور جس انداز سے حاجی موسیٰ مجھے ان سے متعارف کر رہا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب اگر میں یہ کہوں کہ یہ چیزیں دنیا کی کسی اور سرزمین پر بھی پیدا ہوتی ہیں تو حاجی موسیٰ بہت برا مانے گا اور سمجھے گا کہ میں اب نیل کی بے حرمتی کر رہا ہوں۔“

حاجی رضا علی موسیٰ کی دکان میں جو نواد تھے وہ اکثر فرامین کے مقبروں سے نکلے ہوئے زیوروں، برتنوں، نقش سلوں وغیرہ پر مشتمل تھے اور حاجی رضا علی کا بیٹا جو بیروت یونیورسٹی کا انڈر گریجویٹ تھا بڑی فصاحت سے گاہکوں کو ان نواد کی مدد سے مصر کی شاندار تہذیب کا پس منظر سنایا کرتا تھا۔ قاہرہ اور اسکندریہ کی فیشن ایبل دکانوں میں عورتوں کے زیورات کے نقش و نگار کار حجان بھی فرامین کی ملکہ کے زیورات کی طرف مائل تھا اور ترمین و آرائش کے جملہ لوازمات صریحاً ان خطوط کی پیروی کر رہے تھے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے مصر کی تہذیب و تمدن کا طرہ اقباز تھے۔

اگر آپ مصر کی اصلی اندرونی زندگی دیکھنے کا قصد ظاہر کریں تو قاہرہ کے سند یافتہ گائیڈ آپ کو فوراً ایک خاص

رہستوران میں لے جاتے ہیں جو باہر سے قدرے غیر آباد نظر آتا ہے، اندر ایک چوکور کمرہ ہے جس کے دروازوں پر سرخ بانٹ کے پردے لٹک رہے ہیں، دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے لگے ہیں اور فرشی نشستوں کے سامنے کھانا کھانے کے لیے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں دھری ہیں۔ کمرے میں بے حد مدہم روشنی ہے دیواروں پر چاروں طرف فرعونی مقبروں کے اندرونی مناظر کی تصویریں اور علامتیں آویزاں ہیں، پردوں کے پیچھے کسی جگہ کوئی پراسرار آرکسٹرا ہے جو نظر نہیں آتا، اس کی دھن پر ایک لڑکی آپ کے سامنے بل کھا کھا کرنا چنے لگتی ہے لڑکی کی کمر اور پنڈلیاں اور بائیں کھلی ہیں اس کے باقی جسم پر جو باریک سالباں ہے وہ پرانی تصویروں کے مطابق فرامین کی ملکہ کے دربار کی لونڈیاں پہنا کرتی تھیں۔

اگر آپ خوش قسمت ہیں تو رہستوران کے عملے میں سے ایک خوش پوش معزز نما آدمی آپ کے پاس آکر بیٹھ جائے گا اور سرگوشیوں میں اس لڑکی کے ناچ پر محققانہ تبصرہ کرنے لگے گا۔ یہ ناچ طوطیوں کے بیٹے شہزادہ ائیمیز کے دربار کی محبوب رقاصہ کا خاص ناچ ہے۔ بڑی محنت سے کوئی دس بارہ مقبروں کے اندرونی نقش و نگار کی تحقیق کے بعد اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ مسیح سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل شہزادہ ائیمیز اپنے باپ کی افواج کا پہلا سالار تھا اور جب وہ سیر و سیاحت کے لیے سفر اختیار کرتا تھا اس کے جلو میں ایک ہزار ایک رقاصاؤں کا لشکر بھی پایہ رکاب ہوتا تھا۔

اگر آپ کے دل و دماغ پر اس ناچ اور تبصرے کا اثر خاطر خواہ ہو رہا ہے تو یہ خوش پوش معزز نما آدمی بڑی رازداری سے اپنی جیب سے ایک البم نکال کر آپ کے ہاتھ سے دامن فروخت کرنے کی پیشکش کرے گا۔ اس البم میں بے حد عریاں اور فحش تصویریں ہیں اور ان تصویروں میں فرعونوں کے اٹھارہویں خاندان کی عیش کوشی کے بے حد خفیہ راز پوشیدہ ہیں۔

تصویروں کے بعد یہ خوش پوش معزز نما آدمی آپ کو چند مقوی طلا اور تیل خریدنے کی ترغیب دے گا۔ جن کے نئے تین تین ہزار سال پرانے مقبروں کے کتبوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

چوڑیاں ہوں یا بندے، ہنریاں ہو یا قدیم نواور، جنسی تصویریں ہوں یا مقوی ادویات قاہرہ کی ہر نئی خصوصیت فرعونوں کی تہذیب سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کرتی ہے۔ مصری عوام کی نظر میں یہ رشتہ کسی صورت سے بھی باعث فخر نہیں۔ عوام مصر میں ہوں یا شام میں یا عراق یا ایران یا پاکستان میں ہر جگہ وہ بے چارے سیدھے سادے مسلمان ہیں لیکن دراصل بات تو اس پڑھے لکھے طبقے کی ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ یہ طبقہ سارے مشرق وسطیٰ میں بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی تربیت میں سب سے زیادہ ہاتھ اس شدید رد عمل کا ہے جو مذہبی عقیدوں اور ماؤرن مادی قدروں کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً فرازونی اس طبقے کی بے حد دل کش نمائندہ تھی۔

ادھر

فرازونی سے میری ملاقات اس کے باپ کے گھر میں ہوئی۔ فرازونی کا باپ سوڈان کا رہنے والا تھا اور درویشوں کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کے متعلق کئی ایک قصے مشہور تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کے پاس مصر کا قدیم جادو سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے

کہ وہ ایک بہت بڑا روشن ضمیر ولی اللہ ہے لیکن جو لوگ اس کی جادوگری یا ولایت کے قائل نہیں تھے وہ بھی اس کے علم و فضل کو تسلیم کرتے تھے۔

قاہرہ کے جس حصے میں اس کی رہائش تھی اس کا نام امام شافعی ہے۔ اس علاقے میں اینٹوں اور سیمنٹ کے بے شمار پختہ مکان سلسلہ وار بنے ہوئی ہیں اور ان کی تعمیر میں ایک غیر معمولی یکسانیت نمایاں ہے۔ دیکھنے میں تو یہ رہائشی نظر آتے ہیں لیکن دراصل یہ سارے کا سارا محلہ امیروں کا قبرستان ہے۔ قاہرہ کے کھاتے پیتے لوگ اپنے مردوں کو عوامی قبرستان میں دفنانے کے قائل نہیں ہیں۔ جس طرح آج سے کئی ہزار سال پہلے شاہان مصر اپنی قبروں پر بڑے اہرام تعمیر کرتے تھے اسی طرح قاہرہ کے امراء آج بھی اپنی لاشوں کی تدفین کے لیے پکے کمروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر خاندان کے لیے ایک الگ چار دیواری ہے اس کے اندر ایک کشادہ صحن ہے جس کے نیچے دوزمین دوز کمرے ہیں۔ ان میں سے ایک کمرہ مردوں کی لاشوں کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔

جب کبھی کوئی نئی میت تیار ہوتی ہے تو پرانے مردے کی ہڈیاں سمیٹ کر ایک کونے میں جمع کر دی جاتی ہیں اور نئی لاش کو ان تہہ خانوں میں لے جا کر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تہہ خانوں کے دروازے کو بڑی بڑی سلوں کے ساتھ پاٹ دیتے ہیں اور جن سیڑھیوں کے ذریعے ان زمین دوز کمروں میں اترا جاتا ہے ان کے بالائی حصے کو بھی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ باہر صحن کے کونے میں بھی ایک باقاعدہ کمرہ بنا ہوتا ہے خاندان کے لوگ بعض تقاریب پر یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ فاتحہ درود پڑھا جاتا ہے، قرآن خوانی ہوتی ہے اور یوں تو رات کے وقت شہر کے عام لوگ بھی ان کمروں سے اور بھی بہت سے کام لینا جانتے ہیں۔

اس انوکھے شہر خموشاں میں کسی جیتے جاگتے انسان کا گھر تلاش کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بہت تلاش کے بعد جب میں نے ایک دروازے پر دستک دی تو دستک کی آواز آس پاس کے مکان نما مقبروں میں گونج کر ساکت ہو گئی۔ چند لمحات سکون طاری رہا پھر اندر سے اونچی ایڑی والے جو توں کے چلنے کی آواز سنائی دی اور جس نے دروازہ کھول کر مجھے حیرت سے دیکھا وہ فرازونی کا باپ نہیں تھا بلکہ فرازونی خود تھی۔

”آپ کون ہیں!“ فرازونی نے پوچھا۔

”میں پاکستان سے آیا ہوں اور آپ کے والد محترم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”آئیے تشریف لائیے۔“

فرازونی مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جس میں ایک تخت پوش پر قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد بید کی چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

فرازونی نے ہاتھ اٹھا کر تالی بجائی، تالی کی آواز سن کر ایک حبشی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ فرازونی نے اسے قہوہ لانے کو کہا۔

”میں نے ان کے علم و فضل کا بہت چرچا سنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ اصلیت چھپار ہے ہیں۔“ فرازونی نے طنزیہ ہنس کر کہا۔ ”علم و فضل کا چرچا سننے والے لوگ اکثر جامعہ

الازہر جایا کرتے ہیں۔“

230
شہاب

فرازونی کا تجربہ تھا کہ عام طور پر لوگ اس کے باپ کے پاس علم و فضل کے بہانے آیا کرتے تھے اور ملاقات ہوتے ہی اس سے کشف و کرامات کی فرمائش کرتے۔ ان میں بادشاہ بھی ہوتے تھے، شہزادے بھی، مرد بھی، عورتیں بھی۔ امیر بھی، غریب بھی۔

”کیا آپ بھی میرے والد کو جادو گریا ولی سمجھ کر یہاں آئے ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔
”پہلے تو مجھے ایسا خیال نہ آیا تھا“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہاں پہنچ کر یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے والد محترم ضرور بہت بڑے جادوگر ہیں۔“
”وہ کیسے؟“ فرازونی نے پوچھا۔

”یہ جادو کیا کم ہے۔“ میں نے جواب دیا ”کہ وہ آپ جیسی خوبصورت اور ذہین لڑکی کے والد ہیں۔“
فرازونی شرما کر مسکرانے لگی۔ حبشی ملازمہ قبوے کی ٹرے لے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے فرازونی کا باپ بھی کمرے میں آ گیا تھا اور اس نے میری بات سن لی تھی۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے میری تائید کی۔ ”واقعی فرازونی جیسی بیٹی کا باپ ہونا بھی ایک طلسماتی معجزہ سے کم نہیں ہے۔“

فرازونی کا باپ 60، 65 برس کا وجیہہ اور منس کھ بزرگ تھا۔ اس کا رنگ گندھے ہوئے میدے کی طرح سفید اور ملائم تھا۔ اس کی داڑھی سنہری اور فرنج کٹ تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک اور سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں عجیب سی کشش تھی جب وہ آنکھیں اٹھا کر دیکھتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے مقناطیسی شعاعیں نکل کر سارے کمرے میں پھیل رہی ہوں۔

مصر میں جادوگری خلاف قانون ہے۔ فرازونی کے باپ پر دو مرتبہ ان الزامات پر مقدمہ چل چکا تھا کہ وہ پانی کو بغیر آگ کے اُبال سکتا ہے، گمشدہ عورتوں اور بچوں کا سراغ لگا لیتا ہے اور دوسرے لوگوں کے دل کی باتیں معلوم کر لیتا ہے۔ دونوں مرتبہ عدالت نے اسے بری کر دیا تھا۔ عدالت کو اس امر کا اعتراف تھا کہ فرازونی کا باپ چند غیر معمولی اور مافوق الفطرت کمالات کا مالک تھا لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہ مل سکا کہ وہ اپنی ان قوتوں کو جادو کے طور پر کسی کو نقصان پہنچانے یا روپیہ کمانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کے برعکس عدالت کے سامنے جو گواہ پیش ہوئے وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ فرازونی کا باپ ایک درویش صفت، نیک سیرت اور خدا ترس انسان ہے اور اپنی کشف و کرامت کو دوسروں کی خدمت کے لیے کام میں لاتا ہے۔

”اگرچہ عدالت نے مجھے دو مرتبہ بری کر دیا ہے“ فرازونی کے باپ نے زہر خند کر کے کہا ”لیکن قانون کا باز اب بھی اکثر میرے دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔“

میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اگر یہ شخص دوسروں کے دل کی باتیں جاننے پر قدرت رکھتا ہے تو اسے ابھی تک یہ معلوم کیوں نہیں ہوا کہ میں اس کی کرامات کا کچھ مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

فرازونی کا باپ میری طرف دیکھ کر مسکرایا..... ”میرے پاس کوئی ایسی کرامت نہیں جسے دکھا کر میں آپ کی خواہش پوری کر سکوں۔“

پھر اس نے تالی بجا کر حبشی ملازمہ کو بلایا اور اسے کچھ اور قبوہ اور انڈے لانے کو کہا۔

ملازمہ ایک خالی دیکھی اور تین انڈے لے آئی۔ فرازونی کے باپ نے انڈے دیکھی میں رکھ کر ایک صراحی سے اس میں پانی انڈیلا۔

”آپ کو سخت اُبلّا ہوا انڈا پسند ہے یا نرم“ فرازونی کے باپ نے پوچھا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کیوں نہ ”سخت اُبلّا ہوا انڈا مانگوں۔“

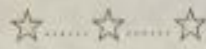
”انشاء اللہ آپ کو ایسا سخت اُبلّا ہوا انڈا دوں گا کہ آپ چاہیں تو اس سے کرکٹ کھیل سکیں۔“ فرازونی کے باپ

نے ہنس کر کہا۔

دیکھی کو ایک گتے کے ٹکڑے پر رکھ کر فرازونی کے باپ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو پانی میں ڈبو دیا۔ دیکھی میں پہلے کچھ بلبلے اٹھے، پھر سوسوں کی آواز آنے لگی، پھر بھاپ نمودار ہوئی اور اس کے بعد پانی باقاعدہ کھولنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کھولتے ہوئے پانی میں فرازونی کے باپ کی انگلی بھی بُری طرح جل جائے گی۔ لیکن جب اس نے انگلی باہر نکالی تو اس پر کسی قدر سرخی کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔

”لیجئے نوش جاں کیجئے۔“ فرازونی کا باپ میری طرف دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔

29 اکتوبر 1961ء ہفت روزہ ”لیل و نہار“ لاہور



ماما

دوسرے کمرے سے ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ماما اپنی کونٹری کے درتے میں بیٹھی ہوئی سوئی میں دھاگہ ڈال رہی تھی وہ جتنی بار سوئی کی نا کے پر ٹنگی باندھنے کی کوشش کرتی، اس کی آنکھوں میں کنڑی کے چالے سے تن جاتے اور اس کو یوں نظر آنے لگتا جیسے ہوا میں رنگ رنگی پتلیاں سی گھوم رہی ہوں۔ صابن کے بلبلوں کی طرح سرخ سرخ، نیلے نیلے، سبز، بھنور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے..... اور پھر یکا یک ایک ٹین اندھیرا چھا جاتا..... ماما کے ہاتھوں میں بھی ایک کمزوری کپکپاہٹ رہا کرتی تھی اور کبھی تو وہ بیٹھے ہی بیٹھے پسینے میں شرابور ہو جاتی تھی.....

اس نے سوئی اور دھاگے کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا اور پھر اپنے کرتے کے دامن سے پسینہ پونچھنے لگی۔ اس کے بال ادھ پکے ہو گئے تھے اور اس کے منہ پر جھریوں کے ساتھ ایک میلی کچیلی پیلاہٹ سی چھا گئی تھی۔ جب اسے پسینہ آتا تو اس کے چہرے کے مونے مونے مسام کھل کر ابھر آتے اور پھر یوں نظر آنے لگتا جیسے کسی پھٹی پرانی پتھر دانی کا ٹکڑا گد لے سے پانی میں بھیگ گیا ہو.....

دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز مدھم ہوئی اور ایک مترنم آواز نے اس کو بلایا..... ”ماما“ ماما تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کے گھٹنوں میں ایک کمزوری کٹکٹاہٹ ہوئی اور پھر اس کی پنڈلیوں میں گوبا چیونٹیوں کی ایک لمبی سی قطار ریگنے لگی، وہ لڑکھرائی اور دروازے کا کواڑ تھام کر ذرا زور سے پکارا۔ ”آتی ہوں بیگم“ ماما نے جواب دیا اور پھر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

بیگم نے ذرا غصے سے کہا۔ ”اے ہے ماما، یہ کیا بات ہے؟ برسوں سے پکار رہی ہوں تم کو“ بکلی کی تیز روشنی میں ماما کی آنکھوں کے چالے کچھ مدھم پڑ گئے اور وہ بیگم کے گالوں پر گلابی ڈورے سے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گئی۔ صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ غصے کے جوش میں بیگم کی دلکشی میں گلاب کھل جاتے ہیں۔ بیگم نے ٹیلی فون کا ریسور ہاتھ سے رکھ دیا اور ذرا نرمی سے بولی۔ ”دیکھو ماما“ صاحب نے دفتر سے فون کیا ہے کہ ان کو چھٹی مل گئی ہے، اب ہم کل پہلی گاڑی سے دارجلنگ روانہ ہو جائیں گے..... اُف، یہ گرمی، بیگم نے بخلی بھر کے سے پیشانی مل کر کہا۔

”اللہ جانے آج اتنا مس کیوں ہے؟“ بیگم کچھ نڈھال سی ہو گئی۔

”ذرا پگھلاتیز کر دوں؟“ ماما نے دیوار پر لگے ہوئے سوچ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ماما، بیگم شکستہ سی ہو کر بولی۔ ”یہاں یہ مصیبت کیا کم ہے پکھا تیز ہو تو اس ریڈیو میں پلچل مچ جاتی“

اللہ ماری گرمی کیا ہوئی مستقل دوزخ بن گئی۔“

”میں ابھی تازہ لیموں کا شربت لاتی ہوں بیگم، طبیعت سنبھل جائے گی۔“ رہنے دو، ماما، بیگم نے کہا۔ ”کوئی یہاں تک شربت پیتا جائے۔ گاڑی صبح چھ بجے چھوٹی ہے تم راتوں رات میرا سامان درست کر دو۔ صاحب کا کام بھرا کرے گا۔“

”جی اچھا، بیگم۔“

”ایک ہی مہینے کے لیے تو جانا ہے۔“ بیگم نے لمبی آواز کر کے کہا۔ ”زیادہ سامان لاؤنے پھاندنے کی ضرورت نہیں۔ کپڑے چھانٹ کر چڑے کے سوٹ کیسوں میں ڈال دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”نہیں ماما۔“ بیگم نے نرمی سے کہا۔ ”تم سے اتنا کام ہوگا، بھلا؟ میں ابھی آتی ہوں، تم چلو۔“

ریڈیو میں کوئی دھیمے دھیمے سُر میں ستار بجا رہا تھا بیگم نے تھکے ہوئے انداز سے ٹھنکی پھر کالوں پر پھیرا، اور سوئے پر نیم دراز ہو گئی۔

ماما کی آنکھوں کے سامنے مکڑی کے جالوں کی بجائے اب رنگ برنگ کی ساڑھیاں، ریشمی دوپٹے اور ٹھنکی قمیضیں تھیں۔ جب اس کی انگلیاں کپڑوں کی نرم نرم، گداز گداز تہوں میں جھنس جاتیں تو اسے ایک قسم کا سکون سا محسوس ہوتا اور وہ سوچتی کہ بیگم کے چہرے پر بدن پر جو گلاب کے پھول کی طرح ملائم اور مشکبار جلد ہے اس کے لیے ایسے ہی نرم اور گداز کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس نے اپنے کھدر کی قمیض کے دامن سے چہرے کا پسینہ پونچھا اور شلواریوں کی تہ لگا کر صندوق میں رکھنے لگی۔ بار بار اٹھنے بیٹھنے سے ماما کی ٹانگوں میں کپکپی ہونے لگتی، اور جب وہ کسی بھاری صندوق کو زور لگا کر کھینچتی تو اس کے منہ پر پسینے کا سیلاب سا آ جاتا اور بدن کی ہڈیاں ٹوٹے ہوئے ستار کے تاروں کی طرح جھنجھنا اٹھیں۔ لیکن پھر یکا یک کسی ساری یا شلواری کی تہ سے بیگم کے سینٹ کی بھینی بھینی پٹیش نکل کر ماما کے دماغ پر نشے کی طرح چھا جاتیں۔

”اہو، ماما۔“ بیگم ایک جوان مرغابی کی طرح تیرتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ”تم نے بہت سا کام سمیٹ لیا مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ صاحب آگئے تھے میں ذرا ٹھہر گئی۔“

”آپ جانیے نا بیگم، میں سب کام کر لوں گی۔“ ماما نے ملتجیانہ کہا۔ وہ اپنے صاحب کو جانتی تھی، جو بیگم کے بغیر کمرے میں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر گھوم رہے ہوں گے۔“

”نہیں ماما، بیگم نے پھر نرمی سے کہا۔ ”تم یہ سب کام کیسے کر سکو گی بھلا؟ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔“

بیگم گدے والے دیوان پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظر اپنے رنگ برنگے مختلف کپڑوں پر مچلنے لگی ہر نئی ساڑی، ہر نئی قمیض، ہر نئی شلوار کے ساتھ کسی چھوٹے سے رومان کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ننھے ننھے، معصوم سے رومان جو بیگم کی زندگی میں آسمان کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے وہ اپنی سوسائٹی میں شمع انجمن کا درجہ پاتی تھی اور اب یہ جوان شعلہ اورنگ کی رنگینیوں میں چمکنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ دارجلنگ! بیگم نے مسرت آمیز شوق سے سوچا۔ اونچی اونچی

شاداب پہاڑیوں پر پکنک، صبح سویرے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں گھوڑے کی سواری، چائے کی پارٹیاں، پُر تکلف ڈنر، کھب کی خوش گپیاں..... اور پھر بیگم خود رنگینی محفل کی جان..... لیکن اُف گرمی! آج اس ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے، پکنک کی ہوا بھی لو ہو گئی اور یہ ماما؟ معاذ اللہ کیا مردہ دلی سی کام کر رہی ہے ایک ہاتھ کمر پر ہے، دوسرے ہاتھ میں کپڑے الجھ رہے ہیں۔ بھلا ایسے بھی کام چلے گا؟ اور یہ گرمی! بیگم کو کچھ غصہ سا آنے لگا۔

”سنو تو ماما“۔ بیگم نے اس کے ہاتھ سے کچھ کپڑے چھین کر کہا۔ ”بھلا اوئی شال تم کا ہے کو صندوق میں ٹھونس رہی ہو؟ آسمان سے آگ تو پہلے ہی برس رہی ہے۔“

ماما نے شالیں اٹھا کر الگ کر دیں۔

کچھ گرمی کی وجہ سے، کچھ چڑچڑاہٹ سے بیگم کے چہرے پر پسینے کی پھواری پڑ گئی جیسے ہلکی گلابی رنگ کے بلور دھند کی نمی چھا جائے۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انگڑائی لی، اور جی چاہا، کہ اپنی رعنائیوں پر خودی فریفتہ ہو جائے۔

ایک، دو، تین..... ماما ریشم کے بلاؤز گن رہی تھی۔ ”دو درجن بلاؤز رکھ لوں، بیگم؟“ اس نے کمزوری آواز میں پوچھا۔

”ہاں ماما رکھ لو۔“ بیگم نے آئینے کے سامنے سے جواب دیا۔

ماما بلاؤز گن رہی تھی اس کے جوڑوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں بار بار جھکنے سے اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ آ گئی تھی، اور اب اس کی سانس بھی پھول گئی تھی، وہ اکھڑی اکھڑی سی سانس.....! بس ایک اسی سانس کے سہارے اس نے زندگی کے ساٹھ سال گزار دیے تھے۔ ساٹھ طویل اور پیچیدہ سال جو ایک دائمی الجھن کی طرح اس کے سامنے اُلٹے گئے اور وہ ایک بار بھی یہ نہ سمجھ سکی کہ اب کیا ہوگا؟ ہر روز جب آفتاب غروب ہوتا، تو وہ کسی موہوم سی، ناکام سی امید کا سہارا لے کر ایک نئی صبح کا انتظار کرتی، لیکن ایک سال، دو سال، ساٹھ سال..... اس کے لیے وہی صبح رہی، وہی شام۔ اور اب یکا یک اس کو اپنے ننھے ننھے دن یاد آنے لگے جب وہ پتیل کے تلے آنکھ مچولی کی باری بار جاتی تھی اور جیتنے والے اس کے کندھے پر بیٹھ کر سواری کرتے۔ اور پھر وہ..... سبزی کی ٹوکری اٹھا کر بازار جانے لگی۔ اور پھر..... اور پھر..... یہ زندگی! یہ ساٹھ طویل اور پیچیدہ سال! وہی بوجھ، وہی تکان، وہی اکھڑی اکھڑی سانس..... ماما پر ایک تھکی ہوئی غنودگی سی چھانے لگی اور اس کا سر جھکتے جھکتے ٹھک گیا.....

”ماما“ بیگم نے کچھ نرمی سے کہا۔ ”تم تھک گئی ہو؟“

”نہیں تو، بیگم“ ماما جلدی سے اٹھی۔ ”ابھی تو کام ادھورا ہے۔“

اور پھر اس نے بحرمانہ انداز سے بیگم کی طرف دیکھا..... پیلی پیلی دھنسی ہوئی بے نورسی آنکھیں، پیشانی پر ابھری ہوئی تیز رفتار رگیں، لگی ہوئی جھریاں، موٹے موٹے مسام، ٹپ ٹپ گرتا ہوا پسینہ..... اب یوں نظر آتا تھا جیسے اس کی پھٹی ہوئی مچھروانی کا چیتھرا کچھڑ میں لت پت ہو گیا ہو.....

قی، قی، قی..... ماما کی صورت دیکھ کر بیگم کو ابکیاں سی آنے لگیں، اس نے جلدی سے اپنا معطر ہنجر کا ناک پر رکھ لیا اور دونوں آنکھیں زور سے بند کر کے بولی، ”اے ہے، ماما تمہاری صورت کیا بن گئی ہے؟ ذرا جلدی سے جاؤ، مہرئی

سنگار منہ پر پاؤ ڈرکا ڈبہ ہے تھوڑا سا اپنی چہرے پر لگا لو۔“
”پاؤ ڈر، بیگم؟“ ماما حیران ہو گئی۔

”ہاں ہاں ماما۔“ بیگم نے بے صبری سے کہا۔ ”ذرا جلدی کرو نا میں کب تک آنکھیں بند رکھوں گی؟“ او، زندگی!

او، خدا!! اے موت!!!

اور جب ماما واپس آئی، تو یوں نظر آتا تھا جیسے سوکھی ہوئی دلدل میں کچھ مرجھائی ہوئی کلیاں بکھر گئی ہوں۔ بیگم نے ڈرتے ڈرتے نیم باز آنکھوں سے ماما کی طرف دیکھا، اور پھر ایک اطمینان کا سانس لے کر بولی..... ”ہاں تو ماما، ذرا جلدی جلدی کام کر لو نا، صاحب کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اور پھر بیگم نے دیکھا کہ اس کی اونی شالیں تو ایک طرف بکھری پڑی ہیں۔ ”اوہو، ماما۔“ اس نے تنک کر کہا ”تم بھی عجیب ہو۔ یہ اونی شالیں تو صندوق میں ڈالی ہی نہیں۔ ان کے بغیر دارجلنگ میں گزارا ہوگا بھلا؟ اونہہ، ماما!“

یہ افسانہ ”نفسانہ“ سے لیا گیا جو 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی۔

☆.....☆.....☆

جال

اس کے قدم ڈمگائے، وہ لجائی، لیکن پھر اس نے قینچی اٹھا کر اپنے لائے لائے سیاہ بالوں کا گھنسا گچھا کاٹ ڈالا۔ اب جیسے نرملا کا دل ٹھنڈا سا ہو گیا اور اس کی پہلی کپکپاہٹ اور جھجک دور ہونے لگی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اپنی لمبی لمبی گنگھر یالی زلفوں کا انبار لگ گیا..... جیسے غصے میں بھرے ہوئے کالے کالے زہرناک سانپ الجھ پڑے ہوں۔ اس شام جب بوڑھا ماہی گیر گھر لوٹا، تو اس نے دیکھا کہ اس کا ٹوٹا ہوا جال درست ہو چکا تھا اس کے دل میں خوشی کی ایک لہری اٹھی، لیکن جب وہ اپنے سکڑے ہوئے خشک ہونٹوں سے مسکراتا ہوا نرملا کی طرف بڑھا تو یکایک اس کا دل دھک سے ہو گیا اس کا ہاتھ جو پیار کے جھٹکے سے نرملا کے سر کی طرف اٹھا تھا، ہوا میں ٹھمد ہو کے رہ گیا اسے یوں نظر آنے لگا جیسے انار کے ٹٹماتے ہوئے شگوفے پت جھڑ میں گر گئے ہوں۔ نرملا نے اپنی ساڑھی کا آٹھل احتیاط سے سر پر اوڑھا ہوا تھا لیکن کمر تک جھومنے والی ریشم جیسی زلفوں کی جگہ کون لیتا؟ ماہی گیر نے غیر ارادی طور پر اپنے جال کو اٹھایا اور اس کے ہاتھ ان جگہوں کو ٹٹولنے لگے جہاں نرملا کے نرم نرم بالوں کے پیوند لگے ہوئے تھے وہ دیر تک جال کو ٹٹولتا رہا جیسے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو وہ کچھ نہ بولا۔ بولتا بھی کیا؟ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ جال کئی روز سے ٹوٹا پڑا تھا وہ روز جلی کٹی سناتا اور کہا کرتا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے ماہی گیر اپنا تانا بانٹنے میں لگے ہوئے ہیں اب اس کے جال کی مرمت کے لیے سوت کہاں سے آئے؟ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ نرملا اپنے آنوی بالوں کو اس گندے سے، حقیر سے جال کے ساتھ پیوند کر دے..... سوت کے دام اونچے سہی، اس کی بساط سے باہر سہی..... لیکن نرملا کی لہراتی ہوئی پیچیدار زلفوں کی قدر کون پہچانے؟ ماہی گیر کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے..... اور وہ لڑکھڑایا..... لیکن پھر اس کے دماغ نے ایک کروٹ لی اور اسے وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں وہ سنا کرتا تھا کہ دنیا میں ایسی سوراخیں بھی گزری ہیں جو ٹوٹی ہوئی کمانوں میں سر کے بال باندھ کر میدان جنگ میں جان کی بازی لگا دیا کرتی تھیں..... ماہی گیر نے اپنی دھندلائی سی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اور اسے اپنی نرملا ایک ویسی ہی شیردل، سوراخ سپاہی نظر آنے لگی، جو اپنے الجھے ہوئے گیسوؤں کا جال بن کر فاقہ مستیوں کو گرفتار کرنے نکلے ہو۔ یہ کوئی پہلا روز نہ تھا کہ نرملا کے چوہے میں آگ نہ سلگتی تھی لیکن اب بڑھے ماہی گیر کو یقین سا ہونے لگا کہ کائنات بھر کی مچھلیاں اس کے جال میں آنے کے لیے بے تاب ہیں وہ پل کی پل میں آس پاس کے شہروں میں مچھلیوں کے انبار لگا دے گا پھر اس کے ٹھنڈے چوہے میں بھی آگ جلے گی۔ اسی ویران جھونپڑی میں پھر دھواں اٹھے گا اور نرملا کے سوکھے ہوئے کمزور ہونٹوں میں جان آ جائے گی..... یہ سوچتے سوچتے ماہی گیر نے نرملا کی طرف دیکھا، تو اس کے خالی پیٹ میں ایک زبردست گھونسا لگا۔ نرملا جھکی ہوئی چوہے کی راکھ نکال رہی تھی اس کی ساڑھی کا پٹو سر سے کھسک گیا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر کی آنکھوں میں کانٹے سے چھیننے لگے اس کی نظر گویا گرم گرم راکھ میں جھلس گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھا

اور جال کندھے پر ڈال کر جھونپڑی سے نکل آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ بھوک کی تپش سے اس کے سمٹے ہوئے پیٹ میں آگ سی جل رہی تھی اس کی ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی اس کا دل غم اور غصے سے جوار بھانا میں ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ نرملا دیر تک جھونپڑی کے دروازے سے لگی ہوئی اپنے بڑھے باپ کو دیکھتی رہی جب وہ دریا کے کنارے پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں میں اوجھل ہو گیا تو نرملا نے اپنی تھکی ہوئی آبدیدہ آنکھیں بند کر لیں..... جیسے پھول کی پتی شبنم کے بوجھ سے جھک جائے۔ وہ دیر تک کھڑی کھڑی سی کھڑی رہی۔ شاید وہ بھی اپنے دل میں امید کے موبوم چراغ جلا رہی تھی..... یوں کھڑے کھڑے یکایک اس کو محسوس ہوا جیسے کوئی سانپ اس کی ٹانگوں میں لپٹا جا رہا ہو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ چارو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اپنا سبز انگو چھپا اس کی ٹانگوں کے گرد باندھ رہا ہے۔ نرملا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ مسکرائے اور اسے بے اختیار ہنسی آنے لگی جیسے نسیم سحری کا ہلکا سا جھونکا افسردہ پھولوں میں جان سمو دے۔

ہشت، چارو! ”نرملا اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ ”تو نے تو مجھ کو ڈرا دیا۔“ چارو ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مسکراتے وقت اس کے سفید سفید دانت تاروں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کی بڑی بڑی مستانہ آنکھیں لبریز پیمانوں کی طرح جھلک رہی تھیں وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح مسکراتے آئے تھے اور ہر روز ایک نیا کیف سا گہرا سرور سا ان کی زندگی میں چھایا جا رہا تھا۔ ”میں تو سمجھی کوئی زہریلا سانپ میری ٹانگوں کو جکڑ رہا ہے“ نرملا نے ایک پُر اطمینان سانس لے کر کہا۔ ”چارو کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے اپنا میلا سا انگو چھپا پیار سے نرملا کے گالوں پر مارا جیسے کہہ رہا ہو کہ بھولی لڑکی، تم کیا جانو محبت کی بیڑیاں کس کو کہتے ہیں!

”تم آج دریا پر نہیں گئے چارو؟، نرملا نے پوچھا۔ ”انہوں“ چارو مستانہ وار سر ہلا کر بولا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سارے دریا میں ایک بھی ایسی مچھلی نہیں جو تمہارے نرم گماز بازوؤں کا مقابلہ کر سکے۔

”آج تو دریا چڑھاؤ پر ہے، چارو۔“ نرملا نے ناریل کے درختوں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”تم کو تو ضرور جانا چاہیے۔“ ”اونہوں!“ چارو اسی شریرا انداز سے مسکرایا۔ اس کے سانس کی بڑھتی ہوئی گرمی کہہ رہی تھی کہ دل کا جوار بھانا دریا کا تار چڑھاؤ سے کہیں زیادہ زوردار ہے۔

”جال ٹھیک ہوا یا نہیں؟“ نرملا نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اونہوں، چارو نے اپنی شریر آنکھیں گھمائیں۔ اب وہ جال ٹھیک نہ ہو گا نرمل۔ سوت کے دھاگے کچے جو ہوئے ان پر بھروسہ کون کرے“ نرملا نے ایک گہری اور لبریز نظر سے اس کو دیکھا۔ چارو مسکرایا۔ ”تم مذاق سمجھتی ہو، نرملا؟ تیری قسم، تیرا وہ جو تیری پلکوں کی کمان سے نکلے اور جال وہ جو تیرے لمبے لمبے بالوں سے بنے۔“

نرملا کے دل میں ایک زبردست ٹیس اٹھی۔ وہ ہوا کی سی تیزی کے ساتھ جھونپڑی میں بھاگ گئی چارو چوڑیاں

شہاب نگر
بھرتا اس کے پاس پہنچا اور اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ "تم شرمائی ہو، نرمل؟ لیکن میری قسم، یولو میں نے جھوٹ کہا ہے؟ میں نے دریا کی چٹکتی ہوئی لہروں میں ایک بھی ایسا ہنسنے والا نہ دیکھا جو تیری بل کھاتی ہوئی کالی زلفوں کا مقابلہ کر سکے۔ مجھے جیون بھرا ہی جال میں رہنے دو، نرملا مجھے کچے دھاگوں کے جال پسند نہیں جو پل میں ٹوٹیں، پل میں۔"

نرملا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی گھنی پلکیں آنسوؤں کے امڈتے ہوئے پرناؤں پر تھر تھرا رہی تھیں۔ چارہ مسکریا اس کو یوں نظر آتا تھا جیسے سیلاب کے روز، لہروں کا جوار بھاتا مایہ گیروں کے جال میں بھنور کھاتا ہوا آئے، اور چھٹکتا ہوا نکل جائے۔

"جس میں رونا کیوں آگیا نرملا؟" اس نے نرملا کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا۔

"جال ٹوٹ گیا ہوگا؟" چارو روز سے ہنس کر بولا۔ "اس میں رونا کا ہے کا؟ کچے سوت کے کچے جال۔"

چارو کا ڈبلا پتلا سبڈول جسم تیز تیز چلنے میں یوں بل کھاتا تھا جیسے کسی گرتی ہوئی آبشار میں روہو مچھلیاں تیر رہی ہوں، نرملا جھونپڑی کی دیوار سے پیٹھ لگائے اسے دیکھ رہی تھی اس کے دل میں ایک موم سا، ایک ناقابل فہم سا خطرہ لرز رہا تھا وہ دم بھر کے لیے ساری کائنات کو بھول گئی۔ مایہ گیروں کی اس چھوٹی سی ہستی میں مہینوں سے بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال رکھی تھی پہلے چھوٹے چھوٹے قاقے آئے پھر چوہوں کی آگ سرد ہونے لگی اور جب ہولے ہولے بوسیدہ جالوں کے تار بھی ٹوٹنے لگے تو گویا بھوک سے تھماتی ہوئی روحوں کے بندھن کھل گئے اب کالی کالی گندی جھونپڑیوں کے دروازوں سے کراہتے ہوئے، ریگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کی جگہ آزاد روہیں باہر نکلتے لگیں جن کی پرواز کے سامنے زمین اور آسمان کی وسعتیں سمٹ گئی ہوں۔ نرملا جب گلی میں گرے ہوئے بچوں کو سانس توڑتے ہوئے دیکھتی یا جب وہ چلتی ہوئی چٹاؤں میں سے چڑمڑ چڑمڑ کی بھیا تک آواز سنتی، تو اسے رہ رہ کر اپنے بڑے باپ کا خیال آتا، جس کی وحشت لائی ہوئی آنکھیں روز روز اندر کودھنستی جاتی تھیں۔ وہ کھانستا، تو اس کی ابھری ہوئی پسلیاں ٹھنک ٹھنک سے بھرتی اور جب وہ پٹیل کے پتے نمک کے ساتھ کھا کر اوپر سے پانی کے دو گلاس پی جاتا، تو اس کے منکڑے ہوئے پیٹ کی ٹنگی ہوئی جھریاں یوں بل کھاتے لگتیں جیسے مرے ہوئے سانپ سورج کی گرمی سے تھوڑی دیر کے لیے ریگتے لیں۔ باپ کہا کرتا تھا کہ بیٹی! بڑھا پا تو سوکھے ہوئے دریا کی مچھلی ہے جو آج نہیں تو کل تڑپ جائے گی لیکن نرملا کی کائنات میں باپ کے سوا اور کیا سہارا تھا؟ وہ سوچتی اور سوچ کے رہ جاتی رات کے وقت ڈراؤنے خواب اس کی بندھن میں ہڈیوں کے ڈھانچے ہی ڈھانچے نکمیر دیتے۔ دن کے وقت اس کا بوڑھا باپ ٹوٹے ہوئے جال کو کندھے پر ڈالے ایک زندہ لاش کی طرح گھومتا نظر آتا اور اسی سوچ میں جب نرملا نے اپنی لہراتی ہوئی زلفوں کے تار کاٹ کر ہڑھے دی گیر کا جال سنوار دیا، تو اس کے دل میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں کہ اب اس کا باپ ریگتی ہوئی ہلہلاتی ہوئی موت کے پھندے میں نہ آئے گا۔ لیکن!

لیکن اب نرملا کے دل میں ایک موم سا، ایک ناقابل فہم سا خطرہ لرز نے لگا وہ دم بھر کے لیے ساری کائنات کو بھول گئی اپنے بڑے باپ کو بھی جس کی میڑھی میڑھی پسلیاں یوں کٹکٹاتی تھیں جیسے سوکھے ہوئے بیڑ کی شہنشاہ ٹوٹ رہی ہوں۔ نرملا کے دل میں ایک گہرے قسم کا احساس پشیمانی سرا بھارنے لگا۔ وہ اپنے وحشی اندیشوں کے گرداب میں پھنس کر کانپنے لگی۔ چارو کا ہانکا پھلکا سبڈول جسم روہو مچھلی کی طرح بل کھاتا ہوا جارہا تھا۔ نرملا کے دل میں ایک پشیمانی سی آواز کہہ رہی تھی کہ بیوقوف لڑکی! تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سہری جال کاٹ ڈالا۔ اب وہ نکل جائے گا جیسے رہا ہے

مچھلی نوٹے ہوئے جال کے شکاف سے پھسل جاتی ہے اور پھر وہ زندگی کے اکتاہٹ سمندر میں کھو جائے گا..... نرملا کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکلنے لگیں اسے اپنے بڑھے باپ پر غصہ آنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باپ کے ہاتھ سے جال چھین کر تار تار کر ڈالے اور اپنے بالوں کی رسیوں کو اس سبک خرام روہو کی کمر میں ایسے ڈال دے کہ وہ کبھی پھسل نہ سکے، کبھی منتشر نہ ہو.....

چارو تیز تیز جا رہا تھا اس کے پیٹ میں ایک آنچ سی تھی۔ ایک بے کیف، بے شراری آگ جو بغیر ایندھن کے چولہے میں رنگ رہی ہو لیکن اسے نرملا کا خیال آتا، تو وہ آگ گویا بجھ سی جاتی اور اس کی زندگی پر ایک ہلکا سا سکون چھا جاتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لہروں کا شباب زوروں پر تھا۔ پانی کے اونچے اونچے ریلے آتے اور ساحل کی دیواروں سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے تھے موجوں کے تھپڑے چھٹک چھٹک کر اٹکھیلیوں کا ساز بجا رہے تھے اور مائی گیروں کی ہلکی پھلکی نوکیلی کشتیاں لہروں کے تلاطم میں یوں جا رہی تھیں جیسے پانچویں رات کا چاند بھورے بھورے بادلوں کے درمیان بھاگا جا رہا ہو..... لیکن چارو نے سوچا کہ یہ تیکھی کشتیاں تو نرملا کی پلکوں کی طرح ہیں جو چھٹکتے آنسوؤں پر ڈگر رہی ہوں! اس کا جی چاہا کہ وہ نرملا کے گالوں پر زور سے چٹکی بھرے اور اس کو ایک بار پھر لڑا دے..... سیلاب، کشتیاں، جال۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر اس نے ہوا میں ایک طویل اور بلند بوسہ لے لیا۔

آسمان پر ایک ٹیلا سا چاند ابھر ہوا تھا۔ بڑھتی ہوئی شام کے سنائے میں دریا کے تھپڑے اور بھی بلند ہو رہے تھے بڑھامائی گیر کنارے پر کھڑا ہوا جال کھینچ رہا تھا۔

”کبو چاچا، آج تو بورے بھر لیے تم نے؟“ چارو نے پاس آ کر پوچھا۔

بڑھے مائی گیر کے دانت اس کی پسلیوں کی طرح کٹکٹائے اور اس نے خالی جال اٹھا کر چارو کے سامنے پھینک دیا نرملا کے بالوں کے پیوند الجھ الجھ کر گچھے سے بن گئے تھے اور ان کی پلیٹ میں صرف دو ننھی ننھی مچھلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ مائی گیر نے دونوں مچھلیوں کو نکال کر زمین پر پنک دیا اور ان کو اپنی ایڑیوں کے نیچے دبا کر کچل ڈالا۔ اس کے سینے میں احساس ناکامی کی آندھیاں چل رہی تھیں اور اس کا جی چاہتا تھا کہ نرملا کے کالے بالوں کی کمند بنا کر آسمان کے تاروں کو نوچ نوچ کر پھینک دے۔

”یہ کیا لے آئے چچا؟“ چارو نے جال میں الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ”جالوں کے بال، یا بالوں کے جال؟“ چارو ہنسا۔

مائی گیر نے بتایا تو

چارو کھٹکھٹا کر ہنس دیا۔ ”تم دونوں بڑے بھولے ہو، چاچا کہیں ہیرے کی کرن سے مٹی کے دیے جلے ہیں؟“ مائی گیر کچھ سمجھ نہ سکا اسے چارو کی مہمل سی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔ چارو دل ہی دل میں بڑبڑاتا جا رہا تھا..... بالوں کے جال! پلکوں کی کشتیاں..... آنسوؤں کا سیلاب..... اور پھر اس نے جال میں الجھی ہوئی کالی زلفوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر چوم لیا.....

یہ افسانہ ”نفسائے“ سے لیا گیا جو 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی۔

پہلی تنخواہ

تین سو نٹاویس روپے پندرہ آنے..... ایک آنہ رسید کے ٹکٹ کا کٹ گیا ورنہ پورے چار سو ہوتے۔ رویش نے نوٹوں کا پلندا سنبھال کر جیب میں ڈالا، اور خزانچی کے زمین دوز سلام کا جواب گردن کی ایک رعونت آمیز جنبش سے دے کر خزانے سے باہر نکل آیا، اس کے دل میں رسید کا ایک آنہ کٹ جانے کا درد تھا۔ ورنہ اس کی جیب میں اب تین سو نٹاویس روپے پندرہ آنے کی جگہ پورے چار سو ہوتے۔ کل چار سو روپے اور دنیا بھر کا خرچ اُف! یہ سرکار بھی مضحکہ خیز حرکتیں کرتی ہے میرے دستخطوں پر ایک پورے دفتر کا کام چلتا ہے لیکن جب تنخواہ کے چار سو روپوں کی بات ہو تو ایک آنہ رسید کا ضرور کٹے گا۔ چہ، رویش نے غصے سے خزانے کے چپڑا سی کی طرف دیکھا جو پھاٹک کے پاس کھڑا ہے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا۔ جیسے بخشش کی ایک چوٹی پر اس کا پیدائشی حق ہے۔ لوگوں نے بھی کیا کیا واپس دیا رکھے ہیں۔ بے کار، فضول جیسے وہ اُلُو کا پٹھا کوئی تنخواہ ہی نہیں لیتا۔ یہی بخشش تو رشوت کا پہلا سبق ہے۔ تنگ گیا شیطان، اگر منہ سے کچھ مانگتا تو رپورٹ ہو جاتی سالے کی.....

راستہ بھر رویش مسکراتا رہا۔ ہنستے کھیلتے چہرے، بھڑکیلی دکانیں، چمکیلے لباس..... زندگی میں مسرت کی چاندنی خوشی کی لہریں۔ دادا کیا کہتا۔ جب وہ اپنے نئے فرزند کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا تو ایک بے چین سا احساس ہولے ہولے ستانے لگا اس نے سوچا کہ آج اس کی کوشی کچھ خالی خالی سی نظر آتی ہے کمروں کا فرنیچر خوشنما تھا۔ امری پندے نفاس سے لنگے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں پھول تھے۔ الماریوں میں کتابیں میز پر نئے رسالے، آتش دان کے بائیں کونے میں ٹیگور کا مرمریں مجسمہ، دائیں کونے میں تانبے کا ننھا سا دھکتا ہوا کیو پڈ، لیکن ان پر ویرانی سی برس رہی تھی جیسے کوئی ضروری چیز کھو گئی ہو۔ جیسے ایک بے پایاں، بے کنار خانہ نے سارے گھر کو نگل لیا ہو.....

رویش ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے پر جا بیٹھا۔ وہاں سے کرسی پر آ گیا پھر میز پر، پھر آئینہ کے پاس، ابھی یہاں، ابھی وہاں، وہ بے چین تھا، وہ تھملا رہا تھا اسے غصہ آنے لگا یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ خالی ذہن کی طرح ڈھم، ڈھم، ڈھم، تھپ، تھپ، تھپ..... نہ اس کے ساتھ شہنائی کی گلت، نہ ستار کا الاپ، یہ خالی کمرہ، ویران صوفے، یہ اچڑی ہوئی فضا..... کیوں نہیں کوئی اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھتا؟ جس کی مسکراہٹوں کے پھول ان گلدستوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں، جس کے فرتنی قہقہے کمرے کی بے معنی خاموشی میں چاندی کی کھنٹیوں کی طرح بچنے لگیں۔ جو تندی کی لہروں کی طرح چل چل کر بھاگے۔ رویش جیب سے نوٹوں کے پلندے نکال نکال کر اس کے منہ پر مارتا جائے۔ سارے کمرے میں لوٹ ہی لوٹ بکھرے ہوئے ہوں.....

”حضروں اس خط پر ٹکٹ کم ہے۔ ڈاکہ ایک آنہ مانگتا ہے۔“ رویش کے نوکر نے ایک جو جھل سا لاف لاکر دیا۔

رومیش نے دستخط پہچان کر خط کو ہاتھ میں تولیا۔ اس کے کندھے بیزار گن تھکاوٹ سے سکڑ گئے۔ اونہبہ پنشن پانے کے بعد پتاجی تو بالکل بیکار ہو گئے لیکن انہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ بیچارہ بیٹا نیا نیا ملازم ہوا ہے اسے اتنے لمبے چوڑے خط پڑھنے کی فرصت کہاں؟ ان کی بلا سے.....

رومیش نے سگار سلگا کر لفافہ کھولا اس میں بہت سے خط تھے۔ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے چہ خوش! رومیش نے لمبے لمبے کس لگائے اب تو گھر کا گھر خط لکھنے کا شوقین ہو گیا ہے! پہلا خط رومیش کے پتا کا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی وہی پرانی، باسی باتیں۔ ”صحت کا خیال رکھنا، دوسرے تیسرے روز کوئین کی ایک گولی کھالیا کرو..... شام کے وقت لمبی سیر کرنا چاہیے..... سورج نکلنے سے پہلے تھوڑی سی ورزش ضروری ہے.....“ جیسے یہ باتیں کوئی اور جانتا ہی نہیں!

دوسرا خط ماتا جی کا لکھا ہوا تھا ”پر ماتما نے بڑی مرادوں کے بعد یہ دن دکھایا ہے بیٹا، کل تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی، ایسور تمہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی دے، پہلا کام یہ کرنا کہ شو جی کے مندر میں پھول چڑھا کر تین براہمنوں کو بھوجن کھلاتا..... محلے کے یتیم بچوں کو کپڑے بنوادینا..... دان پن میں بڑا آئندہ ہوتا ہے بیٹا، میں بھی اگلے مہینے ضرور اپنے بیٹے کے پاس آؤں گی..... پر ماتما کا کتنا شکر ہے.....“

ماتا بھی کیا دقیا نویں باتیں کرتی ہے! مندر میں چڑھاوا، براہمنوں کو بھوجن، یتیموں کو خیرات..... چھی! ماتا کو کیا معلوم کہ ابھی اگلے روز رومیش نے انسداد گداگری کے جلسے میں کرسی صدارت کو زینت بخشی تھی.....

اُف دنیا بھر کے بکھیڑے اور ایک آنہ کم چار سو روپے نقد، وہ خیر ہوئی کہ خزانے کا چہرہ اسی کچھ ہچکچا گیا، ورنہ ایک چونی اور نکل جاتی اور پھر ماتا جی ہیں، کہ خود بھی یہاں آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ خواہ مخواہ جیسے پتا کے پاس انہیں بے حد تکلیف ہے! بڑھاپے میں سفر کرنا بھی تو ایک زحمت ہے ایک کمرے کا فرنیچر درہم برہم کر کے ان کی پوچا کا انتظام کرنا ہوگا۔ وہ کیک، گوشت، انڈوں پر کس قدر ناک بھوں چڑھائیں گی پھر ان کی سیاہ کنارے والی سفید دھوٹی..... میں کہتا ہوں، اس روشنی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی پرانی اور دقیا نویں باتیں.....

تیسرا خط شاننا کی طرف سے تھا..... بھیا، ہماری چیزیں نہ بھول جانا، جمپروں کے نمونے بھیج دیے تھے۔ جارجٹ کا رنگ بسنتی کی جگہ گلابی ہو تو اچھا ہے، یوں تو آسمانی رنگ بھی بُرا نہیں اگر ہو سکے تو دونوں بھیج دیں۔ شلواریں کی سلک احتیاط سے خریدیں سفید ہو تو سب سے بہتر، ورنہ ہلکا شربتی رنگ اچھا رہے گا آپ نے کہا تھا کہ جاتے ہی یا ڈلے کا روج اور لپ اسٹک بھیج دوں گا میرے پاس تو اب پاؤڈر تک نہیں رہا۔ یہاں پر کسی دکان میں فیسرین نہیں ملتی۔ پتاجی بازار سے کچھ ہینڈ بیگ دکھانے کے لیے لائے تھے مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا جیسے بھینس کے چمڑے کے بنے ہوئے ہوں! آپ کو کرا کوڈائل لیدر کا ہلکا سا ریٹی بیگ مل سکتا ہو تو خرید رکھیں..... آج کل میری ایک کیلی یہاں آئی ہوئی ہے آپ کو شاید چمپا یاد ہوگی کانپور کے رائے صاحب گلاب مل کی بیٹی جس کے ساتھ ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے اس نے اس سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا ہے۔ اگر آپ اس کے لیے کوئی اچھی سی چیز بھیج دیں، تو وہ بہت خوش ہوگی۔ شاننا اور اس کی فرمائشیں! رومیش نے سوچا وہ روز بروز کتنی آزاد ہوتی جا رہی ہے جب دیکھو بناؤ سنگار کا بھوت سر پر سوار ہے۔ جمپر، جارجٹ، روج، لپ اسٹک.....! کم بخت ماتا جی کی مثال سے سبق نہیں لیتی وہ اپنی سادگی میں کس قدر خوش ہیں ان کی زندگی کیا بے فکری سے گزرتی ہے..... خوب چمپا نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! اب تو بڑی ہو گئی ہوگی..... اور شاننا ابھی تک انٹرنس میں لگی ہوئی ہے..... کس قدر شوخ ہوا کرتی تھی چمپا! اب اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی

وہ دیا ہے اچھا نام کچھ کچھ چنبیلی کے وزن پر ہے..... جیسے کلیاں! مسکراتی ہوئی کلیاں!! میں اسے ضرور ایک تختہ بھجوں گا

چمکتا ہوا سنگا رودان! کالے اور پیلے اور نیلے بلاؤ زرا! مرمر کا کیو پڈ!.....
رومیش نے چوتھا کاغذ نکالا، تو اسے دستخط پہچاننے میں دقت ہوئی۔ منھی بملا نے اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا تھا عبارت میں بچپن کی مصومیت بھی تھی اور ایک چھوٹی بہن کا تحکمانہ انداز بھی، بملا کی فرمائشیں بہت بڑی نہ تھیں وہ پہلی تنخواہ کی اہمیت کو نہ سمجھتی تھی اس لیے مندر کا چڑھاوا، قییموں کی مدد، براہمنوں کا بھوجن، اس کے لیے کچھ معنی نہ رکھتے تھے زندگی کے پہلے آٹھ سالوں نے ابھی اسے جہر چار جٹ اور روج کی کشش سے آگاہ نہ کیا تھا اسے انگریزی کا نیا قاعدہ چاہیے ایک اچھا سا جزدان، سیاہ رنگ کے چمکدار بوٹ، کچھ مٹھائیاں..... اور یہاں تک آ کر اس کی ضروریات کا تخیل پورا ہو جاتا تھا۔

رومیش پر ایک وجدانی سرور سا چھا گیا۔ اس کے دل میں پیار کی ہلکی ہلکی گدگدیاں ہونے لگیں..... بملا نے کس محنت سے یہ خط لکھا ہوگا لکھتے وقت وہ زبان ہونٹوں میں دبا کر کاغذ پر جھکتی ہوئی، اور پھر اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے قلم کو یوں خوبصورتی سے گھماتی ہوگی جیسے ایک باکمال مصور اپنا رنگین شاہکار بنا رہا ہو!

انگریزی کا قاعدہ، اچھا سا جزدان، سیاہ رنگ کے چمکدار بوٹ، کچھ مٹھائیاں..... رومیش دل ہی دل میں ان ننھی ننھی فرمائشوں پر مسکرا رہا تھا۔ دنیا میں ہر کسی کا تخیل اپنی ذات کے گرد منڈلاتا ہے! ماما جی یہاں آنے کا ارادہ کر رہی ہیں لیکن کیا اچھا ہو، ان کی جگہ چمپا..... یعنی شاننا اور چمپا دونوں آجائیں! اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تین سو نواوے روپے پندرہ آنے..... مہینہ بھر کا خرچ..... ننھی بملا کی فرمائشیں بھی کتنی ننھی ہیں..... لیکن بچوں کی تربیت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہیں ہوش سنبھالتے ہی دوسروں سے مانگنا سکھایا جاتا ہے.....

رومیش نے ایک بار پھر اپنے ویران کمرے پر اچھتی نگاہ ڈالی اور وہ خلا جو آج یکا یک وہاں پیدا ہو گیا تھا اسے اور بھی بے تاب کرنے لگا۔ سامنے ٹیل صاحب کی کوٹھی تھی۔ باغیچے میں رنگارنگ پھول لہلہا رہے تھے۔ ننھی کملا مالی کی تپنی ہاتھ میں لیے پودوں کی قطع و برید کر رہی تھی۔ رومیش کو کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے سلام کیا..... رومیش کا دل دھک سے رہ گیا اس کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب کی طرف اٹھا اور نوٹوں کے پلندے کے پاس جا کر رک گیا..... اوہ! اس نے سوچا، کملا کس قدر بڑھ گئی ہے! ابھی کل تو بچہ نظر آتی تھی اسے کاش! آج پھر وہ میرے پاس سنگترے کے بیج مانگنے آئے.....

رومیش کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ویران ماحول سے فرار ہو کر اور کہیں نہیں تو کچہری کے کمرے میں چلا جائے اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدموں، مسلوں اور فیصلوں میں کھو جائے..... شاید آج وہاں پھر وہ بڑھیا آئے جس کا بیٹا چوری کے الزام میں حوالات میں بند تھا شاید اس کے ساتھ اس کی بہو بھی ہو..... وہ نو جوان، شرمائی ہوئی غم دیدہ لڑکی جو اس روز تن تہا رومیش کی کوٹھی پر اپنے پتی کو چھڑانے آئی تھی جب وہ زبان سے رحم کی زکوٰۃ نہ پاسکی تو غالباً رشوت کے طور پر اس نے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا! ایک برق نما چہرہ اس کے دامن پر تڑپ کر گرا وہ دم بھر کے لیے دو تیرتی ہوئی سیلاب زدہ آنکھوں میں ڈوب گیا..... آہ، بیوقوف رومیش! آج سے چند روز پہلے وہ ایک جذباتی گدھا تھا۔ انصاف!!! اصول! سچائی! اخلاق!..... اونہہ دنیا نے بھی کیا کیا ڈھونگ بنا رکھے ہیں اس روز وہ خوبصورت لڑکی مایوس ہو کر لوٹ گئی اسے کاش ایک بار پھر وہ اپنا جی جیل سے چھڑانے آئے صرف ایک بار.....

رومیش نے بے تاب ہو کر کھڑکی بند کر دی اور کمرے کی بے کیف خاموشی سے گھبرا کر باغیچے میں آ گیا سامنے مالن مرغیوں کو دانے بکھیر رہی تھی اس کی سیاہ رنگت میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور وہ اپنے موٹے موٹے، بھدے سے ہونٹ پھلا کر مرغیوں سے کچھ مہمل سی باتیں کر رہی تھی رومیش ذرا زور سے کھانسا اور نوٹوں کا پلندا نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا..... مالن نے نظر اٹھا کر غور سے دیکھا، جھک کر سلام کیا، اور مرغیوں کو اپنے آگے لگا کر دوسری طرف چلی گئی۔ غوں..... غوں..... غاں..... غاں..... مالن مرغیوں کو اسی طرح پیار کرتی جا رہی تھی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا..... کوئی بھی نہیں..... رومیش نے سوچا، اس مطلب پرست دنیا میں کوئی بھی کسی کی پرواہ نہیں کرتا..... اور پھر سارا زور لگا کر اس نے نوکر کو پکارا۔ ”چندو، وہاٹ ہارس کی ایک بوتل..... انگریزی شراب کی دکان سے..... فوراً.....“

چندو اچھل کر ایک طرف ہو گیا جیسے اسے کچھو نے ڈس لیا ہو۔ فرط حیرت سے اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

”تم جاتے کیوں نہیں؟“ رومیش کڑک کر بولا۔ ”میری طرف گھور کیا رہے ہو..... حرامزادے.....“

صبح صادق کے چھپٹے میں چندو نے سنگھار میز پر حجامت کا سامان لگا کے رکھ دیا۔ رومیش ایک صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی پروہاٹ ہارس کی خالی بوتل تھی اصری پردوں سے چھن چھن کر آنے والی چند مدھم سی شعاعیں کمرے میں خرقہ راری تھیں۔ ننھی بملا کا خط صوفے کے پاس گرا پڑا تھا اور اس کے قریب رومیش کی پہلی تنخواہ.....“

یہ افسانہ ”نفسانے“ سے لیا گیا جو 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی۔

☆.....☆.....☆

غریب خانہ

”تو چلی جا غریب خانے“ ہری بلہہ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ یہاں سب سب کر کے دکھا رہی ہے سالی؟ شام تک پھر سوچ لے، گماشتہ نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مونچھیں سنہال کر دوبارہ کہا، تیرے باپ کی جگہ ہوں سالی!

پتھر کے بھگوان تو بھوک مانتے ہیں ہمارا بھگوان ساری عمر کے لیے نہال کر دے، ہاں: ”اور جاتے جاتے ہری بلہہ نے چہرے کی بناوٹ سے ہنسنے کی کوشش کی، کچی کچی مونچھوں میں اس کے تین کالے کالے، پیلے پیلے دانت ڈمگاتے سے نظر آئے جیسے دھوئیں سے گھٹی ہوئی بھڑیں اپنے جھتے میں دم توڑ جاتی تھیں، جب وہ باپو سے لگان کا تھنا کرنے آتا تو یہی گھناؤنی مسکراہٹ ان گندی گندی گالیوں کا راستہ صاف کرتی تھی جنہیں سن کر کامنی کچا ماں شرم کے بوجھ سے جھکتی جاتی تھی اور باپو زور سے کھانس کر گماشتہ کی گرجتی ہوئی آواز کو دھیمہ کرنے کی کوشش کرتا۔ بیگار کے روز تو وہ مونچھیں اور بھی جھکتیں اور بھی گرتیں اور اس کی بھڑیں کچھ زیادہ پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ دم توڑنے کی کوشش کرتیں کیونکہ ہری بلہہ کے ہاتھ چھتے کی جگہ لٹخے کے ساتھ زیادہ مصروف رہتے اور پھر ایک دن جب کامنی نے دیکھا کہ اس کی چھوٹی سی جھونپڑی میں اتنا بڑا خلا ہو گیا ہے جتنا کہ آسمان کی افقی وسعتوں کو سمیٹ کر بھی نہ ہو سکے تو اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹے ہوئے جالے کے ایک تار سے لٹکے ہوئی مکڑی کی طرح اس بے پایاں خلا میں لٹک رہی ہے۔ اکیلی بے سہارا، بے آواز..... اور اس وقت ہر بلہہ گماشتہ نے زبان گھما گھما کر اپنے منہ میں سوئی ہوئی بھڑوں کو جھنجھلایا اور کامنی کے ہاتھ میں بھگوان کے سہارے کی ڈور تھما دی۔ ”رونے سے کیا ہوگا۔ پگی؟ باپو گیا، میا گئی، بسیا گیا، کبھی جاتے ہیں، کامنی کون رہا ہے اور کون رہے گا؟ سدا نام بھگوان کا..... چل تیرے باپ کی جگہ ہوں، سوشیل ٹھا کر کے پاس رکھو ادوں گا سالی، پتھر کے بھگوان تو بھوک مانتے ہیں ہمارا بھگوان.....“ اکیلی بے سہارا، بے آواز..... کامنی نے سہارے کی ڈور کو تمام لیا سوشیل ٹھا کر بھگوان تھے انہوں نے کھینچا۔ ہری بلہہ گماشتہ کے بھگوان نہیں، آٹھ گاؤں کے سبکدہند، سند یافتہ ان داتا..... انہوں نے ڈور کو کھینچا..... جھٹکے سے پیار سے، غصے سے، ہولے ہولے، تیز تیز وہ دیو داسی تھی، کھنچتی آئی، آنکھیں موندے، بھرم لگائے پجاردن کی طرح جو من کی لو سے موہ مایا کا جال کاٹتی ہوئی بڑھتی جائے..... مایا کا جال! آنکھوں پر پردہ ہی تو ہے، موہ کا۔ مایا کا..... اور بچپن میں کامنی کے کان کتنی ہی بار اٹینٹھے گئے تھے اور اس کی بانہوں پر شہتوت کی چھڑیاں شاک شاک برسا کرتی تھیں جب وہ پاٹھ شالا میں گیتا کے اشلوک بھول جایا کرتی تھی! پنڈت جی کی لمبی؟ چھڑی ہوا میں دائرے بنا کر گھوما کرتی تھی..... آنکھوں پر پردہ ہے مورکھ، موہ کا، مایا کا، پردہ اٹھا اور درشن پایا..... پنڈت جی اونچی اونچی لے میں پڑھاتے اور پھر چھڑی ہاتھ سے رکھ کر اپنی ران کھجلائے لگتے اور پو پلے منہ سے گھسے ہو۔

پکار ڈی طرح گایا کرتے دگھونگٹ کے پٹ کھول ری تو ہے پیالیں گے..... گھونگٹ۔ ہاں رے۔ ہاں جی۔ گھونگٹ کے پٹ کھول ری۔

اسی، بے سہارا، بے آواز..... وہ ڈور میں مچھلی کی طرح انگی ہوئی جا رہی تھی۔ بنسی کا دوسرا سہرا بھگوان کے ہاتھ میں تھا ہر بلبھ گماشتہ کے بھگوان، آٹھ گاؤں کے بھگوان، کامنی کے بھگوان..... اور ایک روز جو زور کا جھٹکا لگا تو جیسے سارے جال ٹوٹ گئے ہوں۔ سارے پردے ہٹ گئے ہوں..... کیونکہ اس نے دیکھا تو سوشیل ٹھا کر ننگے کھڑے تھے بالکل ننگے، جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے نکل آئے ہوں۔ بڑبڑاتے ہوئے، بگڑے بھینسے کی طرح ڈکارتے ہوئے اور ان کے منہ سے ایک تیز تیز سرا ند نکل رہی تھی، جو ہر سانس کے ساتھ کمرے میں منتشر ہوتی جاتی تھی۔ کامنی گھبرائی، زنی اور ایک جھٹکے سے اپنے سہارے کا پھندا توڑتاڑ کر بھاگ گئی..... چھی چھی چھی..... اسے گھن آرہی تھی، جیسے آسمان کے کسی سوراخ سے اس نے دیوتاؤں کو گندگی کھاتے دیکھ لیا ہو اور جھونپڑی میں آتے ہی سب سے پہلے اس نے تلسی کا پورا کٹناک سے توڑ ڈالا اور چبوترے پر رکھے ہوئے بھگوان کو ہوا میں زور سے گھما کر پچھواڑے کے تالاب میں دے مارا..... غٹ، غٹ، غٹ تالاب میں بلبلے اٹھے اور ٹوٹ گئے کامنی کو سکون سا ہوا کہ اب مایا کے پردے پر گدلے پانی کا ایک مونا سا غلاف بھی چڑھ گیا ہے۔

”میں نے کہا۔ تو کتیا ہے کتیا۔“ ہری بلبھ گماشتہ نے لائٹھی زمین پر مار کے کہا ”چار دن سے بھوکی بلک رہی ہے، تجھے کاٹا ہے سوشیل ٹھا کر کا گھر؟ چل اٹھ پھر سے لگوا دوں گا ہاں..... باپ کی جگہ ہوں سالی۔“

”نہیں چاچا۔“ کامنی نے وقت سے کہا ”میں وہاں نہ جاؤں گی۔“

”تو پھر کہاں جائے گی، بڑی رانی؟“

”غریب خانے۔“

”تو چلی جا غریب خانے۔“ ہری بلبھ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سک سک کر کسے دکھا رہی ہے سالی؟“ کامنی کو ڈر بھی لگا اور غصہ بھی آیا میں تو غریب خانے جاؤں گی ہی لیکن یہ کون ہے سالی کا باپ بیچ میں آنے والا؟ اس نے سوچا..... اور جب ہری بلبھ گماشتہ اپنے چہرے کی بناوٹ سے ہنسنے کی کوشش کرتا ہوا چلا گیا تو کامنی نے اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں بسنے والے لامحدود خلا پر ایک ویران سی نظر ڈالی اور کسی اندرونی کچکاہٹ سے مغلوب ہو کر اس نے تلسی کے ٹوٹے ہوئے پودے کو بڑے زور سے جھنجھوڑا اور سوکھی ہوئی پتیوں کے ذرے ہوا میں اڑاتی ہوئی غریب خانے کی طرف چل پڑی۔

غریب خانہ پانچ کوس تھا تین کوس چل کر رمن کی کٹیا آئی۔ ”اری کمنو۔ کہاں چلی؟“ رمن نے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پوچھا۔

”غریب خانے۔“

”پرچی لائی؟“

”نہیں تو۔ کیسی پرچی، رتی؟“

”اری تو نہیں جانتی؟ سوشیل ٹھا کر یونین کے سر بیچ ہیں نا؟ ان کی پرچی بنا داخل کیسے ہوگی؟“ ”دیکھوں گی شاید کون سا“ کامنی نے مایوسیوں کا سیلاب دبا کر کہا۔

ہمارے پاس بیٹھو۔“

کامنی کا دل بیٹھا جا رہا تھا اسے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے گردن مروڑ کر اسے ایک اندھے غار میں دھکیل دیا ہے جس میں بھیانک ڈراؤنی روچیں ایک دوسرے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ غریب خانے میں چار سو پچاس روچیں تھیں۔ بیڑھی بیڑھی ناگوں والے ہڈیوں کے ڈھانچے، سسکتے ہوئے آدمی، سوکھی ہوئی لنگتی ہوئی چھاتیوں والی، رینگنے والی بوڑھی عورتیں جن کے بال ان کی ہڈیوں کی طرح سوکھ کر جھڑ گئے تھے۔ بے شمار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، ان کے دلوں میں ایک نامعلوم ارتعاش تھا۔ ایک چھٹی ہوئی کپکپاہٹ جو ڈراؤنا خواب دیکھ کر رگ رگ میں لرزنے لگتی ہے لیکن زبان پر نہیں آتی۔۔۔۔۔ ان کی معصوم آنکھوں میں ایک اچھتی ہوئی سی وحشت تھی، سہمی ہوئی سی ویرانیاں جو ان کی زندگی کے راستے میں خون آشام بھیڑیوں کی طرح دانت نکالے کھڑی تھیں، بچوں کو دیکھ کر کامنی کا دل تڑپ اٹھا اور اس کا جی چاہا کہ وہ ان تمام معصوم بچسوں کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے اور بھینچ بھینچ کر کہے۔ میری جان، تم کائنات کی ویرانیوں میں اڑتے ہوئے آوارہ ذرے ہو جن کو نہ زمین لگتی ہے نہ آسمان سنبھالتا ہے۔ تم آ کر میرے سینے سے چمٹ جاؤ۔۔۔۔۔

ان کے علاوہ پورے ہوس میں آٹھ دس جوان عورتیں تھیں جن کے کپڑے ذرا صاف تھے چہروں پر رونق، آنکھوں میں چمک۔۔۔۔۔ جیسے اُبڑے ہوئے قبرستان میں کلیوں کے بوٹے اُگے ہوں! ان میں بیٹا تھی، مالو، بسنتی، رحمن، فروزاں، شامولی۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی بدنصیب جوانیاں جن کو اُجڑا ہوا حسن ان چڑھاوے کے پھولوں کی طرح تھا جو قبر کے سر ہانے پڑے پڑے مرجھا گئے ہوں۔۔۔۔۔ شاید اس چار دیواری میں آنے سے پہلے ہی ان کے سنبھالے ہوئے آگینے چمک چمکے تھے شاید وہ کسی ازلی انصاف کے ترازوں میں تل چکی تھیں اور قدرت کے کسی درندہ قانون نے ان کے جسم کو چار چھانک چاول کی قیمت پر چکا دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ غریب خانہ میں داخل ہو گئیں، تو گویا ان کی زندگی کے چور دروازے اپنے آپ کھل گئے اور اب ان راستوں سے نئی نئی دھوتیاں، خوشبودار صابن کی نکلیاں سسکتے ہوئے رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے حصول سے پُرائے ہوئے گلو کوڑی کے ڈبے، وٹامن بی کے قرص، کاڈیور آئل، سبے ہوئے بچوں کے منہ سے چھنی ہوئی دال، کبھی دودھ، کبھی سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کی چائے، کبھی ڈاکٹر کی الماریوں کے پیچھے رکھے ہوئے مصری کے کوزے۔۔۔۔۔ ان کھلے ہوئے دروازوں سے یہ چھوٹی چھوٹی عورتیں ان کی زندگی میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے رومان بھی! جو رات کی تاریکی میں غریب خانے کی فضا پر زبردستی چھا جانے کی کوشش کرتے، جس طرح قبرستان کے احاطے میں دولہا دلہن کی برأت کھڑی ہو کر بلجہ بجانے لگے۔۔۔۔۔ اور شاید یہی وجہ تھی، کہ رات کے وقت جب سسکتے ہوئے کراہتے ہوئے ڈھانچے زندگی کے لق و دق صحرا میں آخری کنارے کا کھوج لگانے کے لیے تڑپنے لگتے، اور جب ننھے ننھے بچے خواب میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی جھنجھاتی ہوئی کھوپڑیاں دیکھ کر چیخ چیخ اٹھتے، تو اس وقت بیکار سپرنٹنڈنٹ کے ڈبے اور کونین کی شیشیاں الماری میں سجانے کے لیے فروزاں کی فوری ضرورت محسوس ہوتی۔ گلزار مسکن کے کی مشینز میں سرشام چھید ہو جاتے اور بسنتی کو ٹانگے لگانے کے لیے جانا ہی ہوتا۔ مالو اپنا آنجل سنبھال کر مجھو پان باورچی کے برتن منجھوانے جاتی۔ سٹاکھو مہتر کا ٹوٹا ہوا جھاڑو رحمن کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ اور شامولی کو غریب خانے کی حفاظت اتنی پیاری ہوتی کہ وہ آدھی آدھی رات گئے گیٹ کیپر کو ہوشیار کرنے جایا کرتی۔۔۔۔۔ اور اسی طرح غریب خانے کی بہت سی بیٹیاؤں، بسنتیوں اور شامولیوں نے اپنے اپنے سہارے کی لڑیاں تمام رکھی تھیں اور ان کی زندگی

کے چور دروازوں سے اُبلتی ہوئی دال اور چاول کے ساتھ ساتھ نئی نئی دھوتیاں، صابن کی ٹکلیاں، ورگلو کوز ڈی، کی مٹھاس بھی
ریس کر آئے تھی۔

”کیا سوچتی ہو، کامنی؟“ بیٹا نے اسے ہلا کر کہا۔ ”بابو پوچھتے ہیں نام لکھوادیا تو نے؟“

کامنی چونکی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب عینک ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ ”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائے۔

”داخلہ پھر ہو جائے گا بچاری بھوکی ہے لے جاؤ لنگر میں بیٹا۔ نام ہو گیا ہے۔“

گھر ار حسین سٹے نے مسکرا کر ایک مٹی کی تھالی اور پیالہ اسے دیا۔ کامنی کو لنگر میں جاتے ہی ایک دھکا لگا ایک دم
سے چراغ کی روشنی میں غریب خانے کی ساری آبادی مٹی کے پیالوں اور تھالیوں پر جھکی ہوئی پڑ پڑ کھا رہی تھی، بچوں
کے غول آپس میں لڑ رہے تھے اور نیم جان ہڈیوں کے ڈھانچے کسی برقی قوت سے بیدار ہو کر چیلوں کی طرح بھوپن
باورچی پر جمیٹ رہے تھے۔

”ادھر آ جاؤ، اس طرف۔“ بھوپن باورچی نے سر اٹھا کر کامنی کو آواز دی اور اپنے کندھے کا رد مال اتار کر پاس
والی جگہ جھاڑنے لگا۔

کامنی چلتے ہوئے لرزتی تھی اس کے بدن میں چھوٹے چھوٹے سانپ رینگ رہے تھے کبھی کسی بڑھیا کی سوکھی
ہوئی چھاتی اس کے ہاتھوں چھو جاتی، اور کبھی کوئی ہانپتا ہوا بوڑھا بے تحاشا اس کے کندھوں پر گر کے دم سیدھا کرنے لگتا۔
اور پھر اچانک اس کے پاؤں پر جیسے ابلتا ہوا پانی گر پڑا ہوا اور ایک خوفناک سی بڑھیا نے اس کی ناک پکڑ کر منہ پر زور سے
چاٹا مارا۔ ”اندھی ہے رائے؟“ بڑھیا کڑکی۔ ”دال گرا دی، باپ کی کتیا نے۔“ اور جب تک کامنی بھوپن باورچی کے
پاس نہ جاتی تھی وہ بڑھیا غضبناک آنکھوں سے اس کا پیچھا کرتی رہی۔

بھوپن نے اسے بہت سے چاول دیے، بہت سی دال، اور جب وہ کھا چکی تو اس نے ٹوکے کے نیچے سے دودھ
کا پیالہ بڑھایا اور کہا ”اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چکے چکے پی لینا۔“ اور پھر گلو کوز ڈی کی ایک مٹھی بھی کاغذ میں لپیٹ کر کامنی
کو دی۔ ”یہ شکر ہے“ بھوپن نے ہونٹوں سے جس جس کرتے ہوئے کہا ”ولانتی ہے ولاکتی!“ اور اپنا ہاتھ پونچھنے کے لیے
کامنی کی پیٹھ پر رگڑنے لگا۔

”اری ادھر سے جا“ بیٹا نے کامنی کو دھکیل کر کہا۔ ”کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا، یہ کلمو ہے کسی کو کھاتے
ہوئے دیکھ کر سہارتے نہیں“ بیٹا نے سہر سہر کرتی ہوئی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن کامنی کے نکلنے سے پہلے ہی بچوں کے ایک غول بیابانی نے اسے گھیر لیا اور ”دودھ۔ دودھ“ کے ہلے کے
ساتھ اس کی ٹانگوں، بانہوں، کمر کندھوں سے لپٹ گئے اسی ریل پیل میں ایک گرتے ہوئے بڈھے نے اس کے ہاتھ
سے پیالہ چھین کر غٹ غٹ پی لیا! ”حرامی“ بھوپن پھنکار کر اٹھا، گلزار سٹے نے لائٹ پیسکی سکھو مہتر جھاڑو چلانے لگا اور
سپرنٹنڈنٹ صاحب نے لالتوں، مکوں، طمانچوں کی بارش برسائی۔ سور کے بچے، بدتمیز، حرامزادے..... سپرنٹنڈنٹ
صاحب گلغشتانی کرنے لگے اور پھر اندھیرے میں جا کر انہوں نے کامنی کی کمر میں ہاتھ ڈالا، اور پکار کر بولے۔ ”کچھ
نہیں گوری، دودھ اور بھی بہت ہے۔ بیٹا لے آنا اسے میرے دفتر میں فارم بھی تو بھرنا ہے۔“ وہ مسکرائے، بیٹا بھی مسکرائی
اور کامنی کو چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں ایسا نظر آنے لگا جیسے وہ دونوں اس کے سامنے کھڑے کھڑے
نکلے ہو گئے ہوں.....

رات کے سنائے میں جس وقت ڈاکٹر کی الماریوں کو مدد کی ضرورت ہوئی اور گلزار سٹے کے مشینز کے میں چھید نظر آنے لگے جن کو بسنتی کے سوا کوئی دوسرا مرمت نہ کر سکتا تھا اور سپرنٹنڈنٹ صاحب رجسٹر کا ایک نیا فارم بھرنے کے لیے بے تاب ہونے لگے..... اس وقت کامنی اپنے گاؤں کی پگڈنڈی کی طرف تیز تیز بھاگی جا رہی تھی اسے غریب خانے کی چار دیواری سے ڈر لگنے لگا تھا اور یوں نظر آتا تھا کہ بہت سے ننگے بھوت اس کے گلے میں بانٹیں ڈال کر ناچ رہے ہیں اب فطرت کی وسیع فضا میں آ کر اس نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا اور سوچنے لگی کہ معلوم نہیں سہارے کی ہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سا، وحشی سا حیوان کیوں کھڑا ہوتا ہے اور..... یکا یک وہ کسی چیز سے ٹکرائی اور منہ کے بل گر پڑی۔

”اندھا۔ ایک آدمی تڑپ کر اٹھا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اس پر گر کرنے والی چیز عورت ہے، تو اسی گرجدار آواز سے گرام درست کر کے بولا ”اندھی“۔

”کیا ہے؟“ دوسرے آدمی نے لیٹے ہی لیٹے خوابیدہ آواز میں پوچھا۔ ”چھو کری ہے“۔ پہلے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے ٹول کر وثوق سے کہا۔ لے جاؤ صاحب کے تنبو میں۔ شام سے منہ پھلایے بیٹھا ہے، سالاتیسرا بولا۔

صبح کے دھندلکے میں کامنی پھر فطرت کی وسیع فضا میں سانس لیتی ہوئی جا رہی تھی ہولے ہولے اُبھرتے ہوئے سورج دیوتا کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی تھر تھرا رہی تھی زندگی کی شاہراہ میں سہارے کی ڈوریوں کا تانا بانا الجھا ہوا تھا اور اس میں کالے کالے، سفید سفید، ننگے ننگے بھگوان بھولے بھٹکے راہیوں کی دستگیری کے لیے ہاتھ پھیلائے بیٹھے تھے۔ کامنی کے دل میں نفرت کا لاوا ابل رہا تھا اسے ساری دنیا سے گھٹن آنے لگی..... خنی خنی فطرت کی وسیع فضا سے، سورج کی اولین ناپاک کرنوں سے، اپنے بدن کی دکھتی ہوئی رگ رگ سے، لال کبل سے جو اس کے کندھے پر جلتی ہوئی چتا کے شعلے کی طرح دہک رہا تھا، بسکٹوں کے ڈبے سے جو وہ ہاتھ میں بھینچتی ہوئی جا رہی تھی..... اور جب رقص نے اسے واپس آتے دیکھا، تو وہ ہنسی۔ ”آگئی نا واپس۔ میں نے کہا تھا، پرچی لے جاؤ۔“

پھر اس نے دیکھا کہ کامنی کے پاس تو لال کبل ہے اور کریم کریم کریم کریم بسکٹوں کا ڈبہ بھی، رقص نے تڑپ کر اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا، جیسے کامنی نے اس کی منہ پر کھینچ کے جوتی ماردی ہو..... ”رائڈ“ وہ نتھنے پھلا کر غصے سے چلائی ”میرے ساتھ چل کھیتی ہے، کنجری؟ غریب خانے کا نام بدنام، اور جاتی ہے اپنے یار لو تھر کے پاس.....“

ماہنامہ ”ہمایوں“ لاہور مارچ 1945ء

سب کا مالک

جمعرات کے جمعرات نندی گرام کی بستی میں وہ پگلا سا فقیر آیا کرتا تھا لوگ اسے سائیں بابا کہتے تھے وہ دیوانوں کی طرح اچھلتا، پھلانگتا، دوڑتا، مچلتا اور پچھپھڑوں کا پورا زور لگا کر سب کا مالک کون؟ اللہ..... کا ورد کیا کرتا تھا۔ بچے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ مائیں چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ گاؤں کے مکھیا لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ایک روز ننھی رضیہ ہاتھ میں سرسوں کے تیل کا کٹورہ اٹھائے جا رہی تھی کہ اچانک ٹھوکر کھا کے گر گئی۔ تیل کا کٹورہ چھٹک کر نالی میں جا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا اور دل میں خوف کے مرغولے لپکنے لگے۔ رضیہ کی ماں نے بڑی منت سماجت کے بعد رشی کیش بابو کی بیوی سے دو آنے ادھار لیے تھے۔ بزرگ لال بیے نے بڑی مشکل سے دوئی کا چھٹانک بھر تیل دیا تھا۔ رضیہ کا باپ کئی روز کے بعد دریا سے مچھلی پکڑ کے لایا تھا رضیہ کی ماں چولہے پر ہنڈیا دھرے تیل کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اب جو رضیہ نے دیکھا کہ آدھا تیل اس کے کپڑوں میں اور آدھا زمین پر لنڈھ گیا ہے تو اس نے سارا زور لگا کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں دُور سے سائیں بابا کی آواز آئی۔ رضیہ نے دوڑ کر اس کی انگلی کو پکڑ لیا اور منت سے کہنے لگی۔ ”سائیں بابا۔ میرا تیل لنڈھ گیا ہے۔ ماں مارے گی۔ سائیں بابا تم سب کے مالک ہو۔ مجھے ایک دوئی دے دو۔“ یہ سن کر جیسے سائیں بابا کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے پھٹکار کر ہوا میں ایک جست لگائی اور رضیہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ”سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟..... وہ چلا رہے تھے اور پھر انہوں نے رضیہ کے ہاتھ پر ایک دوئی رکھ دی جب رضیہ کے ماں باپ کو معلوم ہوا کہ وہ سائیں بابا سے دوئی مانگ کر تیل لائی ہے تو مچھلی کا گوشت کاٹا بن کر ان کے حلق میں پھنس گیا اور انہوں نے غصے میں آ کر رضیہ کے دونوں گال طمانچوں سے لال کر دیے۔ شام کے وقت جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مسجد میں قرآن مجید کا سبق لینے گئی تو مولوی صاحب نے کہا:

”آج مالک آئے ہوئے ہیں ہمیں فرصت نہیں جاو۔“

”کس کے مالک مولوی صاحب جی؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”ہم سب کے مالک بیٹی جا۔ تو نہیں جانتی۔“

”ہاں ہاں جی! میں جانتی ہوں۔“ رضیہ کی آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک آ گئی۔ ”سائیں بابا جو کہتے ہیں سب کا

مالک اللہ میاں.....

رضیہ کا فقرہ دانتوں کے درمیان کٹکٹا کے رہ گیا مولوی صاحب نے ایک زقائے کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور ڈپٹ کر بولے۔ ”کافر کی بچی! دو سال سے پڑھ رہی ہے ابھی اتنی تمیز نہیں آئی حرامزادی کو.....“

رات کو جب وہ تاروں کی چھاؤں میں پلنگڑی بچھا کر لیٹی، تو دریا سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس

کے تھکے ہوئے گالوں پر مرہم کا پھاہا رکھ دیا خیالوں کے عجیب عجیب تانے بانے اس کے دماغ میں الجھنے لگے۔ اس کا چہرہ گویا قاتلو تھا، کہ جو دیکھتا تھا اس پر بے تکلف چائے جمادیتا تھا اسے اپنی بے پناہ مجبوری پر رونا آنے لگا اور اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ اپنی روح کی ساری پنہائیوں کو اکٹھا کر کے آنکھیں میچ لے اور دہلی زبان سے کہے کہ اے ہم سب کے مالک، تو جو کچھ بھی ہے جہاں کہیں بھی ہے، میری ایک بات سن لے..... نہ جانے اس کے دل میں کیا کیا شکوے تھے، کیا کیا فریادیں تھیں جن کو وہ اپنے خیالوں کی بھول بھلیاں سے کرید کرید کر نکالنا چاہتی تھی لیکن مالک کے تصور نے اس کے تجسس کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان تازہ ہو کے ابھر آئے۔ رات کے سناٹے میں ایک میٹھا میٹھا سا ارتعاش اٹھ رہا تھا دور حویلی سے جھم جھم جھم کی مدھم مدھم سی آواز آرہی تھی، جیسے بہت سی تیتریاں اپنے پروں میں گھونگھرو باندھ کر پھولوں پر ناچ رہی ہوں۔ رضیہ نے چوری چوری گردن اٹھا کر اپنے ماں باپ کو دیکھا جو آنگن میں تخت پوش پر لیٹے ہوئے خراٹے لے رہے تھے پھر اس نے اپنے دل کو دھوکا دینے کے لیے چادر کا گول مول اور لمبوتر سا ڈھانچا بنا کے چارپائی پر رکھ دیا اور دبے پاؤں باہر نکل آئی اور تاریک گلی میں اسے ڈر لگ رہا تھا لیکن مالک کو دیکھنے کا حق اس نے بڑی محنت سے خرید لیا تھا۔ پے درپے، طمانچوں کی سرسراہٹ اس کے گالوں میں ابھی تک آگ سی جل رہی تھی اس کے کانوں میں سائیں بابا کے نعروں کی گونج تھی۔ مولوی صاحب کے لمبے لمبے وعظ تھے۔ مندر کی گھنٹیاں، ٹکسی کے بوٹے، نماز، روزے، نیاز مالک کے لئے، مالک کے نام پر، مالک کی راہ میں..... رضیہ کے دل میں مالک کا جو غلط ملط ساتھ ساتھ رہتا وہ اسے اندھیری اور سنسان گلی میں روشنی دکھاتا لیے جا رہا تھا اس کے شوق اور تجسس میں پیسیرانہ وار فکری کا تناؤ آ گیا تھا اگر دنیا میں ایک اور موسیٰ کے لیے جگہ ہوتی لاریب مندی گرام کی وہ تاریک اور ویران گلی کوہ طور کی بلند چوٹیوں کے ہمدوش اٹھ جاتی.....

بڑی حویلی کے صدر دروازے پر اس نے رامانند چوکیدار کی منت کی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی، رامانند ایک لمبے سے بیچ پر لینا ہوا اونگھ رہا تھا۔ سارا سال وہ بڑی حویلی کے اندر رہتا تھا لیکن سال میں ایک بار جب مالک لگان کا حساب کرنے آتے تو وہ صدر دروازے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ باغیچے میں پھولوں کی قطاروں کے درمیان مالک کا ہار لگا ہوا تھا۔ صدر میں مالک تھے۔ بائیں طرف مالک کے تحصیل دار، گماشتے، پیر و کار اور مصاحب تھے۔ دائیں جانب گاؤں کے کھیا لوگ تھے۔ ان میں مولوی صاحب تھے، پاشہ شالا کے پجاری، سکول کے ماسٹر، دونوں سیٹھ بھائی، بالائیش بجرنگ لال اور ایسے ہی چند ایک اور جو دن بھر میں دو کی جگہ تین یا چار دفعہ پیٹ بھر سکتے تھے۔ درمیان میں ریتا بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں میں چھم چھم چھم، چھما چھم چھم چھم، چھم چھم چھم چھم، چھم چھم چھم چھم۔ وہ ایک پتلی سی سرخ ساری پہنے شیشے کی طرح ناچ رہی تھی اس کے پیچھے سازندوں کی قطار تھی..... چچی داڑھی والا چچی موناسا ہار مونیم ماسٹر، سوکھا ہوا زرد زور مار گئی والا..... ریتا اسی گاؤں کی چھو کری تھی، لیکن اب اس کا گھر کلکتے میں ہے جب مالک آتے ہیں تو گاؤں والے اسے بچوں روپے دن کے حساب سے چکال لاتے ہیں ریتا کی ماں مندی گرام میں کپڑے سیا کرتی تھی جب اس کا چاندو باز خانہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو سیٹھ بھائیوں بالا بخش بجرنگ لال نے اپنے قرضے کا تقاضا شروع کیا۔ دوسروں پر یہ اصل زور قسم کی جنبش سے بے نیاز تھا لیکن پانچ روپیہ ماہوار شرح سود کے عوض دونوں بھائیوں نے اسے مانا بنا کر گھر میں ڈال لیا۔ زندگی کے اس الٹ پھیر میں جب ریتا پیدا ہوئی تو سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ساتھ سارے گاؤں نے یہ قسمیں کیا کہ تسمی کے پودے میں ببول کا کانٹا اگ آیا ہے۔ انہوں نے بیک آواز اس کانٹے کو گاؤں سے نکال دیا لیکن

کھلتے میں جا کر یہی کانٹے گلاب بن جاتے ہیں اب ریتا کا بھی چرچا ہے اور جب سینٹھ بھائیوں بالا بخش بجرنگ لال میں سے کوئی بیوپار کے سلسلے میں کھلتے جاتا تو اس کے حساب میں عموماً تیس چالیس روپے گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ ریتا اور سے کی تال پر ناچ رہی تھی۔

مالک کے سامنے ارغوانی بوتلوں اور گلاسوں کی قطارتھی۔ ہر سریلے الپ پر وہ پورے کا پورا گلاس فٹ فٹ کر کے چڑھا جاتے تھے پھر انہوں نے ایک موٹے سے پلندے سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور انگلی پر رکھ کر ریتا کی طرف ہاتھ نہانے لگے۔ ریتا کبوتری کی طرح پھڑپھڑاتی لپکی۔ مالک نے ہاتھ کھینچ لیا اور دونوں کے درمیان گویا آنکھ بھولی کا کھیل رچنے لگا جس میں کبھی مالک کا ہاتھ ریتا کی سرخ ساری کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا تھا کبھی ریتا کے گھنگر یا لے بال مالک کی بانہوں میں کھو جاتے تھے۔ اور جب وہ تھک گئی تو اوئی کر کے اس نے اپنا سر مالک کے کندھے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کی پھیلی ہوئی توند تھپتھپانے لگی۔ مالک نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے گلابی ہونٹوں کے درمیان لٹکا دیا۔ سازندوں نے زور سے انترے کی تان اُرائی۔ اور ریتا کو لھے مٹکا مٹکا کر، گردن گھپا گھپا کرنا چنے لگی۔ پھر ٹھمری شروع ہوئی چگی داڑھی والے طیلچی اور موٹے ہارمونیم ماسٹر نے ایک میلی سی چادر اٹھا کر محفل کی طرف تان دی اور ریتا نے اس کی اوٹ میں کھڑے کھڑے اپنی لال ساری اتار کر سبز انگرکھا پہن لیا۔ عین اس وقت مالک کو زور کی انگڑائی آئی اور وہ کھڑے ہو کر ایڑیاں اٹھا اٹھا کی جمائی لینے لگے۔ یوں بھی ساری مجلس کی گردنوں میں بے ٹکے سے لوج آگئے تھے اور وہ اوپر اٹھنے لگیں۔ مولوی صاحب کن انکھیوں سے چادر میں کسی آوارہ چمید کو تلاش کرنے لگے۔ سینٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال نے ٹانگیں اٹھا کر زور سے ڈکاریں لیں۔ گماشتے اپنی مونچھوں کو بل دینے لگے۔ ریتا نے نگلی بانہیں سر پر رکھ کر ادھر ادھر دیکھا اور آنکھیں مٹکا کر مسکرانے لگی۔

مالک کی بوتلیں خالی ہوتی گئیں۔ نوٹوں کا پلندہ اگھٹتا گیا چادر جلد تننے لگی ریتا نے رنگارنگی ساریوں کے پھول کھلائے۔ محفل پر ایک لطیف سا سرور چھا گیا۔ رفتہ رفتہ مالک بھی ریتا کے گیتوں میں لقمہ دینے لگے۔ وہ گلا پھاڑ کر اس کی تان میں تان ملا تے اور کبھی گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بدست بھینسے کی طرح جھومنے لگتے۔ ریتا نے دھپک راگ گایا پھر باکیشری ہوئی۔ پھر وہ بہاگ کے سر پرنا چنے لگی۔ تین تال کی گلت پر جھومتے ہوئے اس کی کمریوں کچتی تھی جیسے گلاب کی ٹہنی پر فاختہ بیٹھی ہوئی پھڑپھڑا رہی ہو۔ اس کے بال کالے ابر پاروں کی طرح پھیل گئے اس کی بانہیں والہانہ طور پر کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ مالک کے ہاتھ سے گلاس چھن سے گر گیا ان کے ہونٹ تھر تھرائے اور وہ ایک زبردست جنبش کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ کمر اور دوسرا سر پر رکھ کر مٹک مٹک کرنا چنا شروع کر دیا۔ سازندوں کے ساز بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح تیز ہو گئے۔ ریتا کی بانہیں اور بھی سرعت سے کھلنے اور بند ہونے لگیں اور پھر مالک نے جھپٹ کر اسے اپنی آغوش میں بھیج لیا۔

”سالا چور۔“ راما نند چوکیدار کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اس نے ہاتھ سے ہاتھ جوڑ کر ایک زبردست جمائی لی اور آنکھیں مل کر مالک کی طرف دیکھا جو ریتا کو گلے میں ڈالے دیوانہ وار گھوم رہا تھا پھر اس کی نظر رضیہ پر پڑی جو دروازے کے ساتھ سائے کی طرح لگی بیٹھی تھی۔ ”چل بھاگ، حرامزادی۔“ راما نند نے اس کے منہ پر ترانے سے تھپڑ مارا۔ ”شرم نہیں آتی سو رکی بچی کو۔“

اس رات رضیہ کی نیند میں سونے اور چاندی کے گھنگر و بجتے رہے جب وہ جاگی تب بھی اس نے چاندی اور

سوناہی دیکھا۔ تخت پوش پر اس کا باپ رومال بچھائے بیٹھا تھا اس کی ماں اپنے میلے کچیلے زیور اکٹھے کر کے رومال میں ڈال رہی تھی۔ رضیہ کے ہاتھ میں بھی چاندی کے ہلکے ہلکے سے کنگن تھے۔ ماں نے چکار کر اس سے کنگن مانگے کیونکہ مالک کا لگان اور باقی آج ہی چکایا نہ گیا تو شام تک ان کے گھر میں لال لال پکڑیوں والے گماشتوں کا جھگھا لگ جائے گا۔ رضیہ نے بہتیرا کہا کہ مالک کے پاس تو نوٹوں کے بھاری بھاری پلندے ہیں اس کو ان معمولی کنگنوں کی ضرورت کیا؟ وہ روئی تھی ماں نے دم دلا سادے کر اس کے کنگن اتار ہی لئے۔

”آنسو نہ بہا، بیٹی!“ باپ نے اپنے آنسو روک کر کہا۔ ”میں اس مہینے بہت سا دھان اکٹھا کر لوں گا اور پھر تمہارے لیے سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔“

مہینہ بھر رضیہ کے دماغ میں سونے اور چاندی کے کنگن خواب کی طرح آتے اور جاتے رہے اس کے باپ نے دن دگنی اور رات چوگنی محنت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس من دھان جمع کر لئے۔ چاول کا بھاؤ روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ بالا بخش بجرنگ لال کے دلال اور آدھتی دھڑا دھڑا اونے پونے چاول اور دھان خرید کر جمع کر رہے تھے۔ آٹھ روپیہ من سے دس بیس، پچیس، تیس، پھر پینتیس روپیہ من کا بھاؤ ہو گیا لیکن کسانوں کے ذخیروں کی کنجیاں سیٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ہاتھ میں تھیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر بچائے ہوئے چاول اور لہو پسینہ ایک کر کے جمع کیے ہوئے دھان پانچ روپیہ من کے حساب سے اٹھتے گئے کچھ اصل زر میں کٹ گیا، کچھ سود میں لگ گیا۔ باقی بھی کھاتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا..... اور جب گلی کوچوں میں نندی گرام کے ہستے کھیلنے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر گرنے لگے تو رضیہ کے کنگنوں کا خیال دونوں لے چاول بن کر اہل گیا۔ بچوں کی پسلیاں چرچر کر کے اندر کی طرف دھنس گئیں اور پیٹ غبارے کی طرح پھول کر ابھر آئے۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ سوکھ کر ڈھلک گئیں جیسے چیلوں کے پنچے میں مردار گوشت کے لوتھرے لٹک رہے ہوں..... آدمیوں کا لہو ٹھنڈی آہیں بن کر اڑ گیا۔ کشوری چرن سارا دن چوراہے میں گرا ہوا دم توڑتا رہا۔ لوگ ناک پر کپڑا رکھ کے گزر گئے، راستہ کترا کے نکل گئے کسی سے یہ نہ ہوا کہ اس کے سوکھے ہوئے گلے میں پانی کا آخری گھونٹ پکا دے۔ ہم لتا کی ماں نے بیٹی کے کپڑوں پر تیل چھڑک کے آگ لگا دی اور پھر اپنے گلے میں ری ڈال کر آم کے درخت سے لٹک گئی ایک دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ رضیہ کا باپ جھونپڑی کے اندر اوندھا پڑا ہے اور ایک بھوکا پیاسا گیدڑ اس کی ایڑیوں میں دانت گاڑے خرخر منہ چلا رہا ہے۔ رضیہ کے باپ میں ابھی ایک ذوق جان باقی تھی لیکن اس کے بدن میں اتنا سہارا نہ تھا کہ وہ اس حریص درندے سے اپنا پاؤں چھڑالے۔ اس کے ہونٹ بھٹک کر دانتوں کے درمیان کٹ گئے تھے اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دو گد لے سے آنسو بھرے ہوئے تھے جیسے بلور کی گولیوں پر دھند کے بادل جم گئے ہوں.....

ایک روز بجرنگ لال کا بھائی بالا بخش ان کی جھونپڑی میں آیا..... ایک موٹی سی بھی الٹ پلٹ کے اس نے کوئی ساڑھے پانچ من دھان کا حساب جوڑا جو رضیہ کے باپ نے کسی وقت بیچ کے لیے ادھار لیے تھے۔ ”بھاؤ تم میں ہے“ بالا بخش پان چہا کر بولا۔ ”لیکن میں بیس روپیہ من ہی لگاؤں گا۔ کل 110 روپے نقد ہوئی۔“

پھر اس نے نظریں گاڑ کر رضیہ کی ماں کو پرکھا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پان کی پیک کا ایک بڑا سا گھونٹ غٹ کر کے گلے لیا۔

”تو فکر نہ کر۔“ بالا بخش دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ ”رضیہ کی ماں تیری عمر ہی کیا ہے..... تو جب کہے گی بھی میں

رسید چڑھا دوں گا، ہاں! لیکن بھیا کو خبر نہ لگے! بالابخش نے آنکھ میچ کے مستقبل کا ایک لذیذ سا چٹخا رہ لیا۔
 دوسرے روز بالابخش کا بھائی بھنگ لال آیا۔ اس نے بھی ایک موٹی سی بھی میں ساڑھے پانچ من دھان کا
 حساب لیا، اور اس میں کی جگہ بیس روپیہ من کے دام سے 110 روپے نقد کی رقم جوڑی۔

”روپیہ سالا کیا ہے، رضیہ کی ماں“ بھنگ لال نے سرگوشی کی۔ ”ساری بات تو دل کی ہے۔ تو چاہے، تو سارا
 حساب کاٹ دوں۔ آپس کی بات ہے بالابخش کو نہ بتاؤ!“

تیسرے روز منہ اندھیرے رضیہ کی ماں نے ایک کندھے پر رضیہ کو اور دوسرے پر کپڑوں کی گٹھڑی ڈال کر اپنی
 جھونپڑی کو حسرت سے دیکھا، جس میں اس نے سہاگ کی پہلی اور آخری رات بسر کی تھی۔ ان دو راتوں کے درمیان
 ایسے لمحے بیتے تھے جن کی دھڑکن میں اس نے زندگی کے بیٹھے بیٹھے نغمے جی بھر کر سنے تھے۔ لیکن اب اس کا سزا بغیر
 سازندے کے تھا۔ وہ اندھیرے منہ اپنی منھمی سی کائنات کندھے پر اٹھائے جا رہی تھی۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے آگے
 پیچھے ایک جہان تھا جو اٹھ آیا تھا۔ ان میں بچے تھے جو بلکتے ہوئے جا رہے تھے، بوڑھے آدمی جو سکتے ہوئے جا رہے
 تھے، عورتیں جو بکتی ہوئی جا رہی تھیں۔ کچھ مر گئے۔ کچھ لٹ گئے۔ لیکن جو چل سکتے تھے وہ چلتے رہے جو ریگ سکتے تھے
 وہ ریگتے رہے۔ اور ایک آسودہ منزل کا خیال ان کی گرتی ہوئی ہمت کو اٹھاتا رہا۔ ان کی اُمیدوں کا کعبہ کلکتا تھا جہاں
 بڑے بڑے مکان ہیں، رنگ برنگی دکانیں، موٹے موٹے سیٹھ۔ جہاں کتوں کو گوشت ملتا ہے بلیاں دودھ پیتی ہیں۔
 لوگ ناچتے ہیں۔ وہاں چاول بھی تو ہوں گے! نیم جاں ڈھانچوں کا یہ قافلہ ایک اسی اُمید کا سہارا لئے جا رہا تھا۔ ان
 کے تخیل نے کلکتے کے اونچے مکانوں میں اور چمکیلی چمکیلی سڑکوں پر چاولوں کے بورے ہی بورے بچھا دیے تھے، جو محض
 ان کے آنے کا انتظار کر رہے ہوں گے! یہ ذہنی سراب ان کی ٹوٹی ہوئی کمر میں رستے باندھ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔
 رضیہ کبھی چلتی تھی، کبھی گرتی تھی، کبھی اس پر بھوک کا ایک گہرا اور طویل نشہ چھا جاتا تھا۔ نشہ شراب ہی میں نہیں، نشہ عورت
 کی شرمیلی آنکھوں ہی میں نہیں، نشہ بھوک میں بھی ہے۔ ایک دھڑکتا ہوا خمار جو روح کی آزادی کو جسم کے احسان سے
 بے نیاز کر دیتا ہے! پیغمبر کا نشہ الہام بن جاتا ہے۔ صوفی کا نشہ بے خودی ہے۔ لیکن بھوک کے نشے کو بے ہوشی کہتے
 ہیں..... خیر، بے ہوشی ہی سہی۔ لیکن رضیہ کے دماغ میں ہر وقت یہ اُمید تیرتی رہتی تھی، کہ شاید اگلے لمحے کوئی اس کا منہ
 کھول کر مٹھی بھر چاول ڈال دے۔

رفتہ رفتہ افقی لکیروں پر اونچی اونچی چھتوں کے نشان ابھرنے لگے زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں بھٹکے ہوئے
 مہاجرین کے لیے مدینے کے میناروں کی یہ پہلی جھلک تھی۔ ان کی عقیدت کے پیانے چھلکنے لگے۔

وہ قدم قدم پر گرتے تھے اور ہر نئے موڑ پر ان کی اُمیدوں کا ہجوم چمچھا اٹھتا تھا اُمیدوں کا ہجوم ہی نہیں، کلکتے کی
 چمکیلی سڑکوں پر اور تنگ گلیوں میں نیم جاں ڈھانچوں کا ہجوم بھی تھا اور ہر لمحہ سیلاب کے پانی کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔
 او ماں چاول او، بابا چاول..... او، بابو چاول..... لیکن ماں کہاں تھی؟ بابا کہاں تھے؟ اور پھر وہ چاولوں کے بورے کہاں
 ہوئے جو کلکتے کی سڑکوں پر بکھرے ہوئے تھے؟ یہاں تو دروازوں پر دربان کھڑے تھے سڑکوں پر موٹریں..... اور پانی
 معلوم ہوتا تھا کہ حاجیوں کا قافلہ مکے اور مدینے کی تلاش کرتا ہوا قاہرہ کے شراب خانوں میں بھٹک نکلا ہے۔ یہ بھوکے
 اور پیاسے لوگ موت سے لڑتے آئے تھے اب وہ زندگی سے لڑنے لگے۔ وہ نالیوں میں تیرتے ہوئے موگت پھلی کے
 چھلکوں اور گوبھی کے پتوں کو نکال کر کھاتے تھے۔ وہ گندگی کے ڈھیروں کو کرید کر اپنا پیٹ بھرتے تھے وہ کارپوریشن کی

شہاب نگر
توڑے کرکٹ والی گاڑی پر چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے وہ ایک دوسرے سے لڑتے تھے منہ لوپتے تھے۔ ہال کھینچتے تھے ان کی لڑائی کتوں سے ہوتی تھی اور جب وہ نڈھال ہو کر سڑک کے درمیان گر جاتے تھے تو لال پگڑی والے سپاہیوں کا رستہ انہیں ایسولینس کار میں ڈال کر ہسپتال میں بھیج دیتا تھا۔

رضیہ کو کندھے پر ڈالے رضیہ کی ماں بھی ہسپتال جا رہی تھی ایسولینس کار میں بہت سی نڈھال عورتیں بیٹھیں اور مرد تھے۔ ان کے ننگے ننگے جسم پسینے میں شرابور تھے اور وہ بے ترتیبی سے ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے جیسی گیلی گیلی نیم جان مچھلیوں کو چمکڑے میں ٹھونس کر بھر دیا ہو ڈرائیور کے ساتھ ایک کالا سا ڈاکٹر سفید سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ ہر اونچی آہ، ہر بلند چیخ پر وہ تلملا اٹھتا تھا..... ”خاموش شالے، چھی یہ کالا آدمی چین سے مرنا بھی نہیں جانتا“ اگر اس وقت رضیہ ہوش میں ہوتی تو اس کا حساس دماغ ضرور سوچتا کہ یہ اُلو کا پٹھا کالا کس کو کہتا ہے؟ اس کا اپنا منہ کوتاہی کی طرح لتھڑا ہوا ہے..... ہسپتال والے بہت نیک تھے وہ مرتے ہوئے لوگوں کو دودھ، کھجری، وٹامن، گلوکوز کی لالچ سے بچا لیتے تھے اور پھر اسے انگلی سے پکڑ کے ہسپتال سے باہر چھوڑ آتے تھے کہ جاؤ بیٹا ایک بار پھر مالک کی شان دیکھو..... ضرورت پڑے تو ہمارا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے!

جب رضیہ اور اس کی ماں ہسپتال سے ڈسچارج ہونے لگے تو نرس منازی نے رضیہ کو چاکلیٹ کا بنڈل اور ایک تصویر دی جس میں خداوند یسوع مسیح صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔

”تم مالک پر بھروسہ رکھو۔“ نرس منازی نے تصویر چوم کر کہا۔ ”ساری دنیا تمہارے سامنے ہے خداوند مسیح تمہارا رہنما ہے وہ تمہاری مدد کرے گا۔ ڈلہوزی سکور کے وسیع چوراہے میں رضیہ ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھنا بھول گئی جن کی ایٹ ایٹ پر تاریخ نے انسانی انصاف کے بہت سے عجیب عجیب فیصلے لکھے ہیں وہ اپنے مالک کو دیکھ رہی تھی جسے لوہے کی کیلوں کے ساتھ صلیب پر گاڑ دیا تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اس کے دل میں ایک زبردست جذبہ ترحم پیدا ہوا وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگی، سائیں بابا پر، مسجد کے مولوی پر، نندی گرام کے زمیندار پر.....

رضیہ کی ماں نظریں گاڑے نرس منازی کی اس دنیا کو تلاش کر رہی تھی، جس میں سب کا رہنما خدا ہوتا ہے، چورنگی کے پاس ایک موٹا بابو اور ایک بھینگا بابو اس کے سامنے آکھڑے ہو گئے۔

”بھوک ہو؟“ موٹے بابو نے نکر کی جیب میں ہاتھ گھما کر کہا۔

”چلو۔ ایک ایک روپیہ دیں گے۔ بھیجے بابو نے آنکھ ماری۔“

ایک شیشے کی طرح چمکتی ہوئی موٹر کار روڑی پوش ڈرائیور ان کی طرف لپکا۔ ”آؤ گوری تمہیں کلکتہ دکھلاؤں۔ یہ لو پانچ روپے بیٹگی.....“

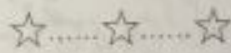
ایک ہوٹل کے گارڈ نے اس کی پسلیوں میں کہنی ماری..... ”سوچتی کیا ہو چلی آؤ میرے ساتھ، بیس روپے روز کما لوگی.....“ ایک رکشا والا اسے پچاس روپے دلوار ہاتھ، ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے گالی دی، ایک موٹا سیٹھ بے تحاشا اس کے ساتھ لگا گیا۔ ایک خوبصورت نوجوان نے اس کی خوشامد کی، وہ دیکھ رہی تھی کہ کلکتہ بھی بھوکا تھا۔ ایک روپیہ، پانچ روپے، بیس روپے، پچاس روپے..... چاول کی طرح عورت کا بھاؤ چڑھتا جا رہا تھا۔ بھوکے پیاسے لوگ ہاتھ پھیلا کر تڑپ رہے تھے..... ہر جوان عورت کو دیکھ کر ان کے دل سے بے ساختہ فریاد نکلتی تھی کہ او ماں، او بہن، او بیٹی ذرا ٹھہرو.....

رضیہ کی ماں ان گرسنہ بھیڑیوں کے جنگل میں بھاگتی جا رہی تھی اور جب وہ پور ہو کر ایک بجلی کے سہمے کے نیچے

بیٹھ گئی تو کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
یہ ریتا تھی۔

”تم بھی آگئی ہو چچی؟“ ریتا نے رضیہ کی ماں کے پاؤں چھو کر کہا۔ ”اچھا ہوا مجھے مل گئیں۔ یہ بڑی بُری جگہ ہے چچا۔“
جب وہ ایک وکٹوریہ میں بیٹھ گئے تو رضیہ نے پہلی بار اطمینان سے رنگ برنگی دکانوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ریتا کہہ رہی تھی۔ ”میرے پاس عزت نہیں ہے چچی۔ لیکن مجھے دوسروں کی عزت کا پاس ہے۔“ اس نے ایسی بہت سی باتیں کیں۔ بات بات پر اس کی کٹوراسی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے۔ ریتا کے چوہارے میں نندی گرام کے بہت سے بچے تھے، بہت سی عورتیں، بہت سے مرد..... ان میں سائیں بابا بھی تھا وہ ایک کونے میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا کبھی کبھی اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور وہ آہستہ سے کہتا تھا سب کا مالک کون! اللہ سب کا مالک کون؟ جب رات ہوئی ریتا نے گلابی ساری پہن کر سنا کر کیا، اس نے اپنے گھنگھر یا لے بالوں میں پھول لگائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بیٹھک میں چلی گئی اس کے گھنگھر وچھم چھم چھم، چھما، چھم چھم، بجنے لگے اس کی کمر سانپ کی طرح بل کھانے لگی اس کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کی ناؤ تیرنے لگی..... زندگی کے اس دودھارے میں ایک طرف سائیں بابا تھا دوسری طرف ریتا بوس اور درمیان میں رضیہ تھی جس کے ہاتھ میں ابھی تک مالک کی تصویر لٹکی ہوئی تھی.....

ماہنامہ ”ہمایوں“ لاہور جولائی 1945ء



نجمی کے بال

دو پہر بھر کی دھوپ کھا کر کنوئیں کی ڈول کی رسی سوکھ کر اکڑ گئی تھی اور اس کی رگڑ سے میرے دونوں ہاتھ شل ہو رہے تھے لیکن پیاس اور تکان کی شدت میں کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پانی نکالا اور لپک کر ڈول سے منہ لگا کر ہی پینا شروع کر دیا، کچھ پانی آستینوں کی طرف بہ نکلا۔ کچھ اس طرف گیا کچھ اُس طرف اور اس وقت پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ دنیا میں گلاس بھی ایک شے ہے۔ پانی پی کر میں نے زنگ آلودہ ڈول کو نہایت سیر طبعی سے ایک طرف پھینک دیا، وہ لڑھکتا لڑھکتا کنوئیں کے منڈیر سے جا نکلایا۔ اس کے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے چھنے ہوئے جسم سے ایک عجیب قسم کی جھنجھناہٹ پیدا ہوئی جو دو پہر کے سناٹے میں ایک وحشت ناک چیخ کی طرح گونج کر خاموش ہو گئی۔ ایک بوڑھا کسان جو پاس کے درخت کی چھاؤں میں سویا ہوا تھا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور گرد و پیش ایک تجسس نگاہ ڈال کر زہر لب بڑھاتا ہوا پھر سو گیا۔ گاؤں کے چند آوارہ کتے زبانیں باہر نکالے ہوئے میری طرف جھپٹے اور ان میں سے ایک نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر لمبی لمبی آواز نکال کر رونا شروع کر دیا۔

میں طبعاً تو ہم پرست نہیں لیکن اُس خاص ماحول میں مجھے یہ بھی آواز کچھ غیر مانوس سی محسوس ہوئی۔ میں نے بڑھ کر اپنے گھوڑے کا چابک اٹھایا اور کتے کو مارنے کے لیے پیچھے کی طرف پھرا لیکن وہاں کوئی کتا موجود نہ تھا۔ نجمی نے ان سب کو پہلے ہی بھگا دیا تھا۔ نجمی کے کپڑے بوسیدہ اور پھٹے ہوئے تھے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے وحشت فک رہی تھی اور اس کے گھنے بال شفیق شام کی طرح سیاہی مائل سنہری تھے۔

نجمی کے ہاتھ میں ایک خالی گلاس تھا۔ مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ کسی قدر جھپنی اور اس نے اپنے گلاس کو قمیص کے نیچے چھپانے کی ایک ناکام سی کوشش بھی کی لیکن میں نے بھانپ لیا کہ ڈول کے ساتھ میری کشمکش کو دیکھ کر ایک رحم دل بھکارن کو ترس آیا اور وہ میری مدد کے لیے اپنا گلاس لیکر آ گئی لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے نجمی کا ہاتھ قسے رکھا اور گلاس کی بروقت موجودگی میرے نئے لباس کو پانی کے چھینٹوں سی نہ بچا سکی۔

کیا میری ظاہری ٹپ ٹاپ نے اس کا منہ بند رکھا؟

کیا میری امارت کا خیال اس پر غالب آ گیا؟

شاید نجمی نے سمجھا ہو کہ ذیل دار کے بیٹے کے ساتھ مدد کے وقت بات کرنا بھی گستاخی ہے۔ کچھ بھی ہو، ذیل دار کے لڑکے ایسے واقعات کی وجہ سے پریشان ہونے کی عادی نہیں ہوتے۔ میں نے جیب سے چار پیسے نکال کر نجمی کی طرف پھینکے اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی گاؤں کی طرف چل دیا۔

بیموں کی جھنکار سن کر نجمی پھول کی طرح کھل گئی۔ اس نے جھپٹ کر انہیں زمین سے چن لیا اور گلاس میں ڈال کر

مجھن مجھن بھاتی ہوئی لڑھ پن سے اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کے ساز پر ایک حور رقص کرتی ہوئی جا رہی ہے۔

اس بات کو دو سال ہو گئے۔ ان دو سالوں میں دنیا نے بہت سے رنگ بدلے ہیں۔ میں نے ایم اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گیا اور اسی عرصہ میں میرا متوالا دل جو آوارہ تیزی کی طرح نت نئے پھولوں سے اکھیلیاں کرنے کا عادی تھا، آخر ایک مخصوص نقطہ پر ٹھہر ہی گیا۔ ننھے کیو پڈ نے اپنا تیر چلا دیا تھا اور میں بہت بری طرح اظہری کی زلفوں کے جال میں پھنس چکا تھا۔ اظہری!..... بہرام پور کی پرسکون فضا میں اظہری بلبل کی طرح چبکتی تھی۔ گاؤں کی ان پڑھ آبادی میں اس کا وجود بدلیوں میں گھرے ہوئے چاندی کی مانند دمکتا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، اظہری کی مستانہ آنکھوں کا خمار اور اس کے بدن کی کوندتی ہوئی جھلماہٹ میری زندگی پر سپید صبح کی طرح چھا گئے اور میرے اٹھاہ جذبات کا سمندر سکڑ کر اس کے دموں میں جا پڑا۔

لیکن اظہری کا دل بہ یک مشت دو بازیاں کھیل رہا تھا اس کے دل کے دائیں گوشے پر مسعود کا نقش چھایا ہوا تھا اور بائیں کونے میں شاید میرے لیے بھی تھوڑی سی جگہ باقی تھی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اظہری کا دل فقط میرے لیے وقف ہو جائے لیکن مسعود کی تصویر ان مٹ ثابت ہوئی۔ میری منت سماجت نے ان نقوش کو اور بھی پختہ کر دیا۔ میری دھمکیاں بے اثر نکلیں اور ایک دن جب اظہری نے اپنے من سے یہ کہہ دیا کہ محبت کی دنیا میں عورت کے جذبات مکمل آزادی کے حقدار ہیں تو میری تمام آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ میں نے اسے بے تحاشا سخت و ست کہا اور غم و غصہ کے کھولتے ہوئے جوش اور پامال شدہ تمنائوں کی خونچکاں حقیقت میں تلملاتا ہوا دلپس لوٹا۔

راہ میں نجی کا گاؤں پڑتا تھا۔ پورے دو برس کے بعد آج پھر دو پہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں میرا گزرا سی زور افادہ کنوئیں کے پاس سے ہوا۔ آج بھی پیاس سے میرا ہر حال ہو رہا تھا نا کام آرزو کی پیاس پانی کی بجائے خون جگر سے بہت بھرتی ہے۔ دو پہر کی خاموشی میں گاؤں کا گاؤں سویا پڑا تھا۔ دو تین گنتے اپنی مخصوص بھینک غرغراہٹ کے ساتھ بھونک رہے تھے لیکن کنوئیں کا ڈول بدلا ہوا تھا۔ ڈول کی رسی بھی نئی نظر آتی تھی اور کنوئیں کی منڈیر پر جا بجا مرمت کے آثار نمودار تھے۔ میں نے سرسری طور پر کنوئیں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ ہمسائے کی ایک خستہ حال کنیا کا دروازہ کھلا اور بھرے ہوئے جسم والی ایک نوجوان بھکارن ہاتھ میں گلاس لیے میری طرف بھاگی ہوئی آئی، زندگی کے چوبیس مہینوں نے نجی کی کمسنی کو اور غوانی شباب میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا اور چہرے پر جوانی کا نکھار تھا۔ نجی کے سنہری بال پہلے سے بھی زیادہ گھنے ہو گئے تھے اور اس کے مچلتے ہوئے تبسم میں بہت سی نئی بچلیوں کی کوند تڑپ رہی تھی۔

نجی نے کچھ کہے سنے بغیر بائیں ہاتھ سے مجھے سلام کیا اور دائیں ہاتھ سے اپنا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی وحشی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ تمہیں پسینہ آ رہا ہے خدا را پانی پی لو لیکن پیاس کا خیال ہی کسے تھا؟ میں نے ایک اکئی گلاس میں ڈال دی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر روانہ ہو گیا۔

آج پھر کائنات کے ذرے ایک سریلی جھنجھناہٹ پر تھر تھرانے لگے لیکن ساز کی بے ربط اور ٹوٹ ٹوٹ کر پیدا ہونے والی آواز بتا رہی تھی کہ نجی کے ہاتھوں میں کیپکاہٹ ہے۔

رفتہ رفتہ دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے گئے اور ہفتے مل کر مہینے بنانے لگے۔ آخر کار ایک دن اظہری اور مسعود کی شادی کا وقت بھی آ پہنچا۔ اس روز میں ایک ناقابل بیان ذہنی کرب میں سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہا۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی اور رات کا اندھیرا عینیت سے عمیق تر ہونے لگا۔ واپسی پر راستے میں ایک قبرستان تھا۔ مایوسی کے عالم میں انسان کو موت کے ساتھ خاص انس ہوتا ہے۔ قبرستان میں مٹی کے نئے پرانے خاموش ڈھیروں کو دیکھ کر مجھے کچھ ڈھارس ہو رہی تھی لیکن ایک میرادل بیٹھنے لگا، سانس رک گیا اور انتہائی خوف کے عالم میں بدن پسینہ پسینہ ہو گیا۔

کیا مردہ بھی زندہ ہو سکتا ہے؟

میرے دماغ میں عجیب کشمکش ہوا تھی کیونکہ کچھ دُور پرے درختوں کے جھنڈ میں ایک قبر پھٹی ہوئی تھی اور رات کی تاریکی میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک مردہ گردن باہر نکال کے میری طرف جھانک رہا ہے۔ خوف و ہراس سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر ایک بھیا نک شکل قبر سے نمودار ہوئی اور رات کے اندھیرے میں سائے کی طرح چلتی ہوئی میرے پاس آئی، مجھ میں اتنی سکت بھی باقی نہ تھی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں اور جب ایک برف کی طرح ٹھنڈے اور ہڈیوں کی طرح سخت ہاتھ نے میرا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچا تو میں نے بلاچوں و چرا اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔

اس ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس جا کر مجھے معلوم ہوا کہ میری رہنما ایک ضعیف العمر بڑھیا ہے جسے میں نے متعدد بار آس پاس کی بستیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ بظاہر سامنے والی قبر بالکل نئی اور تازہ نظر آتی تھی لیکن بڑھیا نے کھود کھود کر اس کا نصف حصہ اکھیڑ لیا تھا اور باقی ماندہ کام کی تکمیل کے لیے قبر کے کھدے ہوئے گڑھے میں چند لوہے کی سائیں پڑی تھیں اور ایک مدھم مٹی کا چراغ بھی جل رہا تھا۔

بڑھیا نے اپنی خمدار کمر پر ہاتھ رکھ کے میری طرف دیکھا اور اپنی پڑمردہ آنکھوں میں ایک تیز چمک پیدا کر کے کہا:

”بیٹا اسے کھودو۔“

یہ عجیب اور بھیا نک حکم سن کر میں کچھ کپکپایا اور اپنی ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن بڑھیا کی مرجھائی ہوئی زرد زرد آنکھوں میں ایک بار پھر وہی ملتجیانہ چمک پیدا ہوئی اور اس نے بچوں کی طرح بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ کہا۔ ”اسے کھودو بیٹا!“ اب سر تسلیم خم کرنے کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ کھٹ..... کھٹ..... کھٹ رات کی پرسکون خاموشی میں چار ہاتھ نہایت سرعت سے قبر کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔ قبر کے ایک سرے پر میں بیٹھا تھا اور دوسرے سرے پر وہ بڑھیا بجلی کی طرح اپنے کمزور ہاتھ چلا رہی تھی۔

”لیکن تم یہ قبر کس لیے کھود رہی ہو؟“ آخر کار میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ بڑھیا نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر چراغ کی بتی کو ٹھیک کیا اور لوہے کی سلاخ کو چھوڑ کر ہاتھوں سے مٹی کو کریدتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ بابو جی اس مٹی کے تے میری بیٹی ہے، کل میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا تھا آج انہی ہاتھوں سے اسے باہر نکال رہی ہوں کیونکہ مجھے ایک بھول ہو گئی بابو جی میری بیٹی بڑی بھولی بھالی تھی۔ اسے پیروں فقیروں پر بڑا اعتبار تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے مجھے یہ تعویذ دیا اور کہا کہ ماں، جب میں مر جاؤں تو اسے میرے بازو پر باندھ کے دفن کرنا۔ بابو جی کل یہ کام مجھے یاد دل نہ رہا۔ یاد کیسے رہتا؟ میری بیٹی کی موت کے بعد مجھے کچھ یاد رہ سکتا ہے! لیکن رات کو جو میں گھر واپس گئی تو

میں نے سنا کہ کوئی انسان گھر کے اندر رو رہا ہے۔ آواز میری بیٹی کی تھی۔ میں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کوئی نہ ملا۔ میں بھاگتی ہوئی قبر پر آئی یہاں بھی وہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں ایک گھر سے دوسرے گھر بھاگی۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں گئی لیکن وہ آواز متواتر میرے کانوں میں آتی رہی۔ بابو جی، جیتے جی میری بیٹی کے آنسو بھی نہ جھمتے تھے۔ اب مرنے کے بعد بھی اسے چین نہیں، آخر بہت کچھ سوچنے کے بعد مجھے یہ تعویذ یاد آیا..... آہ میری بھول کی وجہ سے

میری بیٹی کی روح کو اس قدر روٹا پڑا..... بابو جی، میں یہ تعویذ اس کے بازو پر باندھنے آئی ہوں۔

بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سن کر مجھے ایک قسم کا یقین سا ہو گیا کہ بیٹی کی موت نے بے چاری کا دماغ پریشان کر دیا اور یہ لرزہ خیز کھدائی محض اس کے جنون کا نتیجہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ بڑھیا کی سال خوردہ نگاہوں نے میرے اندرونی خیالات کو بھانپ لیا کیونکہ اس نے پھر اسی سکیپاتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا لیکن بابو جی یہ لڑکی پاگل بھی تھی۔ دو سال سے اوپر ہوئے کہ اس کا دماغ پھر مری تھا۔ میری عمر بھر کی پونجی خرچ کر کے اس نے ایک ہتیل کا نیا گلاس خرید لیا۔ ایک ڈول اور رسی لیکر کنوئیں پر رکھوا دیے۔ کنوئیں کی پھوٹی ہوئی منڈیر کو معماروں سے درست کروا دیا اور دن بھر میں کئی بار وہ اپنے گلاس کو دھو دھا کر طاقے میں رکھتی اور دن رات کنوئیں کے ارد گرد دیوانوں کی طرح منڈلاتی رہتی تھی۔ آخر یہی کنوئیں اس کا قاتل ثابت ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ.....

بڑھیا کی کہانی ختم نہ ہوئی تھی کہ میں ایک دلدوز چیخ کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی کھدائی پوری ہو چکی تھی اور بڑھیا کی باتیں سنتے سنتے میرا ہاتھ قبر کی تہ تک جا پہنچا تھا۔ اس وقت میں نے دفعتاً محسوس کیا کہ ساری کی ساری قبر روٹی سے بھری ہوئی ہے کیونکہ گھبراہٹ کے عالم میں میرا ہاتھ جس طرف جاتا تھا اسی طرف کسی چیز کے نرم نرم گالے میری گرفت میں آتے تھے۔

بڑھیا نے چراغ اٹھا کر قبر میں اتارا..... ایک سنگ مرمر کی طرح سفید نیم برہنہ لاش کفن کو پھاڑ کر بے ترتیبی کے عالم میں قبر کے اندر پڑی تھی۔ اس کے لائے لائے بال پریشان ہو کر ساری قبر میں بکھرے ہوئے تھے..... بڑھیا کے اشارے سے اس بے جان مجسمے کو قبر سے باہر نکالا اور اس کے مرمریں بدن کو پریشان بالوں کی الجھنوں سے آزاد کیا۔ یہ نجی کی لاش تھی۔

بڑھیا نے نجی کے پھٹے ہوئے کفن کو جگہ جگہ سے گانٹھا اور اس کے بکھرے ہوئے سنہری بالوں کو سمیٹ کر باندھنا شروع کیا۔ میں نے چپکے سے چراغ کی روشنی میں نجی کے تعویذ کو کھول کر دیکھا۔ اس میں چار پیسے اور انجی بندھی ہوئی تھی۔

عرصہ ہوا کہ زمین کے کیڑے نجی کے خوبصورت جسم کو کھا کھا کر خود بھی خاک ہو چکے ہوں گے لیکن نجی کے سنہری بالوں کا سایہ آج تک میرے دل پر چھایا ہوا ہے۔ چالیس برس میں دنیا بدل جاتی ہی۔ جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اب تک نجی کے گھنے بال بھی قبر کی تنہائی میں سفید ہو چکے ہوں گے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کہکشاں کی دودھنی جھللاہٹ میں بھی اس کے پریشان بالوں کا پرتو نہیں۔

”نیرنگ خیال“ لاہور دسمبر 1958ء

شجر ممنوعہ

میری جان پہچان کی ایک خاتون ہیں جو غرارے اور اردو ادب دونوں کو یکساں نیک نیتی سے فیشن کے طور پر نوازتی ہیں۔ ایک روز بریکیل تذکرہ میں ان سے پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ کبھی ممنوعے ملی ہیں؟ اس سوال پر انہوں نے کچھ اس طرح منہ بنایا جیسے میں نے کوئی خلاف شرع بات کہہ دی ہے۔ ان کے میاں نے بھی حسب توفیق مجھے ملامت کی۔ نیز بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن میرے دل میں کھٹک باقی رہی کہ یہ میاں بیوی کئی لحاظ سے خاصا ”روشن خیال“ جوڑا ہے۔ اپنے پلانے کو برا نہیں سمجھتے، رقص نگاہ میں نامحرم عورتوں اور مردوں کے ساتھ ناچنے سے بھی عار نہیں اور مجھ سے منٹو کی قریباً سب کتابیں مانگ کر نہ صرف پڑھ چکے ہیں بلکہ غالباً چاٹ گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بہت کم کتابیں مجھے واپس ملی ہیں۔ پھر ان کا منٹو سے ملاقات کے تذکرہ پر یوں ناک بھوں چڑھانا چہ معنی دارد؟ فقط توجہ کی ضرورت ہے چنانچہ سراغ لگانے پر انکشاف ہوا کہ جس طرح پرویش کے بعد شراب پینا، تو لازمی طور پر گناہ نہیں لیکن برسر عام شراب پر لعنت بھیجنا باعث ثواب ہے اسی طرح ”کھول دو“ اور ”ٹھنڈا گوشت“ کے بعد منٹو کی کتابیں پڑھنا تو بدستور باعث لذت جسم و روح ہے کہیں اس کے نام پر ناک سکیڑنا ملک و قوم کی بہبودی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی منٹو کا کمال ہے، کہ اس کا فن اور اس کی ذات دونوں انسان کی سرشت کی ساری خباثتوں کو نہایت بے رحمی کے ساتھ عریاں کر کے انہیں انسانیت کے منہ پر دے مارتے ہیں کسی محفل میں بیٹھ کر منٹو کا ذکر دیکھیے۔ آنا فانا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ صالحین کا طبقہ جو رات کو چوری چھپے منٹو کے افسانے پڑھ کر اپنے آباؤ اجداد کی روح کو ثواب پہنچایا کرتا ہے فوراً لاجول پڑھ کر تیوریاں چڑھالے گا اور غیر صالحین، خیر منٹو کے ضمن میں ان کا..... ذکر ہی کیا!

ایک آسامی کے لیے انٹرویو ہو رہا ہے۔ بورڈ نے مجھے اور شائستہ اکرام اللہ کو مشورے کے لیے اپنے ساتھ بلوایا ہوا تھا ایک جانے پہچانے ادیب بھی امیدوار کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ چند سال پہلے انہوں نے منٹو پر ایک خاص الجھا ہوا مقالہ لکھا تھا۔ اس روایت سے انٹرویو کے دوران میں، میں نے ان سے منٹو کی ادبی پوزیشن کے متعلق سوال پوچھا۔ اس وقت ادیب صاحب کے سامنے ادب سے زیادہ ملازمت کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ ملک و قوم کے ساتھ اپنی وفاداری کو غیر مبہم طور پر واضح کرنے کے لیے انہوں نے جواب دیا کہ منٹو کا وجود ادب کے ذہن پر ایک بدنما داغ ہے! غالباً یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان دنوں ”ٹھنڈا گوشت“ کا مقدمہ اپنے عروج پر تھا!

میرے خدائے منٹو اور گندم کو پیدا کر کے بنی نوع انسان کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اگر کھائیں تو جنت سے خارج، نہ کھائیں تو بنگال کا قحط۔

منٹو سے میری پہلی ملاقات محمود ہاشمی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ہاشمی پر ان دنوں کشمیر کی اداسی بڑی شدت سے طاری

تھی اور وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے کسی تیز قسم کی صحبت کا متلاشی تھا۔ ہم نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا، کہ چلو آج منٹو کو آزما دیا جائے۔ جب ہم دونوں منٹو کے فلیٹ میں پہنچے، تو دفعتاً میرے منتوں میں آنیڈ وفارم کا بھپکا سا آیا۔ دراصل اس کمرے میں آنیڈ وفارم یا اس قسم کی کوئی اور دوا موجود نہ تھی محض "بو"، "خوشیا" اور "ہنک" کے مصنف کا جو تصوراتی نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا، وہ اچانک آنیڈ وفارم کی تیز تیز سڑاند میں تحلیل ہو کر سامنے آ گیا۔ اس شعبہ بازی میں کچھ میرے اپنے ذہن کی کثافت کا ہاتھ تھا کچھ منٹو کے فن کا کمال تھا۔ کمال اس لیے کہ منٹو ایک بڑا جادوگر تھا۔ وہ لوگوں کی نظر بند کر کے انہیں عجیب و غریب بھول بھلیوں میں چکر دیتا رہتا ہے اور قدم قدم پر ان کا تصادم عورتوں سے کراتا ہے۔ جو لوگ راہ سلوک میں ثابت قدم نہیں رہتے، منٹو انہیں عورتوں کے خوبصورت اور کسے ہوئے جسم میں الجھا کر چھوڑ دیتا ہے۔ جن لوگوں کی بصیرت اس منزل کو عبور کرے، وہ ان اجسام میں ترغیب گناہ کے اُبلتے ہوئے، رستے ہوئے، پیپ سے بہتے ہوئے ناسوروں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور کچھ بندگان خاص جو صاحب اسرار ہوں ان کی نظر ان ناموزوں کے نیچے مدفون جہازوں تک بھی جا پہنچتی ہے۔ اگر منٹو ڈھنڈورچی ہوتا تو وہ برسر عام منادی کرتا پھرتا، کہ آؤ ان زندہ عاشقوں پر بھی دو بول دعا کے پڑھتے جاؤ۔ لیکن وہ ڈھنڈورچی نہیں بلکہ ایک فن کار ہے۔ اس لیے

بات ذرا دور جانگی منٹو کے پاس بیٹھتے ہی موقع محل کی رعایت سے محمود ہاشمی اور میں موضوع سخن فلموں اور فلموں کے بعد فوراً عورتوں کی طرف پھیر دیا۔ منٹو کچھ جھینپ سا گیا اور جب تک ہم نے گفتگو کا رخ تبدیل نہ کیا وہ بدستور جھینپ رہا۔ اس ملاقات کے بعد اب کچھ ایسی بات ہے، کہ میں جس قدر منٹو کے قریب جاتا ہوں، اسی قدر اس کے افسانوں کی دنیا سے دور جا بھٹکتا ہوں۔ مجھے منٹو کے افسانوں سے منٹو کی ذات زیادہ عزیز ہے، جو لوگ اس سے واقف نہیں ہیں انہیں شاید کبھی بھی یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ منٹو کا باطن کس قدر روشن اور شفاف ہے۔ بہت سی لڑکیاں الف لیلیٰ کی شہزادیوں کی طرح منٹو پر نایدہ عاشق ہوتی رہتی ہیں لیکن منٹو نے کبھی کسی کے خط کا جواب نہیں دیا۔ ایک دن ایک نو مشق افسانہ نگار خاتون اس سے ملنے آئی۔ منٹو اسے فوراً اپنی بیوی کے پاس چھوڑ آیا اور خود باہر برآمدے میں آ کر بیٹھا رہا۔ چند روز کے بعد جب اس نے سنا کہ ایک اور ادیب نے اس لڑکی کے شوق سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک محبت نامہ لکھ مارا ہے، تو وہ بہت سٹ پٹایا اور مجھ سے شکایتا کہنے لگا کہ لو بھئی، میں تو اس حرام زادے کو اچھا آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ تو بڑا بد معاش نکلا۔ نہ معلوم یہ لوگ دوسروں کی ماں بہن کو کس طرح خط لکھ لیتے ہیں۔

عام عورتوں میں منٹو کی دلچسپی ایک عام صحت مند فرد سے رتی بھر بھی زیادہ نہیں ہے لیکن جہاں اسے عورت کے کردار میں ذرا سا بل ذرا سی کجی نظر آئے تو اس کا احساس بے قابو ہو جاتا ہے اور پھر وہ منٹو نہیں رہتا، افسانہ نگار بن جاتا ہے۔ ایک ایسا عظیم فن کار جس کی تمام گہرائیوں میں بہت سے پڑھنے والے ڈبکیاں کھا کھا کر بدحواس ہو جاتے ہیں اور جب بدحواس ہو جاتے ہیں، تو اسے گالیاں دینے لگتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ اگر عورت ذات میں عصمت چغتائی والی میٹھی لکیریں نہ ہوتیں تو شاید آج منٹو بھی افسانے لکھنے کی بجائے کسی دارالترجمہ میں بیٹھ کر فقہ و حدیث کے تراجم کر کے پرسکون اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہوتا اور اسے دنیا کے سامنے یہ فریاد نہ کرنی پڑتی کہ آخر میں بھی ایک بیوی کا شوہر ہوں۔ آخر میں بھی تین بچوں کا باپ ہوں۔ آخر میری بھی تو یہ خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو وہ دوسروں کے محتاج نہ ہوں۔

لیکن منٹو، دوست! تمہیں اس قدر مایوسی زیب نہیں دیتی۔ تمہاری مصیبتیں فقط تمہاری زندگی کے ساتھ ہیں۔

تو یقین رکھو کہ دنیا کا ضمیر آنا فنا زندہ ہو جائے گا۔ یہی طوطا چشم لوگ جو تمہیں دیکھ کر اس لیے کئی کھاتے ہیں کہ کہیں تم ان سے اپنے افسانوں کا معاوضہ طلب نہ کر بیٹھو..... یہی بے حس لوگ تمہارے نام پر بڑے بڑے ادبی فنڈ جمع کیا کریں گے۔ حفیظ ہوشیار پوری، اقبال کے کلام سے تمہارے لیے ایک زندہ جاوید تاریخ وفات برآمد کرے گا اور ریڈیو والے جو آج تمہیں اپنے سٹوڈیو میں بلانے سے ہچکچاتے ہیں ہر سال بڑی بڑی رقمیں دے کر تمہارے فن پر مقالے لکھوایا کریں گے..... کیا تم نے خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ جو لوگ اختر شیرانی سے اس لیے نظر بچایا کرتے تھے کہ کہیں وہ ان سے ٹھرے کی ایک بوتل کے لیے کچھ قرض نہ مانگ بیٹھے۔ آج اس کی یاد میں محفلیں برپا کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ وہ میراجی کے آخری ایام میں ہسپتال جا کر اس کی مزاج پر ہی کرائیں، اب وہ اس کی یادگاریں قائم کرنے کے درپے ہیں۔ اسی لاہور میں جو لوگ آغا حشر کو اپنے محلے میں گرایہ پر مکان تک دینے کے روادار نہ تھے، اب بڑی عقیدت مندی کے ساتھ ”یوم حشر“ میں شرکت کرتے ہیں..... اپنے فن میں تمہارے مقام ان تینوں سے بلند ہے۔ بھلا پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہو سکتا ہے؟ ہاں تم یہ پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہو۔ کہ کیا اس قبر پرست قوم کو کبھی زندوں کی لاج رکھنے کا شعور بھی آئے گا؟

☆.....☆.....☆

آوازِ دوست

بہرنگے کہ خواہی جامہ پوشی
من انداز قد تم رای شناسم

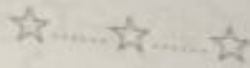
یوں تو بیوروکریسی میں ہر کوئی باون گز کا ہوا ہی کرتا ہے لیکن اگر حسن اتفاق سے بیوروکریٹ کی دم پری ایس پی کا چھلا بھی چڑھا ہوا ہو، تو دفعتاً اس کا قد اکاون گز کا ہوتا ہے۔ جس بیوروکریٹ پری ایس پی کے تین حرف پڑ جائیں، خود کسی کام کا رہے نہ رہے، لیکن دنیا بھر کے سارے کام بعنوان شائستہ اس کی ران کے نیچے آ جاتے ہیں۔ صنعت و حرفت ہو یا تجارت و زراعت تعلیم و تربیت ہو یا سائنس اور ٹیکنالوجی، معدنیات و عدلات ہو یا حفظان صحت، معاشیات ہو یا معاشریات..... کاروبار زندگی میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جو سول سرونٹ کی خداداد صلاحیتوں کے تانے بانے میں ایک بے بس مکاری کی طرح جکڑا ہوا نظر نہ آئے۔ ہمہ وانی کی اس بحر بیکراں میں ڈبکیاں کھانے سے اگر کوئی جنس محفوظ رہتی ہے، وہ تخلیقی فنون اور ادب کا شعبہ ہے۔ یہ بات نہیں کہ سول سرونٹ نے اس میدان پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی حسب توفیق کوشش نہیں کی۔ لیکن ارباب ادب نے ادیب نما بیوروکریٹ کو کبھی ضرورت سے زیادہ گھاس نہیں ڈالی۔ اگر کبھی ان کے احساس مروت نے بہت ہی بل کھایا، تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ ادب کے مارے ہوئے انکا دکا بیوروکریٹ کے چھوٹے موٹے شاعروں اور نیم ادبی محفلوں کی صدارت کے لیے ایک سماجی خلال کے طور پر مخصوص کر لیا جاتا ہے۔ ان لحاظ سے بھی مختار مسعود خوش نصیب ہیں، ”آوازِ دوست“ کے جواب میں ان کو ادب کی چوہور یہ نشانی عطا ہوئی ہے۔ وہ ادبی محفلوں کی نیچے دروں نیچے پروں کرسی نشینی پر ہزار گنا بھاری ہے۔ اس خوش نصیبی میں کچھ عمل دخل اس نیک ساعت کا بھی ہے جب وہ لاہور کے کمشنر ایسے وقت تعینات ہوئے جبکہ مینار پاکستان کا منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ لاہور کا کمشنر کوئی اور ہوتا، تو بھی اقبال پارک میں مینار پاکستان تعمیر تو ضرور ہو جاتا لیکن اردو ادب میں اس کا عکس اس آب و تاب سے ہرگز نہ جھلکاتا۔ میرے لیے ذاتی طور پر عکس بڑا پرکشش، اور علم افروز ہی کیونکہ میں نے آج تک اس مینار کو پوری طرح نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ 16 دسمبر 1971ء سے پہلے جب کبھی ریل میں بیٹھے ہوئے یا ہوائی جہاز کی کھڑکی سے مینار پاکستان کی جھلک دکھائی دیتی تھی، تو دور ہی دور سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے صدیوں کے جمود سے اکٹایا ہوا بادشاہی مہر کا کوئی مینارہ محراب و منبر سے دامن چھڑا کر بھاگتا ہوا پکڑا گیا ہو اور اہلیان شہر نے اسے پانچولاں کر کے کھلے میدان میں یکا و تنہا، بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو۔ اقبال کے نور بصیرت کی طرح سنگ و خشت کی یہ بے بسی بھی لاہور کے گلی کوچوں میں

اس قدر عام ہے کہ اس کے مشاہدہ کے لیے مینار پاکستان تک جانے کی ضرورت کبھی لاحق نہیں ہوتی اور اب 16 دسمبر 1971ء کے بعد یہ مینار کہ جس کی اونچائی 197 فٹ بتائی جاتی ہے، غالباً نصف رہ گیا ہوگا یا نصف سی کچھ کم۔ یا نصف سے کچھ زیادہ۔ اب اس کی طرف نظر بھر دیکھتے ہوئے یوں ہی گزرتا ہے، کہ نامعلوم اس کا کون سا حصہ غائب نظر آئے گا۔ اگر اوپر کا نصف غائب ہوا، تو سر بلندی میں فرق آئے گا اور اگر نیچے کا نصف غائب ہے تو بنیاد پر ضرب پڑنے کا احتمال ہے۔ حقیقت ایک ہو یا دوسری، دونوں صورتوں میں بے حد بھیانک اور ہولناک ہے۔ شاید اسی تلخ حقیقت سے بچنے کے لیے آج ساری قوم احساس کی آنکھ یوں بند کیے بیٹھی ہے جیسے ملک پر کوئی قیامت ٹوٹی ہی نہ ہو۔ خود فراری اور خود فرہی کے اس افسوس نے پاکستان کے لیے کو ایک قومی سانحے کی سطح سے ہٹا کر بے شمار چھوٹے چھوٹے انفرادی حادثوں میں بانٹ دیا ہے۔ اب یہ اس ملک کا المیہ نہیں جس کی سرزمین کے 55، 126 مربع میل اس سے چھن گئے ہیں۔ یہ اس قوم کا المیہ نہیں جس کے چھ کروڑ سے زیادہ افراد اس سے الگ ہو گئے ہیں۔ اب یہ محض اس ماں کا المیہ ہے جس کا بیٹا بھارت میں جنگی قیدی ہے۔ اس بچے کا المیہ ہے جس کا باپ چٹا گانگ کی فوجی بیرک میں شہید ہو گیا۔ اس بیوی کا المیہ ہے جس کا شوہر نرائن گنج کے کارخانوں میں گم ہے۔ اس بہن کا المیہ ہے جس کا بھائی ڈھاکہ کی گلیوں میں لاپتہ ہے۔ پشاور سے کراچی تک لاکھوں خاندان اس قسم کے المیوں کا زخم کھائے اپنے اپنے غم کدوں میں سو گوار بیٹھے ہیں لیکن کسی طرح پر کسی پہلو سے ان کا انفرادی غم قوم اور ماحول کے اجتماعی شعور پر اثر انداز ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں ایک ایسا تضاد پرورش پا رہا ہے جس میں انفرادی حقائق اور اجتماعی رجحانات کے درمیان وسیع سے وسیع تر خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ ذاتی طور پر قوم کا کوئی فرد و بشر ایسا نہیں، جو 1972ء کے واقعات سے ذہنی، روحانی اور قلبی طور پر بری طرح شل نہ ہو۔ ملک کے کسی حصے میں ذرا سے شورش برپا ہو تو گھر گھر یہ فکر میں پڑ جاتا ہے، کہ کہیں اس سے پاکستان کی سالمیت پر تو کوئی آنچ نہیں آرہی؟ ہوائی جہاز یا ریل کا ایک حادثہ بہت سے دلوں کو ہلا دیتا ہے، کہ کہیں اس کی زد وطن عزیز کے استحکام پر تو نہیں پڑ رہی اسمبلیوں میں کوئی گفتار سے تلخ کلامی ہو جائے یا حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی کشمکش واک آؤٹ اور بائیکاٹ کا رنگ اختیار کر لے تو گلی گلی، کوچے کوچے میں خوفزدہ انسان سبھی سبھی سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں کہ ان واقعات سے پاکستان کی بقاء پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا؟

عام حالات میں اس قسم کے واقعات اور حادثات روزمرہ کی زندگی کا معمول ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اجتماعی طور پر وہ کسی خاص پریشانی کا باعث نہیں بنتے۔ لیکن انفرادی طور پر ان کا رد عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ جزو اور کل، قوم اور فرد کی نفسیات میں اس بعد اور تضاد کا رخ بدلنے میں ہماری سیاسیات کے مزا اور ہماری معاشیات کے نظام کو سب سے زیادہ عمل دخل حاصل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں پر ادیب کا کوئی اختیار نہیں۔ ادیب کی رسائی تو قاری کے ذہن تک ہے اور اسی رسائی کی وجہ سے ادیب کی ذمہ داری بھی نازک اور غیر معمولی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہمارے آج کے ماحول میں ادیب کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خیال اور بیان کی ہر صلاحیت کو بروئے کار لا کر پاکستانی عصبیت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے۔ یہی وہ عصبیت ہے جو حب الوطنی کے جذبہ میں جوش اور جنون کے لاوے کو پگھلا سکتی ہے۔ آج ہمیں ایسی حب الوطنی کی حاجت نہیں جو محض ایک مقدس فرض کے طور پر ہمارے دل کے تابوت میں بے حس و حرکت ٹھہر پڑی ہو بلکہ آج تو ہمیں ایک مسلسل اضطراب اور شدید تڑپ کی تلاش ہے، جسے صرف ادیب کا فانوس خیال ہی

ڈھونڈ کے لاسکتا ہے۔ یہ ادب میں آفاقیت اور افادیت کا نظریاتی مسئلہ نہیں اور نہ ہی یہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا روایتی جھگڑا ہے بلکہ یہ تو دراصل ایک قوم اور ایک معاشرے کی بقاء کا سوال ہے۔ ایک ایسی قوم کی بقاء کا سوال جسے بیرونی دنیائے ادب کا ایک با اثر طبقہ چار قومیتوں میں تقسیم کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اس خاص بیرونی دنیائے ادب میں ایسے ایسے کج نگاہ دانشور بھی ہیں جنہیں پاکستان میں چار اور ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد نظر آتی ہے۔ اور علی ہدیان کی صدائے بازگشت کبھی کبھی اور کہیں کہیں ہمارے ہاں بھی سننے میں آنے لگی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کا ادیب اور دانشور اس کھلے چیلنج کو قبول کرے اور ملک کے اندر اور باہر اس سموم رجحان اور ذہنیت کو پائے حقارت سے رد کر دے۔ اگر آپ نے قلم کے اس جہاد میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا تو کل کا نقاد یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ اس دور کے پاکستانی ادب میں بڑا شدید قحط الرجال تھا۔ اگر اس وقت آپ کو مختار مسعود جیسا ہمدرد، خوش بیان اور پردہ پوش آئو گراف ہنرمیں سر نہ آیا، تو قحط الرجال کی یہ داستان بڑی تاریک اور بے حد عبرتناک ہوگی۔

ماہنامہ کتاب لاہور، مارچ، اپریل 1972



دوتارے

رانو، نصرت، جوز..... رانو کا پورا نام رنیکا تھا۔ جوز کا جوز فین، نصرت کا نصرت، اگرچہ اس کا نام تو شکست ہوتا چاہیے تھا۔

صدر بازار میں چوک کے پاس ایک خوانچے والا بیٹھتا ہے وہ لہک لہک کر اپنے گاہکوں کو دعوت دیا کرتا ہے۔ "تراوٹ میں آئیے! تراوٹ میں آئیے!" وہ چار آنے میں تین سگترے دیتا ہے۔ پاس ہی دوسرے دکاندار چھ پیسے میں دو دو کی پکار لگاتے ہیں لیکن وہ محض سگترے بیچتے ہیں۔ خوانچے والا تراوٹ بھی ساتھ دیتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں نام میں کیا نہیں ہے۔ اگر اس کا نام فقط مس شاکر داس ہوتا تو لوگ بیٹھتے، ہنستے، کھیلتے اور چلے جاتے۔ اگر اس کا نام صرف جوز فین ہوتا تو آنے، بیٹھنے، ہنسنے، کھیلنے کے عمل میں شاید بالشت ڈیڑھ بالشت کا اضافہ ہو جاتا لیکن جب کسی نے تعارف یوں کروایا کہ یہ مس شاکر داس ہیں، مس جوز فین شاکر داس، تو لمبے بھر کے لیے یہ محسوس ہوا گویا ریڈیا رکھنا اور مرزا غالب گلے مل کر زار و قطار رو رہے ہیں۔

"جی ہاں، جوز فین۔" اس نے اپنی پکوں پر حیا کا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا "لیکن گھر میں مجھے سب جوز کہتے ہیں۔"

بال روم کا آرکسٹرا ایک نشلی دھن بجا رہا تھا۔ نشیلے جوڑے مستانہ وار ناچ رہے تھے۔ میں نے جوز کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا، کہ اس نام میں ترنم اور تاریخ کے رومان بھی ہیں کیونکہ جس عورت کو ملکہ بنانے کے لیے ایک سپاہی نے شہنشاہ بنا قبول کیا، اس کا نام بھی جوز فین ہی تھا۔

وہ لجا سی گئی۔ "آپ باتیں خوب بناتے ہیں..... میرا خیال ہے کہ آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔"

"جی ہاں، بلکہ عشق ہے۔"

"اوہو، آپ عشق بھی کرتے ہیں!" اس نے شرارت سے ناچتے ہوئے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ "میں

نہیں ایم۔ اے ہسٹری کا مضمون لیا تھا۔ مجھے خود اس سے دلچسپی ہے۔"

"عشق نہیں؟" میں نے ناچ ہی ناچ میں اپنا پاؤں ہلکے سے اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"ہاں، آج شاید اب ہو جائے!" وہ آرکسٹرا کی مدہوش دھن کی طرح میرے قریب تر آ گئی۔ "آپ کو تاریخ کا

کون سا کیریئر سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"نور جہاں" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔ "اور آپ کو؟"

”جہانگیر“

اپنی میز کے پاس پہنچ کر ہم نے شمعین کے دو جام منگوائے۔
 ”ملکہ نور جہاں کے لئے“ میں نے اپنا جام اٹھا کر جوش سے کہا۔ ”شہنشاہ جہانگیر کے لئے“ اس نے اپنا جام اٹھا کر میرے جام سے لگا دیا۔ برفانی ہوئی شمعین کے ارغوانی گھونٹ اُس کے گلے میں ہلکی ہلکی پھریریاں پیدا کرتے ہوئے
 دھل رہے تھے جیسے مرمی صراحی میں آب حیات ٹپکایا جا رہا ہو۔
 اس لمحے مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مغل بادشاہوں نے اپنی یادگاروں میں صرف مقبرے ہی نہیں چھوڑے، بلکہ زندہ رومان بھی چھوڑے ہیں۔

جب ہم دوبارہ ناچنے کے لیے اٹھے، تو ہمارے درمیان سے اجنبیت کا پردہ اور بھی اٹھ گیا تھا۔ جہانگیر اور نور جہاں کی کہانی ہمیں روحانی طور پر ایک دوسرے کے قریب لے گئی تھی۔ شمعین کے ٹھنڈے گھونٹ ہمیں جسمانی طور پر قریب تر کرنے لگے روح اور جسم کے ربط کی یہ سریلی تان آ کر کسرا کی دھن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی۔ میں نے کہا ”جوڑا زندگی کے یہ عزیز لمحے کس قدر خوشگوار ہیں اور کتنے مختصر۔“

”جی ہاں، زندگی بھی تو مختصر ہے۔ لیکن جینے والے سو سو برس بھی جیتے ہیں۔“

جوڑی آنکھوں میں ایک تیکھی طنز تھی۔ پلکوں ہی پلکوں سے گویا اس نے میری لرزتی ہوتی ہمت پر تازیانہ لگا دیا کہ جینے والے اس طرح خوشگوار اور مختصر لمحوں کو ضائع نہیں کرتے۔ تم ان دلربا گھڑیوں کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنا سکتے ہو۔ لیکن تم میں ہمت بھی ہو۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا! کہکشاں کی چادر میں لپٹے ہوئے تاروں کو بھی نوچ سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاید وہ پھوٹے ہوئے کنکر ہی نکلیں!
 رانو کی بات دوسری طرف تھی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب رس تھا ایک اتھاہ گہرائی جیسے کنول کے کٹوروں میں شراب چھلک رہی ہو۔ ایک روز ریڈ کراس فنڈ کے لیے کھیل ہو رہے تھے۔ گھڑ دوڑ ہوئی۔ سائیکل رکشاؤں کا مقابلہ ہوا، فینسی فٹ بال کھیلا گیا اور آخر میں میوزک کانفرنس منعقد ہوئی۔ سب سے اچھا گانا کلاڈھینگر کا تھا اس نے اپنے گلے کا سارا نور مالکونس کی راگنی میں بھر دیا۔ رانو اگلی صف میں بیٹھی تھی میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھا کلا گار ہی تھی اس کی سریلی تانیں رس اور مٹاس کی چاشنی بن کر ہلکی ہلکی پھوار کی طرح منتشر ہو رہی تھیں۔ سُر اور تان کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کنول کے کٹوروں میں پھریریاں اٹختی تھیں اور کلا کے گیت رانو کی آنکھوں میں لہریں بن کر رقص کر رہے تھے۔

رانو کی آنکھوں میں ایک جھنکار سی آ گئی اور وہ کلا کے گانے کے ساتھ ساز کی طرح آویزاں ہو گئی جب کلا کو انعام کا تمغہ ملا تو میں نے ہولے سے زیر لب کہا کہ اس کی اصلی حقدار تو رانو ہے!

”جی؟“ وہ چونکی۔ ”لیکن میں نے گانا تو نہیں گایا۔“

”موسیقی صرف آواز ہی میں نہیں ہوتی!“ میں نے اس کی رقصہ آنکھوں کی طرف اشارہ سا کیا وہ شرمانے لگی۔
 رانو کی آنکھوں کی پلکوں میں میرے لیے ایک دنیا سی آباد ہو گئی تھی۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز پر کنول کے پھول

کھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن اس نئی دنیا کے وجود پر ہمیشہ ایک گہرا سا چھایا رہا ایک خاموش غبار سا جیسے کسی رنگ
 عمل کے اونچے اونچے کلس بادلوں کے اوٹ میں چھپے ہوئے ہوں۔ کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے کبھی رانو سے یہ نہ
 کہا کہ اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میں نے کبھی اس کو یہ نہ بتایا کہ اس کی گھنی پلکوں کے سائے میں ایک ننھی سی
 دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ ہم دونوں سمندر کی لہروں کی طرح ایک ہی ساحل کی طرف
 جا رہے تھے، وہ مجھے ایک بار بھی نہ بتا سکی کہ ہمارے دل کی دھڑکنوں نے چوری چوری ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا لیا
 تھا۔ ہم وقت کے پردے میں خاموش دھماکے سنتے رہے دو برس تک ہم ایک دنیا میں رہے لیکن متوازی خطوط کی
 طرح الگ الگ۔ ایک ہی کشتی میں سوار، لیکن دریا کے کناروں کی طرح جدا جدا، ہر روز ہم ملتے تھے کبھی کلب میں
 کبھی سینما میں، کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ اور گھنٹوں ہم کھیلتے تھے کبھی پنگ پانگ کبھی ٹینس، کبھی تاش، کبھی کیرم۔
 ایک روز ٹینس کھیلتے کھیلتے اس کے پاؤں میں موج آ گئی، مجھ سے یہ بھی نہ ہوا کہ اسے سہارا دے کر کرسی تک لے
 جاؤں، کلب کے دو بیروں نے اسے اٹھا کر کوچ پر لٹا دیا اور پھر ایک روز تاش کھیلتے کھیلتے میز کے نیچے اچانک ہمارے
 پاؤں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکڑا گئے ہم نے اٹھ کر ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ لیکن ہمارے دل یہی کہتے رہے
 کہ تم دونوں جھوٹے ہو۔ چور ہو، تم تو چاہتے تھے کہ وہ مختصر سا لمحہ غیر فانی ہو کر کائنات پر چھا جائے اور اب تم معذرت
 کرتے ہو، جھوٹ مٹا اور اس جھوٹ کی سزا انجام کار یہ ملی کہ رانو کا ایک جگہ بیاہ ہو گیا، ہونا ہی تھا، لیکن ہمارے
 درمیان آرزوؤں کی جو ایک خوشنما ٹیکسلا مسمار ہوئی تھی اسے ابھی تک کوئی کھود نہیں سکا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ
 کبکشاں کی پھلواڑی میں ایسے تارے بھی تو ہیں جو صرف نظر آتے ہیں، ہاتھ نہیں آتے۔ لیکن نصرت کا وجود رانو اور
 جو دونوں سے الگ ہے وہ اس تارے کی طرح ہے جس کی روشنی ابھی زمین تک نہیں پہنچی۔ میرا مطلب ہے کہ
 میں نے آج تک نصرت کو نہیں دیکھا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام شکست ہونا چاہیے تھا۔ وہ کچھ بھی ہے
 جہاں کہیں بھی ہے ایک لڑکی ہے۔ شاید وہ جوان ہو یا وہ خوبصورت ہو۔ لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کون ہے
 اور کیسی ہے۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ وہ ہے اور ابد تک رہے گی۔ اسے ابد تک رہنا ہی چاہیے مگر اس کے چاہنے یا نہ
 چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو ابد تک رہنا ہی پڑے گا وہ بنی نوع انسان کا عزیز سرمایہ ہے وہ لٹ سکتی ہے لٹا سکتی ہے
 لیکن وہ مٹ نہیں سکتی۔ شاید وہ مٹا سکتی ہو، لیکن لالے کا داغ نہ آندھی نے مٹایا ہے نہ کالی گھٹاؤں نے۔ پجاری
 نصرت کی کیا بساط ہے۔ جبکہ اس کا نام ہی شکست ہو! کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ محض عورت ہے۔ یعنی مرد کی ایک
 آدھ حاجت روا کرنے والی بے ذائقہ سی دوا۔ جیسے قبض کے لیے کسٹرائل یا کھانسی کے لیے جوشاندہ۔ کبھی خیال
 آتا ہے کہ شاید وہ عورت نہ ہو، محبوبہ ہو، ان دونوں بہنوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک آرزوؤں کو پورا کر کے منادیتی
 ہے۔ دوسری تمناؤں کے آن مٹ جزیرے آباد کیا کرتی ہے، لیکن منزل تو دونوں کی ایک ہے عورت یا تو خود تھک بار
 کر پٹنگ پر جا گرتی ہے ورنہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گرا لیا جاتا ہے لیکن محبوبہ کی مسافت، ناز کے سہارے طے ہوتی
 ہے۔ وہ تمناؤں کی کشتی میں سوار ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے ہچکولے اسے جھولا جھلاتے ہیں لیکن اس کے
 دماغ کی پرواز بھی اپنی روایتی پلنگڑی کی پاس جا کے ختم ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نصرت عورت بھی نہیں،
 محبوبہ بھی نہیں، محض نصرت ہے یعنی اس کا نام شکست ہونا چاہیے تھا۔ میں تصور رہی تصور میں اپنے ویرانوں کی نصرت

کو آ باد کر لیتا ہوں۔ ایک معلوم سی، آوارہ سی غم دیدہ لڑکی جسے اپنے پاس بٹھا کر یہی جی چاہیے کہ صرف باتیں ہی کیے جاؤ۔ غم کی باتیں، الم کی باتیں، شکست کی باتیں، فلسفہ نہ سہی، ادب نہ سہی..... نہ قہقہے ہوں، نہ راز ہو، نہ نیاز ہو۔

فقط نصرت ہو اور اس کی باتیں۔ جب اس نے پہلی بار محبت کی جب اس کی محبت کے آگے پہلی بار پھوڑ ہوئے جب اس نے دوسری بار محبت کی جب اس کی محبت کے آگے دوسری بار پھوڑ ہوئے جب اس نے تیسری بار..... لیکن میں اس نے دوسری بار محبت کی جب اس کی محبت کے چھپائے ہوئے راز فاش کر رہا ہوں۔ شاید نصرت مجھے کبھی بہک رہا ہوں۔ میں باتوں ہی باتوں میں نصرت کے چھپائے ہوئے راز فاش کر رہا ہوں۔ مجھے نہ عورت کی تمنا ہے نہ محبوب کی، میں تو معاف نہ کرے گی..... لیکن نصرت تم جانتی ہو، میں بالکل بے یار ہوں۔ مجھے نہ عورت کی تمنا ہے نہ محبوب کی، میں تو نصرت کو چاہتا ہوں، خواہ وہ شکست ہی کیوں نہ ہو، جو گوشت اور پوست کی خواہشوں سے بے نیاز ہو کر کسی کو اپنا سکے..... بہن کی طرح، ماں کی طرح، ساتھی کی طرح..... لیکن..... لیکن عورت کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح نہیں۔

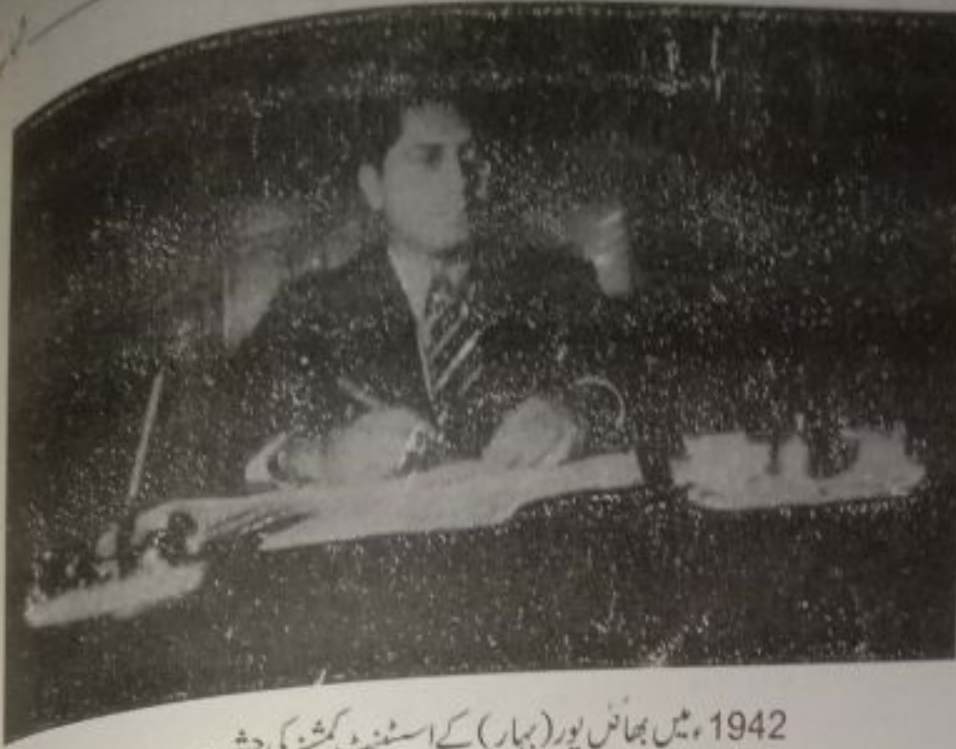
بلکہ شکست کی طرح۔

یہ افسانہ ”نفسانے“ سے لیا گیا جو 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی۔





قدرت اللہ شہاب اپنی بیگم عفت شہاب کے ساتھ



1942ء میں بھائیں پور (بہار) کے اسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے



قدرت اللہ شہاب (عالم شباب میں)



قدرت اللہ شہاب



عفت شہاب، ثاقب شہاب اور قدرت اللہ شہاب



قادر علیک پٹیل



پاکستانی سفارت خانہ ہیک میں سر ظفر اللہ، عفت شہاب اور قدرت اللہ شہاب



بائینڈ کے پاکستان سفارت خانے میں سفیر پاکستان قدرت اللہ شہاب اور اُن کی اہلیہ عفت شہاب



صمد ایوب خان کے پرنسپل سیکرٹری کی حیثیت سے (دائیں جانب) قدرت اللہ شہاب



کوی جیسیم الدین، اسے حمید، کوی غلام مصطفیٰ، جمیل الدین عالی، قدرت اللہ شہاب، حفیظ جانندھری، ابن انشا، امیر ایم جلیس اور



قدرت اللہ شہاب، محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ



اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا اور پاکستان نے مارچ ۱۹۵۹ء میں آزاد کشمیر کا دورہ کیا۔ کمیشن کچھ دن آزاد کشمیر میں ٹنجر اور وہاں کے وزراء سے ملاقات کی۔ کمیشن کے وفد کے ساتھ دائیں جناب سب سے پہلے قدرت اللہ شہاب کھڑے ہیں۔



قدرت اللہ شہاب اور ملکہ ترنم نور جہاں فلم ’سکھ کا سپنا‘ کے افتتاح کے موقع پر



فلم "سکھ کا پننا" کا افتتاح --- فیض احمد فیض اور قدرت اللہ شہاب



موجودہ اڑو کے مسافر: امین انشاء، قدرت اللہ شہاب، خالد درانی، رفیق چوہدری، پروفیسر شتیق اور دوسرا احباب



برنگم میں



قدرت اللہ شہاب فیض احمد فیض کے ساتھ



کنیٹن (جین میں) حضرت وقاصؑ کے مزار پر



قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی



جیمز مین ماؤزے تنگ، قدرت اللہ شہاب اور چوہان لائی



قدرت اللہ شہاب، ثاقب شہاب اور فیلڈ مارشل
محمد ایوب خان کے ساتھ

تشنگی ذوق کے مضمون

مضامین

قناعت	چناب کے کنارے	مشاہیر
آٹھ سال قصرِ صدارت میں	کافرستان	میرے کردار
سرکاری ملازم کی بیلنس شیٹ	دوڑ پیچھے کی طرف	حرفِ شیریں
دورہ	صدر بھٹو کے نام ایک خط	پیغام
لیڈر	ادیب اور مسئلہ کشمیر	سات سمندر پار
جنگی قیدی اور ادیبوں کی عذر خواہی	اینٹ کا جواب روپیا	حرفِ چند
پاکستان میں تعلیم	سیرت نگاری کا فن	پہلا شمارہ
طلباء اور سیاست	التماس	پاکستان تصور سے حقیقت تک
ایس ایس اینوٹریا	حسنِ نظر	یادگارِ غالب
چین کا ثقافتی انقلاب	سیاحت	پچاس روپے کا خط
دہلی کا سفر	نیا ورق	آخری تحریر

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا
(غالب)

قناعت

میری زندگی میں کوئی خاص فلسفہ نہیں ہے۔ البتہ میں نے زندگی کے ہر موڑ کو ایک نیا تجربہ ضرور پایا ہے۔ یہ تجربات بھی تلخ ہوتے ہیں، کبھی شیریں اور ان کے البھاد اور سلجھاؤ میں کچھ ایسے درس بھی ملتے رہتے ہیں جنہیں میں نے اپنے ذاتی کردار کے لیے نہایت اچھا مشعل راہ پایا ہے۔

سب سے پہلا سبق میں نے اپنے والد محترم سے سیکھا تھا۔ ایک روز والد مرحوم کے ایک دوست ان کے پاس بیٹھے ہوئے اپنی کچھ مصیبتوں کا رونا رورہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے چند ایسے اصحاب پر بھی بہت سی جہتیں تراشیں جو اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب وہ اپنا شکایت نامہ ختم کر چکے تو والد صاحب نے پوچھا:۔

”کیا آپ یہ سب باتیں ان لوگوں کے منہ پر بھی دہرانے کے لیے تیار ہیں؟“

”اس سے فائدہ؟“ ان صاحب نے ذرا تذبذب اور حیرت سے پوچھا۔

”اس سے آپ کی بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی؟“

”وہ کیسے؟“

والد محترم نے جواب دیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو کسی کی پیٹھ پر وہی بات کرنی چاہیے جو وہ اس کے منہ پر بھی دہرا سکے۔ بات معمولی سی تھی لیکن میں نے اس پر عمل بڑا مشکل پایا ہے۔ جب کبھی اس پر عمل چاہوں نے کی تو فنی ملی ہے اس وقت زندگی بڑی ہلکی اور آسان محسوس ہوئی ہے۔

زندگی کا دوسرا سبق مجھے ایک نہایت غیر متوقع انسان سے ملا۔ یہ شخص پولیس میں انسپکٹر تھا اور ایک عدالت پر ہیکلنگ کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ رشوت تو خوب لیتا ہے لیکن آدمی دیا نندار ہے۔ شہرت کے اس تضاد میں جو حقیقت پوشیدہ تھی وہ اس نے ایک بار خود مجھ سے یوں بیان کی:۔

”میں نے کبھی ایک انسان کا نقصان کر کے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچایا۔ جب کوئی مقدمہ میرے سپرد ہوتا ہے تو میں دونوں فریقوں سے برابر کی رقم وصول کر لیتا ہوں اس کے بعد میں مکمل ایمانداری سے مقدمہ کی پیروی کرتا ہوں جو فریق ہار جائے اس کی پوری رقم واپس کر دیتا ہوں۔“

اگرچہ یہ طریق کار ذرا انوکھا تھا لیکن اس کی تہہ میں کام کرنے والا جذبہ بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔ اگر ایک کامیاب دوسرے کے نقصان پر مبنی نہ رہے تو انسان کی بہت سی الجھنیں اور بے قاعدگیاں بہت حد تک کم ہو جاتی ہیں۔ اس ہمہ تن مہموف پولیس انسپکٹر کی نقش قدم پر چلنا تو محال ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ اس اصول کی نگہداشت ایک عام انسان کی ذاتی زندگی کو بہت ہموار اور خوشگوار بنادیتی ہے۔ میں اس سادہ اور جاندار اصول کو انفرادی سطح پر کھینچ کر تعلیم کی فرسودگی دینا

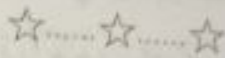
نہیں چاہتا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اجتماعی تعلقات میں بھی یہ روش داخل ہو جائے تو قومی معاشروں اور بین الاقوامی ریاستوں کا دامن بہت سی نا انصافیوں اور جارحانہ کشمکشوں سے پاک ہو سکتا ہے۔

ایک اور سبق جو میں نے زندگی سے سیکھا ہے اس کی بنیادار باب تصوف کی ایک حکایت پر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز ایک سائل حضرت قطب الدین بخارا کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلطان امتش کے نام سفارشی چٹھی مانگی۔ قطب صاحب نے جو سفارش لکھی وہ کچھ اس طرح کی تھی:-

”میں اس شخص کا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور آپ کے علم میں لاتا ہوں۔ اگر اس کا کام آپ کے ہاتھوں انجام پا گیا تو یہ تدبیر الہی ہے اور آپ مشکور ہوں گے بصورت دیگر اگر یہ کام آپ کی جائز کوشش کے باوجود پورا نہ ہوگا تو یہ تقدیر الہی ہے اور آپ معذور ہوں گے۔“

اگر ہر کامیابی کا رد عمل شکر اور سعی کے باوجود ناکامی کا رد عمل صبر ہو تو اس امتزاج سے انسان کو ایک ایسی لطیف ملتی ہے جو باقی سب دولتوں سے بڑی نعمت ہے، اس نعمت کا نام قناعت ہے زندگی بھر میں خود اس نعمت سے بڑی حد تک محروم رہا ہوں، لیکن کبھی کبھی مجھے قناعت کے صرف احساس ہی سے بے حد لذت ملتی ہے۔ (غیر مطبوعہ)

”درس زندگی“ مرتب پطرس بخاری پبلشر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور



آٹھ سال قصرِ صدارت میں

اکتوبر 1952ء میں جب لاہور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے عہدے پر فائز تھا اور ایک سرکاری کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کراچی گیا ہوا تھا ایک مجھے ہدایت ملی کہ گورنر جنرل مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ملک کے اعلیٰ ترین قصر میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا چنانچہ حفاظتی پابندیوں کو پار کر کے اس کے اندر داخل ہونے میں مجھے کچھ وقت ہوئی۔

جب مجھے اوپر پردوں سے ڈھکے ہوئے ایک درآمدے میں مسٹر غلام محمد کے سامنے پیش کیا گیا تو مجھے ذرہ برابر بھی یہ علم نہیں تھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ گورنر جنرل نے لکنت کے ساتھ کچھ کہا لیکن میری خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کی پرسنل سیکرٹری مس رتھ بورڈل نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہز ایکسی لینسی کی ہدایت ہے کہ آپ نیچے جا کر گورنر جنرل کے سیکرٹری کا چارج لے لیں۔ میرا خیال ہے کہ اس خبر کا میرے اوپر ناخوشگوار اثر پڑا ہوگا کیونکہ مسٹر غلام محمد غصہ میں چلائے۔ ”اب جاؤ منہ کیوں لٹکا رہے ہو۔“ ایک فرض شناس اے ڈی سی مجھے ساتھ لے کر نیچے آفس میں لے آیا اور میں یہاں پہنچ چکا تھا مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ سربراہ مملکت کے سیکرٹری کو حقیقتاً کیا کرنا پڑتا ہے۔ قریب ایک سال تک میں بیزاری اور اکتاہٹ سے وقت گزارتا رہا یہاں تک کہ ایک دن مجھے نقلی تماشا میں دھکیل دیا گیا۔ مسٹر غلام محمد شدید طور پر بیمار ہو گئے اور ان کو بغرض علاج زیورج بھیجنے کے لیے ایک طیارے کا انتظام کیا گیا گورنر جنرل کو خاموشی کے ساتھ ایک ہند ایسویٹنس میں ہوائی اڈے روانہ کر دیا گیا اور ریکی گاڑیوں کے جلوس میں مجھے ان کی جگہ لینے کی ہدایت کی گئی۔

میں سر پر جناح ٹوپی لگائے اپنے کالر میں گلاب کا سرخ پھول سجائے اس سیاہ سرکاری موٹر کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا جس پر گورنر جنرل کا پرچم لہرا رہا تھا۔ میرے پہلو میں ملٹری سیکرٹری اور سامنے اے ڈی سی بیٹھے ہوئے تھے۔ موٹر کے دونوں جانب موٹر سائیکلوں کے مسلح دستے تھے۔ آگے آگے حفاظتی جیپ کاروں کا جلوس تھا اور پیچھے پرچم لہراتی ہوئی دوسری موٹریں تھیں جن پر اصل لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایک عجیب مضحکہ خیز تجربہ تھا مگر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوا۔ اگرچہ ملٹری سیکرٹری سخت احتجاج کرتے رہے، لیکن میں ہوائی اڈے کے راستے میں مسکرا کر ہر شخص کو دیکھ کر ہاتھ ہلا دیتا۔

جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں خصوصی طیارہ کھڑا ہوا تھا تو ایک وزیر جو اپنا فونو کھینچوانے کے بے حد شائق تھے کار کا دروازہ کھول کر گورنر جنرل کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ لیکن جب موٹر میں سے ”میں“ نکلا تو وہ چند لمحوں کے

لیے مہبوت ہو کر رہ گئے۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے ان سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی قدرتی طور پر وزیر موصوف پیچھے ہٹ گئے اور باواز بلند بگڑ گئے میں نے میجر جنرل اسکندر مرزا کے ساتھ جو زمانہ گزارا وہ بڑے تساہل کا تھا۔

جب مارچ 1956ء میں پاکستان کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا گیا اور پہلے صدر نے حلف اٹھایا تو مجھ میں 12% جوش پیدا ہو گیا۔ پہلے صدر کا سیکرٹری ہونا بہت بڑی عزت افزائی ہے مگر یہ جذباتی مسرت بڑی مختصر ثابت ہوئی۔ کابینہ اس قدر تیزی سے بنے اور بگڑنے لگی کہ سارا سلسلہ تھکا دینے والا بن کر رہ گیا۔ ہر روز گھر سے آفس جاتے ہوئے میں نے ریڈیو پاکستان کی خبروں کو سن لینا اپنا اصول بنالیا تھا تاکہ اگر رات میں کوئی نئی وزارت بن گئی ہو تو میں اپنے ساتھ اپنا کوٹ اور ٹائی لیتا جاؤں تاکہ حلف اٹھانے کی رسم میں شرکت کر سکوں۔

ایک مرتبہ کابینہ کے ایک نئے رکن نے مجھ سے فون کر کے پوچھا کہ نئے وزیر کس قدر حلف اٹھائیں گے؟ ایک نئی تشکیل شدہ کابینہ کئی روز تک حلف نہ اٹھا سکی کیونکہ 'بھیکے' اور سوکھے پورٹ فولیو کے متعلق کچھ جھگڑا ہو گیا تھا آخر کار سودا ہو گیا اور وزیر حلف اٹھانے کے بعد اپنی اپنی وزارتوں کی طرف دوڑ پڑے یکا یک پتا چلا کہ وزارت تعلیم کی کے سپرد نہیں کی گئی ہے اور کسی نے بھی اس وزارت کی طرف توجہ نہیں دی ہے چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوڑا جاؤں اور جو بھی وزیر ابھی تک ایوان صدر سے باہر نہ گیا ہو اسے پکڑ لاؤں۔ مجھے ایک بیمار صاحب نظر آئے جو تیز چلنے سے معذور تھے اور اسی لیے کھڑے ہوئے اپنی موٹر کا انتظار کر رہے تھے ان کو جلدی سے کابینہ کے کمرے میں بلایا گیا اور کہا گیا کہ آئیے تعلیم کی وزارت سنبھال لے۔ وہ اس سے کچھ خوش نہ ہوئے اور انہوں نے بڑی لا پرواہی سے اس پورٹ فولیو کو جب میں رکھا۔ اس دوران میں میرا کام قسم قسم کی تقریریں تیار کرنا رہا، یہ ایک بے کار سا کام تھا کیونکہ ان تقریروں میں جو کچھ کہا جاتا تھا ان پر کچھ عمل نہیں ہوتا تھا اور جو لوگ ان تقریروں کو سنتے تھے وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھے یہ سب محض فن برائے فن تھا۔

ایک دن ایک ہی دن میں دو تقریریں تھیں ایک سائنس کانفرنس کا افتتاح تھا اور دوسرا تاریخ کانفرنس کا۔ میں نے دونوں تقریرات کے لیے ایک ہی مسودہ بنایا اور اس کے پیش لفظ میں موقعوں کے لحاظ سے تبدیلیاں کرویں۔ اس کی ابتدا یوں کی گئی کہ سائنس تاریخ کو جنم دیتی ہے اور دوسری میں کہا گیا تھا کہ تاریخ بذات خود ایک سائنس ہے دونوں کے بقید مسودے ایک ہی جیسے تھے اے ڈی سی اس تقریب میں غلط تقریر لے کر پہنچ گیا لیکن دونوں میں تاریخ اور سائنس ایسی گڈ بڑھتی کہ کسی کو اس غلطی کا احساس نہ ہوا البتہ پریس کو دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا کہ موقع کی صحیح تقریر دی جائے۔ اس پس منظر میں مجھ میں اگر سربراہ مملکت نہیں تو سربراہ مملکت کے سیکرٹریوں کی طرف سے ایک خاص سنجیدہ اور طنزیہ جذبہ پیدا ہو گیا۔

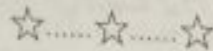
چنانچہ جب مجھے صدر ایوب کے سیکرٹری کی حیثیت سے ذمہ داریاں سونپی گئیں تو میں نے اپنے فرائض اسی جذبہ سے ادا کرنے کا ارادہ کیا جو مجھ کو میرے سابقہ تجربات سے ملتا تھا لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ طریقہ یہاں نہیں چلے گا۔

نئی حکومت کے قیام کے شروع میں صدر کو ایک عوامی تقریب میں تقریر کرنا تھی۔ عادت کے بموجب میں نے

ایک تقریر گھڑی اور منظوری کے لیے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے اس تقریر کو بڑے سکون سے پڑھا میری محنت کا شکریہ ادا کیا اور پھر بڑے حلم کے ساتھ کہا کہ وہ اس میں دو ایک چیزیں بڑھانا چاہتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کو میز پر رکھی ہوئی دوات پر جمع کر کے انہوں نے صاف اور شستہ انگریزی میں جملے بولنے شروع کر دیے۔ میں بڑی مشکل سے ان کو اپنی تحریر میں لاتا گیا۔ ایک گھنٹے کی اس مشق کے بعد جب میں ان کے دارالمطالعہ سے باہر آیا، میرے ہاتھ میں ایک پوری نئی تقریر تھی۔

اس وقت سے ان کا یہی اصول رہا ہے اپنی پبلک تقریروں کے لیے ایک یا دو باتوں کا اضافہ کرنے کے واسطے صدر ایوب عام طور پر اپنی تقریر خود لکھاتے ہیں اور مجھے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مخصوص شارٹ ہینڈ طریقہ ایجاد کرنا پڑا۔ میرے نزدیک وہ ایک مکمل ڈکٹیٹر ہیں لیکن یہ صرف ڈکٹیشن اپنے تک محدود ہے۔ ڈکٹیشن کے علاوہ وہ نوٹ اور کارروائیاں بھی بہت زیادہ لکھتے ہیں۔ میں ان کی واضح اور ابھری ہوئی تحریر کے ریم کے ریم کا غنجد جمع کرتا رہا ہوں جس میں بین الاقوامی مسائل اور آئین سازی سے لے کر کھانا میں نمک کی کمی، سکھر کے ٹریکٹر خریدنے والوں کی شکایت کے نوٹ تک درج ہیں۔

ہفت روزہ "شہاب" 17 جون 1962ء



سرکاری ملازم کی بیلنس شیٹ

خدا کے فضل و کرم سے حکومت پاکستان کے ساتھ میری 34 سالہ مدت ملازمت مکمل ہو گئی ہے اب جبکہ میں اس قفس سے پرواز کے لیے تیاریاں مکمل کر رہا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ وہ جال جو اس 34 سالہ ملازمت کے دوران سرکاری قواعد و ضوابط نے میری سوچوں کے گرد بنا تھا بالکل ایک مکڑی کی طرح، کب تک قائم رہے گا۔

(کاغذات زیر غور) (مشودہ برائے منظوری) (تازہ مسودہ) ان کے علاوہ فائلوں پر سبزیلیبلوں جن پر فوری توجہ لکھا ہوتا تھا اور وہ فائلیں جو عام نوعیت کی ہوتی تھیں۔ مزید برآں وہ فائلیں جن پر ROP SECRET یعنی ”اہم راز“ لکھا ہوتا تھا اور جن کے مندرجات کا ذکر دفتر کے گرد و نواح بڑے کڑ و فر سے جاری رہتا تھا۔ ان سب باتوں کو سیکھنا اور بالخصوص اس بات کو ”فوری توجہ“ بہر حال فوری توجہ والی بات ہے اور راز کا مطلب ”مٹی راز“ ہے کوئی آسان بات نہیں۔ حالات جیسے بھی رہے ہیں ملازمت کو خیر باد کہنے کے عمل سے جو نفسیاتی صورت حال پیدا ہوئی وہ بالکل ویسی ہی تھی جو تیس سال قبل اس میں شامل ہوتے وقت پیدا ہوئی تھی۔

کھیل کا یہ میدان عجیب و غریب تھا مگر پھر بھی اس پر ایک باسٹرت اور لمبی انگ کھیلی جا رہی تھی یہ صورت حال زیادہ خوشگوار نہ تھی مگر پھر بھی بعض اوقات ایسے لگتا تھا کہ جیسے چائے کے کپ میں طوفان پیدا ہو گیا ہے۔ ملازمت کی پہلے دن ہی مجھ پر آفت آن پڑی میں ڈیڑھ دو دن کے تربیتی کیمپ میں پیش ہوا تو جناب پینل صاحب جو اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے ملازمین کے بیت الخلا کی انسپکشن فرما رہے تھے۔

وہ ایک مغموم رہنے والی شخصیت تھی جس کی لمبی ناک شاید اس کے لیے بنائی گئی تھی کہ بدبو سونگھنے میں آسانی ہو، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مدعو کیا کہ میں ان کی ساتھ بیت الخلا کی معائنہ کے دوران رہوں، مجھے دھوکا دے کر ایک بیت الخلا میں لے گئے کہ جہاں ایک صحت مند اور اچھے ہاضمہ رکھنے والے شخص نے پاخانہ کیا ہوا تھا۔ اس مقام پر فینا کل، چونا اور دوسری اشیاء بھی پھینکی ہوئی تھیں مگر ان کی موجودگی کے باوجود ایک خطرناک بدبو فی میرا ناک میں دم کر دیا اور میں نے گرنے پر مجبور ہو گیا جو کہ ڈائریکٹر اکیڈمی کے جوتوں پر گر پڑی۔

ڈائریکٹر صاحب اس صورتحال سے سنبھل نہ سکے گھور کر مجھے دیکھا اور اس نظام کو مطعون کرنا شروع کر دیا کہ جس کے ذریعہ ہر کس و ناکس ایک ایسے نظام کا حصہ بن رہا تھا جس نے برطانیہ کے تحت کو قائم رکھنا ہے دوسری آفت اس وقت آئی جب میں نے ضلع بہار کے بھگل پور کے اسٹنٹ کمشنر کے طور پر ابھی مشکل سے فرائض سنبھالے ہی تھے۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس نے بھارت میں ”بھارت چھوڑ دو“ مہم کا آغاز کر رکھا تھا اور بھگل پور بہار میں اس تحریک کا مرکز تھا

پولیس کے ایک آدمی کو مشتعل ہجوم نے ہلاک کر دیا تھا اور اس کی نعش کو یونین جیک کے جھنڈے میں لپیٹ کر ایک درخت کی چوٹی پر رکھ دیا گیا تھا انگریز ڈپٹی کمشنر، پولیس سپرنٹنڈنٹ اور ڈی آئی جی ایک خیمہ میں ایک جگہ اکٹھے ہوئے تاکہ انسانی آبادی کو نکالنے کے بعد سارے گاؤں کو اور اس کی فصلوں کو نذر آتش کر دیا جائے۔

چونکہ میں انچارج مجسٹریٹ تھا اس لیے میں نے ان کو روکا کہ وہ اس شیطانی تجویز پر عمل نہ کریں۔ وہ زور سے ہنسنے اور مجھے ایسی غلیظ گالیاں دیں کہ جن کو شائع نہیں کیا جاسکتا، میں نے انہیں اس کام سے باز رکھنے کے لیے اسی خیمہ میں صبح تک بندوق کی نالی سے محبوس رکھا۔ بالآخر انہوں نے اپنے ارادے بدل دیے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ بہار وہ علاقہ نہ رہا کہ جہاں میں زیادہ دیر تک قیام کر سکتا چنانچہ میں نے رضا کارانہ طور پر بنگال میں کہ جہاں قحط، سیلاب، آندھیوں اور بارشوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی جا کر اپنی خدمات ادا کرنے کی پیشکش کر دی۔

جب میں وہاں پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ جیسے انسان اور فطرت نے مل کر زمین پر قیامت صغریٰ برپا کرنے کے لیے کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔ لاکھوں انسان فاقہ کشی کی وجہ سے مر رہے تھے ایسے لگتا تھا کہ ہلاک کرنا فاقہ سے مرنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔

ساکن جسموں سے زندگی رخصت ہو رہی تھی اس صورت حال کو چاولوں کی ایک پلیٹ دم بھر کے لیے روک دیتی تھی مگر چاول تھے کہاں؟ وہ تو سرکاری گوداموں میں تھے جہاں اس لیے رکھے گئے تھے کہ وہ جنگ کے متعلقہ دفتر کے استعمال میں لائے جائیں یا پھر انہیں جاپانی فوجوں کے ملک میں گھس آنے پر برباد کر دیا جائے۔ میں متوجہ پور کے تمبوک کی سب ڈویژن کا ایک ایس ڈی ایم تھا کہ جسے فسادات نے برباد کر کے رکھ دیا تھا جہاں تین برطانوی ڈپٹی کمشنروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا یہ کارروائی سو بھاش چندربوس سے تعلق رکھنے والے تحریک کاروں کی تھی۔

یہ ایک ایسا علاقہ تھا جسے خوفناک طوفان اور قحط نے برباد کر رکھا تھا۔

میں نے صوبائی حکومت سے تار کے ذریعہ ان 2000 چاولوں کی بور یوں کو قحط زدہ عوام میں مفت تقسیم کرنے کی اجازت طلب کی جو کہ شہر کے ایک گودام میں رکھی ہوئی تھیں جب اس تار کا کوئی جواب نہ ملا تو پھر میں نے ان بور یوں کو تقسیم کرنے کے بارے میں سوچا۔ سیاسی پارٹیوں کے مقامی رہنماؤں کی ایک میٹنگ بلائی اور چاول کی ان بور یوں کو ان کے ذریعہ قحط زدہ عوام میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔

قحط زدہ مرد، عورتیں اور بچے ان چاولوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح پل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ خوبصورت بچے جن کی پسلیاں بھوک کی وجہ سے ان کے سوکھے پیٹوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ چاول کا ایک لقمہ کھانے کی بعد چل بے بھوک نے ان کی آنکھوں کو پتھر بنا ڈالا تھا۔

صوبائی حکومت کو اس صورتحال نے برا فروختہ کر دیا اور میری اڑیسہ تبدیلی ہو گئی۔ دو سالوں میں یہ صوبہ میرے لیے تیسرا صوبہ تھا۔ کلک میں زندگی پرسکون نہ تھی۔ میں ایک ایسے مکان میں رہائش پذیر تھا جہاں لوگ رہتے نہیں تھے کیونکہ اس بات کا چرچا ہو رہا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آخر یہ راز کھل گیا، میں اس تجربہ سے بھی گزرا۔

یہ ایک ایسی لڑکی کا بھوت تھا جسے اس کے عاشق نے اٹھارہ سال قبل اس وقت ہلاک کر دیا تھا جب اس کے بطن سے اس کا بچہ پیدا ہونے کا وقت آیا اس کو ڈرائنگ روم کے جنوب مشرقی حصہ میں دفن کر دیا گیا تھا۔

کنک نے مجھے یہ موقع بھی فراہم کیا کہ میں خفیہ طور پر ایک ٹوٹے پھوٹے ڈکونا میں سوار ہو کر جاتا یہ ڈکونا ہوجا
شہوار سے جو ادویات نائر، ٹیوپ جیپوں کے فاضل پرزہ جات لے کر جا کرتا تھا میں اس مہم سے لطف اندوز
ہو رہا تھا۔

اس دوران مجھے احمد سوہی کارنو، سلطان شہریار، ڈاکٹر ہتیا اور دیگر شخصیات کو دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔
آزادی ملنے پر ابھی میں نے کراچی میں وزارت تجارت میں انڈر سیکرٹری کے طور پر کام کرنا شروع کیا تھا کٹیم
میں جنگ چھڑ گئی میں آزاد کشمیر کی پہلی حکومت کا سیکرٹری جنرل بن گیا میں چوہدری محمد علی سے جو کہ پاکستان کے سب
سے زیادہ بااثر سیکرٹری جنرل تھے سے ملنے گیا چوہدری صاحب نے فرمایا کہ آزاد کشمیر رہے یا نہ رہے تمہیں یہ بات یاد
رکھنی چاہیے کہ تم اپنا کام کشمیر میں کرو اور مجھے ملنے پر نہ اپنا وقت ضائع کرو اور نہ میرا مگر میں وہاں کیا کام کرتا وہاں تو پہلا
ہی کام ہو رہا تھا وہاں ہر نو جوان کسی نہ کسی مقام پر جنگ میں شریک تھا بچے، نو جوان، بوڑھے، مرد اور عورتیں فلک بول
پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتے برف کو کھود کر اپنے لیے خندقیں بناتے تھے اور پھر ننگے پاؤں برف سے اٹے ہوئے
راستوں پر پیدل چل کر واپس گھر آتے تھے۔

کابینہ کے وزیر اور سیکرٹریٹ کے افسران جنہاں پہاڑی پرسرو کے درختوں کے سایہ میں اپنا دفتر بنا کر کام کرتے
تھے جبکہ بھارتی فوج کے طیارے ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

واقعی وہ دن بہت خوب تھے ایک ایسے وقت میں جنگ بندی کا اعلان کیا گیا کہ جب پاکستان کشمیر پر ایک بڑا حملہ
کر رہا تھا، ہو سکتا تھا کہ اس حملہ سے کشمیر کا تنازعہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا جنگ بندی کے تحفہ کے طور پر ایک مرکزی وزیر
صاحب منصب شہود پر مسلط کر دیے گئے اس کے بعد کشمیر پر توجہ کی بجائے اس کے امور پر توجہ شروع ہو گئی مجھے آسانی سے
وہاں سے نکال لیا گیا اور فارن پالیسی کے انچارج کے طور پر بطور ڈپٹی سیکرٹری مقرر کر دیا گیا یہاں میں ہیکٹر بوتی تھوے
الجبہ پڑا جو ایک اوسط درجہ کا قلم کار تھا جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اسے غلط طور پر قائد اعظم کی سوانح عمری لکھنے پر
مामور کیا گیا تھا اس بات نے مجھے مرکز سے نکال دیا اور پھر مجھے پنجاب میں جھنگ کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا۔ میرے لیے یہ
ملازمت ساری عمر کے لیے خوشی کا باعث رہی یہاں مجھے آدمی کے حوصلہ اس کی قوت برداشت راست گوئی دیانت اور
معصومیت کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا میں نے عدالت کا کام تقریباً چھوڑ دیا اور چھوٹے لوگوں کے چھوٹے مسائل پر توجہ
دینے لگا اس بات سے بااثر جاگیر دار موروثی پیر اور امیر ناؤٹ جنہوں نے عوام اور انتظامیہ کے درمیان دیوار کھڑی کر
رکھی تھی سخت برا فروختہ ہو گئے مگر اس جنگ میں فتح میری ہوئی میں جھنگ میں تھا کہ جب میں نے اپنے کیریئر کی پہلی
رشوت قبول کی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ آخری رشوت تھی۔

ایک کمزوری بوڑھی بیوہ مہینوں دفتر کے بے سود چکر لگا رہی تھی تاکہ اس کے خاوند کی وفات کے بعد مال کے
کاغذات میں اس کے خاوند کے بعد اس کے نام ضروری انتقال کر دیا جائے میں نے اس کو اپنی کار میں ڈالا اس کے گاؤں
گیا اور ضدی پٹواری سے موقع پر ہی معاملات حل کروائے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے مسائل حل ہو گئے ہیں۔
جب اس نے گاؤں کے بڑوں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور انہوں نے بھی بتایا کہ معاملات حل ہو گئے ہیں
تو بے ہوش ہو کر گر پڑی اور رونے لگی پھر اس نے اپنے تار تار دوپٹے کے ایک کونے سے ایک گانٹھ کو کھولا اور ایک روپہ کا

شہاب نگر
کریا نہ نکال کر چوری سے میری جیب میں ڈال دیا۔ مجھے سونے کی کوئی بھی مقدار اتنا امیر نہیں بنا سکتی تھی کہ جتنا ایک روپیہ کے اس کریا نے، واپسی پر میں اپنی کار میں سوار اس بات پر رو پڑا کہ انسانی خوشیاں خریدنا کس قدر آسان ہے اور کتنا سستا بھی!!

جھنگ میں اپنے قیام کے دوران میں نے صرف ایک پولیس کا مقدمہ پنپایا ایک غریب کسان کی گائے گم ہو گئی تھی اس کی شکایت پر پولیس نے چوری کا مقدمہ درج کر دیا اور اس دوران ملزم پکڑا گیا اور گائے کو ڈھونڈ لیا گیا مگر جب دودھ دینے کا وقت ہوتا تو گائے پولیس سٹیشن میں پہنچا دی جاتی تھی تاکہ اسے زیر سماعت مقدمات میں بطور شہادت پیش کیا جاسکے۔ جب دودھ دینے کا موسم ختم ہو جاتا تو اسے پھر اس کے مالک کے پاس بھیج دیا جاتا تاکہ اسے حفاظت سے رکھا جاسکے اس طرح یہ مقدمہ سالہا سال تک لٹکا رہا ایک رات میں پولی سٹیشن گیا گائے کو اس کے مالک کے سپرد کر دیا مقدمہ کو ختم کر دیا اور تھانہ کے انچارج کو معطل کر دیا۔

اس بات سے قربان علی شاہ صاحب جو ان دنوں آئی جی پی تھے سخت برہم ہوئے وہ پولیس کو عدلیہ پر حاوی کرنا چاہتے تھے اسے سب لوگ جن میں وزیر اعلیٰ بھی شامل تھے چچا کہتے تھے۔ مجھے پنجاب سے نکال دیا گیا میں چوہدری محمد علی صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے کسی قسم کی کارروائی کرنے سے معذرت کی اور مجھے ہالینڈ میں پبلک ایڈمنسٹریشن کا کورس کرنے کے لیے بھیج دیا جو اس وقت ہیگ کے سوشل سٹڈیز کے انسٹیٹیوٹ میں ہو رہا تھا۔

کورس اچھا تھا اور پاکستان میں اس کی افادیت بھی تھی مگر ہیگ ایک خوبصورت مقام ہے یہاں میں خوب گھوما پھرا اور پھر قیام کے دوران مجھے یہ بھی موقع ملا کہ واپسی پر حج کی فضیلت کی بہرہ ور ہو جاؤں۔

حج کی سعادت کا لفظوں میں بیان مشکل ہے اس کا جذباتی اور روحانی پہلو اظہار پر حاوی ہے مگر انتہائی شوق کے عالم میں یہ بات میرے ذہن میں سودا بن کر چھائی رہی کہ میں مدینہ منورہ سے واپس نہ آؤں میں نے تو دعا بھی کی اسی جگہ پر میرا خاتمہ باخیر ہو جائے جب میں نے اس کا ذکر سوڈان سے آئے ہوئے ایک عالم دین سے کیا تو وہ بے ساختہ طور پر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

میں نے بھی ایسا ہی چاہا تھا مگر تم اور میں دونوں اپنی دعاؤں میں مخلص نہیں جب کچی خواہشیں لے کر لوگ اس مقام پر آئے تو پھر مرنے کے لیے انہیں دعا کی حاجت نہ رہی اور پھر اس نے بہت سے آزمودہ عاشقان نبی کا ذکر کیا کہ جو حضور محمدؐ کے عشق میں یہاں پہنچ کر فوری طور پر فوت ہو گئے اس نئی مکرم محمدؐ کے عشق میں جس نے موجودہ زمانہ کی تاریخ کو نیا رخ دیا۔

واپسی پر مجھے ایک عجیب و غریب نوکری دی گئی اور وہ بھی پنجاب میں مجھے ملک فیروز خان نون نے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز بنا دیا میں نے ملک صاحب سے احتجاج کیا کیونکہ ایک ٹیکنیکل کام کے لیے میں شاید ناموزوں ہوں اللہ ملک صاحب کو مغفرت کرے فرمانے لگے ہم صرف ایک ایسا آدمی چاہتے ہیں جو اس کام سے پیسے نہ بنائے۔

ظاہر ہے کہ مجھے ملک صاحب کے یہ الفاظ اچھے لگے مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرا کام نئی صنعتیں لگانا نہیں بلکہ غیر مسلموں کے سینما گھروں، سٹوڈیوؤں، فیکٹریوں کو ان مسلمان مہاجرین کو دینا ہے جو بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں۔

کلیں کے لیے جو دوڑ لگی وہ دھوکا، فریب، دھاندلی اور فراڈ کا ایک تند و تیز سیل رواں تھا۔
 تانگے کو جائیداد ظاہر کیا گیا اس لیے کہ گھوڑے کے مرنے پر یہ حرکت نہ کر سکتا تھا سرکس کا شیر اس لیے ساکن تھا
 کیونکہ وہ ایک پنجرہ میں بند تھا جتنا بڑا کلیم ہوتا تھا اتنا بڑا فراڈ ہوتا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں اس دلدل سے جلد واپس آ گیا
 کیونکہ مجھے گورنر جنرل صاحب نے کراچی میں طلب کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد صاحب اپنے بھائیوں
 کے بارے میں کوئی بات کریں گے کہ جنہوں نے بہت بڑے بڑے کلیم داخل کر رکھے تھے کہ انہیں صنعتی یونٹ الائن
 کردوں گا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ایک لمبی سیٹوں والی آواز سے جس کو پائپ سے گیس کے نپٹے
 کے بعد سنا جاسکتا، یا اس سے مشابہت دی جاسکتی ہے، کچھ کہنے کی کوشش کی، مس رتھ بورل نے بتایا کہ وہ فرما رہے ہیں
 کہ آپ میرے دفتر جائیں اور گورنر جنرل کے سیکرٹری کے طور پر اپنے فرائض انجام دینا شروع کر دیں۔ اس امر سے اس
 دور کا آغاز ہوا جب مجھے تین سربراہان مملکت کا سیکرٹری بنایا گیا گورنر جنرل غلام محمد، صدر سکندر مرزا، فیلڈ مارشل ایوب
 خاں۔ ان نو سالوں میں حالات کے اتار چڑھاؤ سے میرا سامنا رہا مگر میں نشیب و فراز سے بچ تو نکلا مگر ایک موقع پر میرا
 سرتن سے جدا ہوتے ہوئے بچ گیا۔

غلام محمد گورنر جنرل کو عادت تھی کہ وہ اپنے سٹاف کی دن میں ایک یا دو مرتبہ عزت افزائی کرتے تھے۔ ان کے
 ساتھ ملاقات کے بعد انسان اپنے آپ کو ادھ مرا اور بے عزت محسوس کرتا تھا، ان دنوں میں ہر روز ایک کورٹ سرکلر
 جاری کرنا ضروری ہو گیا تھا جس میں ان باتوں کا ذکر تھا۔

”عزت مآب ذاتی عملہ کے ساتھ کوئٹہ سے واپس آ گئے ہیں۔“

”عزت مآب اپنے ذاتی عملہ کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گئے۔“

اس دن جو کورٹ سرکلر میں نے بھیجا۔ وہ یوں تھا۔

عزت مآب اپنے ذاتی عملے کے ساتھ پاگل ہو گئے ہیں۔ عملہ کے مشتعل اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے
 میں نے عملہ کے ارکان کو یہ پڑھنے کے لیے دیا۔ مس رتھ بورل خاص طور پر بہت خوش ہوئیں۔ اس نے اسے سال کا
 ایک لطیفہ گردانتے ہوئے اسے اپنی معصومیت میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے مطالعہ کے لیے پیش کیا مگر عزت
 مآب اس سے محفوظ نہ ہوئے اور فوری طور پر مجھے بلا بھیجا جونہی میں ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا انہوں نے میرے
 سر پر اپنا پسندیدہ ٹائم پیس دے مارا۔ بد قسمتی سے ٹائم پیس کو نقصان پہنچا اور میرا سر مضبوط ہونے کی بنا پر بچ گیا۔ مجھے
 بعد میں ٹائم پیس کو اپنی جیب سے مرمت کروانا پڑا میرا خیال ہے کہ غلام محمد صاحب نے میرے سر کی موٹی کھال کو کبھی
 معاف نہیں کیا۔

1962ء میں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے گرد میری موجودگی ان کے لیے مشکلات

پیدا کر رہی ہے چنانچہ انہوں نے مجھے 1963ء میں وزارت اطلاعات براڈ کاسٹنگ اور قومی تعمیر نو کا سیکرٹری بنا دیا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس وفد میں مجھے شریک کر کے عزت دی کہ جس نے چین کے ساتھ سرحدوں
 کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ اقدام اس موقع پر اٹھایا گیا کہ جو بعد میں پاکستان چین دوستی کی عمارت کے لیے پہلی اینٹ
 ثابت ہوئی۔

قارن سروس..... چھ ماہ بعد مجھے باقاعدگی سے ہالینڈ بھیج دیا گیا مگر اس مرتبہ وہاں سفیر بنا کر بھیجا۔ اس دوران میں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے فری میسری معاملات کی چھان بین شروع کر دی میرا خیال ہے کہ یہ سیکشن پاکستان کی خارجہ پالیسی کے لیے اجنبی ہے میں مرکز میں محکمہ تعلیم کا سیکرٹری تھا جب اچھے اور پرانے پاکستان پر یچی خاں کی لعنت اتری۔ مارشل لاء کے اعلان کے 10 دنوں بعد یچی خاں اور اس کے ٹھگوں نے وفاقی حکومت کی سول انتظامیہ سے رابطہ کیا ہے۔

گیٹ ہاؤس کے ایک متعفن کمرے میں ایک اجلاس ہوا یہ اجلاس ایک مایوس گن صورت حال پیش کرتا تھا شرکاء کے چہروں پر دھوکا، لالچ، جنسی بے راہ روی، تباہی برپا دی، انا پرستی اور رعونت کے اثرات ہویدا تھے۔ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ایک اہم قومی مسئلہ پر الجھ پڑا جس کے نتیجہ میں وہ بے وقوف دکھائی دینے لگے، ان کے غصہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا اور بعد میں سول سروس آف پاکستان کی ملازمت سے ہی مستعفی ہو گیا۔

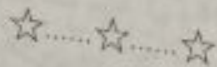
دسمبر 1971ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے واپس حکومت کی ملازمت میں بلایا تو میں نے اس بات کا پکا ارادہ کر لیا کہ ایک مجروح اور مفلوک الحال قوم کی خدمت کے لیے کام کروں گا جس کو شکست نے اور زیادہ نڈھال کر دیا ہے۔

میں نے اپنی ملازمت کے دوران تین سبق سیکھے ہیں۔ تین سربراہان مملکت کے سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کے باوجود کسی طرح حکومت نہ کی جائے۔ بطور سیکرٹری اطلاعات کسی طرح کی اطلاع فراہم نہ کی جائے۔ بطور سیکرٹری تعلیم کسی کو پڑھایا نہ جائے۔

ان میں اکثر باتیں خسارے کی ضمن میں آتی ہیں۔ نفع کی طرف میرے ریکارڈ میں صرف ایک بات درج ہے خواہ میں ہیگ کے سفارتخانہ جہاں شاندار قالین، قیمتی فرنیچر، پرانے چوب دار یا مین فوٹنگم کے چھوٹے متعفن کمرہ میں رہائش پذیر ہوں میرے لیے زندگی دونوں صورتوں میں ایک جیسی رہی۔

اب جب ماضی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو شک و شبہ کا سانپ میری روح ڈستا دکھائی دیتا ہے۔ کیا میری بیوی کچھ اور دنوں تک زندہ رہتی، اگر اسے میرے ساتھ تین سالوں تک جلاوطنی کی صعوبتیں برداشت نہ کرنا پڑتیں۔ میں ان باتوں کا جواب اب جاننا ہی نہیں چاہتا۔

روزنامہ ”پاکستان ٹائمز“ 31 مارچ 1963ء



دورہ

ایک روز صبح ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سٹی مجسٹریٹ اور مال افسر ایک وفد کی صورت میں میرے پاس آئے ہمیں ابھی ابھی اطلاع ملی تھی کہ اگلے ہفتے چیف منسٹر صاحب ضلع کے تین روزہ دورہ پر تشریف لانے والے ہیں۔ دور افتادہ ضلعوں میں وزیر صاحبان کی دورے آندھی کی طرح آتے ہیں اور بگولے کی طرح جاتے ہیں چند روز کے لیے دفتر کے سارے معمول درہم برہم ہو جاتے ہیں اور افسروں اور اہلکاروں کی انتظامیہ صلاحیتیں، وزیر صاحبان کے دورے کو خوشگوار اور کامیاب بنانے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس دورے کی اطلاع پاتے ہی اے ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور مال افسر نے ایک ہنگامی مجلس شوریٰ منعقد کی اور سابقہ روایات کو سامنے رکھ کر وزیر اعلیٰ کے سہ روزہ دورے کا مکمل پروگرام مرتب کر لیا۔

اس پروگرام کی سب سے بڑی مدد وزیر اعلیٰ کے استقبال کے متعلق تھی۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈران کرام کو دعوت نامے ارسال کیے گئے کہ وہ وقت مقررہ پر ڈاک بنگلے میں تشریف لا کر وزیر صاحب کی پیشوائی کے لیے موجود رہیں۔ شہر کے رئیسوں اور پنشن یافتہ بزرگوں نے بھی اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے نام یہی دعوت نامے جاری کروائے۔ ڈاک بنگلے کے صحن میں ایک شامیانہ نصب کر دیا گیا تاکہ استقبال کرنے والے لوگ اس کے نیچے بیٹھ کر آرام سے انتظار کی گھڑیاں گنتے رہیں۔ میونسپل کمیٹیوں کی لاریوں نے چھڑکاؤ کر کے ڈاک بنگلے کے آس پاس کی سڑکوں کو گلیا کیچڑ کر دیا۔ ناظر صاحب نے نظارت کے سٹور سے کپڑے کی رنگین جھنڈیاں برآمد کر کے وزیر اعلیٰ صاحب کے راستے کو دور دور تک سجا دیا۔ مڈل اور ہائی اسکولوں کے بوائے اسکاؤٹ وردیاں پہن کر سڑک کے دورو یہ ایستادہ ہو گئے اور چند مقامات پر ان کے بینڈ باجوں کو بھی تعینات کر دیا گیا۔ پولیس نے سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی اور وزیر اعلیٰ کی آمد سے کچھ عرصہ پیشتر ہر قسم کی ٹریفک کو بند کر دیا۔ بسیں اپنے مسافروں سمیت جگہ بہ جگہ رک گئیں تاکہ والوں نے اطمینان سے اپنے گھوڑے کھول کر درختوں کے نیچے سائے میں باندھ دیے اور تمازت آفتاب میں جھلتے ہوئے مسافر وزیروں اور افسروں کی جملہ برادری کو کوس کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے میں مصروف ہو گئے۔

ڈاک بنگلہ سرکاری تھا اور پی ڈبلیو ڈی نے اپنے حساب سے اس میں ضرورت کا سامان رکھ چھوڑا تھا لیکن افسران ضلع کی نظر میں یہ ساز و سامان وزیر اعلیٰ کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ چنانچہ ایک میونسپل کمشنر صاحب کے گھر سے صوفوں کے دو سیٹ لائے گئے۔ یہ صوفے میونسپل کمشنر صاحب نے خاص اس مقصد کے لیے بنوا چھوڑے تھے۔ قالینوں کے کئی خوبصورت جوڑے ایک رئیس کے ہاں سے آگئے اور پلنگوں کی چادریں، تکیوں کے غلاف، کشیدہ کاری سے مزین میز پوش، چینی کے برتن، چھری، کانٹے اور نیپکن ایک خوش باش وکیل صاحب نے مجسٹریٹوں کی وساطت سے عاریتاً دیے۔ ڈاک بنگلے میں پولیس کا گارڈ آف آنر سلامی دینے کے لیے کھڑا ہو گیا ایک لائن میں سرکاری افسر اور ان کے مقابل دوسری لائن میں غیر سرکاری مشاہیر شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے۔ جونہی وزیر اعلیٰ کی سواری نازل ہوئی، ڈپٹی کمشنر کو

اس بات کی سعادت نصیب ہوئی کہ وہ لپک کر موٹر کار کا دروازہ کھولے۔ وزیر صاحب برآمد ہوئے۔ گارڈ آف آنر نے سلامی دی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے سرکاری اور غیر سرکاری حاضرین کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر ڈاک بنگلے کے اندر تشریف لے گئے۔

وزیر اعلیٰ تو اندر چلے گئے لیکن باہر ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے مال افسروں کو دبوچا اور اردلی نے تحصیلدار صاحب کا ٹیٹو لیا۔ ان دو صاحبان نے مال افسر اور تحصیلدار کو ان تمام لوازمات سے آگاہ کیا جو وزیر اعلیٰ کے آرام اور آسائش کے لیے بے حد ضروری تھے۔ وزیر تو خیر وزیر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ پرائیویٹ سیکرٹری کا دم جھٹکا بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ قلمدان وزارت میں پرائیویٹ سیکرٹری کا درجہ بالکل قلم کا ہے۔ وزیر آتے ہیں وزیر جاتے ہیں لیکن وزارت کی چلتی پھرتی دھوپ چھاؤں میں پی اے اور پی ایس کی نوکری پکی ہوتی ہے اور وہ ہر وزارتی بحران میں ثابت و سالم رہتا ہے۔ کوئی وزارت ٹوٹے، تو پی اے اور پی ایس بڑی مستعدی سے پرانے وزیروں کو سرکاری کوٹھیوں سے نکالنے میں حکومت کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ادھر نئے وزیر نے حلف وفاداری اٹھایا، ادھر ان کے پی اے اور پی ایس نے لپک کر انہیں دبوچا اور اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیا۔ جس طرح روز اول سے ڈپٹی کمشنر کی زندگی پر ناظر کا فیض سوار ہو جاتا ہے اسی طرح وزیر صاحب کے آگے پیچھے دائیں بائیں بھی پی اے اور پی ایس کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اب جس نے وزیر صاحب کے دامن اقتدار کو چھونا ہو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ پہلے پی اے کے پل صراط کو عبور کرے اس پل صراط کے نیچے ایک مضبوط ستون کا سہارا ہوتا ہے جسے وزیر صاحب کا اردلی کہتے ہیں۔ پی اے کی طرح یہ ستون بھی پکی اینٹوں کا بنا ہوتا ہے اور وزارتی بحران اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

وزیر اعلیٰ منہ ہاتھ دھونے کے بعد تازہ دم ہو کر ڈاک بنگلے کے ڈائنگ روم میں تشریف لائے تو میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اپنے تین روزہ دورے میں کس کس کام کا پروگرام پسند فرمائیں گے۔ وزیر صاحب نے بڑی خوش اخلاقی اور مروت سے فرمایا۔ ”آپ ضلع کے حاکم ہیں میرا پروگرام بالکل آپ کے ہاتھ میں ہے آپ جو کچھ تجویز کریں گے مجھے بسر و چشم منظور ہوگا۔“

پیشتر اس کے کہ میں کچھ تجویز کرتا، پی اے صاحب نے ایک فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی اس فائل میں پہلے ہی وزیر صاحب کا مکمل پروگرام طے کیا ہوا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق تینوں روز کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کا کھانا بڑے بڑے زمینداروں، رئیسوں اور سیاست دانوں کے ہاں مقرر ہو چکا تھا۔ صبح نو بجے تک ایک سیاسی وفد۔ 3 بجے سے 5 بجے تک آرام۔ چائے کے بعد ڈنر تک سیاسی ملاقاتیں، دوسرے روز ایضاً۔ تیسرے روز ایضاً۔ میں نے وزیر اعلیٰ سے پوچھا کہ وہ ضلع کے افسروں سے ملاقات کے لیے بھی تھوڑا سا وقت نکال سکیں گے، تاکہ ہم کچھ مقامی انتظامی مسائل ان کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ انہوں نے کچھ دیر اپنے پروگرام کی فائل کا مطالعہ کیا اور فرمایا ”نہیں اس بار تو وقت نہیں ملے گا انشاء اللہ اگلے دورے پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔“

پرنٹنڈنٹ پولیس سے البتہ انہوں نے تینوں روز بڑی طویل ملاقاتیں کیں غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ضلع میں ایک ضمنی انتخاب کی تاریخ نزدیک آنے والی تھی!

”قدرت اللہ شہاب بہ حیثیت افسانہ نگار، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے اردو 1981ء، رضوانہ یعقوب

لیڈر

لیڈر کے طبقے میں سب سے مشکل پسند برادری ان رہنماؤں کی ہے جو سیاست کی جگہ خالص مذہبی پیشوا کی گزراہ کرتے ہیں۔ عید بقرعید کی طرح ان کا کاروبار بھی سال میں فقط ایک یا دو بار چمکتا ہے خاص طور پر محرم کے دنوں میں ان کی کارگزاریاں بہت زوروں پر ہوتی ہیں۔ کہیں جلوس کے راستوں پر تنازعہ ہے کہیں تعزیوں کی لمبائی پر مکرر ہے۔ کسی زمانے میں جب ہولی یا دسہرے کے جلوس مسجدوں کے آگے سے گزرتے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اچھا خاصا میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا لیکن آزادی بھی ملی، اور ہندو بھی گئے پھر بھی جلوسوں اور مساجد کا تصادم اسی گرم بازاری سے جاری ہے۔

ظہر کا وقت ہے محرم کا جلوس نکلا ہوا ہے۔ سٹیوں کی مسجد میں معمول سے زیادہ نمازی جمع ہیں۔ جلوس نے اپنی رفتار جان بوجھ کر سست کر دی ہے تاکہ جب اذان کی آواز بلند ہو تو وہ لپک کر مسجد کے سامنے پہنچ جائے۔ ادھر مؤذن کو انتظار ہے کہ، کہ ادھر جلوس نزدیک آئے تو خدا کے بندوں کو نماز کے لیے پکارا جائے..... باہر جلوس اور اندر جماعت دو مخالف فوجوں کی طرح صف آراء ہو جاتے ہیں لیکن عین اس وقت علاقہ کا تھانیدار یا مجسٹریٹ دونوں فریقوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے نمائندے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجیں۔ فریقین کے پیشوا اپنے اپنے ”وٹو“ لے کر بھدڑک دے، اشتہام، ڈپٹی کمشنر کے پاس آتے ہیں اب اگر ڈپٹی کمشنر نے سال بھر سے ان رہنماؤں کے ساتھ مزید خیر-گالی کے تعلقات استوار کر رکھے ہیں تو بہت جلد مصالحت کے آسان آسان راستے نکل آتے ہیں ورنہ اگر بد قسمتی سے ”وٹو“ میں کسی صاحب کارا شن ڈپوان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے منسوخ ہو چکا ہے، یا کسی صاحب کوڑک چلانے کا لائسنس نہیں ملا، یا کسی صاحب کی دکان کی الاٹمنٹ معرض التوا میں ہے یا کسی صاحب کے فرزند ارجمند کو ضلع کچہری میں ملازمت نہیں ملی تو.....

ایک گاؤں میں اچانک خطرناک قسم کی کشیدگی نمودار ہو گئی، مسئلہ زیر تنازعہ یہ تھا کہ درود و سلام کے دوران میں ”یا رسول اللہ“ کہنا جائز ہے یا نہیں۔ باہر سے دو مولوی آئے ہوئے تھے۔ ایک کا ارشاد تھا کہ یا رسول اللہ کہنا جائز ہی نہیں باعث برکت بھی ہے دوسرے مولوی صاحب اسے ناجائز اور بدعت قرار دیتے تھے۔ علماء کرام کے دائرے سے پہلے ہی یہ بحث سارے گاؤں میں سرایت کر گئی اس آڑ میں بہت سی ذاتی رنجشوں، قزاقیتوں اور محاصروں نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور رفتہ رفتہ گاؤں کے بہت سے لوگ آپس میں برسرِ پیکار ہو گئے۔

ایک دوسرے کے مویشی چرائے گئے سر پھٹول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں فساد اور بد امنی کے ایک مستقل چکر میں بری طرح پھنس گیا۔ آخر کار دونوں مولویوں کو گرفتار کر کے باہر بھیج دیا گیا اور جب پوری تفتیش کے بعد

اس جگہ سے کا پہاڑ دکھوا گیا، تو اس میں سے سیاست کی ایک چھوٹی سی چوہیا برآمد ہوئی۔ گاؤں میں ایک نمبردار صاحب تھے جو کسی زمانے میں صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے کچھ عرصہ تک انہوں نے بڑے ٹھانڈے سے ممبری کی لیکن ان کے مخالف امیدواروں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ انتخاب ناجائز طریقے سے ہوا تھا اس لیے کالعدم قرار دیا جائے، مقدمہ منظور ہوا اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایم ایل اے صاحب اسمبلی کی رکنیت سے خارج ہو گئے۔ اسمبلی اور شراب میں ایک مشترکہ نشہ یہ ہے کہ، چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جن دنوں یہ نمبردار صاحب ایم ایل اے تھے ان کی شان ہی کچھ اور تھی۔ لاہور جاتے تھے تو وزیروں کے دوش بدوش بیٹھتے تھے۔ ضلع کی تقریبوں میں انہیں اگلی صف میں جگہ ملتی تھی۔ تحصیلدار، تھانیدار جب دورے پر آتے تھے تو ان کے گھر کھانا ضرور کھاتے تھے چند پنواریوں اور ضلع داروں کو بھی انہوں نے اپنے اثر سے ادھر ادھر تبدیل کر دیا تھا۔

اتنا سارا خون منہ کو لگنے کے بعد جب اسمبلی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو زندگی کے سارے مزے کر کرے ہو گئے۔ اب نہ وزیران کی بات پوچھتے تھے نہ ڈپٹی کمشنر انہیں اپنی دعوئوں میں بلاتا تھا ہاں تحصیلدار اور تھانیدار ان کا کھانا اب بھی کھا لیتے تھے، لیکن گھر جا کر نہیں بلکہ حسب ضرورت اپنے کیمپوں ہی میں منگوا بھیجتے تھے۔

زندگی کی اس بے کیفی کو ختم کرنے کے لیے سابق ایم پی اے نے بہت سے نئے آزمائے، لیکن سیاسی وقار کی جو عمارت منہدم ہو چکی تھی، اس کے مینارے کسی صورت دوبارہ بلند نہ ہوتے تھے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر انہوں نے اپنے خرچ سے دو متضاد مولویوں کو بلا کر گاؤں میں یہ نیا فساد برپا کر دیا۔ بیچارے مولوی صاحبان تو گرفتار ہو گئے لیکن کچھ روز کے لیے نمبردار کی لیڈری کا بازار بھی خوب گرم ہو گیا۔ پولیس اور مال کے افسر اور مجسٹریٹ صاحبان جو اس ہنگامے کے سلسلے میں وہاں جاتے تھے وہ سابق ایم این اے کے ہاں فروکش ہوتے تھے اور حفظ عامہ کے سارے منصوبوں میں ان کی رائے بڑی مفید ثابت ہوتی تھی۔

لیڈروں کی منڈی میں بازار کے بھاؤ اکثر بدلتے رہتے ہیں۔ منڈی غلہ کی ہو یا سیاست کی، تجارتی اصول سب جگہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ آج کل بڑی بڑی دکانوں میں مختلف چیزوں پر قیمتوں کے لیبل لگانے کا رواج عام ہے یوں بھی حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے بہت سے قانون بنائے ہیں لیکن رہنماؤں کی جس جنس سے ڈپٹی کمشنر کا سابقہ پڑتا ہے، اس پر راشن بندی اور پرائس کنٹرول کا کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہوتا یہاں پر ڈپٹی کمشنر کو محض اپنی کاروباری فراست اور نظر شناسی سے ہی کام لینا پڑتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ سیاست اور تجارت کی اس کشمکش میں کبھی کبھی بے چارے ڈپٹی کمشنر کا اپنا بھی دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

”قدرت اللہ شہاب بہ حیثیت افسانہ نگار، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو 1981ء، رضوانہ یعقوب

جنگی قیدیوں اور ادیبوں کی عذرخواہی

پچھلے دنوں لاہور میں ایک مذاکرہ ہوا ہے جس میں ادیبوں اور دانشوروں سے احتساب کرنا مقصود تھا کہ انہوں نے ہمارے جنگی قیدیوں کے ضمن میں کیا تاثر قبول کیا ہے اور اپنے احساسات کو اظہار کا کیا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ محاسبہ جائز تو ہے لیکن اسے آج سے بہت پہلے شروع ہو جانا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں میرے جیسے نیم ادیب کا بھی ایک نقطہ نظر ہے جسے بیان کرنا بھی غیر واجب نہیں۔ جنگی قیدیوں کا مسئلہ درحقیقت اس عظیم المیہ کا حصہ ہے جو ستمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان کی سرزمین پر رونما ہوا۔ یہ سارا مسئلہ اب تک اتنی داخلی اور خارجی پیچیدگیوں، احتیاطوں، احتیاجوں اور متضادم احتجاجوں کے گرداب میں گرفتار ہے کہ اس پر ادیب کا ردِ عمل بھی اب تک آزادی سے اُبھر نہیں پایا۔ ایک حکایت ہے کہ بسطام میں ایک آتش پرست حضرت بایزید بسطامیؒ کے پاس آیا جایا کرتا تھا اور ان کا وہ بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم جو اس قدر عقیدت سے شریک محفل ہوتے ہو آخر مسلمان ہی کیوں نہیں ہو جاتے؟ آتش پرست نے جواب دیا کہ اگر اسلام وہ ہے جو بایزیدؒ میں پایا جاتا ہے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اگر وہ ہے جس کا نمونہ تم ہو تو یہ میرے لیے باعثِ ننگ ہے۔

اس آتش پرست کی طرح غالباً آج کا ادیب بھی یہ کہنے پر کسی قدر حق بجانب ہوگا کہ جنگی قیدیوں کے لیے اگر ردِ عمل وہ ہے جو ان کے زندہ درگور ماں باپ، اداس بھائیوں، بہنوں، منتظر بیویوں اور پریشان بچوں میں پایا جاتا ہے تو لاریب ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے اور اگر وہ ہے جو بساطِ سیاست پر ہر روز نت نئے روپ دھار کر عوام الناس کے ذہن پر ابتری، پراگندگی، انتشار اور الجھن کے گرد آلود جھکڑ چھوڑتا ہے تو یہ ہمارے لیے باعثِ ننگ ہے۔

لیکن پھر ایک اور سوال اُٹھتا ہے۔ اگر ہمارا ادیب ہیروشیما اور ناگاساکی پر برا فروختہ ہوتا ہے، اگر اس کے اعصاب برصغیر کی تقسیم کے فسادات میں انسان کی بربریت سے شل ہو سکتے ہیں، اگر الجیریا کی مظلوم مجاہدہ جیلہ اس کے دل کے تار ہلا سکتی ہے، اگر یروشلم کی شکست اس کے عرفان میں دیوار گر یہ اٹھا سکتی ہے اگر رویت نام کی جنگ سے اس کی تخلیقی صلاحیت میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے تو پھر سقوطِ ڈھاکہ پر خاموشی کی اوس کیوں پڑی ہوئی ہے؟ توے ہزار بے گورہ کفن زندہ لاشوں پر ادب کی آنکھ کیوں بے نم ہے؟

میرے خیال میں اس کی وجہ ادیب کی بے جسی نہیں بلکہ اس کی بے بسی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اول تو جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ مسلم بنگال کے ساتھ ہمارے آئندہ تعلقات کی نوعیت سے الجھا ہوا ہے جس طرح کاغذ کی ناؤ بھنور کے محیط میں پھنس کر چکر کاٹ رہی ہو۔ یہ معاملہ ابھی تک دو ٹوک اور قطعی طور پر طے نہیں ہوا بلکہ بدستور

مستقبل میں مسلم بنگال کے ساتھ ہمارا رابطہ ابھی فیصلہ کن نہیں بلکہ فیصلہ طلب ہے۔ بیرونی دنیا میں اس مسئلہ پر جو ابتدائی تفریق تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی تیزی سے کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن خود پاکستان کے اندر یہ فیصلہ ابھی تک متضاد جذبات اور متضاد سیاست کی دودھاری شمشیر بے نیام کی نوک پر معلق ہے۔ یہ نواریں چوکھی انداز سے وار کرتی رہی ہے کہ یہ سارے کا سارا مسئلہ اپنی قومی سطح سے کٹ کر انفرادی یا زیادہ سے زیادہ جماعتی ٹکڑیوں میں بٹ گیا ہے۔ اس بات پر ساری قوم میں یکجہتی پائی جاتی ہے کہ جنگی قیدیوں کو جلد از جلد رہا ہونا چاہیے۔ اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک نہ ایک روز مشرقی پاکستان یا مسلم بنگال یا بنگلہ دیش کے ساتھ ہمارا کسی نہ کسی قسم کا رابطہ قائم ہونا لازمی ہے۔ دہلی اور ڈھاکہ کے ملی بھگتوں کی ضد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب تک دوسری بات طے نہیں پا جاتی، جنگی قیدیوں کی رہائی میں ایک رکاوٹ کے بعد دوسری رکاوٹ بدستور پڑتی چلی جائے گی۔ یہ رویہ ناواقف ہٹ دھرمی کی منہ بولتی ہوئی مثال ہے کیونکہ جنگی قیدی انسانی مسئلہ ہیں اور بنگلہ دیش ایک سیاسی سوال۔ ان دونوں کو پاکستان کے خلاف زور ازوری کی سیاست میں گنڈ کرنا نہ دہلی کو زیب دیتا ہے نہ ڈھاکہ کو۔ لیکن ان سے کوئی اور امید رکھنا بھی بیکار ہے۔

اس کے برعکس ہم جنگی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ تو بیک زبان کرتے ہیں۔ لیکن مسلم بنگال کے سوال پر یہی ایک زبانی بھانت بھانت کی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان بولیوں کے سر اور تال بھی وقت اور موسم کے حساب سے ادا بدلتے رہتے ہیں۔ آج کی رائے کل کی تردید اور کل کا بیان پرسوں کی تائید میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک سیاسی مسئلہ پر موقوفات اور خیالات کی یہ ملتون مزاجی اور تغیر پذیر اس کے انسانی پہلو پر بھی لازمی طور پر اسی شدت سے اثر انداز ہو رہی ہے چنانچہ ڈیڑھ برس کے اندر اندر اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کے حق میں جلسے کرتی ہیں تو ان کی سوگوار بیویاں اور جلوس نکالتے ہیں تو ان کے اداس بچے۔ باقی معاشرہ انتہائی خیر سگالی سے سڑک کے دورویہ کھڑے ہو کر ان کا نظارہ کرتا ہے، ہمدردی جتاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی میں تاخیر پر ارباب بست و کشاد کو برا بھلا کہتا ہے اور پھر گھر جا کر اپنے روزمرہ کے مشاغل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جلسے جلوس کو چھوڑ کر باقی کسی وقت یہ مسئلہ معاشرے کا اجتماعی تہیہ بن کر قوم کی نیند حرام نہیں کرتا بلکہ یہ محض اسی ماں، اسی بہن، اسی بیوی، اسی بچے کا انفرادی المیہ رہتا ہے جنہیں کئی مہینوں سے ریڈ کر اس کے ذریعے ان کے قیدی جوان کا خط ہندوستان کے زندان خانے سے موصول نہیں ہوا۔

ادیب کا فرض تھا کہ وہ اس بات کا نوٹس لیتا کہ ملک کے اندر اور باہر سیاسی تنازعات کا اثر ڈھاکہ ایک انسانی مسئلہ کو اسے میں جکڑی ہوئی بے بس مکڑی کی طرح نگٹے تو جا رہا ہے لیکن نہ قوم کے کان پر بجوں رہی جیتی ہے اور نہ ہی دنیا کا ضمیر اس سے ٹس ہوتا ہے لیکن بیچارہ ادیب بدحواس ہو کر چوک گیا اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عوامی ذہن پر آج کل خطابت اور نفافت کا راج ہے۔ اس نقار خانے میں ادیب کی آواز طوطی سے بھی زیادہ نحیف ہے۔ آزادی کے بعد وطن عزیز میں بننے اپنے لیے ایسا مقام پیدا نہیں کیا کہ وہ سیاست، صحافت، یا تجارت کی طرح سارے ماحول پر نہ سہی زندگی کے کی ایک پہلو پر پورا طرح اثر انداز ہو سکے۔ 25 برس میں ہمارے ادب میں ایک بھی منصور نہیں اٹھا جو ان الحق کا نعرہ لگا کر بازار پر چڑھنے کے لیے تیار ہوا۔ اس کو تاہی کا اندازہ ادیب کو خود بھی ہے۔ اس احساس نے اس کو ایک پوشیدہ ذہنی چنپ اور انداز عند خواہی میں مبتلا کر کے اس سے جنوں کی وہ بے باکی چھین لی ہے جس کی کوکھ سے زمانے کا رخ بدلنے

والا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس فلسفاتی مجبوری میں وہ کہ ہمارا ادیب اپنے خود ساختہ شیش محل میں چناہ لے کر بیٹھ گیا اور اس کی زیادہ توجہ اس احتیاط پر لگ گئی کہ کہیں کوئی دوسرا اس کے گلاس ہاؤس پر پتھر اڑ نہ کرنے پائے۔ ہمارے ہاں جس آسانی سے ہر کس و نا کس پر طرح طرح کے بھارتی یا نظریاتی لیبل چسپاں کرنے کا رواج ہے، ادیب اس سے بہت غافل ہے وہ تو بزم خود آفاقی قدروں کی علمبرداری کا وارث ہے وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو روزمرہ کی سیاست اور صحافت کی زد میں ڈال کر قومی مسائل کی آگ میں بے خوف و خطر کود پڑے۔ اس چنگا پھٹ نے ہمارے ادیب کو قومی سیاق و سباق میں بے اثر اور معطو معطل بنا کے رکھ دیا ہے۔ محتاط ادیب زیادہ تر محتاج ادب ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی بحرانی تاریخ نازک ترین سال 1971ء کے دوران یا اس کے بعد ہمارے ادیب نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ دوسری طرف ہمارے ادیبوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ بھی ضرور موجود ہے جو ہر قسم کی سہولتوں اور ہر طرح کا لیبل لگنے کے باوجود پوری ذہن اور وحیاء کے ساتھ اپنے لائحہ عمل پر نہایت مستعدی اور ثابت قدمی سے کام کر رہا ہے۔ یہ ”چار قومی“ دانشوروں کا نولہ ہے جو اپنی ذم میں باہر سے آئے ہوئے مور کے چراگ کر بیڑی دیدہ دلیری سے کولے کی چال چلتا ہی رہتا ہے۔ کاش! ہمارے محبت وطن ادیب اپنے ان دانشور بھائیوں سے جرأت زندان کا کم از کم اتنا ہی سبق سیکھ لیتے۔ لیبل تو آتی جانی چیز ہے، آج لگے کل اتر گئے، جو شے زندہ اور با اثر رہتی ہے، وہ فن کا خلوص، بیان کی سچائی اور نصب العین کی راستی ہے۔ اگر آج بھی ہمارا ادیب اپنی چنگا پھٹ کے خول اور احتیاط کے تابوت سے باہر نکل آئے تو قوم کے ہنگامی مسائل پر شاید اس کا فالوئس خیال بھی روشنی کی کوئی تازہ کرن ڈال سکے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے ادیبوں کی روش پر بھی ایک نظر ڈالنا بے محل نہ ہوگا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی جیسے حساس ادیب آج بھی وہاں موجود ہیں۔ بنگال میں قحط پڑے تو ”ان داتا“ جنم لیتا ہے۔ تقسیم ہند پر فسادات ہوں تو کبھی ”ہم وحشی ہیں“ کا نعرہ بلند ہوتا ہے، کبھی ”پشاور ایک سپر لیس“..... ”سردار جی“..... ”میں کون ہوں“، ”دھانی بانگمیں“ اور ”اجتھا“ جیسے ادب پارے تخلیق ہوتے ہیں لیکن جب انہی فنکاروں کے آس پاس تو بے ہزار زندہ درگور انسان پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہوں تو ان کی انسان دوستی کو کون سا سانپ سونگھ جاتا ہے؟ ان قیدیوں کے لاکھوں عزیز واقارب آس اور یاس کی سولی پر لٹکے ہوئے ہوں تو ان کے دل کے آگینے پتھر کی کنکریاں کیوں بن جاتی ہیں؟ پاکستان کا ادیب تو اپنی قومی احتیاطوں اور بین الاقوامی نزاکتوں کی وجہ سے کسی قدر معذور ہے کیا ہندوستان کا ادیب بھی اپنے ملک کی طرح اپنی جارحانہ فتح مندی کے نشے میں مسرور و مخمور ہو چکا ہے؟ اگر ایسا ہے تو انسانیت کے ترازو میں ہماری مجبوریوں کا عجز ان کے سرکاری درباری پندار پر ہزار درجہ بھاری ہے۔

اس ضمن میں ان ادیبوں اور دانشوروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو ڈھاکہ، چٹاگانگ، راج شاہی، میمن سنگھ میں آج بھی بقید حیات ہیں۔ ہندوستانی ادیب ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے لیکن ہمارے ساتھ ان کا رشتہ بڑا گہرا تھا۔ منیر چوہدری تو قتل ہو گیا جس نے انسانی فسادات کے بعد ڈھاکہ میں پہلا اردو مشاعرہ اپنی ذاتی نگرانی میں کروایا تھا، لیکن شوکت عثمانی تو زندہ ہے جس نے پاکستان کا دورہ کر کے اپنا شاہکار ”ہیکٹر الملک“ (ایک ملک) لکھا تھا۔ آج ہم کو کیسے پتہ چلے کہ اب وہ ایک کی جگہ دو ملکوں کی داستان کس قلم سے لکھ رہا ہوگا کوئی جیم الدین بھی ڈھاکہ میں موجود ہے ہم اس کی

گائے کے لیے گھاس کی ٹوکریاں خرید کر اپنے کندھوں پر لاد کر اس کے گھر ”پاشی باڑی“ لے جایا کرتے تھے۔ اس کے باغیچے میں ایک پھول بھی ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر گر جاتا تو جیسیم الدین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ اب ہمیں کون بتائے کہ نوے ہزار انسانوں کی صعبو بتوں پر اس کا دل پتھر ہے یا موم؟ پاکستان رائٹرز گلڈ نے مشرقی پاکستان کے شہروں میں ایسے سینکڑوں قلبی رابطے اور ذہنی پل تعمیر کر رکھے تھے۔ ان پلوں کو نہ ہندوستان کے ٹینک مسمار کر سکتے ہیں نہ شیخ مجیب الرحمن کی مکتی باہنیاں۔ ان رشتوں اور رابطوں کو اگر کوئی توڑ سکتا ہے تو وہ گزرتے ہوئے وقت کا بے رحم ہاتھ ہے۔ اگر وقت کا کارواں یوں ہی بے مقصدی، بے یقینی اور سرد مہری سے چلتا رہا تو کل ہم اُسی سرزمین کے ادیبوں اور دانشوروں کے لیے اتنے ہی اجنبی ہو جائیں گے جتنے اجنبی ہندوستان کے ادیب آج وہاں ہیں۔

پاکستان کا ادیب اپنے ارباب سیاست سے یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ کیا آپ وقت کے کدال کو اتنی مہلت دیں گے کہ وہ ان ذہنی پلوں کو کھود کر مسمار کر ڈالے جو سالہا سال کی محنت، محبت، نفرت، صلح اور لڑائی کے اینٹ گارے سے ہم نے اسلام آباد اور ڈھاکہ، کراچی اور چٹاگانگ، لاہور اور راج شاهی، ملتان اور گھلنا، پشاور اور مہمن سنگھ، کوئٹہ اور سلہٹ کے درمیان تعمیر کر رکھے تھے؟

ماہنامہ ”افکار“ کراچی شمارہ نمبر 41 اگست 1973ء



پاکستان میں تعلیم

صدر پاکستان نے جب سے نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا ہے اور وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے جب سے مذکورہ پالیسی کی توضیحات عوام کو پیش کی ہیں، اسی وقت سے طلبہ، اساتذہ اور سرپرست حضرات لگاتار بے شمار سوالات پوچھنے کے لیے میرے پاس پہنچ رہے ہیں۔ جواب کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تعلیمی پالیسی کے لمبائی و حصص کا خاکہ ہر وقت میرے سامنے ہے۔ میں اس وقت پوری کی پوری تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، اس کے چند ضروری نکات سے بحث کروں گا۔ اس بحث میں وہ سوالات بھی پیش نظر رکھے جائیں گے جو اکثر لوگوں کے ذہن میں ابھر رہے ہیں۔

مظاہرے

کچھ دن ہوئے راولپنڈی میں اس سلسلہ میں اساتذہ نے ایک جلوس نکالا۔ وہ اپنے مطالبات پیش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ اساتذہ کی تنخواہوں کے سکیل نیشنل پے سکیل کے متوازی کیے جائیں۔ مظاہرین نے جو کچے اٹھائے ہوئے تھے ان میں بعض پر یہ عبارت درج تھی:.....
”چپڑ اسی کی تنخواہ ایک سواڑ میں روپے اور اساتذہ کی تنخواہ ایک سو بیس روپے“۔

کیا استاد اور چپڑ اسی کے کام میں کوئی فرق نہیں؟

استدلال کے اس انداز سے مجھے ذہنی تکلیف ہوئی۔ تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرنے کا استاد کو پورا پورا حق ہے لیکن بھونڈے تقابل کے طور پر غریب چپڑ اسی کو درمیان میں لانے کا کوئی جواز نہیں۔ میں توقع کرتا تھا کہ اساتذہ، آنے اور محنت کش میں ”توقیر محنت“ کا احساس پیدا کرنے کے لیے بہتر خدمت سرانجام دیں گے لیکن یہ دیکھ کر باپوسی ہوئی کہ مندرجہ بالا تقابل میں چپڑ اسی کا ذکر درمیان میں لانے سے خود کو برتر سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کو کمتر جاننے کے احساس سے بھی خالی نہیں، کیا میرے کام، آپ کے کام اور چپڑ اسی کے کام میں توقیر محنت کے اعتبار سے واقعی کوئی فرق موجود ہے؟ میں سمجھتا ہوں آپ کا جواب اثبات میں نہیں جہاں تک اساتذہ کی تنخواہوں کے سکیل کا تعلق ہے۔ میں یقین دلاتا چاہتا ہوں کہ ہماری نئی تجاویز میں استاد کی تنخواہ کا مسئلہ حکومت کی توجہ کا مرکز ہے۔ طلبہ اور اساتذہ اور سرپرست حضرات کو چاہیے کہ وہ نئی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں تاکہ ان کی شمولیت با مقصد ہو۔

رد عمل

ہی تعلیمی پالیسی پر عوام کے رد عمل کا جائزہ لینے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر شخص نے اسے مفید چیز کے طور پر غاموٹی سے قبول کیا ہے اور بقدر ضرورت اس کی توثیق کی ہے۔ ایک عام تاثر جس کا مجھے احساس ہوا وہ یہ ہے کہ لوگ اسے ایسی اچھائی تصور کرتے ہیں جسے قابل عمل تسلیم کرنا مشکل ہو۔ میں پوری دیانتداری سے قوم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک قابل قبول اچھائی ہے اور اس کے متعلق کسی کو بھی تذبذب میں نہیں آنا چاہیے اور نہ مایوسی کا شکار ہونا چاہیے۔ تعلیم ایک نہ ختم ہونے والا اور نہ تھکانے والا مسلسل سفر ہے جو انسان کو علم و عرفان کے افق کی طرف کھینچے لے جاتا ہے۔

چونکہ وہ افق روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہی، اس لیے لازماً ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا، لیکن بالفعل ہمیں انشاء اللہ وہ تمام وعدے لفظاً اور معنا پورے کرنا چاہئیں۔ جو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں قوم سے کیے تھے۔ دوسرا عام تاثر جو نئی تعلیمی پالیسی کے متعلق لوگوں میں پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ پالیسی اپنی جگہ پر مفید اور درست ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے وسائل کہاں ہیں؟ واقعی یہ کروڑوں روپوں کا کام ہے اور ہمارا ملک غریب ہے۔ اس کے علاوہ حالیہ جنگ کے اثرات سے ہماری اقتصادی حالت کو جو دھکا لگا ہے۔ اس سے ہم غریب تر ہو گئے ہیں لیکن یہ عارضی اقتصادی مشکلات ہمیں اس بات سے روک سکتی ہیں کہ ہم اپنے عزائم و مقاصد کے لیے خطوط وضع کرتے وقت اپنے آپ کو آسودہ حال نہ سمجھیں؟ اور پھر یہ سمجھنے کی بات نہیں یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے کہ انسانی ترقی کے لیے دولت صرف ایک بڑے خزانے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ خزانہ خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کا ہے۔

قومی جذبہ

تعلیمی اصلاحات کے مصارف کا جائزہ لیتے وقت صرف حکومت کے ان مالی وسائل کو مد نظر نہیں رکھا جو ہمارے سامنے ہیں بلکہ قوم جو تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں اس نے اپنی نیک خواہشات اور تعاون کی یقین دہانی کے طور پر پیش کیا۔ اتنا عظیم منصوبہ دفتری وسائل سے، خواہ ان میں کتنی ہی مستعدی کیوں نہ ہو، معرض عمل میں نہیں لایا جاسکتا اور نہ ہی مالی بجٹ کے وسائل اسے تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ ترقی تعلیم کو ہمیں ایک مضبوط تحریک کے طور پر بلکہ ایک مقدس مشن کے طور پر چلانا ہوگا تاکہ ہم اخلاقی عظمت اور سماجی ذمہ داری کی بدولت کے وہ تمام خزانے یک جا کریں جو ابھی تک غیر مرئی ہیں اور جو ہماری قومی محبت کی سنہری قانون میں مخفی پڑے ہیں۔ ہمیں تعلیم کو دفتری، انتظامی اور سیاسی سطح سے اٹھا کر بلند تر مقام پر لے جانا ہوگا اور یہ درحقیقت پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی میں منصوبہ بندی کا کام صوبائی، ضلعی بلکہ درسگاہی سطح کی مشاورتی کونسلوں کے سپرد کیا جائے جن کے ممبر زندگی کے ہر شعبہ اور ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں گے تعلیمی ترقی کے ضمن میں طلبہ، اساتذہ، سرپرست حضرات اور دیگر تعلیم سے تعلق رکھنے والے سماجی بھی خواہوں کی شمولیت کے اخراجات ہمارے آئندہ میزانیہ کا ایسا نمایاں جزو ہوگا جس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

مالی وسائل

تعلیمی درسگاہوں کو گورنمنٹ کی تحویل میں لینے کا منصوبہ صرف مندرجہ بالا نظریاتی بلند پروازی پر ہی مبنی نہیں بلکہ ہم اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مالی وسائل بھی فراہم کر رہے ہیں۔ تعلیمی اصلاحات کا کوئی حصہ محض اس وجہ سے تشنہ تکمیل نہیں رہے گا کہ اس کے لیے روپیہ موجود نہ تھا۔ شاید قارئین کو علم ہوگا کہ اس سے پہلے گورنمنٹ کل بجٹ کا صرف دو فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرتی تھی اس کی مجموعی رقم اتنی بن جاتی تھی جتنی غالباً ملک کے بائیس امیر ترین خاندانوں نے مل جل کر بھی جمع نہ کی ہوگی۔ اب جبکہ حکومت اپنے مجموعی بجٹ کا 4 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کا تہہ کر چکی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ مستقبل قریب میں ملکی تعلیم تیسواں بڑا خاندان بن کر قوم کے سامنے آ رہی ہے۔

بنیادی فلسفہ

قومی پریس کے بعض حلقوں میں ایک اور بڑی چیز جس کو ہوا دی گئی ہے، یہ ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی عقب میں کودنا بنیادی فلسفہ کا فرما ہے۔ میرے نزدیک یہ سوال اتنا مشکل نہیں۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے چونکہ یہ پالیسی پاکستان کے لیے وضع کی گئی ہے، اس لیے اس کی پشت پر وہی بنیادی فلسفہ ہے جو پاکستان کا ”بنیادی نظریہ“ کہلاتا ہے۔ جب پاکستان کی تعلیمی ترقی کا ذکر آئے تو اس وقت بنیادی مقصد صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جو پاکستان کے قیام، سلامتی اور ترقی کا موجب بن سکے۔ پس یہی وہ فلسفہ ہے جو آج ہماری نئی تعلیمی پالیسی رُوح رواں ہے۔ ہمیں اپنی تعلیمی درسگاہوں سے ایسے مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہیں جو مندرجہ بالا بنیادی مقصد کی لگن رکھتے ہوں، جو اپنی روایات کے مطابق ماضی کی دل نواز قدروں کا امتزاج، مستقبل کی خوش آئند توقعات کے ساتھ کر سکیں اور عہد حاضر کی سائنسی اور فنی دنیا میں ہمسایہ اقوام کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ انہیں نہ صرف فنی اور ثقافتی تعلیم میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے بلکہ نا انصافی، ظلم اور عدم مساوات کے خلاف مضبوط محاذ بھی قائم کرنا ہے انہیں طبقاتی تعصبات سے معاشرے کو پاک کرنا اور قوت رکھنے کے باوجود برداشت کی عادت ڈالنا ہے کسی خوف کے بغیر انصاف قائم کرنے اور کسی قریبی تعلق کے بغیر مروت اختیار کرنے کی راہ ڈھونڈنا ہے۔ انہیں بہترین دوست اور شدید ترین دشمن بننے کے انداز سیکھنا ہیں۔ جب تک قوم کا وقار بحال نہ ہوا نہیں اپنے آرام و آسائش کو نظر انداز کر کے مشرقی پاکستان کو اس غلامی کے پنجے سے رہائی دلانا ہے جس کا جو 1947ء میں اس کے کندھوں سے قائد اعظمؒ نے اُتار دیا تھا لیکن دسمبر 1972ء میں ایک دفعہ پھر ہندو سامراج نے اس پر مسلط کر دیا کہ انہیں اپنے وطن عزیز کے ایک ایک سپاہی کو طاقت کے نشے میں مخمور دشمن کی قید سے آزاد کرانا ہے۔ یہ معمولی مقاصد نہیں ان تک پہنچنے کے لیے خطرات کے پہاڑ ہماری راہ میں آئیں گے، لیکن ہمیں مضبوط عزم و ثبات اور بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

نئی نسل کی ذمہ داری

قیام پاکستان کے وقت ہی سے یہ سب سے بڑا اسلامی ملک ان لوگوں کی نگاہوں میں جو اسلام سے روایتی طور پر

خود وہ ہیں کائنات کی طرح کھلتا تھا۔ وہ لگاتار اس ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے کہ کسی طرح پاکستان کو کھڑے کھڑے کر دیا جائے۔ آخر کار ایک بین الاقوامی سازش کے نتیجے کے طور پر جس کے ساتھ پاکستان کی اندرونی بد نظمی اور غاصب عناصر کی منہمی بھر جماعت کی بے تدبیری بھی شامل تھی۔ اس عظیم قوم کے نام پر فکست کا بد نما دھبہ لگ گیا جس کے افراد اور جس کی مسلح افواج بہادری و جانثاری احساس ذمہ داری اور قربانی کے جذبات میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہ تھیں۔ اب ہماری نئی نسل کو آگے آنا ہے اور ان مقاصد میں کامیابی حاصل کر کے دکھانا ہے جن کے حصول میں ہم ناکام رہے۔ اسے قوم کے سر سے غصہ اور بدنامی کے وہ سیاہ بادل ہٹانا ہیں جو ہم میں سے کچھ لوگوں کی غداری، حرص و آرزو اور بد کرداری کی وجہ سے ہم پر چھا گئے ہیں۔ بحالی و وقار اور عزت نفس کی اس جنگ میں نوجوانوں کو محنت و جان فشانی سے کام کرنا ہے۔ یہ جنگ نظریاتی طور پر شروع ہو چکی ہے۔ عملاً اسے وقوع پذیر ہونے میں خواہ کتنا ہی عرصہ لگے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ہونے کے رہے گی۔ قدرت کا یہ اہل قانون ہے کہ تاریخ اپنے قرضے چکاتی رہی ہے۔ خصوصاً وہ قرضے جن کا تعلق خونریزی اور بے آبروئی سے ہو۔ انسان ایسے قرضوں کی ادائیگی سے اتفاق کرے یا نہ کرے قدرت کا انتقامی رد عمل کبھی ٹل نہیں سکتا۔

وقار اور عزت نفس کے تعلق کی یہ لڑائی محض اسلحہ اور بارود سے نہیں لڑی جائے گی بلکہ اس میں ہمیں اپنے ہاں کے روحانی، ثقافتی، علمی، اقتصادی اور مادی بارود خانے کا ہر مضبوط ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی۔ نئی نسل کو اس عظیم مقصد کے لیے تیار کرنے میں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں تنہا کچھ نہیں کر سکتیں۔ نوجوان کی اصلی تجربہ گاہ اس کا گھر یا بازار ہے۔ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں طلبہ اپنے ایسے اوقات بسر کرتے ہیں جن کا تعلق تعلیم سے نہیں۔ انہی جگہوں پر وہ زندگی کو اصلی شکل میں دیکھتے ہیں اور اپنے اثر پذیر ذہنوں کو درست یا نادرست سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ مذکورہ ماحول طلبہ کو وہ چیز سکھاتا ہے جو وہ جماعت کے کمرہ یا کتابوں کے مطالعہ سے نہیں سیکھ سکتے۔ تعلیم دراصل پوری زندگی پر پھیلا ہوا ایک مسلسل عمل ہے جس سے ہر انسان زندگی بھر کچھ سیکھتا اور کچھ سکھاتا رہتا ہے۔

طلبہ کا مسئلہ

آج کل لوگ طلبہ کا مسئلہ زیر بحث لاتے ہیں اور نئی نسل کی تباہی کا اکثر شکوہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ غلط انداز فکر ہے۔ دراصل طلبہ سے منسوب کی گئی تباہی کے ذمہ دار ہم عمر رسیدہ لوگ ہیں جو ان کے بزرگ کہلاتے ہیں۔ ہم ہی ان کے لیے الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ شخصی طور پر گھروں میں، جماعتی طور پر بازار میں اور بین الاقوامی طور پر پوری دنیا میں انسانیت من حیث الکل کچھ نئی قدروں کی تکمیل میں مصروف ہے اور بد قسمتی سے منافقت، حکمت عملی کے لباس میں، تجارت مالی امداد کے لباس میں، جنگ صلح کے لباس میں اور امن طاقت کے لباس میں سامنے آ رہے ہیں۔ اب خود سوچے کہ طلبہ انسانی بد کرداری کے اس مکڑی کے جالے میں پھنس جائیں تو ان کے حساس ذہن کا رد عمل کیا ہوگا۔ قدیم زمانہ میں نوجوان کا رد عمل اپنے ناپاک ماحول کے خلاف اتنا شدید ہوتا تھا کہ انسان عام حالات میں اس پر یقین کرنے سے انماض کرتا ہے۔ آج اگر وہی رد عمل شدت کا جامہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے تو اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔

انبیائے کرام کی مثالیں

حضرت یوسف علیہ السلام نے عفتوانِ شباب کا زمانہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بسر کیا کیونکہ وہ اپنے سردار کی بیوی کے حیوانی جذبات کے سامنے ہٹکنے پر رضا مند نہ ہوئے اور شدید ردِ عمل کے طور پر بھاگ نکلے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوانی کا پورا عرصہ جلاوطنی کی تکالیف میں گزارا اور بنی اسرائیل کی فتنہ پرداز قوم کے ہمراہ صحراؤں میں گھومتے رہے یہاں تک کہ تھک کر پتھر ہو گئے۔ ان پر بڑھاپا آن پہنچا۔ حضرت عیسیٰ کو اپنے بعض حواریوں کی غداری کی وجہ سے ہولی پر چڑھائے جانے کا حکم دیا گیا جب ان کی عمر صرف 33 سال تھی۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے معاشرے کی برائیوں سے نفرت کا اظہار کیا جو ان کے ماحول میں پائی جاتی تھیں اور غارِ حرا میں تنہا رہنا پسند کیا۔ چنانچہ آپؐ کی جوانی کا قیمتی حصہ تنہائی کے عالم میں، وجدِ الہی کی نذر ہو گیا حتیٰ کہ آپؐ کی عمر چالیس سال ہو گئی۔ بہت سے مفکرین اور دانشوروں نے جو انسانیت کے لیے روشنی اور سکون کا موجب بنے اپنی جوانی معاشرے کے برخلاف شدید ردِ عمل کی کھٹالی میں جلا دی۔ آج کا نو جوان طالب علم بھی اپنی روایات کا سامنا کر رہا ہے۔ معاملے کی اصل روح وہی ہے اگرچہ اس کا طریق کار بدل دیا گیا ہے۔ اس وقت نو جوان اپنے ماحول کی منافقت، دوڑخی اور غیر مخلصانہ طریق کار کے برخلاف بغاوت کرتا ہے اور ”ہی“ بن جاتا ہے اور نسبتاً امیر سوسائٹیوں میں نشہ آور چیزوں کے استعمال کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ غریب اور غیر مستغل مزاج طبقوں میں سیاسی یا عملی تشدد کو فروغ دیتا ہے۔ نو جوان کا یہ ردِ عمل اپنی مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کرنے کا ایک جدید طریقہ ہے جو ہمارے قول و فعل کے تضاد میں ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مذہب بطور علاج کے

اس مہلک عارضے کا علاج نو جوانوں پر مسلط کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں خود اپنے اوپر مسلط کرنا چاہیے۔ یہی ایک صداقت ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لیے ہم نے اس پورے المیہ کو جدید نسل کی تباہی کا نام دے دیا ہے۔ نو جوان کے ذہن کو اس خطرناک بیماری سے بچانے کا واحد حل یہی ہے کہ مذہب کی حقیقی روح ہماری روزمرہ زندگی میں اس طرح نفوذ کر جائے جیسے انسانی جسم کی رگوں میں خون رواں دواں ہے۔ یہ چیز کہنا آسان ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہے۔ بہر حال حکومت نئی تعلیمی پالیسی کے ذریعے اس پر عمل پیرا ہونے کے خلوص سے قدم اٹھا رہی ہے اور یہ ہماری کوشش سراسر دیانتداری پر مبنی ہے۔ مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ ہم اکیلے اس فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے میں ان تمام حضرات کا دست تعاون قبول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوں جو ہماری مدد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس پر رضا مندی سے آمادہ ہیں۔

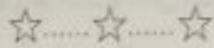
طلبہ کو مفید مشورہ

جب طالب علم اپنی درس گاہ کی محدود چار دیواری سے باہر آتا ہے تو اسے زندگی کے ایسے نشیب و فراز کا سامنا کرنا

پڑتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میں یہاں طلبہ کو اپنی تعلیمی زندگی کی دو ایک چیزیں عرض کرتا ہوں جن پر میں نے عمل کرنے کی کوشش کی اگرچہ وہ کوشش بہت کامیاب اور مکمل نہ تھی مگر پھر بھی اُن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور وہ میرے لیے بہت کچھ امن و سکون فراہم کرنے کو موجب بنیں۔

- 1- طلبہ کو چاہیے کہ وہ سکول یا کالج میں محنت سے حاصل کی ہوئی معلومات گھر پہنچ کر اچھی طرح دہرائیں۔
- 2- کسی شخص کی غیر حاضری میں صرف وہی بات کرنے کی عادت ڈالیں جو آپ اس کے روبرو آسانی سے کہہ سکتے ہیں یعنی چغلی کھانے اور جھوٹ بولنے سے بچیں۔
- 3- اپنے خیالات، عمل اور طرزِ بیان میں توازن اور یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کریں..... اگرچہ مندرجہ بالا سیدھے سادے اصولوں میں سے کسی ایک پر یا تمام پر مکمل نہیں، جزوی طور پر بھی عمل کریں تو وہ دیکھیں گے کہ زندگی ان کے لیے آرام دہ اور موجب اطمینان بن جائے گی وہ اپنی ذاتی وجاہت اور انفرادیت میں صحیح جاذبیت پیدا کر لیں گے بشرطیکہ راستی اور سچائی کو خوف و ہراس سے مغلوب ہو جانے کا موقع نہ دیں۔

ماہنامہ ”الجامعہ“ لاہور مئی 1972ء



طلباء اور سیاست

آپ جانتے ہیں یہ ایک خاردار موضوع ہے لیکن میری آرزو ہے کہ آپ کو بھی اپنے ساتھ اس وائیلڈ خار میں لے چلوں تاکہ اس سفر کے آخر میں ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ منزل پر کوئی پھول ہے یا نہیں۔

میرے جواں سال دوستو! میں طلباء کے موجودہ مسائل پر نہ تو زیادہ گفتگو کر سکتا ہوں نہ ہی میں ان کے مسائل پر کچھ زیادہ معلومات کا اظہار کر سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں ایک بات ہمارے اور آپ کے وقتوں کی مشترکہ ہے، آپ یہ نصیحت مسلسل سنتے چلے آ رہے ہوں گے کہ ”طلباء کو سیاسیات میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔“ اگر آپ سوچتے سمجھتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس قابل قدر نصیحت کو یقیناً پسند کرتے ہوں گے اور ادھر ادھر منہ پھیر کر اس پر ہنستے بھی ہوں گے۔ کم از کم آج سے بیس برس پہلے جب میں بھی آپ کی طرح ایک طالب علم تھا، اس نصیحت پر ضرور ہنسا کرتا تھا۔ جب بھی کوئی بڑا عہدیدار اور معزز آدمی جو ظاہر ہے کہ اونچا آدمی بھی ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں کنوینشن اینڈ ریس پڑھنے آیا کرتا تھا اور یہ پرانی گھسی پٹی بات دہراتا تھا کہ آج کے طالب علم کل کے شہری ہیں اور طلباء قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں لہذا انہیں اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر صرف کرنی چاہیے اور ہر طرح کی سیاست سے کلیتہاً اجتناب کرنا چاہیے تو میں ان کی اس نصیحت اور مشورے کو دل سے نکال کر انہیں ایسے برخود غلط احمق اور بد طبیعت سمجھتا تھا جو مہمل اور غیر دلچسپ زندگی گزار رہے ہیں اور یہ طے کیے ہوئے ہیں کہ ہمیں بھی ایسی ہی غیر دلچسپ اور بے سود زندگی گزارنی چاہیے۔

لیکن میرے دوستو! میں برخود غلط آدمی نہیں بننا چاہتا اور نہ ہی احمق کہلوانا چاہتا ہوں۔ ان چند وجوہ اور ایک اور وجہ کی بناء پر میں نہ تو آپ سے فرسودہ باتیں کروں گا اور نہ ہی وہ گھسی پٹی نصیحت کروں گا کہ طلباء کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے بلکہ اس کے برعکس میں تو پُر زور انداز میں یہ کہوں گا کہ طلباء سیاست سیکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس بات پر مامور ہوتے ہیں کہ سیاست کو عملی طور پر سیکھیں۔ اس طرح ضروری ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے بلکہ ضرورت پڑے تو انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ پورے ہوش و خرد کے ساتھ مؤثر طور پر سیاست میں حصہ لیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ”سیاست ہے کیا؟“ میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس کا صاف جامع اور مانع جواب دے سکوں لیکن میں آپ کے سامنے چند ایک وضاحتیں کروں گا جو آپ کو بتائیں گی کہ یہ لفظ مختلف حالات اور کوائف میں گھرے ہوئے انسانوں کے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔

فرض کیجیے ایک دوست سے کسی ذاتی معاملے پر بات چیت کر رہے ہیں اور اثنائے گفتگو میں آپ اسے کہتے ہیں ”یار سیدھی سادی بات کرو اور میرے ساتھ سیاست نہ لڑاؤ۔“ تو آپ کا خیال ہے آپ کے اس جملے کا رد عمل اس پر کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ اسے آپ کے منہ سے یہ سن کر دکھ ہوگا اور وہ اس بات کا بُرا مانے گا سو اس سیاق و سباق میں لفظ سیاست کے معنی دورِ فنی برتنے اور فریب دہی کے فن کے ہوں گے۔

اگر آپ ایک ہوشیار آدمی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ بہت شریف آدمی ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ ذرا سیاست بھی برتتا ہے تو یہ کہہ کر آپ اس کے کردار اور منصف مزاجی پر شک کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اگر آپ ایک افسر سے کہتے ہیں کہ وہ ایک اچھا افسر ہے لیکن ذرا پولیٹیکل قسم کا ہے تو آپ کا یہ جملہ اس افسر کی قوت فیعلہ اور سیاست مندی کی تعریف نہیں ٹھہرے گا اس کے برعکس یہ اس افسر کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دے گا اور ان تمام برائیوں کی نشاندہی کرے گا جو ایک با اختیار افسر میں ہو سکتی ہیں۔

جب کوئی معاشرتی یا ثقافتی تنظیم بد نظمی کا شکار ہو جاتی ہے اس کا ڈھانچا درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کے فنڈ میں گزربز ہو جاتی ہے تو اس صورتحال پر سب سے مقبول اور فی البدیہہ تبصرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اندرونی سیاست کا شکار ہو گئی ہے۔ جب طلباء ایچی ٹیشن شروع کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، ناراضگی کے نعروں لگاتے ہیں، کمرہ امتحان سے واک آؤٹ کر جاتے ہیں، کچ بکشیوں اور تنازعوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو دوسرے کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ہوتی ہیں، جب وہ تشدد پر اتر آتے ہیں اور نظم و ضبط کو خیر باد کہہ کر فضا میں شک و شبہ پیدا کر دیتے ہیں تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ طلباء خطرناک سیاست میں پڑ گئے ہیں۔

خود سیاست کے میدان میں بھی سیاست کی اصطلاح کو اس کے مروجہ معنی اس وقت نہیں ملتے جب وہ سیاست قیمری ہوتی ہے بلکہ سیاست کو سیاست اس وقت کہا جاتا ہے جب سیاستدان ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ سیاسی فضا میں تلخیاں پیدا کرتے ہیں، آگ اور شعلے اگلتے ہیں، ریشہ دوانیوں کو ہوا دیتے ہیں اور وفاداری، ذمہ داری، راست روی کے علی الرغم سرگرمیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیوں ”سیاست“ کے سیدھے سادھے اور بے ضرر لفظ نے جس کے لغت میں معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ”یہ ایک سائنس ہے، ایک فن ہے حکومت، امور مملکت زندگی اور اصول کا“۔ لیکن پتا نہیں اس نے ہماری زندگی میں دھوکا دہی، ایچی ٹیشن، دغا بازی، تشدد، ریا کاری، بددیانتی اور بد طبیعتی کے معنی کیوں دھار لیے ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ یہ جواب ہماری غلامی کے دور میں مضمر ہے۔ ایک سو برس سے زائد عرصہ تک آزادی فکر اور سرگرمی عمل کے میدان مسدود رہے اور ہر وہ فعل مطعون رہا جو ہمارے سامراجی آقاؤں کے پسندیدہ خاکے میں پورا نہ اترتا۔ ہماری سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور روحانی تجدید کی تحریک کے رہنما طویل عرصہ تک محض پیشہ وراہی ٹیڑھ کھلاتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ غیر ملکی حکمرانوں کے نقطہ نظر سے ایک ایچی ٹیشن ہی تھا اور وہ چیز جو برطانیہ کے لیے تریاق تھی ہمارے لیے زہر ہلا بل ٹھہری۔ سیاست کے بارے میں ان متضاد نظریوں سے برصغیر پاک و ہند میں سیاسی سرگرمیوں کو دو مختلف معنی دیے۔ ہماری غلامی کے زمانے میں منفی رویہ، مخالفت برائے مخالفت، سیاسی ریشہ دوانیاں اور قانونی نظم و ضبط کو تہ وبالا کرنا یہ چند ہتھیار تھے جو ہمارے رہنماؤں کو بہت مرغوب رہے۔

آزادی اپنے ساتھ نئے تقاضے لے کر آئی۔ اس نے پرانے طور طریقوں اور پرانی اقدار کو مکمل طور پر بدلنا چاہا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ تخریب کی قوتیں تعمیر پر صرف ہوں اور حصول آزادی کی جدوجہد اپنا رخ موڑ کر قومی استحکام اور ملکی سلیمت کو اپنا رخ نظر بنائے۔ منفی جذبات کی جگہ ایجابی جذبات لیں اور حقوق منوانے کی کوششیں ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے کی جائیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آزادی کے یہ تقاضے پورے نہ ہو سکے اور سیاسیات نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ نظامی کا عذاب تو اٹھ گیا تھا لیکن تاریک زمانے کی روایات نہ بدل سکیں، اس صورتحال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اقتدار حاصل کرنے کی سیاست نے بے حد قابل نفرت اور نہایت پرخطر کردار ادا کیا اور بارہ برس تک یہ افسوسناک صورتحال ہمارے

ملک میں قائم رہی اور اس کی بدولت ہم اقتصادی بد حالی، اخلاقی اور انتظامی خرابیوں میں پھنس گئے۔ یہ سچی وہ صورتحال جس نے 18 اکتوبر 1958ء کے انقلاب کو منطقی اور ناگزیر ضرورت بنا دیا لیکن ہمارا یہ انسانیت سے معمور اور بغیر خون خرابے کا انقلاب بھی بعض لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ذرا ان وسیع مفادات کی طرف دیکھیے جو اصلاحات اور تعمیر نو کے پروگرام کی زد میں آ گئے ہیں۔ سیاستدان اپنی سلطنت اقتدار سے محروم کر دیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ ہی سیاستدانوں کے ہزاروں ڈٹھو اور خوشامدی بھی اپنی نفع بخش تجارت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار اپنی بے پناہ طاقت اور جبروت کے ایوانوں سے نکل کر ایک عام آدمی کی سطح پر آ گئے ہیں۔ وہ پیشہ ور موقع پرست جو اپنے قلم یا زبان کی ایک جنبش کی دھمکی سے حکام کو ہراساں کیے رکھتے تھے اب یہ جان چکے ہیں کہ ان کے جادو کی چھتری اپنا اثر کھو چکی ہے۔ کئی ایک بدعنوان اور نا اہل افسر جا چکے ہیں اور جو باقی رہ گئے ہیں راہ راست اختیار کرنے پر مجبور کیے جا رہے ہیں۔ نفع اندوزی کے مریض تاجر، بے ایمان، صنعت کار، مشقلم سنگمر، زراندوز اور ٹیکس بھم کرنے والے سب کے سب اب معطل ہو چکے ہیں۔ جھوٹے پیر اور بد معاش سجادہ نشین جو مقدس درسگاہوں کی تجارت کرتے تھے اور جو خدا کے نام کو غلط استعمال کرتے تھے اب ہر لحاظ سے ختم ہو چکے ہیں۔

کسی طرح بھی یہ مفادات معمولی نوعیت کے نہیں تھے یہ ہمارے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور روحانی نظام میں سرطان کی غیر مرئی جڑیں بنے ہوئے تھے۔ اصلاحات کی جراحی نے وقتی طور پر اس سرطان کی روک تھام کر لی ہے لیکن اس کے دوبارہ پیدا ہو جانے کا خطرہ ابھی تک باقی ہے۔ ہر دن اور ہر لمحے خفیہ طور پر سرگوشیوں کی زبان میں ہر ممکن ذریعے سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ پرانا نظام پھر لایا جائے جس نے بُرے لوگوں کے ہاتھ میں ایک ایسا ڈنڈا دے دیا تھا جس سے ہمارا سارا ملک خوف و ہراس میں مبتلا تھا۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ پرانا نظام بُرا نہیں تھا بلکہ جن لوگوں نے اسے چلایا وہ بُرے تھے۔ یہ دلیل بڑی بُری ہے میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً جو لوگ ہماری سیاسی زندگی میں آتے رہے ان کی اکثریت بنیادی طور پر اچھی تھی لیکن سیاسی نظام ایسا تھا جس میں ایک شاطر بیس نیک نفس آدمیوں سے یوں کھیل سکتا تھا جیسے ملی چوہوں سے کھیلتی ہے۔ دیانتداری، آزاد منشی اور نیک نیتی کے سامنے کوئی راہ ہی نہ تھی کہ وہ اس انفرادی شاطری کا مقابلہ کر سکتی جس کو غنڈہ گردی اور پارٹی بازی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پرانی زندگی کی واپسی کے مدعی وہ لوگ ہیں جنہیں اب اپنی طاقتور اور اس موقع سے منفعت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ وقت اور تجربے نے اسے گھلم گھلانا کام اور قابل مذمت ثابت کر دیا ہے۔ ان کے گزشتہ بدترین نظام کی تجدید کے مطالبے سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ غلط حکومت اور بدکردار سیاستدانوں کا بھوت ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی بدرویں ہمیں اب تک ہراساں کیے ہوئے ہیں یہ وہ نازک وقت ہے جبکہ آپ کے یعنی طلباء کے عمل پیرا ہونے کا موقع ہے۔

آئین کمیشن نے ایک سوال نامہ اس غرض سے جاری کیا ہے کہ کون سا نظام ہمارے لیے مفید ہے۔ آپ نے اس کالج میں حال ہی میں اس سوال پر غور کرنے کے لیے ایک سیمینار بھی منعقد کیا تھا لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ میرے

نوجوان دوستو! میں آپ سے اور آپ کی وساطت سے تمام ملک کے طلباء سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس اہم معاملہ پر اور زیادہ توجہ دیں اور سلامتی کی کوئی راہ نکالیں اب جبکہ آپ گرمیوں کی چھٹیوں پر جانے والے ہیں اپنی چھٹیوں کے پہلے دن پوری دنیا کے مختلف نظام ہائے مملکت کے مطالعے پر صرف کیجیے اور اس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر کے پوری دیانتداری اور حب الوطنی سے فیصلہ کیجیے اور اپنے اس فیصلہ سے آئینی کمیشن کو مطلع کر دیئے۔ یہ ہے وہ پہلا اور ضروری سیاسی نکتہ جس پر تعلیمی تربیت کی روشنی میں آپ کو غور کرنا ہے، اپنے ملک کے آئینی مسائل پر غور کرتے ہوئے آپ ان تین نکات کو ضرور پیش نظر رکھیے۔

1۔ یہ یاد رکھیے کہ ہر سوسائٹی میں اور بالخصوص ہماری سوسائٹی میں ہمیشہ ایک طبقہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو ہمارے سابق وزراء، اعظم، وزراء اور سربراہان مملکت جیسا ہوتا ہے، اس طبقے کی راہ میں اپنی ذات سے ماورا جو چیز آتی ہے وہ اسے تاخت و تاراج کر کے چھوڑتا ہے یہ طبقہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن کوئی ایوب خان ہر بار نہیں ہوتا کہ جو اس بگاڑ اور پراگندگی کو نرمی اور خوش اسلوبی سے ٹھیک کر سکے۔ پس یہ یقین کر لیجیے کہ نظام مملکت کوئی سا بھی ہو بہر حال اس میں مٹھی بھر بڑے آدمیوں کو یہ موقع نہ مل سکے کہ وہ بڑی تعداد میں اچھے آدمیوں پر بلیک میلنگ، غنڈہ گردی اور سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعہ چھا جائیں۔

2۔ نیا نظام آپ کو جو کہ کل کے شہری ہیں بہر صورت یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ آپ ہر سطح پر عوامی معاملات میں پوری آزادی اور دیانتداری کے ساتھ دخل دے سکیں اور ایسا کرنے میں آمجور نہ ہوں کہ کسی فرد یا جماعت کا سہارا لے سکیں یا کوئی فرد یا جماعت آپ کو مجبور کر سکے، اپنے نظریات کا محکوم بنا سکے۔

3۔ جو بھی نظام حکومت ہو بہر حال مضبوط اور ذمہ دار حکومت کی ضمانت دے۔ ایسی حکومت جو خفیہ ہاتھوں کی حرکتوں اور جماعتی سیاست اور سیاسی جوڑ توڑ سے ٹوٹی پھوٹی نہ رہے اور مضبوط مفاد رکھنے والے افراد گروہوں کا مقابلہ کر سکے۔ اب سیاست کا دوسرا نکتہ جس سے میں آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ تعلیمی اصلاحات کا نفاذ اور دوسرا پنجابالہ منصوبہ یہ دونوں چیزیں ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی میں زبردست اہمیت رکھتی ہیں۔ آپ ان کے ادراک میں آگے بڑھیں گے شاید آپ اسے ایک مستحسن تجویز سمجھیں کہ پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں ان منصوبوں کو ایک ضروری پرچے کی حیثیت سے شامل کرا لیا جائے۔

آپ کا احساس درست ہے کہ ہماری سوسائٹی میں معلم کا مقام وہ نہیں جو اسے ملنا چاہیے ذاتی طور پر میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب میں ایک سول سرونٹ کی حیثیت میں ایک معلم سے کم تنخواہ پاؤں گا۔ اگر میں کبھی غلطی کرتا ہوں تو ایک افسر کی حیثیت سے ایک یا دو کیس خراب کر سکتا ہوں لیکن اگر معلم غلط راہ پر پڑ جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پوری قوم کی قوم کو تباہ کر ڈالے اب جب کہ ملک میں ہمہ گیر اصلاحات ہو رہی ہیں آخر یہ کیوں نہ ہو کہ دس برس کے عرصہ میں معلم کی تنخواہ کا سکیل بھی مناسب بنا دیا جائے اور اگر ہم ایک ایسا مضبوط اور مستحکم سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اصلاحات کے سلسلے کو صحیح رفتار سے چلا سکے اور ہم پرانی سیاست کے گڑھے میں گرنے سے بچ رہیں تو ضرور اس مرحلہ تک پہنچ جائیں گے۔

ہفت روزہ "لیل و نہار" 10 جولائی 1960ء

ایس ایس اینوٹریا

جب ایس ایس اینوٹریا نے نیپلز کی بندرگاہ سے لنگر اٹھایا تو صبح کے دس بجے تھے۔ مسافروں میں بہت سے امریکن اور یورپین سیاح تھے، کچھ عرب طالب علم تھے جو مغربی درسگاہوں سے ڈگریاں حاصل کر کے گھر واپس جا رہے تھے، کچھ مصری اور شامی تاجر تھے۔ ایک گروپ پاکستانی رؤسا کا تھا جس کے ساتھ بڑی بڑی شلواریں اور لمبی لمبی قمیصوں والے ملازم تھے، چند فرانسیسی نرسیں تھیں اور دو رومن کیتھولک پادری تھے جو شام کے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے جا رہے تھے۔ چاکلیٹ رنگ کے لمبے لمبے لہادوں میں یہ پادری بے حد سنجیدہ اور پُر وقار نظر آتے تھے اور اگر وہ صبح شام فرانسیسی نرسوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نہ پیا کرتے تو ان پر بڑی آسانی سے رہبانیت کا دھوکا ہو سکتا تھا۔

جہاز روانہ ہوا تو اکثر مسافر ڈیک کے جنگلوں پر بچکے ہوئے کھڑے رہے اور یونہی بے معنی نگاہوں سے بندرگاہ کو دیکھتے رہے۔ چند لوگ جو اپنے عزیزوں یا دوستوں کو چھوڑنے آئے تھے الوداعی انداز سے رومال ہلانے لگے۔ اطالوی قلی بے اعتنائی سے کھڑے رہے کیونکہ انہیں مسافروں کی نسبت ان کے سامان سے زیادہ دلچسپی تھی۔ پاکستانی رئیسوں کے شلواریں اور قمیصوں والے ملازم چھاتیاں ابھار کر ڈیک پر گھومنے لگے اور مسافروں میں سے عورتوں کو چن چن کر بڑے جذبے سے انہیں گھورنے لگے۔ اوپر والے ڈیک پر ان کے آقاؤں نے دُور بینیں لگالیں اور بندرگاہ کی بجائے جہاز کے مسافروں کا بغور جائزہ لینے لگے۔

جہاز کے روانہ ہوتے ہی پاکستانی آقا اور ان کے ملازمین بڑی گرمجوشی کے ساتھ اپنے رسمی انداز میں فرانسیسی نرسوں سے معاشرت فرمانے لگے۔ نرسوں نے پہلے تو کچھ رسماً کچھ تکلفاً کے ساتھ اخلاق برتا لیکن جلد ہی انہیں ڈرانے لگا اور وہ ان سے گریز کرنے لگیں لیکن اس کے باوجود رؤسا نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا تو نرسوں نے جہاز کے کپتان کے پاس شکایت کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیک پر ہمارے پاکستانی بھائیوں کی آمد و رفت بہت کم ہو گئی اور وہ نرسوں کے گرد گھومنے پھرنے کی بجائے اب بار میں بیٹھ کر اپنا غم غلط کرنے لگے۔

اس حادثے نے اچانک ایک پاکستانی رئیس کی نظر بصیرت کو وا کر دیا اور وہ بڑے جذبے اور درد کے ساتھ ملت اسلامیہ کے انتشار اور عیسائیوں کے قومی اتحاد کا موازنہ کرنے لگے۔

”ذرا سوچئے تو سہی“۔ وہ مجھے ایک طرف لے جا کر گلہ کرنے لگی۔ ”بھلا ہم نے ان کا کچھ توڑ لینا تھا کیا، یہی گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کی بات ہی تو تھی نا، لیکن سالیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا کپتان کے پاس جا کر شکایت کر دی۔ اب یہ سالیوں ساری ساری رات پادریوں کے ساتھ ناچتی ہیں، شراب پیتی ہیں، عاشقی لڑاتی ہیں، لیکن اس کھلم کھلا عشق بازی سے جہاز کے اخلاق پر ذرا بھی داغ نہیں لگتا یہ سب سارے عیسائی جو ہوئے ہم مسلمانوں کی طرح جو ہر

میں اس کی اس طرح خطرناک فتح کا دندان شکن جواب دینے کے لیے ہمارے پاکستانی بھائیوں نے کھلم کھلا جہاد کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ شلواریوں اور قمیصوں والے ملازمین کی یہ ڈیوٹی لگی کہ وہ ایک کی ہالکونی کے عین درمیان میں کھڑے ہو کر نماز قائم کیا کریں۔ باقی نمازوں کے متعلق تو خدا بہتر جانتا ہے لیکن مصر اور مغرب کے وقت جب ہالکونی پر لوگوں کے ٹہلنے کا وقت ہوتا تھا، ملازمین بڑی پابندی سے نمازیں پڑھنے لگے۔

ہر نماز کے بعد کافی دیر تک بڑے زور شور اور جذبے سے اس بات پر چیخ و پکار ہوتی کہ نماز کے وقت لاؤڈ سپیکر پر گانا کیوں ہو رہا تھا۔ مسافر نمازیوں کے سامنے سے کیوں گزرے۔ جہاز کے کپتان نے اس سلسلے میں ابھی تک ہدایات کیوں جاری نہیں کیں۔

اسلام اور ایمان کا یہ ولولہ انگیز مظاہرہ اکثر سیاحوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور غالباً ان کو یہ گمان بھی گزرا ہو گا کہ نماز کے بعد گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا اور چلاتا بھی مسلمانوں کی عبادت کا ایک اہم جزو ہے۔ مجھے یہ فکروا من گیر تھی کہ اگر ان ایمان کی حرارت والوں نے ڈیک پر ٹہل ٹہل کر ڈھیلوں کے ساتھ استغفار مانے کا مثل بھی شروع کر دیا تو کون مائی کا لال انہیں اس بات سے روک سکتا تھا؟ لیکن خدا کا شکر ہے کہ طہارت کا یہ اصول ان کی روشن ضمیری کی حد سے باہر ہوا اور وہ فقط دو وقت کی نماز کا سہارا لے کر اسلام کا بول بالا کرنے میں مصروف رہے۔

یہ جہاد تو ملازموں کا جہاد تھا ان کے آقائے نامدار اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے ڈرائنگ روم کے اندر بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک اور انداز سے برسرِ پیکار تھے ذرا ذرا سی دیر کے بعد شور و غوغا بلند ہوتا کہ ہمارے سامنے سوڑ کا گوشت کیوں آیا۔ اس پلیٹ سے چربی کی بو آ رہی ہے، یہ پیالہ صاف نہیں، یہ چمچ گندا ہے، اس ٹینکین پر یہ داغ کیسے ہیں۔

اس ہنگامہ آرائی پر دوسرے مسافر صرف حسبِ توفیق ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن جس فرمانبرداری سے اطالوی بیرے ان کی ہرجائز و ناجائز خواہش کو بلا چون و چرا پورا کر رہے تھے اسے دیکھ کر اطالوی ذوقِ میزبانی پر فخر کرنے کو جی چاہتا تھا اگر خدا نے ان اطالوی بیروں کو دُعا میں بھی عطا کی ہوتیں تو بے شک وہ اپنے پاکستانی مہمانوں کی کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑی وفاداری سے انہیں ہلایا کرتے۔

فرائیسی نرسیں پشیمان تھیں کہ ان کی وجہ سے اسلام کے مذہب کو خواہ خواہ اس قدر جوش میں آنا پڑا نہ جانے کیوں مجھے یہ الجھن تھی کہ اگر کوئی پوچھے بیٹھا کہ تم کس ملک کے باشندے ہو تو کیا جواب دوں گا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اس نوعیت کی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

کھانے کی میز پر میرے ساتھ ایک امریکن پروفیسر اور اس کی بیوی بیٹھا کرتے تھے دونوں بہت خوش اخلاق اور ہنس مکھ تھے۔ وہ مصر، پاکستان، ہندوستان اور افغانستان کی سیاست اور ثقافت پر کتاب لکھنے کے لیے سیر و سیاحت کر رہے تھے۔ پہلے وہ کرید کرید کر پاکستانیوں کے متعلق سیاسی، معاشی، اور تمدنی سوالات پوچھا کرتے تھے لیکن جب یہ ہنگامے شروع ہوئے تو ان کی دلچسپی میں نمایاں کمی ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب سوال پوچھنے حاجت نہ رہی ہو چونکہ اب ہمارے پاکستانی رُوسا اور ان کے ملازم بڑی محبت سے اپنے وطن کا نام روشن کرنے میں شدت سے مصروف تھے۔

البتہ یہ ماحول دونوں رومن کیتھولک پادریوں کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا پہلے انہوں نے سہمی ہوئی فرائیسی

نرسوں کو اپنے سایہ عاطفت میں پناہ دی، پھر ان پر اچھی طرح قبضہ جمایا اور اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے تبلیغی مشاغل کی طرف توجہ دینا شروع کی۔

پادری مسافروں کو پکڑ پکڑ کر عبرت دلانے لگے۔ ”خداے بزرگ کا شکر ادا کرو کہ تم انسانیت کا تاج اور حضرت یسوع کے پیر و کار ہو۔ فرانسیسی نرسوں کے ساتھ شراب پینے، ناپنے اور خوش مذاقیوں سے فارغ ہونے کے بعد پادری شکار کی تلاش میں ڈیک پر منڈلانے لگتے اور دو چار مسافروں کو پھانس کر دیر تک انہیں اپنے چند نصائح سے سرفراز فرماتے رہتے۔ گمراہی اور بے راہ روی کا عبرتناک انجام واضح کرنے کے لیے وہ بڑی بے تکلفی سے پاکستانی مسافروں کا حوالہ دیا کرتے۔

ایک روز لنچ کے بعد اچانک ایک پادری نے مجھے گھیر لیا، بڑے اصرار کے ساتھ وہ مجھے لاؤنج میں لے گیا جہاں دوسرے پادری صاحب فرانسیسی نرسوں کے درمیان بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے۔ نرسوں نے پہلے تو سہمی ہوئی فاختاؤں کی طرح مجھے مشتبہ نظروں سے گھورا لیکن کچھ دیر کے بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں انہیں زبردستی اٹھا کر اپنے کیمپن میں لے جانے کی کوشش نہیں کر رہا تو وہ گھل مل گئیں اور باتیں کرنے لگیں۔

باتوں ہی باتوں میں انہوں نے پاکستان کے متعلق کئی ایک پراسرار انکشافات کیے جو غالباً پادری صاحبان کی وساطت سے انہیں مہیا ہوئے تھے۔ اگر میں کسی بات کی تردید کرتا تھا تو وہ بڑی معصوم بے بسی سے کہتیں: ”ہولی فادر نے تو ایسے ہی کہا تھا۔“

نرسوں کا خیال تھا کہ نماز کے وقت پاکستان کی سڑکوں پر سارا ٹریفک بند ہو جاتا ہے لوگ گلی کو چوں میں بازووں میں ہر جگہ نماز قائم کر کے صفوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نماز کے علاوہ فرانسیسی نرسوں کو یہ بھی یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستانی لوگ عورتوں کے بہت رسیا ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ ہر سچے مسلمان پر عائد ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت چار بیویوں سے باضابطہ شادی کرے اور باقی جتنی راہ چلتی عورتوں کو بھی چاہے اٹھا اٹھا کر لونڈیاں بنا کر گھر میں ڈال لے۔ پہلے عرب ممالک میں بھی یہ رسم عام تھی لیکن جہاں جہاں رومن کیتھولک پادری تہذیب اور اخلاق کی روشنی لے کر پہنچ گئے ہیں وہاں یہ وہاں کم ہوتی جا رہی ہے۔

”آپ اپنے ملک میں کسی ہولی فادر کو روشنی پھیلانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟“ ایک نرس نے ازراہ ہمدردی مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جواب میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان شاندار روایات کا ذکر کیا جن سے مسیحی مشنری کئی سو سال سے ہندوستان اور پاکستان کے ظلمت کدوں کو بقہ نور بناتے آئے ہیں۔ میں نے ثبوت کے طور پر لاہور کے فورمن کرچین کالج کی مثال پیش کی اور کہا کہ وہ ہمارے ملک کی ایک مایہ ناز درس گاہ ہے۔

کالج کا ذکر سن کر ایک پادری سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری تھی اور وہ دیر تک وہاں کے پروفیسروں کی تحویلیں اور ان کے رہنے سہنے کے انتظامات کے متعلق تفصیلی استفسارات کرتے رہے۔ کالج کے پرنسپل کا نام اور پتہ انہوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا۔ پادری صاحب کا انداز دیکھ کر مجھے اپنے شہر کے ایک مولوی صاحب یاد آ گئے۔ مولوی صاحب کا قاعدہ تھا کہ مسجد سے فارغ ہو کر وہ صبح و شام گلی کو چوں کے چکر کاٹتے رہتے تھے اگر کسی سے پلاؤ یا زروہ کی خوشبو آتی تو وہ ٹھٹھک کر رُک جاتے اور بڑی سنجیدگی سے چیمیں بھییں ہوا کرتے کہ اگر اس گھر

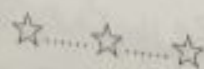
میں شادی یا چالیسویں کی تقریب ہو رہی ہے تو اب تک ان کے پاس دعوت نامہ کیوں نہیں پہنچا۔ اس وقت پادری صاحب کی بھی حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی کہ اگر لاہور میں عیسائی مبلغین علم و ہدایت کی شمعیں جلانے کا کام کر رہے ہیں تو اب ان کی ایم اے کی ڈگری کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔

ایس ایس اینو تریا بڑی مست خرامی سے چلا جا رہا تھا۔ سمندر غیر معمولی طور پر پرسکون تھا۔ سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف نیلگوں لہریں زرکار شامیانوں کی طرح جھلملہا رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں چاندنی پورے شہاب پر تھی۔ رات کے ستارے میں بار بار یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی طلسماتی سفینے پر بیٹھے ایک ایسی دنیا میں سفر کر رہے ہیں جس کی فضا احساس سے بھی زیادہ نازک اور خیال سے زیادہ رنگین ہے۔ سکوت شب میں انجن کی مسلسل بھک بھک، جہاز کے قدموں میں بچھ کر ابھرنے والی موجوں کے جل تھل، ساز، آسمان پر تاروں کے ٹمٹمتے ہوئے چراغ، چاندنی میں پھسکی پھسکی ڈھلی ڈھلی فضا، لہروں کے زیر و بم میں مہتابی کرنوں کے بیچ و خم جیسے نیلم کی کان میں پھلجھڑیاں پھوٹ رہی ہوں..... جوں جوں رات جوان ہوتی جا رہی تھی ماحول کی اس خوبصورتی پر ایک عجیب دیوانگی، ایک شدید جنون پھیلنے لگا تھا جیسے انسان کے دل پر غم اُترتا تھا، ارض و سما کے درمیان ایک بے آواز سکی لرز نے لگی تھی۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ انسان جہاز کے در و دیوار سے لپٹ کر روتا روتا سو جائے۔

موٹے شیشوں کی عینک والی ایک آرٹسٹ نمائش کی جو نیپلز سے ہمارے ساتھ سوار ہوئی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کیبن کے اندر گزارتی لیکن ڈنر کے بعد وہ اپنا کمبل اٹھا کر ڈیک پر آ جاتی تھی۔ معلوم نہیں اسکے دل میں کس سوز کی تڑپ تھی کہ وہ کسی کروٹ بھی چین سے نہ بیٹھ سکتی تھی۔ کبھی کمبل لپیٹ کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتی پھر ڈیک کے جنگلے پر جا کھڑی ہوتی، جنگلے پر جھک جاتی، سیدھی ہو جاتی، پھر وہاں سے سرک کر بے چینی سے ڈیک پر ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر گھومنے لگتی پھر.....

صبح کے وقت جب وہ ڈرائنگ روم میں ناشتہ کرتی نظر آتی تو مجھے ایک گونہ مایوسی کا احساس ہوتا کیونکہ مجھے کئی بار یہ خیال آتا تھا کہ شاید کل رات اس نے چاندنی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو۔

ہفت روزہ "لیل و نہار" 30 اکتوبر 1960ء



چین کا ثقافتی انقلاب

یہ میرا چین کا دوسرا دورہ تھا.....

میں پہلی بار 1929ء میں چین گیا تھا، اس وقت میں اپنی کم سنی کے باعث کوئی شعوری مشاہدہ کرنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا تھا پھر بھی وہ تاثرات میری لوح ذہن پر نہایت گہرے طور پر مرتسم ہوئے یہ آئینہ نقوش تھے، پہلا تاثر قتل، لوٹ مار اور غارت گری کا خوف تھا جو تھکے ہارے مسافروں پر ہر دم مسلط رہتا تھا۔ وہ سڑک کے ہر موڑ، ہر پہاڑ گاہ اور ہر سرائے میں ان کا تعاقب کرتا۔ دن کو جنگ جھوٹے حکمرانوں کا دور دورہ ہوتا اور رات کو ڈاکوؤں کا راج۔ ایک گاؤں میں درجن بھر مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں نظر پڑیں، جنہیں بڑے اہتمام سے اوپر نیچے، ڈھیر کی صورت میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کی کئی ہوئی گردنوں سے خون نکل رہا تھا۔ قریب ہی ان کے بریدہ سروں کا ڈھیر پڑا تھا۔

دوسرا نمایاں نقش گندگی، تعفن، بد تہذیبی اور لوگوں میں پائے جانے والے پھوہڑ پن کا تھا۔ میرے ذہن میں اس چائے فروش کا نقشہ اب بھی موجود ہے جو آلتی پالتی مارے اپنے دھواں دھار چولہے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے ہم سے چائے کے پیسے پیشگی وصول کر لیے اور انہیں اپنے کمرے کے گرد لپیٹی ہوئی چمڑے کی پیٹی میں محفوظ کرنے کے بعد وہ صاب سابق بدبو خیز پائپ پینے میں مشغول ہو گیا۔ ہم نے طویل انتظار کے بعد اسے یاد دہانی کرائی مگر وہ ہم پر ایک خونخوارانہ نظر ڈالنے کے بعد پھر اطمینان سے کش لینے لگا، شاید وہ ہمارے مطالبے کو اپنے آرام میں بے جا خلل سمجھتا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جانوروں کی سی غراتی آواز میں بیوی کو بلاتا جو آ کر اس کے گندے جسم، کانوں اور ناک پر بیٹھی ہوئی کھینوں کے غول اڑاتی تھی۔ بالآخر ہمیں چائے پیئے بغیر لوٹنا پڑا۔ ایسی چائے جس کی ہم پیشگی قیمت ادا کر چکے تھے۔

یہ واقعات اکاؤنٹ کا ذکر نہیں بلکہ بکثرت رونما ہوتے تھے۔ چین کا دوسرا دورہ میں نے فروری 1963ء میں کیا، جب پاک چین سرحدی معاہدے پر دستخط کیے گئے تھے، تیسری بار میں آج سے کوئی دو ہفتے قبل چین گیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس انقلاب کی اہمیت، اس کی ہنیت اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا نہایت ہی مشکل امر ہے، یہ ایک ایسا منظر ہے جو مروج نظریات اور معروف سیاسی اصطلاحات کی حدود سے باہر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کو سمجھنے میں بعض اوقات وہ اصحاب بھی غلطی کر جاتے ہیں جو اپنے دل میں چین کے لیے بھی خواہانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل میں اس کے لیے ہمدردی ہی نہیں ان کا ذکر ہی کیا.....!

درحقیقت چین کے ثقافتی انقلاب کو اس قوم کی تاریخ میں دوسرے ”طویل مارچ“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طویل مارچ جو 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام پر منبج ہوا تھا، علاقائی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نوعیت کا تھا۔ ثقافتی انقلاب جو دوسرے طویل مارچ کی علامت ہے، خالصتاً افکار و نظریات کے میدان میں انقلاب ہے۔ پہلے

چین کا ثقافتی انقلاب

یہ میرا چین کا دوسرا دورہ تھا.....

میں پہلی بار 1929ء میں چین گیا تھا، اس وقت میں اپنی کم سنی کے باعث کوئی شعوری مشاہدہ کرنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا تھا پھر بھی وہ تاثرات میری لوح ذہن پر نہایت گہرے طور پر مرتسم ہوئے یہ انٹ نقوش تھے، پہلا تاثر قتل، لوٹ مار اور غارت گری کا خوف تھا جو تھکے ہارے مسافروں پر ہر دم مسلط رہتا تھا۔ وہ سڑک کے ہر موڑ، ہر پناہ گاہ اور ہر سرائے میں ان کا تعاقب کرتا۔ دن کو جنگ، جو حکمرانوں کا دور دورہ ہوتا اور رات کو ڈاکوؤں کا راج۔ ایک گاؤں میں درجن بھر مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں نظر پڑیں، جنہیں بڑے اہتمام سے اوپر نیچے، ڈھیر کی صورت میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کی کئی ہوئی گردنوں سے خون نکل رہا تھا۔ قریب ہی ان کے بریدہ سروں کا ڈھیر پڑا تھا۔

دوسرا نمایاں نقش گندگی، تعفن، بدتہذیبی اور لوگوں میں پائے جانے والے پھو ہڑپن کا تھا۔ میرے ذہن میں اس چائے فروش کا نقشہ اب بھی موجود ہے جو آلتی پالتی مارے اپنے دھواں دھار چولہے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے ہم سے چائے کے پیے پیشگی وصول کر لیے اور انہیں اپنے کمر کے گرد لپیٹی ہوئی چمڑے کی پیٹی میں محفوظ کرنے کے بعد وہ صاب سابق بدبو خیز پائپ پینے میں مشغول ہو گیا۔ ہم نے طویل انتظار کے بعد اسے یاد دہانی کرائی مگر وہ ہم پر ایک خونخوارانہ نظر ڈالنے کے بعد پھر اطمینان سے کس لینے لگا، شاید وہ ہمارے مطالبے کو اپنے آرام میں بے جا غفل سمجھتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد جانوروں کی سی غراتی آواز میں بیوی کو بلاتا جو آ کر اس کے گندے جسم، کانوں اور ناک پر بیٹھی ہوئی کھیلوں کے غول اڑاتی تھی۔ بالآخر ہمیں چائے پیے بغیر لوٹنا پڑا۔ ایسی چائے جس کی ہم پیشگی قیمت ادا کر چکے تھے۔

یہ واقعات اکاؤنٹ کا نہیں بلکہ بکثرت رونما ہوتے تھے۔ چین کا دوسرا دورہ میں نے فروری 1963ء میں کیا، جب پاک چین سرحدی معاہدے پر دستخط کیے گئے تھے، تیسری بار میں آج سے کوئی دو ہفتے قبل چین گیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس انقلاب کی اہمیت، اس کی بعیت اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا نہایت ہی مشکل امر ہے، یہ ایک ایسا مظہر ہے جو مروج نظریات اور معروف سیاسی اصطلاحات کی حدود سے باہر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کو سمجھنے میں بعض اوقات وہ اصحاب بھی غلطی کر جاتے ہیں جو اپنے دل میں چین کے لیے بھی خواہانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل میں اس کے لیے ہمدردی ہی نہیں ان کا ذکر ہی کیا.....!

درحقیقت چین کے ثقافتی انقلاب کو اس قوم کی تاریخ میں دوسرے ”طویل مارچ“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طویل مارچ جو 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام پر منتج ہوا تھا، علاقائی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نوعیت کا تھا۔ ثقافتی انقلاب جو دوسرے طویل مارچ کی علامت ہے، خالصتاً افکار و نظریات کے میدان میں انقلاب ہے۔ پہلا

مارچ نے چین کو کومنٹانگ، غیر ملکی سامراج اور ڈاکوؤں کے مادی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی غلبے سے نجات دلائی اور انہیں نکال باہر کیا، جنہوں نے ملک کے طول و عرض میں ٹوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ دوسرا مارچ، اس سامراجی ذاتیت کا بھی خاتمہ کر رہا ہے۔

ہم اپنے یہاں کے رسم و رواج سے یہ مثال دے سکتے ہیں کہ پہلا طویل مارچ پرانے نظام کا یوم مرگ تھا۔ 1949ء سے 1965ء تک کا دور اس کا سوئم اور ثقافتی انقلاب رسم چہلم ہے۔ اب جبکہ اس مُردے کی ساری رسوم مکمل ہوئیں، اس کی یادیں بھی محو ہو جانی چاہئیں، جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ثقافتی انقلاب کا بنیادی مقصد پہلی دہائیوں سے تیسری نسل کو قیادت منتقل کرنے کی تقریب ہے۔

پہلی نسل نے لڑائی میں براہ راست حصہ لیا اور خانہ جنگی میں کامیابی حاصل کی۔ دوسری نسل ان افراد پر مشتمل ہے جو اگرچہ خانہ جنگی میں شریک نہیں ہوئے مگر انہوں نے جمہوریہ چین کو قیام کے بعد استحکام کی منزل سے ہمکنار کیا۔ یہ دونوں نسلیں انقلابی عمل میں ہراول دستے رکھتی تھیں لیکن ان کی تشکیل نو کے کام میں حقیقت پسندی اور عملیت پوری طرح نمایاں رہی، وہ اپنے پرانے تجربات کی بنیاد پر انقلاب کے ضروری عناصر کا پورا محاذ رکھتے ہوئے کام کرتے چلے گئے جس میں رعایتوں اور سمجھوتوں کی جھلک بھی موجود ہے۔

جدید چین کی تیسری نسل جو تیز و شعور کے زیور سے آراستہ ہے پہلی نسلوں کے کارناموں سے بھی آگاہ ہے اور ان کی فروگزاشتوں سے بھی وہ اپنے نظریہ حیات کی روشنی میں سابق نسلوں کے اعمال کو جانچتی، پرکھتی اور ان پر حکم لگاتی ہے۔ ثقافتی انقلاب اسی انوکھے تجربے کے لیے لیبارٹری ہے۔

ماؤزے تنگ تاریخ عالم میں ایک ایسے لیڈر ہیں جنہوں نے اپنی ہی قائم کردہ حکومت کے خلاف ایک ملک گیر بغاوت کو انگیزت دی۔ انہوں نے اپنے احباب و رفقاء سے اٹھارہ سالہ گہری وابستگی کو خاطر میں لائے بغیر ان کے فکر و عمل کو کروڑوں نوجوان باغیوں (سرخ محافظوں) کے احتساب کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا لاثانی کارنامہ ہے۔ ماؤزے تنگ کے یہ پرانے احباب اور رفقاء زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ لوگ تجارت، تعلیم، بینک، ادب و ثقافت، سرکاری پارٹی، فلم اور صنعت گویا ہر شعبے میں قائدانہ فرائض ادا کر رہے ہیں۔

چین میں تیرہ سال سے تیس سال کے درمیان عمر کا لڑکا اور لڑکی سرخ محافظوں میں شامل ہیں۔ یہ سرخ محافظ دوسرے ملکوں میں جلوس اور ہنگامے برپا کرنے والے ان نوجوانوں کی بھیڑ سے قطعاً مختلف ہیں جو نعرے لگاتے ہوئے گلیوں میں دوڑ بھاگ کر رہے ہوتے ہیں اور حکومتوں کا تختہ الٹنے کے درپے ہوتے ہیں۔ سرخ محافظ ان کے برعکس شوریدہ سراور ہنگامہ کرنے والے نہیں، وہ نظم و ضبط کے پابند اور مثبت اور تعمیری مصروفیتوں کے جوگر ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کی مقدم ترین مصروفیت چین کے مستقبل کی تعمیر ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے ماؤ کے اقوال ان کی مشعل راہ ہیں، جنہیں انہوں نے بطور عقیدہ قبول کیا ہے۔ کوئی پالیسی مرتب کرنا ہو، پروگرام طے کرنا ہو۔ کسی سے کچھ پوچھنا ہو یا جواب دینا ہو۔ وہ ماؤ کی اقوال ہی کے حوالے سے سارے کام کرتے اور غور و فکر کرتے ہیں۔ آپ جہاں جائیں، بس میں ہوں، ریل میں، ریسٹوران میں، گلی یا بازار میں، کمرۂ انتظار میں یا طیارے میں سوار ہوں۔ سرخ محافظ ہر کہیں ہوں گے جو ماؤزے تنگ کے اقوال گاتے اور گنگلتا نظر آئیں گے۔

چائنا ایرویز کی تجارتی سروسوں میں ٹائی اور چائے کے بعد، جوئی "اپنی پیٹیاں باندھ لیجئے" کا سنگل بچتا

شہاب نگر ہے۔ نو جوان ہوسٹس قطار میں کھڑی ہو کر سرخ کتابیں جیب سے نکال لیتی ہیں مسافر بھی ایسا ہی کرتے ہیں، پھر اس کتاب کے صفحات کو رس میں گائے جاتے ہیں۔ اس رسم کے بعد ایئر ہوسٹس خوبصورت ڈھونگی لے آتی ہیں اور چینی کی عظمت کا گانا اور ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ دوسرے ہوائی اڈے پر اترنے تک جاری و ساری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سرخ محافظوں کی ٹولیاں دفاتر، دکانوں، کارخانوں، تعلیم گاہوں اور دیگر اداروں کا معائنہ بھی کرتی ہیں۔ وہ پارٹی کے ایسے ارکان کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں، جو نظریے میں انحراف کی راہ پر گامزن ہوں یا سرمایہ کاری کی طرف چل نکلے ہوں، ایسا کوئی آدمی مل جائے تو فی الفور ایک مقامی انقلابی کمیٹی بنا دی جاتی ہے جو تادیبی کارروائی شروع کر دیتی ہے۔

اصلاح کا کام بالعموم چار مدارج میں انجام دیا جاتا ہے جو یہ ہیں.....!

بحث و تمحیص، تنقید، قطع تعلق اور سزا

ان مراحل میں الزام لگانے والوں..... اور صفائی پیش کرنے والوں کے درمیان کھل کر تبادلہ خیال ہوتا ہے جو تصادم تک پہنچ سکتا ہے۔ شاف کے جوئیر اور سینئر ارکان بلا روک ٹوک جس فریق کو حق پر سمجھتے ہیں اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ معاملہ شدید نوعیت اختیار کر جائے تو تادم فیصلہ اس ادارہ کو بند کر دیا جاتا ہے۔ ملزم بڑی حیثیت کے مالک ہوں تو ان کے خلاف مہم بھی زیادہ شدت اختیار کر لیتی ہے اور دیواروں پر پوسٹر چسپاں کر کے ان کے خلاف الزامات کی تشہیر کی جاتی ہے۔

پوسٹروں کی مہم بڑی دلچسپ ہے۔ ہر شہری کو اس میں حصہ لینے کی اجازت ہے۔ انہیں کاغذ کی فراہمی اور طباعت کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ پوسٹر بازی کی مہم کی وسعت و گہرائی کا ان دو شواہد سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ پینٹنگ، شنگھائی، کمیونٹن میں مجھے بمشکل ہی کوئی دیوار بغیر پوسٹر کے نظر آئی۔ دیواریں مختلف سائز کے رنگارنگ پوسٹروں سے ڈھکی ہیں جن پر جلی طور پر، نمبر شمار درج ہے۔ یہ دراصل دلائل کا سلسلہ وار نمبر ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ نو جوانوں کی ٹولیاں دن رات ان پوسٹروں کو دقت نظر سے پڑھتی ہیں، ان کے نوٹ لیتی اور آپس میں تبادلہ خیال کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس مہم میں نو جوانوں کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ ایک بار میری بیوی نے چینی ترجمان سے درخواست کی کہ ہمیں بچوں کے لیے کھلونے خریدنے ہیں۔ ترجمان ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک سال سے کسی سٹور میں نہیں جاسکی کیونکہ اسے اپنے ثقافتی انقلاب کے کام میں دن رات مسلسل مصروف رہنا پڑا ہے تاہم اس نے ازراہ اخلاق انہیں پینٹنگ کے ایک سٹور سے کھلونے خرید دیے وہ کھلونے لے کر جب واپس پہنچیں، تو ترجمان کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو ایک عجیب ہی روداد سامنے آئی۔ اس نے بتایا کہ سٹور میں جا کر اس پر منکشف ہوا ہے کہ چین کی کھلونوں کی صنعت نے ثقافتی انقلاب کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ یہ کہنے کے بعد ترجمان خاتون اس موضوع پر پوسٹر تصنیف کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے کہا کہ وہ اس پوسٹر کو جو دو ہفتے میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ جائے گا۔ کھلونوں کے کارخانوں اور ان کی فروخت کے علاقوں میں چسپاں کرائے گی۔ اس سے اس صنعت میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات بے حد پسند آئی کیونکہ اس سے ریاست اور معاشرہ براہ راست اثر قبول کرتا ہے اور دوسرے ملکوں میں رائج احتجاج کے طریقوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مؤثر ہے۔ میں نے ایک سرخ محافظ سے پوچھا اگر انہیں یقین ہے کہ پارٹی کے بعض عہدیدار تحریف یا سرمایہ داری کی راہ

چل رہے ہیں تو اتنی طویل بحث، تنقید اور قطع تعلق وغیرہ کا طولانی راستہ اختیار کرنے کی بجائے، انہیں مہموں سے الگ ہی کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ اس خاتون نے بلا توقف جواب دیا۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہمیں ان افراد سے نہایت توہیناً مل جائے گی مگر نظریہ اور خیال کی خرابی جوں کی توں رہے گی۔ ہم اس دائرہ میں بھی اصلاح کے خواہاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثقافتی انقلاب میں تطہیر اور قتل وغیرہ کی فوج نہیں آئی، یہ رزم گاہ افکار ہے اور ماؤز سے تنگ اس جنگ میں سپریم کمانڈر ہیں۔ اس موضوع پر میں نے ایک لڑکے سے بھی بات چیت کی۔ پوچھا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ جو اعلیٰ مہمیدار سرمایہ

داری کی راہ پر چل پڑے ہیں ان کے خلاف تنقید اور قطع تعلق کا عمل خاموشی سے کیا جائے۔ بازاروں میں ان کے خلاف ہنگامے نہ ہوں۔ اس نے سرخ کتاب نکالی اور ماؤ کا یہ قول سنایا۔ ”جو کام کھل کر کیا جائے وہ جمہوریت ہے اور جو پھپھ کر کیا جائے وہ سازش ہوتی ہے۔“ پھر اس نے بڑے زوردار الفاظ میں کہا ”ثقافتی انقلاب ہرگز سازش نہیں ہے۔“

میں نے ایک اور صاحب سے بھی پوچھا، جو ذرا بڑی عمر کے تھے۔ میرا سوال تھا، فرض کیجئے، ثقافتی انقلاب کا کام ہو جائے تو کیا بنے گا۔ اس نے بھی سرخ کتاب کی ورق گردانی شروع کی..... ایک جگہ لک کر کہنے لگا ”ناکامی، شکست ہرگز نہیں ہوتی“ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ”ایک صحت مند نصب العین کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے اس کی تکمیل کی جدوجہد ناکامی سے دوچار ہو جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بار بار کوشش کی جائے۔“

چینی باشندے اس کا اعتراف برملا کرتے ہیں کہ 28 سے پانچ صوبوں میں ثقافتی انقلاب کا حال کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا باقی صوبوں میں اس عمل کے چاروں مراحل مکمل ہو گئے ہیں!

یہ بات چینی عوام بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ثقافتی انقلاب کے ابتدائی مراحل میں شنگھائی اور بعض دیگر مقامات پر صنعتی پیداوار میں شدید زرخنے پڑے، اصلاحی کارروائی کے لیے کارخانوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس سے صنعتی پیداوار کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ اب وہ سلسلہ مکمل ہو گیا۔ کارخانے دھڑا دھڑ چل رہے ہیں۔ پرائمری اور مڈل سکول پھر سے کھل گئے ہیں۔ ان میں نظر ثانی شدہ نصاب اور نئی کتابیں رائج کر دی گئی ہیں، کئی یونیورسٹیاں ابھی تک بند ہیں۔ ان کے نصاب تعلیم کو چین کی رُو بہ ترقی معیشت کی طویل المیعاد اور مختصر المیعاد ضرورتوں کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔ ریسرچ اعلیٰ تعلیم میں شامل تو ہے مگر اس کی اہمیت قدرے کم کر دی گئی ہے، کیونکہ اس سے قوم بھرپور فائدہ آئندہ کسی مرحلے میں ہی اٹھا سکے گی!

ایک میڈیکل کالج کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں ڈاکٹروں کو کان کی ایک اندرونی جھلی کی خرابی پر ریسرچ کے لیے کئی سال صرف کرنے پڑے تھے حالانکہ چین میں اس کے مریضوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پھر یہ مرض نہ مہلک ہے اور نہ اس سے کسی آدمی کو معذوری لاحق ہوتی ہے۔ معترضین کا موقف تھا کہ جب تک اس سے زیادہ شدید اور عام امراض کے علاج کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، ریسرچ کا یہ کام غیر ضروری اور قبل از وقت ہے۔

یہ بات ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں کے لیے بھی یقیناً باعث دلچسپی ہوگی کہ چین میں فارغ التحصیل ڈاکٹروں کو قصبوں میں پریکٹس کرنے سے قبل دس پندرہ سال تک دیہات میں خدمت انجام دینا پڑتی ہے بعض ڈاکٹر اس عرصے میں دیہی ماحول میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ وہیں کے ہو جاتے ہیں۔

شنگھائی میں ہماری ترجمان چینی خاتون بے حد متواضع اور منکسر المزاج تھیں۔ وہ ہمارے ہینڈ بیگ خود اٹھانے

شہاب نگر
پر اصرار کرتی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ معمولی تر جہان نہیں بلکہ شنگھائی کی ایک سرگرم ڈاکٹر ہے۔ میری بیوی نے جو اس کی ہم پیش ہیں اس سے چین میں ڈاکٹروں کے مشاہرہ کے بارے میں استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی تنخواہیں 80 روپے آن سے لے کر 150 روپے تک ہے جو کہ ہماری کرنسی کے مطابق 160 روپے سے تین سو روپے تک بنتی ہے۔ یہ لیڈی ڈاکٹر ہسپتال میں اپنی روزمرہ ڈیوٹی کے علاوہ ثقافتی انقلاب کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔

ہماری درخواست پر ہمیں زرعی یونیورسٹی لے جایا گیا۔ پکنگ کی زرعی یونیورسٹی ایک سال کے لیے بند پڑی ہے۔ سرخ محافظوں نے اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ گذشتہ دس سال میں یہ یونیورسٹی ضرورت سے زیادہ ”شہری“ بنا دی گئی۔ دیہی زندگی کے حقائق و ضروریات سے اس کا تعلق و رابطہ کمزور پڑتا جا رہا تھا، اس کا کورس فطری زیادہ تھا اور عملی کم۔ اس یونیورسٹی کو ماؤزے تنگ کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے شدید محنت کی جا رہی ہے، جن کا اس ضمن میں قول یہ ہے کہ زرعی سائنس کی عمل گاہ، دیہات کی کھلی فضا اور وسیع و عریض کھیت ہیں نہ کہ شاندار عمارت کے بند کمرے۔ میں نے چند نو جوان محافظوں سے پوچھا کہ اس انقلابی عمل کی تکمیل میں، کیا ان کی تعلیمی زندگی کے دو تین قیمتی سال ضائع ہو جائیں گے؟ انہوں نے ماؤزے تنگ کے حوالے سے، بیک زبان جواب دیا ”پوری نسل ضائع ہونے سے چند سال ضائع ہو جانا بہتر ہے“

چین میں نظام تعلیم کا ازسرنو جائزہ لیا جا رہا ہے، تدوین و تشکیل کا یہ کام بڑی دیدہ ریزی اور باریک بینی سے انجام پا رہا ہے۔ اس سے ثقافتی انقلاب کے ایک بہت بڑے مقصد کی تکمیل ہوگی۔ ایک عظیم عمل جراحی ہے، جو پورے نظام تعلیمات میں ایک نیا خون دوڑا دے گا۔

اگرچہ ثقافتی انقلاب کی وجہ سے کارخانے، وقتاً فوقتاً بند ہوتے رہے اور سکولوں میں بھی تعطیل کرنا پڑی، یونیورسٹیاں بھی زد میں آئیں تاہم پانچ شعبے ایسے تھے جن میں ثقافتی انقلاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑا۔۔۔۔۔!

ایک شعبہ انتظامی مشینری تھا جو کسی تعطل کا شکار نہیں ہوا۔ اس کے تحت ستر کروڑ چینی عوام نے جیسے تیسے زندگی گزاری، کسی مرحلے میں بھی اس شعبے نے حکومت کی مخالفت نہیں کی۔ کہیں کوئی مزاحمت یا تصادم ہوا بھی، تو اس کی نوعیت سیاسی، انتظامی نہیں تھی۔ اس کو ایک ہی نظریہ پر یقین رکھنے والے راسخ العقیدہ اور تحریف پسندوں کے درمیان کشمکش قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں اول الذکر گروہ کی جیت ہوئی۔ یہی گروہ تیسری زندہ نسل ہے، جو اپنے آباء اجداد کے مقابلے میں اعتقاد کی کہیں زیادہ پختگی، جوش عمل کی فراوانی، مقصدیت اور عزم بالجزم کے نشہ سے سرشار ہے۔ اس معرکہ میں ریاست بحیثیت ایک آدرش کے اور حکومت بطور ایک محافظ کی برقرار رہی۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ صورت حال بیرونی دنیا کو خواہ خانہ جنگی کے کتنی ہی مماثل کیوں نہ لگتی ہو۔ حقیقت میں ایسی نہیں تھی۔

دوسرا شعبہ روزمرہ کی عوامی زندگی کا ہے اس میں بھی کوئی غیر معمولی تغیر رونما نہیں ہوا، نہ ہی مفاد عامہ کے کاموں میں کوئی خلل واقع ہوا۔ سرخ محافظ، انقلابی عمل کے ہمہ وقتی کارکن ہیں دوسرے پیشوں سے متعلق افراد اس عمل میں اس وقت حصہ لیتے ہیں جب وہ اپنے روزمرہ کے فرائض سے فارغ ہو لیتے ہیں!

ثقافتی انقلاب نے زرعی شعبے کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ چوتھا شعبہ دفاع ہے۔ اس کی صلاحیتوں پر بھی کوئی ناخوشگوار نہیں پڑا۔ عوامی آزادی کی فوج پر ولتاری ثقافتی انقلاب کے فلسفہ و عمل کے مکمل کورس سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس نے انقلابی عمل سے شدید تاثر قبول کیا۔ فوج میں انقلابی سرگرمیاں کیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے فوجی کیشن

اور لبریشن آرمی کے سیاسی شعبہ کی نگرانی و توسط سے جاری رکھی گئیں!

پانچواں شعبہ جس کو ثقافتی انقلاب کے تقاضوں کے تحت شدید رد و بدل سے بچایا گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے تاکہ چین کی ترقی کی رفتار پر کوئی اثر نہ پڑنے پائے۔

اس بھرپور قومی جدوجہد کو بڑی دانشمندی سے شعبہ وار منظم کیا گیا ہے۔ کسان، کارکن، مزدور، طلباء اور فوج اس دوسری طویل مارچ کا ہراول دستہ ہیں اور ماؤزے جنگ جنہیں چینی احترام و عقیدت سے اپنا عظیم قائد اور عظیم مربی اور سپریم کمانڈر کہتے ہیں، ان کے سالار ہیں۔ میں چین کے اس ثقافتی انقلاب کو ایک اٹھارہ سمندر سے مشابہ پاتا ہوں۔ جس کی سطح پر چھوٹی بڑی لہریں پیدا ہوتی، تیزی سے دھاروں میں تبدیل ہوتی اور خس و خاشاک کو کناروں کی طرف پھینکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ ایک مسلسل اور غیر منتهی عمل ہے۔ جو قانون فطرت کے مطابق چل رہا ہے، بیرونی دنیا کے مبصر چین کا جو بھونڈا نقشہ پیش کرتے ہیں، وہ یا تو ان کے خواہش آمیز فکر کا نتیجہ ہے یا ان کی بے خبری کی دلیل۔

کل کا چین کیسا ہوگا؟ اس کی پیشگوئی کے لیے کسی آلے سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ماؤزے تنگ کے اقوال چینی باشندوں کے لیے اس وقت بھی منبع ہدایت رہیں گے جب وہ جسمانی طور پر ان کے درمیان موجود نہیں ہوں گے۔ نظریات، افراد کے مقابلے میں زیادہ عمر پاتے ہیں اور قائم رہتے ہیں۔ چینیوں کے لیے ماؤ بطور انسان نہیں بلکہ بحیثیت ایک فکر اور ایک نظریہ کے لیے ایک ہستی ہیں۔ قیادت کا یہ انوکھا نمونہ شخصی نہیں بلکہ اصولی ہے۔

دوسری بات یہ کہ چین کی قیادت مکمل طور پر تیسری نسل کو منتقل ہو چکی ہے۔ یہ نسل تیس سال سے کم عمر کے افراد پر مشتمل ہے، جو سراپا عمل، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے پوری طرح صحت مند و توانا اور جوش کردار سے سرشار ہے۔ ثقافتی انقلاب نے ان کی جوانی کی تمام اُمگلوں اور خواہشوں کو ایک نئی منزل سے آشنا کر دیا ہے۔ وہ اخلاقی عیوب سے آزاد اور بے مقصدیت سے کوسوں دور ہیں جو دنیا میں عام نوجوانوں کی خصوصیت بن گئے ہیں۔

اس لحاظ سے جدید چین کا نوجوان شاعر کے تخیل کی زندہ تعبیر ہے جس کی وہ گذشتہ صدی بھر تمنا کرتا رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب غیر ملکی سامراج نے چین کو افیون کے گودام میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے متاثر مزاج چینیوں پر افیون کو مسلط کرنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد ”اوپیم وار“ کے نام سے کی، لیکن آج افیون کی رسیا قوم کے بچے تو مند، صاف ستھرے، مثبت اخلاق سے متصف اور عمل کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اس کے برعکس جن اقوام نے چینی باشندوں کو مفلوج کرنے کے لیے انہیں افیون کا چمکا ڈالا تھا۔ آج ان کی اپنی نسلیں چرس، بھنگ، ایل ایس ڈی اور میری جوانا کی عادی بن چکی ہیں۔ وہ طرح طرح کی جنسی بیماریوں اور کمزوریاں کے شکنجے میں جکڑ لی ہوئی ہیں۔

چین کی نئی قیادت دنیا کے لیے ایک دعوتِ فکر ہے۔ نئی نسل اپنے نظریہ حیات پر پختہ یقین رکھتی ہے جو اس نسل کی رگ و پے میں رچ بس گیا ہے۔ اس قیادت کو ملک کے کسانوں، مزدوروں اور آزاد فوج کی پوری حمایت حاصل ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے مسلح ہے جو جنگ و امن میں یکساں طور پر کارآمد ہے غور طلب امر یہ ہے کہ چین کے گرد نفرت اور علیحدگی کا جو جال تان دیا گیا ہے اس کے پیچھے ایک تو مند اور طاقتور نسل معرض وجود میں آگئی ہے۔ جو مجبور ہے کہ باہر کے لوگوں کے بارے میں یکساں سا تصور باندھ لے۔ وہ امریکہ کو فارموسا، ویٹ نام اور

مشرق وسطیٰ میں اس کی حکمت عملیوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، وہ برطانیہ کے کردار کا جائزہ ”اوپیم وار“ سے لیتے ہیں جس کے لیے ہانگ کانگ کو بطور اڈا استعمال کیا گیا۔ چینی نوجوان بھارت کو سرحدات پر اس کی چھیڑ چھاڑ اور کشمیر میں اس کے طریقہ عمل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ چینیوں کے دل میں پاکستان کے لیے خیر سگالی اور احترام کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ میں آخر میں یہ ضرور کہوں گا کہ جونہی چین کے ساتھ کسی ملک کے تعلقات میں ذرا بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بعض ملکوں میں اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے، جہاں تک چین کا تعلق ہے وہ ایسے واقعات پر جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے نہ مایوسی یا بے جا خود اعتمادی کا، چینی قوم اپنی داخلی پالیسیوں کو اپنے بنیادی اور غیر انتقال پذیر حق کے تحت اپنے حالات و ضروریات کے مطابق مرتب کرتی ہے۔ اس حق کا استعمال اگر بین الاقوامی میدان میں کسی کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے تو کس کا قصور ہے؟

چین کو بین الاقوامی برادری سے دور رکھنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں اس پر چینیوں کو کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی بلکہ اس سے اُلٹا ان کے عزم کو تقویت ملتی ہے کہ انہیں بالآخر تنہا لڑنا ہے۔ لہذا وہ اپنے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے جا رہے ہیں۔ یہ دنیا بھر کی قیادتوں کی دانشمندی، حقیقت پسندی اور سیاسی عقل و تدبیر کے لیے ایک گھلا چیلنج ہے جو امن اور بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے دن رات سوچتے رہتے ہیں۔

روزنامہ مشرق لاہور، جون 1961ء

☆.....☆.....☆

دہلی کا سفر

ستمبر کی پہلی تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت، پالم کے ہوائی اڈے پر ہم زیادہ سے زیادہ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرے ہوں گے کہ ہمارا جہاز ”سٹی آف لاہور“ (یہ پاکستان انٹرنیشنل ایئرویز کا ایک وائی کونٹ جہاز تھا) مقام ڈھاکہ کے لیے رٹولنے لگا۔ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے ازراہ مہمان نوازی دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ رکھوا دیا۔ کھانے کے سامان کے ساتھ ایک بڑی سی لیکن بہت عمدہ بنی ہوئی ٹوکری بھی تھی جس میں سیب، ناشپاتی، ہری چھال کا کیلا اور شربت روح افزا کی ایک بوتل تھی۔ پریذیڈنٹ ایوب بھی پنڈت جی کے لیے اچھی خاصی مقدار میں کھانے کے لیے پاکستانی پھل اور سوچ بچار کے لیے کچھ مواد چھوڑ آئے۔

پنڈت نہرو سے پریذیڈنٹ ایوب کی یہ تاریخی ملاقات پالم کے ہوائی اڈے کے ایک ٹھنڈے کمرے میں جو معزز مسافروں کے لیے مخصوص ہوتا ہے ہوئی۔ پریذیڈنٹ نے ملاقات کے شروع میں ہی پنڈت جی سے کہا: ”مجھے آپ سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے اور میں مشکور ہوں کہ آپ نے ملنے کا یہ موقع دیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں آپ سے ملوں اور مل کر اگر آپ نے اس کی اجازت دی تو آپ کے سامنے بعض تجاویز رکھ سکوں جو میرے خیال میں آپ کے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ یہ تجویزیں ہمارے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں۔ اگر آپ نے سمجھا کہ ان پر سوچ بچار سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنی طرف سے میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اس کو واقعی حاصل خیز بنانا چاہیے اور بالفرض آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب تحصیل لا حاصل ہے اور اس گفتگو سے کوئی نیا پہلو سامنے نہیں آ رہا ہے تو آپ بے شک اس ساری بات کو سنی اُن سنی کر دیجیے گا۔ مجھے اس بارے میں مطلق کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

اس قسم کی ایک مخلصانہ ملاقات کا خیال جو ایک دوسرے کو قریب تر لانے میں مفید ہو سکتی ہو جنرل ایوب کو جب وہ نتھیاگلی میں تھے وارد ہوا۔ گذشتہ جولائی کی ایک صبح پریذیڈنٹ ہاؤس کے ایک سرسبز چمن میں آپ ٹہل رہے تھے دھوپ سے تمام چمن بھر رہا تھا کہ ایسے میں جنرل ایوب کو خیال پیدا ہوا، یہ وہ وقت تھا جبکہ زرعی اصلاحات پر عملدرآمد، بنیادی جمہوریت، سول سروس کی تطہیر اور اقتصادی ترقی کے گونا گوں مسائل یا اس قسم کے دوسرے مسائل نے صدر محترم کے دماغ پر ہجوم کیا ہوا تھا لیکن وہ خوب سمجھتے تھے اور ان کا حقیقت پسندانہ تدبیر ان کو سوچا رہا تھا کہ گھر کو ٹھیک کرنے کے ساتھ ہی دیروز و وہیں اس امر کی ضرورت بھی پڑے گی کہ داخلی ترقی کا رشتہ اپنے قریب کے بین الاقوامی حقائق سے جوڑا جائے۔ جب ایک دفعہ یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی پھر انہوں نے رسومات کا لبادہ اوڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ انہوں نے اس بات کی ضرورت نہ دیکھی کہ کوئی تیسرا دوست ملک جو بخوشی اس بات کو قبول کر لیتا بیچ میں پڑ کر ملاقات کا انتظام کر دے۔ انہوں نے اس بات کو بھی بالکل غیر ضروری سمجھا جیسا کہ موجودہ ڈپلومیسی کا یہ ایک معمولی تقاضا ہے کہ

پنڈت نہرو کی طرف سے اس قسم کا ایک دعوت نامہ ”حاصل“ کر لیا جائے لیکن انہوں نے اس کو بھی گوارا نہ کیا، بخلاف اس کے انہوں نے خود ہی اس کا فیصلہ کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ ڈھاکہ جاتے وقت راستے میں وہ پنڈت نہرو سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا۔ اس قسم کے فیصلے کے لیے واقعی بہت بڑے دل کی ضرورت تھی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ پنڈت جی نے بڑی بے مروتی سے ہمارے انقلاب کا استقبال ”کھلی ہوئی فوجی ڈکٹیٹر شپ“ کے الفاظ سے کیا تھا۔ پریذیڈنٹ ایوب نے مشترکہ دفاع کی مخلصانہ تجویز پیش کی تو انہوں نے بے توجہی سے اسے نظر انداز کر دیا اس برتے پر اگر جنرل ایوب بھی ذاتی وقار کا سوال سامنے رکھ کر حالات کو بکوں کا ٹوں رہنے دیتے تو وہ بالکل حق بجانب تھے اور ان کا یہ رد عمل قابل فہم ہوتا لیکن قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ اگر افراد کے ذاتی میلانات سے وابستہ ہو جائے تو یہ فیصلہ کرنے والوں کے افلاسِ تدبیر کی دلیل ہے اسے صحت مند تدبیر نہیں کہا جاسکتا۔ پریذیڈنٹ ایوب نے اس موقع پر جرأت سے کام لیتے ہوئے صحت مند تدبیر کا ثبوت دیا۔

کراچی سے روانگی سے پہلے ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں جیسے ہی ہمارا طیارہ فضا میں اٹھانی آئی اسے کی ایک چُست ایریز ہوسٹس لیسن ڈراپس سے بھری ہوئی طشتری ہاتھ میں لیے اور تھم برب ایک ایک مسافر کے پاس پہنچی، نیچے بادلوں نے زمین کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا لیکن بادلوں کے اوپر صبح کا سورج پوری توانائی سے چمک رہا تھا۔ ہم آرام سے پالم پور پہنچ گئے کہیں کہیں بادل اڑ رہے تھے۔ دہلی کے مشہور انگریزی اخبار ”اسٹیلٹس مین“ نے اپنے نامہ نگار کی ایک خبر شائع کی ہوئی تھی کہ ہندوستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف نے استعفیٰ دے دیا ہے اور یہ کہ فضائیہ اور بحریہ کے سالارانِ اعظم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں گے۔

ایک بے داغ سفید اچکن میں ملبوس جس میں سرخ رنگ کا پھول لگا ہوا تھا نیچے چوڑی دار پا جامہ، سر پر گاندھی ٹوپی اور بغیر موزوں کے سیاہ پٹا اور چپل پاؤں میں پہنے پنڈت جواہر لال نہرو، پریذیڈنٹ جنرل محمد ایوب خان سے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ پنڈت جی کے ہونٹوں پر نظر بظاہر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ فوٹو گرافروں کا ایک بے پناہ جھوم تھا جس نے ان دونوں رہنماؤں کو گھیرے میں لے لیا اور انہیں ایک وقت تک اکٹھا کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ فوٹو گرافر حضرات ایک دوسرے سے بگڑ رہے تھے، پیچھے والا اگلے والے کے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس منجھدار میں ایک تنہا لڑکی بھی نظر آ رہی تھی، اس کی بے بسی کا عالم.....

”دیکھنا.....“ پریذیڈنٹ ایوب نے خوش مزاجی سے کہا..... ”وہ بے چاری تو کچل جا رہی ہے۔“

”اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے“ اپنا سر بانٹیں کو جھکاتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا..... ”وہ اپنا بچاؤ خود

کر سکتی ہے۔“

لیکن بظاہر وہ مات کھا چکی تھی۔ اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں نے اس کی مطلق پروانہ کی اور اپنے کام کے جوش و خروش میں لگے رہے۔ ان کے مقابلہ میں پاکستانی فوٹو گرافر وغیرہ نظم اور ضبط کی عمدہ مثال پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ ان کے یہاں صحافتی میدان میں کوئی صنف نازک اترنے ہی نہیں پائی جس کا وہ اس طرح طواف کر سکیں۔

فوٹو گرافروں کی ایک ”بنیان المرصوص“ کو پیچھے بٹاتے ہوئے دونوں لیڈر بالآخر ایک علیحدہ کمرے میں داخل

ہوئے جہاں ایک گھنٹہ کے قریب تنہائی میں انہوں نے بات چیت کی۔

اپنی گفتگو کے مقاصد کا ایک خاکہ پیش کرتے ہوئے پریذیڈنٹ ایوب نے پنڈت نہرو سے کہا..... ”میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ملک اور میرا ملک ایک ایسی پالیسی کو اختیار کیے ہوئے ہے جس کے سامنے کوئی معقول مطمع نظر نہ ہو اور پونہ منہ اٹھائے چلے جا رہا ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خوش ہمسائیگی کے لیے ہم نے آج تک کوئی ایک منصوبہ بھی تو چار نہیں کیا۔ ”میل جُل رہے“ کی اصطلاح مجھے پسند نہیں میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا اس سے مجھے کچھ منافقت کی بو آتی ہے لیکن ہمارے دونوں ملکوں میں لاکھوں کروڑوں انسانوں نے غریب اور بے گناہ انسانوں نے دکھ دیکھا ہے اور دیکھتے رہیں گے اگر ہم نے اچھے ہمسایہ ہونے کا ثبوت نہ دیا۔“

یہ فیصلوں کا وقت تو نہیں تھا لیکن خوش ہمسائیگی کی باہمی ضرورت اور احساس نے انہیں بعض حقائق سے دوچار کر دیا جن میں کشمیر، بیرونی خطرات، بین الاقوامی پُر زور سیاست کے اتار چڑھاؤ، سرحدی چپقلش اور یہ جو ”ہم کبھی نہیں لڑیں گے“ کا تذکرہ آئے دن سنتے رہتے ہیں اس قسم کے مسائل کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پریذیڈنٹ ایوب نے پنڈت نہرو سے کہا..... ”پنڈت جی! ہندوستان اور پاکستان کے تمام مسائل کا حل آپ نے ہمیشہ ”ہم کبھی نہیں لڑیں گے“ میں دیکھا ہے۔ میں آپ سے نامتنق نہیں ہوں بشرطیکہ باہمی مسائل کے سلجھاؤ کے لیے کوئی ایسی ترکیب دکھائی دے جس پر ہم دونوں متفق ہوں۔ بالفرض اس قسم کی کوئی ترکیب سامنے بھی آ جائے جب بھی پاکستان کے لیے بہت مشکل ہوگا کہ وہ ہندوستان کے وعدوں پر اعتماد کر لے جب تک ہندوستان کی فوجی طاقت بدستور پاکستان سے تین گنا زیادہ رہے گی۔“

اس مقام پر پریذیڈنٹ نے اس تجربہ کار جرنیل کی حیثیت سے پنڈت نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا..... ”فوجی نکتہ نگاہ میں ”قابلیت اور استعداد“ کو سب سے اہم اور فیصلہ کن جزو قرار دیا گیا ہے اگر ایک ملک کی فوجی طاقت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ وہ فیصلہ کن جنگ لڑ سکتا ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنے ارادے بدل سکتا ہے اور جارحانہ اقدام پر اتر سکتا ہے۔ اس نکتہ نگاہ کی تائید میں مثالیں ڈھونڈ کر لانے کی ضرورت نہیں ہوگی ابھی کل کی بات ہے کہ ایک دفعہ 1950ء اور پھر 1951ء میں ہندوستان کی فوجیں پاکستان کی سرحد پر لا کر جمع کر دی گئی تھیں۔ درآں حالیکہ اس قسم کے اجتماع کی کوئی فوجی ضرورت درپیش نہیں تھی۔“

یہاں پھر ایک حقیقت پسند سپاہی کے انداز میں جنرل ایوب نے اپنے معزز مخاطب سے کہا..... ”اس الجھاؤ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے تعلقات کو درست کریں اور باہر کا جائزہ بھی لیں۔ اگر ہم نے یہ نہ کیا تو ہم ہر پہلو پر شکست کھا جائیں گے یا ایک دوسرے سے تنگ آ کر دونوں میں سے کوئی ایک بھی کسی بیرونی طاقت کو مداخلت کی دعوت دے بیٹھے گا۔ اس نیم براعظم کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ مجھے تو یہی بتا رہا ہے..... حملہ آور آتے نہیں رہے بلکہ اندر سے بلائے جاتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ تاریخ اپنے ان واقعات کو پھر دہرائے اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ میں نے جو بیرونی حملہ آور اور داخلی دعوت کی طرف اشارہ کیا ہے آپ اس سے کوئی غلط مطلب اخذ نہیں کریں گے۔ انسان کچھ واقع ہی ایسا ہوا ہے جب وہ مشکل میں پھنس جاتا ہے تو اس سے ناقابل یقین حرکات سرزد ہو جاتی ہیں۔“

دونوں رہنما کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے اور باہر اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا ایک ہجوم تھا جو ہر

لہجہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا ایک نمائندہ "مائیک" بدست ایک عجیب کھٹکھٹ میں گرفتار تھا کہ کوئی ایسی موزوں جگہ اس کو مل جائے جہاں سے وہ پریذیڈنٹ ایوب کے پیغام کو ریکارڈ کر سکے۔ اس بے چارے کے کیا اپنے صحافتی اور وزارت خارجہ کے کیا غیر صحافتی حریف سبھی اس کی کوششوں کو ناکام دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بھی ارادے کا پکا تھا جیسے ہی پریذیڈنٹ ایوب کمرے سے باہر نکلے اس نے مائیک ان کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ ہجوم نے پریذیڈنٹ کو گھیرے میں لے لیا اور بیان دینے پر مجبور کر دیا۔ پنڈت نہرو گہرے خیالات میں ڈوبے پیچھے برآمدے میں رک گئے۔ پریذیڈنٹ ایوب نے جیسا کہ ان کا طریقہ ہے ایک صاف صاف بیان جس میں نہ کوئی بچ تھا نہ کوئی غم اخباری نمائندوں کو دے دیا۔

وزارت داخلہ اور وزارت خارجہ کے نمائندوں کے اس انسانی حصن حصین کے باوجود جوان رہنماؤں کے گرد گھرا کر دیا گیا تھا اس برآمدہ میں چار ادیب بھی دکھائی دیے گئے۔ وہ آج کے پاکستان کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے خاص طور پر رائٹر گلڈ کے متعلق کہ یہ ہے کیا، یہ کیسے معرض وجود میں آیا؟ یہ کام کیسے کر رہا ہے، اس کے ممبر کون لوگ ہیں؟ اس کا دستور کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے ایک صاحب نے (اور وہ غیر مسلم تھے) بدیں الفاظ اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کو چاہیے کہ چار چیزوں میں پاکستان کی پیروی کرے۔

دوسرے..... زرعی اصلاحات

ایک..... جنرل ایوب خان

چوتھے..... رائٹر گلڈ

تیسرے..... بنیادی جمہوریتیں

ایک ایسا ملک جو کل تک پاکستان کی ہنسی اڑا رہا ہو آج اس کی پیروی کی خواہش کرے حالات کا یہ انقلاب پاکستان کے لیے کچھ کم فخر کا باعث نہیں ہے۔

ایک بات جس پر پریذیڈنٹ ایوب نے پنڈت نہرو کے سامنے خاص طور پر زور دیا یہ تھی کہ دونوں ملکوں کی موجودہ لیڈر شپ ایک ایسا اتفاق ہے جو روز بروز معرض وجود میں نہیں آئے گا۔ انہوں نے کہا..... "جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں مجھے ہندوستان میں ایک دوسرا جواہر لال منصہ شہود پر آتے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس لیے یہ موقع غنیمت ہے ہمیں اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور بہتر ہمسائیگی کے طور طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔"

یہ بالکل درست تھا پریذیڈنٹ ایوب کو کچھ حجاب مانع آ گیا اور یہ نہ کہہ پائے کہ پاکستان میں بھی ایک دوسرا ایوب مستقبل قریب میں پیدا ہوتے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

ڈھاکہ روانہ ہونے کے لیے وہ واپس ہوئی جہاز میں اپنی نشست پر حفاظتی بیلٹ باندھ رہے تھے اور ہم سب دل ہی دل میں ان کی ذات پر گونہ فخر محسوس کر رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان کا ایک ایسا لیڈر ہندوستان میں گیا جس کو اپنی قوم کا مکمل اعتماد حاصل تھا جس نے جاتے جاتے مختصر ملاقات میں پنڈت نہرو کو اتنے مسائل پر سوچ بچار کے لیے اس قدر مواد پیش کیا۔

بوقت روزہ "لیل و نہار" 20 دسمبر 1956ء

چناب کے کنارے

اگر آپ ترقی اور اعلیٰ درجات کے طالب ہیں تو آپ کو ضلع جھنگ کی زیارت کے لیے ضرور جانا چاہیے یہاں آپ رام سلوک کا سفر منزل بہ منزل مقام بہ مقام نہایت بے تکلفی سے طے کر سکتے ہیں۔

جھنگ پہنچتے ہی آپ کا خیر مقدم ایک ساوہی قبر کرتی ہے جس کے کتبے پر یہ تحریر ہے کہ یہ مزار شریف حضرت مہاں راجہا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مائی ہیر صاحبہ کا ہے جنہوں نے عشق حقیقی کی آگ جلا کر بنی نوع انسان کی روح کو گرمایا۔ اب وارث شہادتی شاعری کی رنگ میں جوئی چاہے لکھوالے۔ لیکن اس قبر کا کتبہ بڑی شدت سے اعلان کرتا ہے کہ خیر دار یہ اولیاء اللہ کا مرقد ہے اور جو مہار یہاں ٹہرتا ہے وہ بھی بڑی عقیدت سے آپ کو جوتے اتارنے، فاتحہ کہنے اور منت مانگنے کے آداب سکھاتا ہے اور جھنگ منگیانہ کے گلی کوچوں میں بسنے والے بے شمار محبت نواز جوڑے شہادت دیتے ہیں کہ اس مزار کا قرب زندگی کے بہت سے مقدوں کا حل فراہم کر دیتا ہے۔

اگر آپ جھنگ سے اٹھارہ انیس میل شہار کی طرف جائیں تو آپ کی دوسری منزل کھیوا پنہے گی۔ یہ صاحبان کا گاؤں تھا۔ جہاں مرزا طویل مسافتیں گھوڑے پر طے کر کے اس سے ملے آیا کرتا تھا مرزا صاحبان کے قصبے پر بھی بر خود ملکہ شاعروں نے رو مائی رنگ چڑھا رکھے ہیں لیکن اگر آپ اس گاؤں کے بڑے بوزحوں سے اس قصبے کی بابت کوئی بات ڈرا بے احتیاطی سے پوچھ بیٹھیں گے تو وہ آپ کو بڑی غضب ناک لگاؤں سے گھوریں گے اور آپ کی جہالت اور گمراہی پر لاجوں پر سے ہوئے آپ کو ایک پرانی اور بوسیدہ سی مسجد میں لے جائیں گے تاکہ آپ نماز دو گنا ادا کر کے اپنے باطن کی طہارت کر لیں یہ مسجد بی بی صاحبان کی مسجد ہے اور گاؤں والے بڑی عقیدت مندی سے آپ کو بتائیں گے کہ اس مسجد میں بی بی صاحبان دن رات نوافل ادا کیا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کا نام اللہ کے مقرب شہیدوں میں درج ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی بہت سی ٹیک دھیاں انھوں نے سے پہلے یا انھوں نے کے بعد اس تاریخی مسجد میں برکت حاصل کرنے کے لیے آیا کرتی ہیں۔ بلکہ اگر کوئی عورت اس مسجد میں سرگودھہ دھڑ آئے تو جارتو وہ یہ قیاس کر لیا جاتا ہے کہ یہ بی بی صاحبان کی طرح عشق کھازی سے عشق حقیقی کی طرف ترقی پزیر ہے۔

بی بی صاحبان پر جو درجہ ولایت نازل ہوا۔ اس کی روئید اور بھی اہل قلب و دھڑ کے لیے بڑی کرامت والی چیز ہے کہتے ہیں کہ ایک بزرگ کی دختر نیک اختر گھر سے فرار ہو گئی تھیں۔ وہ اس کی تلاش میں گھومتے گھومتے کھیوا آ پہنچے یہاں پر سر رام صاحبان کی ماں سے ملاقات ہو گئی۔ بزرگ نے اس سے اپنی بیٹی کی نسبت دریافت کیا صاحبان کی ماں نے جواب دیا کہ میں آوارہ و چھو کریموں کا حساب کتاب نہیں رکھتا کرتی اس لیے مجھے تمہاری دختر فرشتہ و بخت کی بابت کچھ معلوم نہیں۔ اس پر بزرگ جلال میں آ گئے اور حالت جذب میں انہوں نے بدعا دی کہ ہاتھیری بیٹی بھی تیرا نام روشن کرے

کی۔ کچھ عرصہ کے بعد صاحبان پیدا ہوئی اور جیسا کہ تاریخ شاہد ہے اس نے اپنی ماں کا تو نہیں بلکہ اپنا نام خوب روشن کیا اور اس روشنی کا نور آج تک مغویہ عورتوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔

غالباً پنجاب کے پانی ہی میں کچھ کرامات ہیں کہ اس کے کنارے جس کسی نے عشق کیا وہ بے تکلف درجہ ولایت تک پہنچ گیا بہرور انجھا اور مرزا صاحبان کی تو پرانی باتیں ہیں لیکن آج بھی اس دریا کے کنارے ایک جگہ ایسی ہے جہاں عشق و محبت کی آمیزش سے کشف و کرامات تصوف اور معرفت کے بہت سے عقدے حل کیے جاتے ہیں یہاں پر ایک پیر صاحب تھے جن کے نام کے ساتھ فخر سالکاں، رہنمائے عاشقان، محبت عارفان کی قسم کے کوئی گز بجز القاب اور خطابات لگا کرتے تھے اگر ان کے نام اور القاب کو کسی تختی پر لکھا جائے تو اس کی صورت ایک کتبے کی طرح بن جاتی ہے جو مقدس مزاروں کے سر ہانے آویزاں کیا جاتا ہے پیر صاحب کچی سڑکوں پر شاندار کار استعمال کیا کرتے تھے، کچی سڑکوں کے لیے اسٹیشن ویگن تھی۔ اس کے علاوہ دس بارہ اعلیٰ قسم کے گھوڑے جن پر وہ خود کبھی سوار نہ ہوئے تھے۔ تین سائز کے تین درجن نسلی ٹٹے تھے جن کی خدمت کے لیے بہت سے خادم مامور تھے۔ کبوتروں کا بھی شوق تھا اور گاہے گاہے بیروں کی پامالی سے بھی جی بہلایا کرتے تھے۔

درگاہ شریف پر درویشانہ ٹھاٹھ تھے لیکن مریدوں کی سہولت کے لیے بہ امر مجبوری پنجاب اور سندھ کے متعدد شہروں میں جدید طرز کی کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں۔ گڈی کے نام پر بہت سی اراضی وقف تھی اور سال بھر میں عقیدت مندوں سے بہت ساندرا نہ بھی آ جاتا تھا۔ صوفیائے کرام کا مسلک ہے کہ دنیاوی مال و متاع راہ سلوک کا راہزن ہوتا ہے چنانچہ ایمان کی سلامتی کے لیے پیر صاحب اپنی ساری آمدنی بڑی باضابطگی سے ٹھکانے لگاتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مری، کوئٹہ، ایبٹ آباد اور سردیوں میں لاہور، پشاور اور کراچی کے شہروں کو فیض پہنچایا جاتا تھا۔ عرس شریف کے موقع پر گاؤں والے روحانی ثواب حاصل کرتے تھے اور اس طرح پیر صاحب سارا سال اپنے مریدان باعفا کی خاطر بڑے بڑے دینی اور دنیاوی مجاہدوں میں غلطیاں و پچپاں رہتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عرس شریف کا آخری روز تھا۔ محفل سماع کے لیے دھوم دھام کا اہتمام تھا۔ گڈی کے بائیں طرف افسروں کی نشستیں تھیں۔ دائیں طرف پیر بھائی، رؤسا اور سیاست زدہ اصحاب تشریف فرما تھے۔ عین سامنے درویشوں کا گروہ تھا۔ جن پر قوالی کے وقت یکے بعد دیگرے حال طاری ہونے والا تھا۔ وجدان کی سہولت کے لیے لاہور سے طریقت پسند لڑکوں کی ایک پارٹی بھی آئی ہوئی تھی اور وہ باریک ممل کے کرتے اور ترچھی ٹوپیاں پہنے بڑے ادب سے دوزانو بیٹھے تھے ان سب کے درمیان قوالوں کا ساز و سامان تھا اور پیچھے حد نگاہ تک زائرین کا اجتماع تھا۔ یہ عقیدت مند دُور دراز مقامات سے آئے ہوئے تھے ان کے پاس نہ سواری کے لیے موٹریں تھیں نہ گھوڑے اور پالکیں تھیں لیکن ہر سال روحانیت کی کشش سفر وسیلہ ظفر کی ہر دشواری و صعوبت کے باوجود یہاں کھینچ لاتی تھی۔ شاید یہ لوگ اپنے مل کا تیل فروخت کر کے یہاں آئے تھے شاید انہوں نے اپنی بیویوں کے زیور یا اپنی بیٹیوں کے جینز رہن رکھ کر نذرانے کا انتظام کیا تھا۔ شاید یہ جب واپس لوٹیں گے تو انہیں کئی کئی مہینے فاقہ سے گزارنے پڑیں گے کیونکہ ان کی گندم کے فالٹو ذخیرے پیر صاحب کے لنگر بھینٹ چڑھ رہے تھے۔

قوالوں نے بڑی خوش مستی کے ساتھ ہارمونیم کی تان چھیڑی۔ درویشوں کے سر نہجوں سے لگے طریقت پسند لڑکے چنگیاں بجا بجا کر بیٹھے بیٹھے بڑی ادا سے کمرس مڑانے لگے۔ پیر صاحب کا مورچہ چل طرزہ بھی جنبش میں آیا جیسے بین کی

آواز پر سانپ کا ٹھن لہرا رہا ہو۔ گلاب پاش تیزی سے گردش کرنے لگے انگلیٹھیوں میں عود و عنبر اور لوہاں سلگنے لگے اور اس سوندے سوندے ماحول میں بھاگیشری کی سر میں قوالوں نے جامی کی غزل شروع کی۔ ایک ایک بول تال پر روچیں بے تحاشہ پھڑکنے لگیں۔ پیر صاحب زور زور سے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے تھے۔ افسر لوگ اپنے وقار کی بندشوں کی وجہ سے کبھی کبھی محض سر ہلا دیتے تھے سیاست زدہ اصحاب اس سے بھی زیادہ وقار کے مد نظر سر کی جگہ چوری چوری پاؤں ہلاتے تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم جو اکثر فارسی سے بے بہرہ تھا نہ سر ہلاتا تھا نہ پاؤں لیکن پیر بھائی درویش اور طریقت پسند لڑکے آپے سے باہر ہو رہے تھے وہ بے اختیار گردنیں مڑکاتے تھے۔ سجدوں میں گرتے تھے اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو ہو کر راگنیوں کی تان پر جھومتے تھے اور پھر یکا یک کئی درویش ہوجھ کر میدان میں کود پڑے ایک صاحب اپنی سفید داڑھی کو مٹھیوں میں پکڑ کر ناچنے لگے دو درویش ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رموز خودی فاش کرنے لگے ساری مجلس مودبانہ کھڑی ہو گئی اور عقیدت مند جھک جھک کر نذرانے پیش کرنے لگے۔ پیر صاحب انہیں ہاتھ سے چھو چھو کر قوالوں کے حوالے کرتے جاتے تھے۔ ایک طالب علم نے اپنا فونٹین پین پیش کیا کیونکہ اس کی جیب سے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ ایک کسان نے جو کے ستوؤں کی پوٹلی نذر کی جسے وہ غالباً زادراہ کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔

جامی کی بعد حافظ، خسرو اور اقبال کی قوالی ہوئی اقبال کی قوالی پر پیر صاحب کو بھی وجد آ گیا اور جب وہ فارغ ہو کر بیٹھے تو ان کے چہرے پر جلال اور سر پر جمال تھا۔ دراصل سر پر اصلی مقام پگڑی کا ہے۔ لیکن اس وقت پیر صاحب کے سر پر صرف جمال ہی جمال تھا کیونکہ ان کی پگڑی کو ابھی ابھی ایک خادم بڑے ادب سے اٹھائے باریک چھتوں کے پیچھے لے گیا تھا۔ جہاں بہت سی عقیدت مند عورتیں رحمت خداوندی کے انتظار میں ہمہ تن گوش بیٹھی تھیں۔ خادم پگڑی اٹھائے جمیلہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ کی ماں اسے پہلی بار عرس شریف میں لائی تھی تاکہ اللہ تعالیٰ کے حضور جمیلہ کی شادی کے لیے دعا کرے، پگڑی کو دیکھ کر جمیلہ رونے لگی۔ لیکن اس کی ماں نے اسے جھڑک دیا۔ جمیلہ بیٹی اللہ کے دربار میں رو کر نافرمانی نہیں کیا کرتے۔ اس مقدس پگڑی ہی میں اولیائے کرام کی وراثت محفوظ ہے اس پگڑی کے ساتھ بزرگی کی عظمت اور معرفت کی روایات صادقہ وابستہ ہیں اس پگڑی کے سہارے پیروں کی پشت بابت عرش عظیم کے میناروں میں چڑھتی رہی ہیں۔ اس پگڑی کی سلوٹوں سے فیض کے چشمے بہتے ہیں۔ صدیوں سے بندگان خاص و عام کو یہ پگڑی انوار تجلیات سے سرفراز کرتی رہی ہے۔ یہ بڑی مرادوں والی پگڑی ہے اس پر ایجاب و قبول کے سب دروازے وا ہیں، یہ پگڑی خدا کی بارگاہ سے کبھی خالی نہیں لوٹی، تو اللہ کا نام لے کر برضا و رغبت اس پگڑی کے پیچھے پیچھے چلی جا، ورنہ بزرگوں کی روح خفا ہو جائے گی اور اگر بزرگوں کی روح خفا ہو گئی تو ہماری سرسبز کھیتیاں اُجڑ جائیں گی ہمارے جھونپڑوں کو آگ لگ جائے گی ہمارے دلانوں میں ہتھکڑیاں جھنجھٹانے لگیں گی۔

دوسری عقیدت مند عورتوں نے بھی حسب توفیق جمیلہ کی ماں کی تائید کی جمیلہ روتے روتے اٹھی آگے آگے دستار فضیلت مآب تھی اور پیچھے پیچھے جمیلہ۔ خادم نے پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہوا تھا تاکہ ان معصوم جوانیوں کو ٹھیس نہ لگ جائے جو اس پگڑی کی ایک ایک سلوٹ میں سالہا سال سے مدفون ہوتی چلی آئی ہیں۔



کافرستان

چترال کے جنوب مغرب میں پہاڑوں کا ایک متوازی سلسلہ چلا جاتا ہے جن میں بریر، بھمبرات اور رمبر کی جنگ وادیاں واقع ہیں۔ یہ وادیاں مجموعی طور پر ”کافرستان“ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان وادیوں میں بمشکل چار سو گھر ہیں اور آبادی ڈھائی ہزار سے زائد نہیں۔ کافرستان کے باشندے جنہیں مقامی طور پر ”کلوش“ کہا جاتا ہے، نسلی اعتبار سے چترالیوں اور پنجانوں سے مختلف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان قدیم آریوں کی ہی ایک شاخ ہو جو دشوار گزار پہاڑوں میں رک گئے تھے یا ممکن ہے کہ سکندر اعظم اپنی یلغار کے دوران جو یونانی ہمراہ لایا تھا ”کافر“ ان ہی کی اولاد ہوں، بہر حال ان کی اصل کچھ بھی ہو، وہ عادات و اطوار اور طرز بود و باش کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

کافرستان کے مرد چوڑے چکلے اور تنومند ہوتے ہیں۔ اس عجیب و غریب بستی میں آپ کو شاذ ہی کوئی ایسا شخص نظر آئے گا جس کا چہرہ مڑجھایا ہوا ہو یا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ کھیل رہی ہو۔ وہ غلے کے کھیتوں اور پھلوں کے باغوں میں اپنا پسینہ بہا رہے ہوں یا شکار کی تلاش میں سرچکرادینے والی چوٹیوں کو پھاند رہے ہوں۔ وہ اپنی مخصوص گفت و مزاجی اور باوقار متانت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان کے انداز زیست سے ایک خاص قسم کی تمکنت ٹپکتی ہے۔ یہ سادہ سے لوگ جس طریقے سے رہتے، بستے ہیں، ان سے بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ، دغا اور چوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔

عورتیں نسبتاً چھوٹے قد کی ہوتی ہیں لیکن جفاکشی میں وہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی جسمانی صحت قابل رشک ہے اور حسن و جمال کے لحاظ سے وہ دنیا کی حسین ترین عورتوں کے ساتھ دعویٰ ہمسری کر سکتی ہیں۔ ان کا لباس سیدھا سادہ ہوتا ہے وہ عموماً ایک ہی لمبا، ڈھیلا ڈھالہ سیاہ چغہ پہنتی ہیں لیکن اپنے سر کی زینت کے لیے وہ اس قدر اہتمام کرتی ہیں کہ اس سے ان کے لباس کی سادگی ڈھک جاتی ہے۔ وہ سر پر ایک طرح کی ٹوپی پہنتی ہیں۔ جس پر قطار در قطار کوڑیاں لگی ہوتی ہیں اس کے علاوہ اس پر سوت اور اون سے رنگ برنگ کے پھول کاڑھے ہوتے ہیں۔ اوپر اور ارد گرد چمک دار پر لگائے جاتے ہیں۔ اس ٹوپی کو کافرستان کے لوگ ”کوٹھسی“ کہتے ہیں۔ یہ کوٹھسی کندھوں پر پڑی ہوئی یوں دکھائی دیتی ہے جیسے سانپ کا پھن، چغے اور کوٹھسی کے علاوہ عورتیں اپنی کمر کے گرد ایک پٹی بھی باندھتی ہیں۔ اس پٹی پر بھی کشیدہ کاری ہوتی ہے۔

عورتوں کا جمالیاتی ذوق بڑا عمدہ ہے۔ انہوں نے آرائش و جمال کے لوازمات خود بنا رکھے ہیں۔ ان کے لیے انہیں کسی ولایتی سرخی، پوڈر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اخروٹ کے دندا سے کے ساتھ اپنے دانت صاف کرتی ہیں جو صفائی کے ساتھ ہی ان کے ہونٹوں اور مسوڑھوں کا رنگ بھی سرخ کر دیتا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کی

عورتیں ”بولپ اسٹک“ استعمال کرتی ہیں، یہ دند اسے اس سے زیادہ بڑھیا قسم کا ہوتا ہے طبی لحاظ سے یہ مفید بھی ہے اور اس کا داغ بھی نہیں پڑتا۔

نوجوان لڑکیاں اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے باقاعدہ ورزش کرتی ہیں اور جڑی بوٹیوں سے ایسے ایسے امین بنا کر چہرے پر ملتی ہیں، جن سے اُن کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً انار اور بادام کے تھلکوں کو جلا کر ان کے ساتھ بہت سی خوشبودار جڑی بوٹیاں اور چکنے بیج ملا کر گھنی پیسٹ سی بنالی جاتی ہے۔ اسے چہرے پر مل کر کچے دودھ کے ساتھ دھویا جاتا ہے۔ اسی کے تیل میں خوشبودار جنگلی پھول ڈال کر بالوں میں لگایا جاتا ہے بالوں کو یا تو گوندھ کر پیچھے ڈال دیا جاتا ہے یا ماتھے پر بالوں کے پھول بنا لیے جاتے ہیں یا انہیں یونہی ”کوپسی“ کے نیچے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

کافرستان کی عورتیں آرائش جمال کے دوران آئینہ استعمال نہیں کرتیں، آئینہ ان کے لیے بہت بڑی عیاشی ہے عام طور پر وہ بہتی ہوئی ندیوں کے کنارے زیب و زینت کے اہتمام کرتی ہیں۔ ان ندیوں کا گہرا اور شفاف پانی اعلیٰ قسم کے آئینے کا کام دیتا ہے اور اس پر دام بھی خرچ نہیں ہوتے۔

کافرستان کے لوگوں کا کوئی مذہب نہیں خدا کا تصور ان کے ذہنوں میں ابھی تک نہیں پہنچا۔ وہ کسی چیز کی پرستش نہیں کرتے۔ جب وہ خوش ہوتے ہیں یا کسی قسم کی آسودگی محسوس کرتے ہیں تو وہ ایک جگہ جمع ہو کر گاتے اور ناچتے ہیں۔ اس کے برعکس جب انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے، کوئی وبا پھوٹ نکلتی ہے یا انہیں موت آتی ہے اس وقت بھی وہ گاتے اور ناچتے ہیں لیکن اس ناچنے کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔

کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو بندوقیں اور پٹائے چلائے جاتے ہیں۔ رات رات بھر رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ اس خوشی میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں، لکڑی کی بڑی بڑی گیلیوں کو آگ لگا کر ان پر جانوروں کو بھون لیتے ہیں اور نمک لگا کر کھاتے ہیں۔ اس رات انگور کا رس پانی کی طرح بہتا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے، ڈھول پیٹتے ہیں، بانسریاں بجاتے ہیں، گانے گاتے ہیں اور ناچتے ہیں۔ کوئی مر جائے تو اس موقع پر بھی بندوقیں چلائی جاتی ہیں اور مردے کے آس پاس جمع ہو کر ناچتے ہیں اور گاتے ہیں۔ ان گانوں میں مرنے والے کی بہادری کے کارناموں، اس کی نشاندہ بازی، مکنی اُگانے اور مولشی پالنے میں اس کی مہارت کی داستانوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ لاش لکڑی کے ایک صندوق میں بند کر دی جاتی ہے۔ یہ صندوق ایک کھلے میدان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ وہیں یہ گل سڑ جاتا ہے۔

اس کے بعد مرنے والے کا ایک نقلی جنازہ تیار کیا جاتا ہے۔ اسے خاص تزک و احتشام سے تابوت تک لے جاتے ہیں اور اسے تابوت کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ اس موقع پر پھر ناچ ہوتے ہیں اور سب مل کر گاتے ہیں۔ یہ گانے شاعری کے لحاظ سے بڑے بلند پایہ ہوتے ہیں۔ مثلاً:

”جب سے تم ہمیں چھوڑ کر گئے ہو، تم کہاں ہو

ہمیں اپنے منے گھر کا کچھ پتہ بتاؤ

کیا وہاں بہتی ہوئی ندیاں ہیں جن میں ٹھنڈا اور شفاف پانی ہے؟ کیا ان ندیوں کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا؟ کیا وہاں نیلی آنکھوں اور گھونگریلی زلفوں والی دو شیرازائیں بھی ہیں، جن کے عناب گوں رخسار کبھی نہیں

مُرجھاتے؟

کیا وہاں مکنی کے بیٹھے سنے، شیریں سب، تازہ شہد اور خوشبودار جنگلی پھول بھی ہیں؟“

کافروں کے تین بڑے تہوار ہیں جو ان کے سادہ نظام زندگی کے عین مطابق ہیں۔

1..... پوز:- انگور کا تہوار، ستمبر کے مہینے میں منایا جاتا ہے اس مہینے میں انگور پک جاتے ہیں اور توڑنے کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ سارے کا سارا قبیلہ جمع ہو کر انگور اکٹھے کرتا ہے۔ انگور کا رس نکالا جاتا ہے۔ یہ رس لکڑی کے بڑے بڑے پیپوں میں بھر کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ یہ اگلے موسم سرما تک کام دے سکے۔ یہ رس شراب بن جاتی ہے سخت سردی کے دنوں میں لوگ پانی کی بجائے شراب ہی پیتے ہیں۔

2..... چتر ماست:- برف باری کا تہوار، دسمبر کے آخری ہفتہ میں کرسمس کے لگ بھگ منایا جاتا ہے۔ اس میلے میں ایک ایسے نو جوان کا انتخاب ہوتا ہے جو سارے قبیلے کے مویشی چرانے کے لیے ان محفوظ وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں برف نہیں پڑتی۔ ان محفوظ وادیوں تک پہنچنے میں بڑے بڑے کٹھن مراحل طے کرنے پڑتے ہیں، کڑا کے کی سردی میں یہ سارا سفر تنہا کرنا پڑتا ہے اس کے باوجود قبیلے کا ہر نو جوان دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کرتا ہے اور اس انتخاب کو اپنی بہت بڑی عزت افزائی سمجھتا ہے۔ اس خدمت کے عوض قبیلے کی طرف سے انہیں ”بڈھا لک“ (جانناز نو جوان) کا اعزاز دیا جاتا ہے۔

اس نو جوان کو بڑے کڑ وافر سے رخصت کیا جاتا ہے۔ نو جوان لڑکیاں اس کے گرد چکر لگاتی ہوئی گاتی اور ناچتی ہیں۔ ”بڈھا لک“ دو روادیوں میں جا کر بھیڑوں اور گایوں کے گلوں کو لیے ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ جاتا ہے۔ اس دوران اس کے قبیلے کی لڑکیاں اس کی واپسی کے انتظار میں محبت کے گیت تیار کرتی ہیں۔

”تم بے برف کی گرم وادیوں میں زندگی کے دن گزار رہے ہو اور گایوں کا دودھ پی رہے ہو۔“

ذرا میرا بھی تو خیال کرو کہ برف پوش چوٹیوں میں بند، خشک انگور اور سیب کھا رہی ہوں اور تمہاری یاد ہر لمحہ تڑپا

رہی ہے۔“

ہفت روزہ ”حرف و حکایت“، 2 جولائی 1967ء



دوڑ پیچھے کی طرف

1937ء کی بات ہے کہ میں ”پرنس آف ویلز“ کالج جموں سے بی ایس سی کا امتحان دینے لاہور آیا۔ پہلے روز پچھو دینے امتحان کے سینٹر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میں اپنا رول نمبر تو جموں میں ہی بھول آیا ہوں۔ سینٹر کے انچارج نے کہا کہ جب تک تم یونیورسٹی سے اپنا فنی رول نمبر بنوا کے نہ لاؤ گے تمہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔

اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کا تصور میرے ذہن میں مسٹر آر پی سنگھ کی شخصیت تک محدود تھا۔ وہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے اور یونیورسٹی کے سارے اعلانات اور نتائج ان کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے۔ میری میٹرکولیشن کی سند پر بھی انہی کی دستخط شہت تھے اور وقتاً فوقتاً اخبارات میں ان کی بڑی دیدہ زیب تصویریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انگریزی سوٹ اور ٹائی پر وہ ایک مخصوص طرز کی کلف دار پگڑی باندھتے تھے اور ان کے چہرے پر دو دو بڑی شاندار نوکیلی مونچھیں نہایت آب و تاب سے لہرایا کرتی تھیں۔

میں بھگم بھاگ یونیورسٹی پہنچا تو کوئی اور طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو رجسٹرار کی تختی والا کمرہ ڈھونڈھا اور بغیر کسی تکلف کے چٹی اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں میرا چہرہ پسینے میں شرابور ہو گیا اور میری سانس بڑی طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں اسی طرح ہانپتا کانپتا مسٹر سنگھ کے سامنے جا کھڑا ہوا میری اس بیہوش کدائی کو دیکھ کر وہ ہلکا سا زیر لب مسکرائے اور نہایت دھیمے لہجے میں بولے۔ ”کیا ہوا؟ کیا آفت آگئی؟“

میں نے ہانپ ہانپ کر اپنی داستان غم سنائی تو انہوں نے پوچھا۔ ”رول نمبر کیا تھا؟“

ستم بالا لائے ستم یہ کہ شامت اعمال سے اس گھبراہٹ میں مجھے اپنا رول نمبر تک یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اقبال جزم کیا تو مسٹر سنگھ کی پیشانی پر کچھ بل پڑ گئے اور کسی قدر تخی سے بولے ”عجب لا پرواہی ہے کم سے کم اپنا رول نمبر تو یاد رکھا ہوتا۔“

میں مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ سنگھ صاحب نے چپڑا سی بھیج کر دفتر کے ایک بابو کو بلایا اور اس سے چند رجسٹر منگوائے ایک رجسٹری ورق گردانی کے بعد انہوں نے فہرست نکالی اور مجھ سے کہا کہ اپنے تین چار ہم جماعتوں کے نام لو۔

میں نے فر فر اپنے ہم جماعتوں کے نام بولنے شروع کیے چند نام سن کر مسٹر سنگھ نے کہا۔ بس بس کافی ہے رول نمبر مل جائے گا۔“

پھر انہوں نے گھڑی دیکھی اور کہا ”وقت بہت کم ہے تم جا کر امتحان میں بیٹھو پرچہ ختم کرنے کے بعد رول نمبر لیتے جانا۔“

ساتھ ہی انہوں نے اپنے چھپے ہوئے سرکاری فارم پر اپنے ہاتھ سے امتحان کے سینٹر کے انچارج کی طرف ایک تحریر لکھ دی کہ اس امیدوار کا فلاں نمبر کا شنئی نمبر تیار ہو رہا ہے اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ دستخط کرنے کے بعد انہوں نے اس کے نیچے خود اپنی سرکاری مہر لگائی اور میرے حوالے کر دی۔

اُس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی لڑکا میں ہر چھوٹا بڑا استاد باون گز کا ہی نظر آیا کرتا تھا۔ کسی شعبے کا کوئی استاد کسی جانب سے گزر رہا ہو تو اکثر طلبہ ادب سے ایک طرف ہٹ کر اسے رستہ دے دیا کرتے تھے۔ استاد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بہت سے منچلے طالب علم اپنے سگریٹ چھپا لیا کرتے تھے۔ ہر استاد اپنے علم کے سنگھاسن پر اس طرح جم کے بیٹھا ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کھاسلہ پر گفتگو کرنا کم از کم میرے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔ اس لیے کلاس روم سے باہر ان کے ساتھ براہ راست کان لگا کر اپنا کام چلا لیا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف اساتذہ کرام کا بددیہ رکھنا تھا تو دوسری طرف وائس چانسلر کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارے لیے وہ کسی دوسرے کڑہ کی مخلوق کی برابر تھا اور کبھی کبھی دُور سے اس کی ایک جھلک دیکھ لینا ہی نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا تھا۔

جس زمانے میں مسٹر وولٹر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے وہ کبھی کبھی یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کا گشت لگانے پیدل گھوما کرتے تھے جس طرف سے ان کے گزرنے کا امکان ہوتا تھا بہت سے طلبہ اور دوسرے لوگ سڑک کے دورویہ کھڑے ہو کر دیر دیر تک ان کا انتظار کیا کرتے تھے تاکہ سر رہے ان کی ایک جھلک دیکھ پائیں۔ پچھلے ایک سو برس میں پنجاب یونیورسٹی کے نئے اور پرانے علوم و فنون کے ہر شعبے میں نہایت تیز رفتار ترقی ہوئی ہے لیکن جہاں تک طلبہ، اساتذہ، رجسٹرار اور وائس چانسلر کے باہمی روابط کی روایات کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

ماہنامہ ”مخبر“ 1982ء



صدر بھٹو کے نام ایک خط

جناب صدر!

میں آپ کی خدمت میں یہ کھلی چٹھی لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں جس کی تین وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے آپ سے دیرینہ نیاز مندی حاصل رہی ہے اور پاکستان کی تاریخ کے اس عجیب دور میں رفاقت کا موقع بھی ملا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ایک نیا رخ دینے میں آپ نے جو کردار ادا کیا ہے اسے میں نے نہایت قریب سے دیکھا ہے اور حسب توفیق اس میں کسی قدر حصہ بھی لیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی سول اور ملٹری سروسوں میں یہ نیاز مند ہی پہلا شخص تھا، جس نے جنرل یحییٰ اور لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ کی نااہلیت اور ناپاک ارادوں کو نہ صرف بھانپا بلکہ بھری محفل میں انہیں برملا بیان بھی کر دیا۔

3 اپریل 1969ء کو جنرل یحییٰ نے اپنی حکومت کی پہلی مینٹنگ منعقد کی تھی جس میں ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے سول اور ملٹری کے اعلیٰ حکام کو بلایا گیا تھا اس مینٹنگ میں جنرل یحییٰ خان اور پیرزادہ نے جس انداز میں ملک کی خدمت کرنے کے لیے اپنے عزائم کو بے نقاب کیا اس پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا کہ یہ ملک کی بد نصیبی ہے کہ دس سال کے اندر دوسری دفعہ مارشل لاء لگانے کی نوبت آئی ہے۔ اب اگر آپ کے یہی عزائم ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں تو یہ مارشل لاء بھی نہ صرف ناکام ہو جائے گا بلکہ اپنی ناکامی کے جوار بھائے میں عوام، فوج اور ملک کو بھی لے ڈوبے گا۔ میری اس عرضداشت پر بڑی ٹوٹوٹو میں ہوئی، لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ چنانچہ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مثل مشہور ہے دودھ کا جلا چھا چھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔

سابق صدر ایوب کے دور میں آپ کی طرح میں نے بھی ان کے بلند بانگ دعوؤں پر یقین کر کے مقدور بھران کا ساتھ دیا لیکن رفتہ رفتہ یہ انکشاف ہوتا گیا کہ ان کے بہت سے دعوے باطل اور بہت سے وعدے جھوٹے تھے۔ آپ تو فوراً ان سے الگ ہو گئے۔ میں نے بھی کم از کم تین بار ان کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کیا جو منظور نہ ہوا۔ لیکن اب جو میں نے جنرل یحییٰ اور جنرل پیرزادہ کے خطرناک ارادوں کو بھانپا تو میں نے اپنے استعفیٰ کی منظوری کا بھی انتظار نہ کیا اور ملک چھوڑ کر باہر چلا گیا کیونکہ میرا ضمیر مجھے ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی ان لوگوں کا ساتھ دوں، جن کی رگ رگ میں شراب و شر، ریشے ریشے میں لالچ و فریب اور خون کے قطرے قطرے میں خود غرضی، جھوٹ اور فریب کا زہر چا ہوا ہے۔

آپ کو یہ خط لکھنے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اُن چند جنسی مریضوں، دولتمندوں اور اقتدار کے غلاموں اور بُزدلی اور کمینگی کے پجاریوں نے آپ کے لیے جو وراثت چھوڑی ہے وہ اس شاندار ملک، اس غیور قوم اور ان بہادر افواج کا بے بن جن کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا کرتا تھا۔ آپ جواں سال بھی ہیں اور جواں ہمت بھی اس کے علاوہ آپ کے

پاس علم و شعور کی دولت بھی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی ذاتی لائبریری بڑی وسیع اور شاندار ہے۔ اس میں پرانی اور نادر کتابیں بھی ہیں اور علومِ حاضرہ کی تازہ ترین نادر تصنیفات بھی، یہ کتابیں صرف الماریوں کی زینت ہی نہیں بلکہ آپ انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ علوم و فنون کے اس ذخیرے نے آپ پر یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی ہے کہ آج کے ماحول میں پاکستان کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ عمل ہے۔ عمل کے فلسفے کا نچوڑ اقبال نے اپنے ایک شعر میں یوں ادا کر دیا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قول و فعل میں ہم آہنگی اور ربط ہو تو عمل میں نیکی اور سچائی ہوتی ہے۔ قول و فعل میں تضاد اور تضادم ہو تو اس سے بد عملی وجود میں آتی ہے۔ آج ہمارا وطن نہ تو بے عملی کی عیاشی برداشت کر سکتا ہے اور نہ بد عملی کا مزید شکار ہو سکتا ہے۔ آج ہمیں حکومت کی جگہ خدمت، تقریر کی جگہ تعمیر، انتشار کی جگہ اتحاد اور اختلاف کی جگہ اتفاق کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری آپ سے کچھ گزارشات ہیں جو افراد یا ادارے یا جماعتیں پاکستان کی وحدت اور سالمیت پر یقین رکھتی ہوں ان پر صرف اس وجہ سے ملک دشمنی یا غداري کا خطاب نہ لگنے دیں کہ ان کے اپنے اپنے سیاسی منشور ایک دوسرے سے مختلف اور الگ الگ ہیں۔ حُب الوطنی کا ٹھیکہ نہ کسی ایک ادارے کا ہے اور نہ کسی ایک جماعت کا۔ حُب الوطنی تو قوم کا سانس ہوا کرتی ہے۔ جب تک یہ سانس آتی رہے تو میں آزاد رہا کرتی ہیں اور جب یہ سانس اکڑ جائے تو اس قوم پر غلامی کے گدھ منڈلانے لگتے ہیں۔ اس لیے اپنے دورِ اقتدار میں اگر آپ نے سیاسیات میں تخل اور برداشت، معاشیات میں ہمواری، نظم و ضبط میں منصفانہ رسم و رواج اور تحریر و تقریر میں آزادی کو فروغ دیا تو آپ ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کریں گے۔

2۔ مشرقی پاکستان ہمیشہ سے پاکستان تھا، پاکستان ہے اور انشاء اللہ پاکستان ہی رہے گا اس پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ایک عارضی سا دور ہے۔ مشرقی پاکستان سے بھارت کا قلع قمع کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔ اصلی منتقم تو اللہ کی ذات ہے۔ ہماری جنگ تو صرف انصاف کی جنگ ہے۔ جب تک مشرقی پاکستان اور کشمیر میں ہم انصاف کی یہ جنگ لڑ کر جیت نہ لیں گے اس وقت تک ہماری قومی زندگی نامکمل، ہماری خودداری کی گردن ٹھکی ہوئی اور ہمارے ایمان کی کمر خیدہ رہے گی۔

3۔ جنگیں انصاف کی ہوں یا انتقام کی، بغیر لڑے نہیں جیتی جاتیں۔ شجاعت اور جوانمردی میں ہماری مسلح افواج دنیا کی کسی فوج سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس بار جن جن افراد، امور اور عناصر نے ہماری شاندار افواج کو فتح مندی سے ہم کنار ہونے سے روکا ہے۔ ان کا پورا پورا جائزہ لیا جائے اور مکمل محاسبہ کیا جائے۔

علامہ اقبال کے الفاظ ہیں

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

4۔ کہنے کو تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ

مومن ہے تو بے نیل بھی لڑتا ہے سپاہی

ہم مسلمان تو ضرور ہیں لیکن کوئی اتنے مومن بھی نہیں۔ اس لیے ہمیں ایمان کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں کا بھی پورا پورا بندوبست کرنا چاہیے۔ بھارت کے عزائم اور روس کی منافقت کے پیش نظر ساری دنیا میں پاکستان کا ایک ایجینڈا پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ضرورت ہمارے موجودہ سفارتخانے کس حد تک پورا کر سکتے ہیں اس کا جائزہ لے کر مناسب اقدامات کیے جائیں اس سلسلے میں آپ کی توجہ ان پاکستانیوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو تارکین وطن کہلاتے ہیں اور زیادہ تر انگلستان میں مقیم ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے ملک کا سفیر ہے۔ یہ لوگ یہاں ٹیلی ویژن اور اخبارات میں پاکستان کے خلاف زہر اُگلتا ہوا دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں۔ یہاں کا متعصب معاشرہ ان پر طرح طرح کے چر کے بھی لگاتا ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ان پاکستانیوں کو حب الوطنی اور جذبہ ایثار پر ذرا سافرق بھی نہیں پڑتا وطن عزیز پر ذرا سی آفت آئے تو ان کے وجود کا ذرہ ذرہ بے قرار ہو جاتا ہے یہ لوگ کام چھوڑ چھوڑ کر بارش، برف اور شدید سردی میں پاکستان کے حق میں جلوس نکالتے ہیں۔ اپنی تنخواہ کے بند لٹانے بھوں کے ٹوں چندوں میں دے ڈالتے ہیں اور ضرورت پڑے تو وطن واپس جا کر اپنا شن من دھن قربان کرنے کے لیے بھی کمر بستہ رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے سفارتخانوں اور ہائی کمشنروں پر ہمارے غریب ملک کے لاکھوں پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے عوض وہ ملک کو کیا دیتے ہیں و سکی کی ایک بوتل؟ جو سر شام وہ خود ہی پی لیتے ہیں فروٹے سالٹ کا ایک ڈبہ، جو وہ اگلی صبح خود اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔

بھٹو صاحب! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہمارے سفارتخانے کم از کم ان لوگوں سے سبق سیکھیں جو حلال روزی کی تلاش میں گھر سے بے گھر ہوئے بیٹھے ہیں، جن کی رگ رگ میں وطن کی محبت اور خدمت کا جذبہ اس قدر چا ہوا ہے جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو؟

5۔ اپنی حالیہ شکستگی کے باوجود بھارت کو کیسے شکست دی جائے۔

6۔ مشرقی پاکستان کے سادہ مسلمانوں پر بنگلہ دیش کے ڈھول کا پول کیسے کھولا جائے۔

مشرقی پاکستان کے بر خود غلط خواص کو کون، کس طرح اور کیا سمجھا جائے۔

ان تقاضوں کی روشنی میں ہمارا آئین کیسا ہو جو ہمارے نصب العین پر پورا اترے اور مشرقی پاکستان، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے لیے بھی نہ صرف قابل قبول بلکہ باعث تسکین و تمکین ہو۔؟

اس دوران میں مشرقی پاکستان میں ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو غیر بنگالی ہیں؟ ان ساٹھ ہزار یا ستر ہزار یا اسی ہزار یا تیرانوے ہزار مجاہدوں کا کیا ہوگا جو وطن کی خدمت میں مشرقی پاکستان گئے اور ہمارے بد اعمال لیڈروں یا گیدڑوں کے طفیل آج ہندوستان کے ہاتھ میں قربانی کے بکروں کی طرح قید ہیں؟

جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو ان ساٹھ ہزار یا تیرانوے ہزار مجاہدوں کے لواحقین کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔

جناب صدر! ان بے شمار سوالوں میں سے صرف چند ایک سوال ہیں جو ایوان صدر میں ضرور آپ کی راتوں کی نیند حرام کر رہے ہوں گے۔ میں نے اپنی ذاتی دوستی کے باوجود ابھی تک آپ کو پاکستان کا صدر ہونے پر مبارکباد نہیں دی۔ اس وقت آپ کو مبارکباد کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔

ادیب اور مسئلہ کشمیر

میں اراکین اہل قلم کانفرنس کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس اختتامی اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر شامل ہونے کا شرف بخشا۔ کانفرنس کے مقرر کردہ موضوع پر ہم نہایت بلند پایہ خیالات کا نثری اور شعری اظہار سن چکے ہیں۔ ان پر مزید اضافہ کرنے کی صلاحیت یہ بندہ عاجز نہیں رکھتا لیکن آپ کی مہربانی اور میزبانی کا کسی قدر حق ادا کرنے کے لیے چند مختصری گزارشات حاضر خدمت کرتا ہوں۔

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس کے چار ہزار سال کے قصص و روایات کا کچھ حصہ ”راج ترنگی“ کی کلاسیکل سنسکرت میں درج ہے۔ اس کے برعکس ریاست کی تحریک آزادی کی داستان اگرچہ ظاہری طور پر 1925ء سے شروع ہوتی ہے، مگر تاحال ادھوری ہے۔ اس کے باوجود تحریک آزادی کشمیر کی ساٹھ سالہ داستان کئی لحاظ سے راج ترنگی کے ہزاروں سالوں پر بھاری ہے۔ جدوجہد آزادی کی اس تحریک کے ایک ایک پہلو پر ایک مستند اور مکمل راج ترنگی شہیدوں کے خون کی رنگینی سے تحریر ہو سکتی ہے۔

مارچ 1846ء میں جب انگریزوں نے یہ ریاست ایک ڈوگرہ مسٹی گلاب سنگھ کے ہاتھ 75 لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دی تھی تو اس نرخ پر یہ زمین رشک فردوس بریں، موجودہ زمانے کے تین پیسوں میں ایک ہزار مربع گز پر اٹھی تھی۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے بھی انسانوں کی قیمت اوسطاً سات روپے فی کس پڑی تھی۔ اس شرمناک انسان فروشی کا بدلہ چکانے کے لیے سری نگر میں شیخ محمد عبداللہ نے ریڈنگ روم پارٹی اور قائد ملت چوہدری غلام عباس نے جموں میں ”ینگ میوز مسلم ایسوسی ایشن“ کے نام سے سیاسی بیداری کی وہ شمع روشن کی، جس نے رفتہ رفتہ ساری ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس کی بازگشت سارے برصغیر میں گونج اٹھی اور مہاراجہ ہری سنگھ کی سرکردگی میں اندرون ریاست مسلمانوں کے خون کی ہولی اس شدت سے کھیلی گئی کہ اس کے چھینٹے متحدہ ہندوستان میں دور دور تک اڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 14 اگست 1931ء کو پہلی بار سارے برصغیر کے طول و عرض میں ”کشمیر ڈے“ منایا گیا۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ سولہ برس بعد اسی تاریخ کو پاکستان کا قیام بھی وجود میں آیا۔ اب 14 اگست کو ہر سال پاکستان ڈے منایا جاتا ہے لیکن یوم پاکستان کا جشن آزادی فی الحال شرمندہ تکمیل ہے، کیونکہ مقبوضہ کشمیر کا الحاق ابھی تک باقی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کی مشترکہ قیادت نے مسلمانان ریاست میں تحریک آزادی کی جولہر پیدا کی تھی اس پر اسٹریٹ سیوم سیوک سنگ نے شب خون مارا اور شیخ صاحب کو ہائی جیک کر کے کانگریس کی جھولی میں ڈال دیا۔ چوہدری صاحب نے نظریہ پاکستان اور قائد اعظمؒ کے ساتھ وفا کی۔ اس کے بعد یو این او کی سیکورٹی کونسل تک جو کچھ ہوا

وہ کوئی راز کی بات نہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو قلابازیاں پر قلابازیاں کھاتے رہے۔ ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گئیں اور اب وزیر اعظم راجیو گاندھی بھی حسب توقع بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سجان اللہ بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

پچھلے دنوں ایک پاکستانی صحافی نے شری راجیو گاندھی کا انٹرویو کرتے ہوئے سوال پوچھا تھا کہ آپ کے نزدیک مسئلہ کشمیر کا کیا حل ہے؟

موصوف نے جواب دیا، اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ پاکستان ہمارے مقبوضہ علاقے کب خالی کرتا ہے۔ یہ لگا سا جواب سن کر بیچارے صحافی کو اس مسئلہ پر اور کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ معلوم نہیں اس صحافی کا کیا احساس تھا۔ احساس کمتری کی وجہ ہماری زبردستی ہے یا بھارت کی زبردستی۔

یہ تو بھارت کا رویہ ہے۔ دوسری جانب روس بھی ہماری طرف خون آشام نگاہیں جمائے بیٹھا ہے۔ یو این او کی سیکورٹی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ کم از کم 133 بار زیر بحث آچکا ہے۔ کبھی بھارت کی درخواست پر، کبھی پاکستان کی تحریک پر۔ ان میں 132 بار سوویت یونین نے کشمیر کے بارے میں کسی قرارداد پر نفی یا اثبات میں ووٹ ڈالنے سے ہمیشہ احتراز برتا تھا۔ یعنی ووٹ ڈالنے سے احتراز کیا تھا، لیکن اپریل 1962ء سے روس نے بھی اپنا رویہ بدل لیا اور 133 ویں بار اس مسئلہ پر اپنا وینو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد یہ مسئلہ اب تک بتدریج کھٹائی میں پڑتا جا رہا ہے۔ پہلے 1966ء میں اسے ایک منوط شدہ لاش کی طرح معاہدہ تاشقند کے تابوت میں دفن کیا گیا۔ اس کے چھ برس بعد معاہدہ شملہ نے اس تابوت پر لوہے کی مزید چادریں چڑھا دیں۔ اب نوبت یہاں جا رسید کہ ہم الحاق کشمیر اور استعصواب رائے کی بات بھی منہ پر لائیں تو بھارتی حکمران نتھنے پھولا پھولا کر گر جئے برسنے لگتے ہیں کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور ایسی باتیں ہمارے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہیں۔

اس کا ایک مہلک نتیجہ یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کا وجود عالمی ذہن اور ضمیر سے رفتہ رفتہ محو ہوتا جا رہا ہے۔ چند برس پہلے تک کم از کم پاکستان میں جمعہ کی نماز کے بعد اجتماعی دعاؤں میں مسئلہ کشمیر کی کامیابی کی دعا ہمیشہ شامل ہوا کرتی تھی لیکن اب ہم فلسطین اور افغانستان کے مسلمانوں کے لیے دعا تو ضرور ہر جمعہ کے روز کرتے ہیں، لیکن کشمیر کا نام کوئی بھولے سے بھی نہیں لیتا۔

ان خارجی اور داخلی حالات میں اب ہم کریں تو کیا کریں، دراصل یہ کام حکومتوں کی پالیسیوں کے ذریعے نمٹائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں ہم اور آپ زیادہ دخل دینے کے مجاز نہیں۔ البتہ ایک فرض ہم سب پر نکلنا ہے، وہ ہے اسلام کے ارکان کو پابندی اور دیانت داری سے نبھانے کا فرض۔ یہ فرض صرف نماز، روزہ، یکساں عائد ہوتا ہے، وہی ادا نہیں ہو جاتا بلکہ ہر مسلمان کا ایک نہایت اہم فریضہ جہاد بھی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں زکوٰۃ اور حج ادا کرنے سے ہی ادا نہیں ہو جاتا بلکہ ہر مسلمان کا ایک نہایت اہم فریضہ جہاد بھی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم فوراً ہندوستان، اسرائیل یا روس جیسی سپر پاور کی خلاف جہاد کا اعلان کر دیں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے ہر شہری کو اس کی استعداد کے مطابق جہاد کی مکمل تربیت دی جائے تاکہ خدا خواستہ کسی بیرونی جارحیت کے موقع پر ہمارا بچہ، بوڑھا اور جوان اپنی ذات اور اپنے وطن کے دفاع کے لیے ہر لحاظ سے تیار ہو۔ یوں بھی تاریخ میں ایمانداروں کو کئی بار قلیل تعداد سے کثیر تعداد پر فتح حاصل ہوتی رہی ہے۔ خوش قسمتی سے آج کل پاکستان اور آزاد کشمیر میں

انعام اسلام کو فروغ دینے کا چرچا بڑا عام ہے۔ اگر یہ جذبہ سچا اور یہ عزم پختا ہے تو خدا کے لیے اس کی ہمسما اللہ جذبہ جہاد کو زندہ کرنے سے کیجیے۔ یہ سچ ہے کہ ”اسلامی ہم“ کے مفروضے کی طرح جذبہ جہاد کے احیاء نو پر بھی بہت سی دنیا ہمیں تنقید اور تضحیک کا نشانہ ضرور بنائے گی لیکن یہی دنیا جو اسرائیل کو نسبتے فلسطینیوں کو قتل کرنے سے باز نہ رکھ سکی اور روس کی افغانستان پر قبضہ جمانے سے نہیں روک سکی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے سامنے ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر بھروسہ رکھنا شرط ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کی یہ سرزمین جہاد ہی کے ذریعے آزاد ہونی ہے۔ یہاں رگ رگ میں جہاد کا خون جاری و ساری ہے۔ یہاں کے رہنے والوں میں ایمانداری اور خلوص کا ایک خاص جذبہ موجود ہے اب ایک چھوٹا سا واقعہ سنا کر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

جنگ بندی سے پہلے 1948ء میں میرپور کا پرانا شہر ملے کا ڈھیر تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیب میں بٹھائے اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے، دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہماری جیب کو روک کر دریافت کیا ”بیت المال کدھر ہے؟“ اس زمانے میں آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال کہا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا ”بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟“

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا ”میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میرپور شہر کے ملے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی ایک بوری جمع کی ہے، اب اسے ایک کھوتی پر لا کر ہم بیت المال میں جمع کرانے جا رہے ہیں۔ میں نے بے اختیار احتراماً اس بزرگ کے پاؤں چھوئے، کیونکہ ایسے پاکیزہ سیرت لوگ اب کہاں ملتے ہیں؟ اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رُخ زبیا لیکر! لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے خمیر میں اس فرشتہ سیرت جوڑے کی امانت اور دیانت کی وراثت بدرجہ اتم موجود ہے۔ صرف اس پر جذبہ جہاد کی برکت کے چھڑکاؤ کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

روزنامہ ”جنگ“ راولپنڈی، 11 نومبر 1944ء

اینٹ کا جواب روپا

بھارت کے صوبہ اڑیسہ میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں اب تک نہایت قدیم ABORIGINAL قومیں آباد ہیں۔ ایک قوم کا نام ساورا ہے۔ ان کی اپنی ایک خاص تہذیب اور زبان ہے۔ 1946ء میں ایک انگریز ادیب ساورازبان کی ڈکشنری مرتب کر رہے تھے۔ وہ کئی برس سے ساورا قوم کے جنگلات ہی میں مقیم تھے۔ یہاں کے دوسرے بیرونی باشندوں میں چند بننے تھے جو وہاں کی خود رو بھنگ اور کیوڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک ہسپانوی مشنری تھے جو تیس برس سے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے اور پھر یکا یک یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ساورادیس میں ایک مولوی صاحب بھی جا پہنچے ہیں۔ اب یہ اضطراب پیدا ہوا کہ کہیں ساورا قوم میں اسلام کی تبلیغ بھی شروع نہ ہو جائے۔ چنانچہ اڑیسہ گورنمنٹ کے حکم سے پولیس کا ایک دستہ ساورادیس گیا اور اپنی نگرانی میں ان مولوی صاحب کو گھیر گھار کر کنک لے آیا۔ جب وہ صوبائی دارالحکومت پہنچے تو اپنے بابائے اردو نکلے۔

اڑیسہ میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ یا دو فیصد سے زیادہ نہ تھی لیکن ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شہری گھرانوں میں اردو بولنے کا رواج تھا چنانچہ جب بابائے اردو پولیس کی حفاظت میں کنک تشریف لائے تو مسلمانان اہالیان شہر نے لگے ہاتھوں مسلم مڈل اسکول کے احاطے میں ایک جلسہ کر ڈالا۔ کانگریس کی حکومت کا زمانہ تھا۔ کسی مسلمان افسر کا مسلمانوں کے بے ضرر جلسوں تک میں شریک ہونا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن میں صرف اس شوق میں نظر بچا کر وہاں پہنچا کہ ان مولوی صاحب کی بھی ایک جھلک دیکھوں جو سی آئی ڈی کی اطلاعات کی رو سے ساورا قوم کے دور افتادہ اور دشوار گزار جنگلوں میں اشاعت اسلام کی غرض سے پہنچے ہوئے تھے لیکن جب مولوی صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو یہ عقدہ کھلا کہ آپ وہاں آئے تو ضرور تبلیغ کے لیے تھے لیکن اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ اردو کی تبلیغ کے لیے۔

اپنی تقریر میں بابائے اردو نے اڑیسہ کی کانگریسی حکومت کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی غیر ملکی مشنری تیس برس سے وہاں عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہو تو کانگریس کے سرکاری دھرم پر کوئی آنچ نہیں آتی لیکن اگر ایک مسلمان نوپا اور شیعروانی پہن کر اس طرف آئے تو کانگریس کے ایوان حکومت میں زلزلہ آ جاتا ہے اور ”لحوق ضرر“ کا احتمال انہیں قدم قدم پر ستانے لگتا ہے۔

”لحوق ضرر“ کی ترکیب مولوی صاحب نے خود اپنی تقریر میں استعمال کی تھی لیکن سی آئی ڈی کا جو نمائندہ جلسے کی کارروائی لکھ رہا تھا وہ غالباً لحوق کو حلق کی جمع اور ضرر کو زور کا کوئی صیغہ کبیرہ سمجھا اور اس نے اپنی رپورٹ میں یہ اطلاع دی کہ ”اردو مولوی صاحب مسلمانوں کو زور کا لالچ دے کر گلا کاٹنے پر اکسارہے ہیں۔“

کنک کے اس جلسے میں مجھے پہلی بار بابائے اردو کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ کوئی بارہ برس بعد 1958ء کے شروع میں ایک روز اچانک آپ ابن انشا کے ساتھ میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے مجھے مسرت بھی ہوئی، حیرت بھی اور شدید ندامت بھی کیونکہ انجمن کے جو مصائب آپ نے بیان فرمائے وہ بے حد المناک اور حوصلہ شکن تھے۔ چند روز کے بعد میں بابائے اردو کو باری باری اس وقت کے وزیراعظم اور صدر مملکت کی خدمت میں لے گیا۔ ان میں سے ایک نے تو بڑی بے تکلفی سے پہلے یہ پوچھا کہ آپ کس مسجد کی امامت فرماتے ہیں؟ اس کے بعد انہوں نے مولوی صاحب مرحوم کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن جو فیصلہ صادر فرمایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ انجمن سازی مسلمانوں کا قدیمی پیشہ ہے۔ انجمنوں میں اندرونی تنازعات بھی مسلمانوں ہی کا طرہ امتیاز ہیں۔ پاکستان کی گلی گلی میں ایک چھوڑ دو دو تین تین انجمنیں چل رہی ہیں۔ اب اگر حکومت عالیہ ان انجمنوں کے داخلی معاملات میں الجھ جائے تو پھر ملک کا کاروبار کون چلائے گا؟

بابائے اردو مایوس ہو کر اپنے اسی حجرے میں جا بیٹھے جہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں نوے برس کی عمر میں اسی پچاسی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ آپ کے کمرے میں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی کا معقول انتظام رہتا تھا۔ یہاں آپ کبھی بجلی کے بغیر، کبھی پانی کے بغیر اور اکثر پیسے کے بغیر اپنے علمی و ادبی کام میں حسب سابق مصروف ہو گئے اور باہر اراکین حکومت ملک کے کاروبار کو کچھ ایسی چابکدستی سے چلاتے رہے کہ چند ہی مہینوں میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے 1958ء کا انقلاب آ گیا۔

چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مارشل لا، ریگولیشن تیار ہو گیا اور راتوں رات انجمن کا بابا از سر نو انجمن میں آ گیا۔ کچھ کم دو برس بعد جب بابائے اردو بیمار ہوئے تو صدر ایوب نے مری بلوا کر انہیں اپنے ذاتی معالج کی زیر نگرانی فوجی ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز صدر خود ان کی عیادت کو جاتے رہے اور جب ہسپتال کے ڈاکٹروں نے باہمی مشورے کے بعد صدر مملکت کو اطلاع دی کہ ہر انسانی کوشش کے باوجود قانون فطرت نافذ ہوا چاہتا ہے اور مولوی صاحب کا جہاد زندگی اردو کے شہید کو پاکستان کا غازی بنانے ہی والا ہے تو جلدی جلدی انہیں کراچی واپس بھیجنے کا بندوبست کیا گیا تاکہ انجمن کی امانت تحسین حیات انجمن تک پہنچ جائے۔

بابائے اردو کی وفات ذاتی، صفاتی اور اجتماعی طور پر ایک سانحہ عظیم تھی۔ ذاتی طور پر وہ مسلمانوں کی اس نشاۃ ثانیہ کی آخری شمع تھے جو سرسید کے ہاتھوں فروزاں ہوئی اور حائی، شہی، اقبال اور قائد اعظم کے چراغ سے چراغ جلا کر حصول پاکستان کی شاہراہ کو منور کرتی گئی۔ جب یہ آخری شمع بھی بجھ گئی تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کی ایک پوری صدی ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئی۔

صفاتی طور پر بابائے اردو ان درخشاں روایات کا جیتا جاگتا مرقع تھے جن میں ہر ذاتی آرام، مفاد اور خواہش، خدمت کے جنون، کام کی لگن اور دیانتداری کی دھن پر قربان ہو جاتی ہے ایک انسان میں یہ صفات صدیوں کے بعد یکجا ہوتی ہیں اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے ایک ایسے انسان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہماری دوسری خوش نصیبی یہ ہے کہ بابائے اردو کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو کی انتظامیہ میں جو خلاء پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کرنے کیلئے صدر ایوب نے اپنے قابل ترین اور معتمد ترین رفیق، جناب اختر حسین کو نامزد کیا اور جمیل الدین

مالی جیسے انٹک اور مخلص کارکن کو انجمن کا سیکرٹری مقرر کیا۔

پاکستان کے نظم و نسق اور تعمیر و ترقی میں اختر حسین صاحب کا جو حصہ ہے اس کے پیش نظر وہ ریٹائر ہونے کے بعد اپنا وقت اور اپنا تجربہ بڑے مہنگے داموں فروخت کر سکتے تھے لیکن جیسا کہ ابن انشانے اپنے خوبصورت انداز میں اشتہار دے دیا ہے وقت اور تجربہ بیچنے کی جگہ اختر حسین صاحب نے اردو کالج کے لیے اینٹوں کے بیوپار شروع کر دیا ہے۔

اردو محاورے میں اب تک اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا رواج رہا ہے۔ آج ہم یہاں اردو کی ٹکسال میں بیٹھے ہیں کیوں نہ اب اس محاورے کی صورت بدل کر اینٹ کا جواب روپے سے دینے کی طرح ڈالی جائے۔ پیش ازاں کہ یہ اینٹیں کسی ذخیرہ اندوز کے ہاتھ میں پڑ کر بلیک میں بکنے لگیں، میں اپنے سارے خاندان کے لیے اردو کالج کی اینٹوں کی رسد جمع کر لینا چاہتا ہوں۔ اب یہ حسن اتفاق ہے کہ اس ڈھاک میں فقط تین پات ہیں۔ یعنی یہ خاندان صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ میری ان تین اینٹوں سے بظاہر کالج کی عمارت میں زیادہ فرق نہ پڑے گا لیکن میں انہیں اپنے لیے سعادت کا سامان سمجھتا ہوں اور یوں بھی یہ اتنی بڑی بڑی بلند و بالا عمارتیں جو آپ جگہ بہ جگہ دیکھتے ہیں۔ آخر دو دو، تین تین اینٹوں کا مجموعہ ہی تو ہیں۔

”قومی زبان“ کراچی، ستمبر 1968



سیرت نگاری کا فن

سیرت نگاری کا فن عربی زبان کے علاوہ کئی اور زبانوں میں بھی تاریخ کے ہر دور میں مسلسل عروج کی جانب ترقی پذیر رہا ہے لیکن اردو میں سیرت نگاری کی عمر کم و بیش 115 برس کے قریب بنتی ہے۔

1857ء میں جب اس برصغیر پر سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا تو اسلامی معاشرے کی جمیعت و تنظیم، اس کے نظام تعلیم اور نظام معیشت اور نظام صنعت و حرفت کے علاوہ مسلمانوں کا دینی اور روحانی نظام بھی انگریزوں کے نشانہ عتاب و انتقام میں آ گیا۔

ایک طرف برطانوی حکومت کی ملی بھگت سے عیسائی مشنریوں کی یورش شروع ہو گئی۔ دوسری طرف انگریزوں کی شہ پا کر ہندوؤں کی آریہ سماج تحریک نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سر اٹھایا۔

تیسری جانب یورپ کے مستشرقین کی ایک پوری جماعت نے عالمانہ اور محققانہ لبادہ اوڑھ کر حیلے بہانے سے اسلامی اقدار اور نظام کو تنقید و تشکیک و تضحیک کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ یورپ کے اس دور میں علم کلام کا مرکزی رخ فلسفہ سے موڑ کر تاریخ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اس علمی کج روی کی آڑ میں اصل مقصد اسلام کے خلاف تاریخی ریشہ دوانیوں کو فروغ دینا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر یہ علمی سازش اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہی اور خود مسلمانوں کے درمیان جدید روشنی کی تعلیم یافتہ نئی نسل انگریزوں اور یورپین مستشرقین کے پھیلائے ہوئے زہر سے متاثر ہونے لگی۔

سیاسی شکستگی، معاشی بد حالی، ثقافتی ابتری اور روحانی اقدار کی پامالی کے اس تاریک دور میں مسلمانوں کے دینی شعور اور ایمان کو سہارا دینے اور محکم رکھنے کے لیے علمائے کرام اور روحانی پیشواؤں نے بہت سے راستے اختیار کیے۔ ان راستوں میں ایک یقینی راستہ سیرت طیبہ کی نشر و اشاعت کا اہتمام تھا کیونکہ احیاء ایمان میں حب رسولؐ اور ذکر رسولؐ کیما کی طرح اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

چنانچہ اسی زمانے میں سر سید احمد خان نے سروہم میور کی گستاخانہ، دل آزار اور زہریلی کتاب ”لائف آف محمدؐ“ کا مفصل اور مدلل جواب لکھا۔ یہ کتاب ”خطبات احمدیہ“ کے عنوان سے 1869ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو اردو میں سیرت کی اولین کتاب کہنا غالباً درست ہوگا بعض وجوہ کی بناء پر سر سید کی تحریک، تحریر اور تقریر اپنے زمانے کے علمائے قدیم میں مقبول نہ تھی۔ اس لیے یہ کتاب بھی اس دور میں قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکی لیکن اس زمانے میں مسلمانوں کی نئی نسل کا ایک پھیلتا ہوا طبقہ جدید علوم و فنون کی روشنی کے سانچے میں دن بدن تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ یہ لوگ یورپین مستشرقین کی گمراہ کن علمی یلغار کی زد میں بنے ہوئے براہ راست ہدف تھے۔ ”خطبات احمدیہ“ نے اس طبقہ کی بروقت اور بھرپور رہنمائی کر کے انہیں حضور رسولؐ کا امتی ہونے پر فخر انبساط کے جذبے سے مالا مال رکھا۔

قدیم علماء اور صوفیاء کے خانوادوں میں مولانا شاہ سلیمان پچلاوی کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے سب سے پہلے سر سید کی تعلیمی تحریک کی حمایت کی۔ انہوں نے 1885ء میں اپنی بستی میں تحریک سیرت کی بنیاد رکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے

مثلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی کارگزاریوں پر اپنی گہری چھاپ لگائی اور ان کے سالانہ جلسوں کو بیان سیرت کے ایک خاص دناواز آہنگ میں رنگ دیا۔ اس پُر آشوب زمانے میں اس تحریک نے بے شمار مسلمانوں کے دل میں اسلام کے ساتھ ایک تازہ لگاؤ اور لگن کو ابھارا اور زندہ رکھا۔

یہی تحریک جا بجا سیرت کی محفلوں، کمیٹیوں اور باضابطہ سیرت نگاری کی محرک بھی ثابت ہوئی۔

اس وقت تک ”خطبات احمدیہ“ کے علاوہ جس کا انداز مناظرانہ تھا اردو میں کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب موجود نہ تھی جو سیرت طیبہ اور تاریخ اسلام کی مکمل تصویر پیش کر سکے۔ اس کی کوپورا کرنے کیلئے مولانا حسن میاں نے ایک جامع سیرت نبوی مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن دو تین چھوٹی چھوٹی جزوی کتابوں کے علاوہ اس منصوبے میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

سیرت نگاری کی پہلی بھرپور اور کامیاب کوشش کا سہرا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے سر ہے جن کی تصنیف ”رحمۃ للعالمین“ 1912ء میں شائع ہوئی۔

اس کے چھ برس بعد سیرۃ النبیؐ کی اشاعت کا آغاز ہوا، جس کی ابتداء مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی اور تکمیل کی سعادت مولانا سلیمان ندوی کے حصے میں آئی۔

سیرت طیبہ پر یہ دو بڑی اور لا جواب کتابیں کلاسیکی درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے بعد اردو میں سیرت نگاری کی جتنی کوششیں بار آور ہوئیں وہ قریباً قریب اسب انہی کلاسیکی شاہراہوں کی راہ نور ہیں۔

ان کتابوں کا حجم ضخیم اور اسلوب بیان عالمانہ، محققانہ اور ٹھیکہ روایتی ہے۔ عقیدت مندوں کے لیے سیرت نگاری کا یہ گراں قدر سرمایہ یقیناً مشعل راہ اور جنت نگاہ ہے لیکن ہمارے معاشرے میں آج کل کا انسان جس ماحول میں گھرا ہوا ہے اس کے تقاضے کچھ اور ہیں ایک طرف جدید علوم و فنون کی کشش سے سائنس، ٹیکنالوجی اور عقل پرستی کی طرف کھینچتی ہے۔ دوسری طرف عالمی ذرائع ابلاغ کے قوی ہیکل آسیب اس کے ذہنی مزاج کو طرح طرح کی بھول بھلیوں میں بھٹکاتے رہتے ہیں۔ تیسری طرف برق رفتار نقل و حرکت الیکٹرونکس اور کمپیوٹر کی دنیا اسے دن بدن زیادہ سے زیادہ عدیم الفرصہ بنانے میں ہر وقت مصروف عمل رہتی ہے۔ ایسے ماحول میں آج کے انسان کا اگر عقیدہ ہی سلامت رہے تو نفیست ہے لیکن اس میں عقیدت مندی کا رنگ بڑی حد تک پھیکا پڑ جانے کا احتمال ہے۔ روایات کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے اور کلاسیکی طرز کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی اس کے بس کا روگ نہیں رہتی۔ اس لیے خطرہ ہے کہ ہمارے موجودہ ماحول کا دباؤ ہمارے معاشرے کو رفتہ رفتہ سیرت طیبہ کے اس انمول خزانے سے بیگانہ کر دے جس کا مطالعہ دین میں عشق کی چنگاری ساگانے اور عشق میں جنون کا شعلہ بھڑکانے کے لیے لازمی ہے۔

سیرت نگاری کے فن کو جدید ماحول اور جدید ذہن کے تقاضوں پر حاوی کرنا موجودہ دور کی ایک انتہائی اہم ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنا ہمارے دانشوروں، ادیبوں، تاریخ دانوں اور سیرت نگاروں کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہے اور ایک کھلا چیلنج بھی۔

التماس

یہ حقیقت ہے کہ سوویت روس کی انجمن مصنفین مناسب مواقع پر ہمیں اپنے تہنیت و خیر سگالی کے جذبات سے آگاہ کرتی رہتی ہے، اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان ملکوں کے مابین بھی جن کے درمیان نظریاتی، سیاسی اور دیگر رجحانات کا سخت اختلاف ہو، اکثر اوقات ذہنی مفاہمت کے میدان نکل آتے ہیں اسی لیے مجھے یہ جرأت ہوتی ہے کہ ایک ایسے لب و لہجہ میں آپ سے گفتگو کروں جو سیاست اور ڈپلومیسی کا روایتی لب و لہجہ نہیں کہلاتا۔

امید ہے آپ اسی جذبہ کے تحت ان الفاظ پر غور کریں گے۔

آپ کو علم ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور ہمیں اپنے ملک کی نظریاتی اساس..... اسلام پر فخر ہے۔ اس لیے اگر اس میں مداخلت کی کوشش کی جائے یا اس کی بات بھی کی جائے تو ہمیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ہمارے علم میں یہ بھی ہے کہ خود آپ کی مملکت بھی ایک نظریاتی ریاست ہے اور آپ کو بھی ایسے ہی جذبات رکھنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ٹھیک ہی رہتی ہے لیکن اصل قضیہ تب شروع ہوتا ہے جب ایک فریق دوسرے فریق کو مختلف محرکات اور ڈھنگوں سے اپنی طرف گھسیٹنے، اپنی راہ پر لگانے اور تخریب تک کرنے پر اتر آتا ہے۔ اپنی بات تو ہم آپ کو یقین دلا سکتے ہیں کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ہماری خواہش ہے کہ ہمارے باب میں آپ کا احساس بھی ایسا ہی ہو لیکن بہت دفعہ ایسے حالات رونما ہو جاتے ہیں جو باعث تشویش اور موجب مایوسی ہوتے ہیں۔

اب مثال کے طور پر کشمیر کے معاملہ ہی کو لیجیے۔ یہ پاکستان اور بھارت کے درمیان صرف ایک سیاسی قضیہ یا علاقائی تنازعہ نہیں ہے بلکہ اہل کشمیر کا ایک بنیادی مسئلہ ہے یعنی یہ کہ اہل کشمیر کو حق خود ارادیت ملنا چاہیے یا نہیں؟ گویا اس طرح یہ مسئلہ انسانی اور اخلاقی بن جاتا ہے۔

جس نظریہ کے تحت آپ کا نظام مملکت چل رہا ہے اس میں بھی حق خود ارادیت جزو عقیدہ ہے۔ اس موضوع پر نظریاتی کتابوں سے تو کم از کم یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

لیکن عمل کی دنیا میں ہمیں کیا نظر آتا ہے؟ نظریہ آتا ہے کہ جو اہل کشمیر کے حق خود ارادیت کا معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جیسے عالمی ادارہ میں پیش ہوا، ساری دنیا کے ملکوں میں روس سب سے پہلا ملک ہوتا ہے جو ویٹو کا استعمال کرنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ یعنی وہ ملک جو ایک طرف خود ارادیت کا علمبردار بنتا ہے خود ہی اس کی عملانی بھی کر دیتا ہے۔ محض سیاسی دھڑے بندی کی خاطر اور اس طرح سیاسی مصلحت کوشی پر نصب العین کو قربان کیا جا رہا ہے۔ خود آپ کے علم سیاست میں جسے ”انماض“ کہا گیا ہے، یہ شے ”انماض“ نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ نے حال ہی میں اسٹالن کی لاش کو اس جگہ سے جو قومی تکریم کی جگہ ہے نکال باہر کیا اور الزام لگایا گیا ہے کہ

اپنی علم و تہدی، وحشیانہ حرکات اور افراط جیسے جرائم کا مرتکب ہوا تھا۔
 آج خود آپ کے نظریہ کا ہی ایک بنیادی تصور بری طرح پامال کیا جا رہا ہے اور اس سے "افراط" کیا جا رہا ہے
 جس کی وجہ سے کشمیری اپنے حق خود ارادیت سے محروم ہو رہے ہیں اور اس طرح ان پر ظلم و ستم ڈھانے اور انہیں ہمیشہ
 ظالم کہنے میں مدد دی جا رہی ہے۔

آپ کو علم ہے کہ وقت بڑا سخت محسوس ہوتا ہے اگر کسی اور نے ایسا نہ بھی کیا تو تاریخ تو ضرور ایک نہ ایک دن ان
 جرائم کو شرف و دیانت انسانی کی مقدس بارگاہ سے (جہاں اس وقت انہیں پناہ دی جا رہی ہے) باہر نکال کر رہے گی۔
 حساس ضمیر کے مالک ہونے کی حیثیت سے آپ اہل قلم اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ خلاصہ بحث یہی نکلا
 ہے کہ انسانیت کی روح اخلاقی اقدار میں مضمر ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اقدار مملکتوں، سیاستدانوں اور سیاست بازی
 سے زیادہ دیر تک زندہ رہنے والی چیزیں ہیں۔

صرف مادہ اور سائنس کی سنے، شہد کی سرشاری انسان کو کفایت نہیں کر سکتی۔ سوچے انسان نے بیرونی غلامی میں
 پروا نہ کرنے کا ابھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ طیور و مکس نہ جانے کب سے وہاں تک چکر لگا رہے تھے۔ آدمی نے میزائل اور
 جوہری آلات ضرب و ہلاکت ابھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے کہ ٹڈیاں دور مار تباہ کاریوں کی حیثیت سے دنیا میں معروف
 نہیں مگر انکی ان تمام قوتوں کے باوجود کسی نے مکس و ملخ کو انسان سے برتر نہیں گردانا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ انسان
 مخلوقات میں اشرف ہے مگر جب ہی کہ وہ احساس فرض، دیانت اور دردمندی کی اقدار اعلیٰ کی تشکیل اور ترقی و تحفظ کے
 لیے کچھ کر سکے۔

ان اقدار کی روشنی میں مسئلہ کشمیر بھی غور کا مستحق ہے۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے اسی اندوہناک قضیہ کا صرف ایک ہی رخ آپ کے سامنے آیا ہے۔
 کشمیریوں کے ساتھ انصاف کرنے کے خیال سے اگر آپ مسئلہ کے دوسرے پہلو سے بھی آگاہ ہونا چاہیں تو پاکستان کی
 انجمن مصنفین ہر اس طریقہ سے جو آپ تجویز فرمائیں، مدد دینے کو تیار ہے۔

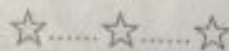
مالسانی، چیخ و گور کی خود سوویت روس کے اہل قلم تھے اور آپ ان کی روایات کے وارث ہیں۔ اس لیے خود
 اپنے ملک کی خاطر اور وسیع تر مفہوم میں انسانیت کی خاطر آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے ضمیر قیادت پر زور
 دیں کہ وہ سیاسی اقتدار کی جتنے بندی جیسی آئی جانی شے کی خاطر حق اور انصاف جیسی اقدار کو قربانی کا بکرانہ بننے دے۔
 پاکستان کی انجمن مصنفین جس کے گیارہ سو ممبر ہیں اور جو قلب ایشیاء میں واقع ساڑھے نو کروڑ انسانوں کے ملک
 کی ہر زبان، علاقے اور مکتب فکر کے ادیبوں کی نمائندہ جماعت ہے اور اس بات کی متوقع ہے کہ آپ ایسا ضرور کر سکیں
 گے۔

"ماہ نو" کراچی، مارچ 1962ء

حُسنِ نظر

کسی سرکاری پرچے کا اچھا ادبی ہونا محالات میں سمجھا جاتا ہے اور ہے بھی بازار میں مجمع گیسروں کو دیکھا ہے کہ جب تک اپنی چٹ پٹی داستان اور اشعارِ ابدار سناتے ہیں، تماشا کی جوق در جوق اُٹھتے ہیں۔ جو نئی حرفِ مطلب زبان پر آیا اور سنیا سی بابا نے نمیرے کا سُرمادکھایا اور لوگ تتر بتر ہونا شروع ہوئے۔ ماہِ نو کی بڑی کامیابی ہے کہ یہ قارئین کو قومی تعمیر کی راہ بھی دکھاتا ہے اور رنگِ رنگ ادبی تخلیقات میں بھی بہت سے معاصرین کو نیچا دکھاتا ہے۔ اس کی اشاعت کا اپنے اکثر معاصرین سے زیادہ ہونا اس کی خوبیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے جو پرچے پاکستان میں حسِ مزاح سے عاری ہوں یا جہاں ذرا سی تنقید پر بھی قدغن ہو چاہے اس میں کتنا بھی سلیقہ روا رکھا گیا ہو وہ ٹھس ہو جاتے ہیں اور سبوں کے حساب سے جوڑیا بازار اور لٹڈ بازار میں بکتے ہیں۔ اس انتخاب میں نظر ثانی کے بعد کے عنوان سے ابنِ انشاء کا ایک پُر لطف طنزیہ میں نے دیکھا ہے جس کو بظاہر ماہِ نو پر بھی طنز سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کا ماہِ نو اور اس انتخاب میں بار پانا مرتبین کے ذوق اور حسِ مزاح کا پتہ دیتا ہے اس کے خالص ادبی نمبر بھی خاصے بھاری بھر کم ہوتے ہیں کسیت کے لحاظ سے بھی کیفیت کے اعتبار سے بھی۔

انتخاب ”ماہِ نو“ 1963ء



سیاحت

خوشی قسمتی سے مجھے دنیا کے کوئی 75 سے زیادہ ملکوں کی سیاحت نصیب ہوئی ہے۔ ہر ملک کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی روٹ ہے۔ ہر ملک میں کوئی پہلو خوشگوار ہوتا ہے۔ کوئی پہلو ناگوار گزرتا ہے لیکن سعودی عرب ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کا ہر پہلو مجھے بے حد خوشگوار محسوس ہوا۔ یہاں کی شدید گرمی، گرد، مچھر اور مکھیوں سے بھی مجھے ناگواری کا احساس نہیں ہوا۔ ایسی بات کسی اور ملک میں نہیں دیکھی۔

مجھے 34 ملکوں کے سربراہوں سے ملنے اور انہیں سرکاری کانفرنسوں اور تفریحی محفلوں میں کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ان میں سے 8 سربراہوں میں ایک قدر مشترک پائی اور وہ یہ کہ پاکستان کے متعلق ان کے قول اور فعل میں اتنا ہی تضاد تھا، جتنا کہ اندھیرے اور اجالے میں ہوتا ہے۔

مجھے یورپ کے ایک ترقی یافتہ ملک کی بہت بڑی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر یاد آتا ہے۔ جو شعبہ فلسفہ کا سربراہ تھا۔ اس نے دس بارہ برس پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن یہ راز اس کے سینے ہی میں محفوظ تھا کہ کسی بہانے اسے یونیورسٹی ہی سے نکال نہ دیا جائے۔ آخر جب اس کی معیاد ملازمت ختم ہوئی اور وہ ریٹائر ہو گیا۔ تو اس نے فوراً اپنے قبول اسلام کا اعلان کر کے اپنا نام محمد نعیم رکھ لیا۔ اس نے اپنے گھر ایک شان دار محفل میلاد منعقد کی مجھے اس محفل میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ پروفیسر نعیم نے ایک مشتاق حافظ کی طرح سورۃ یسین اور سورۃ الرحمن کی تلاوت کی۔ لوگوں نے ان کی قرأت کی تعریف کی تو ہنس کر بولے۔ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ بارہ سال اندر ہی اندر یہی کچھ کرتا رہا ہوں۔ 1952ء میں بیروت کے گرد و نواح میں میں نے فلسطین کے مہاجرین کو جوق در جوق نامعلوم سہاروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے دیکھا۔ اس دشت کو دیکھ کر بے اختیار گھریا دیا۔ جی نہیں پاکستان کی تمام تر ناہمواریوں اور مشکلات کے باوجود مجھے ہمیشہ اپنا وطن ہی اچھا لگا کہ اگر ہم اپنے نصب العین پر ایمان داری اور ثابت قدمی سے قائم رہے تو انشاء اللہ ہمارا ملک باقی سب ملکوں سے اچھا نکلے گا۔

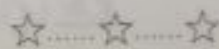
”اردو آن لائن“ لاہور مئی 1968ء

نیا ورق

قائد اعظم محمد علی جناح نے فروری 1947ء میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اپنے اقتدار اعلیٰ اور آزادی کے حق کو منوانے کی جدوجہد کو آگے بڑھانے اور معافی دینے کے لیے پاکستان ٹائمز کی بنیاد رکھی تاہم وقت کے ساتھ ساتھ معیشت اور علمیت کے بودے تال میل نے اسے اپنے آئیڈیلز کو مسخ کرنا اور اپنے کردار سے ہٹانا شروع کر دیا۔ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں سے بہت دور دراز کے محوروں اور غیر ملکی افقوں نے اس اخبار کی آواز اور پالیسیوں پر بہت زیادہ اثر کرنا شروع کر دیا اور یہ آہستہ آہستہ اپنے ہی گھر میں اجنبی نظر آنے لگا۔

تاہم آئیے امید کریں کہ ماضی تو سب ماضی ہے اس سے چمٹے رہنا کارِ فضول ہے جب ہم یہ نیا ورق کھول رہے ہیں تو ہم بڑی عاجزی اور استقلال سے 'آج' کے تمام فرائض اور آنے والے "کل" چیلنج قبول کرتے ہیں ہم حب الوطنی کو ایک فرسودہ سچ کے طور پر نہیں بلکہ ایک عمل کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ہم کاملاً اور بلا جھجک اپنا سب کچھ اس نظریہ کو عطاء کرتے ہیں جس نے پاکستان کو ایک شاعرانہ خواب سے حقیقت کے قالب میں ڈھالا۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ ہماری علمی، جذباتی اور سیاسی ثقافتوں کی بہار ہماری اپنی تاریخ اور اپنی سر زمین سے باہر نہیں بلکہ اسی کے اندر پوشیدہ ہے۔ فکر اور اظہار ہی ہمیں عزیز ہے بلکہ پاکستان کی سلیمت، سلامتی اور عزت اس سے بھی زیادہ عزیز تر۔ ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم پاکستان ٹائمز کو نئے سرے سے حرکت میں لائیں اور دوسری طرف اسے نئی حکومت کے پلو سے باندھ دیں بلکہ ہماری پالیسی کا بنیادی نقطہ معروضیت، آزادی اور اچھا ذوق ہوگا۔ ہماری آنکھیں، کان اور ہمارے قلم دیکھیں گے سنیں گے اور جو معاملات بھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہمتیں گے انہیں لکھیں گے اور اس طرح ہم نہ ہی مصلحت کا شکار ہوں گے نہ ہی خوف سے مارے جائیں گے اور نہ ہی سفارش سے متاثر ہوں گے۔ ہم خوشامد کرنے کے لیے (کسی کی) تعریف نہیں کریں گے بلکہ تشکیلی نو کے لیے تنقید کریں گے۔ کرنے سے زیادہ کہنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن آئیے کوشش کریں اور یہ سب کچھ کریں۔

ادارہ یہ پاکستان ٹائمز، 19 اپریل 1959ء، مترجم۔ اقبال حیدر



مشاہیر

انگلستان کے کسی شہر میں بھی جب کبھی آپ جیسے باعزت، باوقار اور ہشاش بشاش ہم وطنوں کو اتنی تعداد میں ایک جگہ اکٹھے دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار ایک بے یار و مددگار، غمگین و افسردہ اور خالی ہاتھ مسافر یاد آ جاتا ہے جس نے آج سے ایک سو پندرہ برس پہلے لندن کے لیے زحمت سفر باندھا تھا اس نے برتنوں سمیت گھر کا ساز و سامان بچ کر تھوڑی سی رقم جمع کی، کئی روز تک ٹیل گاڑی سے سفر کر کے ناگپور پہنچا جہاں سے بمبئی تک ریل بن چکی تھی۔ سمندری جہاز کے ذریعے ۲۱ روز بعد وہ لندن پہنچا اور کچھ عرصہ تک چیئرنگ کر اس ہوٹل میں مقیم رہا۔ آج بھی چیئرنگ کر اس سٹیشن پر اسی طرح موجود ہے۔ انگلستان میں وہ کوئی دو برس کے لگ بھگ رہا، جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تھے تو وہ خط لکھ کر گھر کا کچھ اور آبائی سامان بکوا کر تھوڑی بہت مزید رقم منگوا لیتا کیونکہ یہاں پر اس کے پاس نہ کوئی ورک پر مٹ تھا نہ ہی وہ کسی فیکٹری، دکان یا دفتر میں کام کرنے آیا تھا اور نہ ہی اس نے یہاں پر کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کے سامنے کسی قسم کی مدد مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلا یا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی انمول دولت تھی جو بڑے بڑے شاہی خزانوں میں بھی نہیں ملتی۔ یہ دولت اس کے دل میں تھی جو قوم کے لیے درد مندی، قوم کے لیے ہمدردی اور قوم کے لیے بے لوث خدمت پر مبنی تھی غالباً آپ پہچان گئے ہوں گے کہ یہ عجیب و غریب مفلوک الحال مسافر کون تھا اس مسافر کا نام سر سید احمد خان تھا۔

انگلستان میں قیام کے دوران انہوں نے یہاں پر دو بڑے کام کیے ایک تو انہوں نے متعصب انگریز سر ولیم مور کی انتہائی دل آزارانہ اور گستاخانہ کتاب The Life of Mohammad کا مدلل اور عالمانہ جواب لکھا۔ دوسرے انہوں نے یہاں کے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اداروں کا مطالعہ کیا۔ اپنے مشاہدات کو اسلامی اور مشرقی روایات کے سانچے میں ڈھالا اور واپس جا کر علی گڑھ موومنٹ کی وہ تحریک شروع کی جس نے 1857ء کی شہنشاہی اور در ماندگی اور خستہ حالی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں میں ذہنی خود اعتمادی، ثقافتی سر بلندی اور تعلیمی برتری کی ایک نئی روح پھونک دی۔

مسلمانوں کی اس نشاۃ ثانیہ کے شروع ہونے کے بعد قدرت نے ہمیں ایسے ایسے مشاہیر عطاء کیے جن کی بدولت ہمارا شمار اقوام عالم کے دوش بدوش، ہمیشہ قائم و دائم رہے گا مثلاً علمی، ادبی اور فکری سطح پر علامہ اقبال سیاسی اور علمی سطح پر قائد اعظم محمد علی جناح، سال بھر میں کم از کم چار ایسے مواقع آتے ہیں جس پر کسی نہ کسی جگہ قائد اعظم کا ذکر خیر لازمی طور پر ہوتا ہی رہتا ہے۔

۲۳ مارچ کو قرار دیا پاکستان پر ۱۴ اگست کو یوم آزادی پر، ۱۱ ستمبر کو یوم وفات پر، ۲۵ دسمبر کو یوم ولادت پر ایسے ہر

موقع پر بڑی فصاحت و بلاغت سے قائد اعظم کی شخصیت، کردار اور سیاست پر نہایت دھواں دھار تقریریں کرنے اور سننے کا رواج سا بن گیا ہے مجھے بے حد افسوس ہے کہ اس سلسلے میں میں آپ کی توقع پر پورا نہیں اتر سکتا کیونکہ میں فصاحت و بلاغت سے بھی محروم ہوں اور دھواں دھار تقریر کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا میں تو محض ایک چھوٹا سا معمولی سادہ استان گو ہوں۔

ہمارے انفرادی اور اجتماعی کردار ہی نہیں بلکہ ہمارے وطن کا تو نقشہ ہی سراسر بدل چکا ہے۔ ان تبدیلیوں کی وجوہات پر روشنی تو دراصل تاریخ دان ڈالیں گے لیکن ایک موٹی سی جٹکی سی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

ہندوستان میں ایک شہر ہے جس کا نام اجیر شریف ہے آج سے ساڑھے سات سو سال پہلے وہاں پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر ایک بہت بڑی دیگ چڑھائی گئی تھی، یہ اتنی بڑی دیگ تھی کہ اس میں اترنے کے لیے سیڑھیاں لگانی پڑتی تھیں۔ ہر روز سینکڑوں ہزاروں زائرین اس دیگ سے کھاتے ہیں لیکن یہ کبھی خالی نہیں ہوتی اس کی ایک وجہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حضرت خواجہ کی برکت ضرور ہوگی لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص وہاں زیارت کرنے آتا ہے وہ اپنی توفیق کے مطابق اس دیگ میں کوئی نہ کوئی جنس ضرور ڈال دیتا ہے۔ اگر کسی کے پاس اور کچھ موجود نہ ہو تو وہ اس میں کم از کم نمک کی ایک چٹکی ہی ڈال دیتا ہے اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو وہ شخص درختوں سے گرے ہوئے چند سوکھے پتے ہی لا کر دیگ کے نیچے آگ کے چولہے میں ڈال دیتا ہے! چنانچہ حضرت خواجہ کے لنگر کا فیض صدیوں سے جاری ہے اور صدیوں تک جاری رہے گا۔ اسی طرح قائد اعظم نے بھی ہمیں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی دیگ چڑھا کر دی تھی یہ تحفہ ہمیں مفت میں نہیں ملا تھا بلکہ اسے حاصل کرنے میں لاکھوں، شہیدوں، قیدیوں، بیواؤں، ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کی قربانی شامل ہے لیکن ہم نے اس میں ڈالا تو بہت کم اور دونوں ہاتھوں سے کھا کھا کر اسے اتنا گھر چاتا گھر چا کہ اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا پڑا۔ اب اس شکستہ دیگ کا جو آدھا حصہ ہمارے پاس رہ گیا ہے مناسب یہی نظر آتا ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ کبھی کبھی یہ سوچ لیا کریں کہ اس میں کیا ڈالنا ہے اور کیا نکالنا ہے مشاہیر کو یہی ہمارا اصلی خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ ”شفیق“ لندن، مارچ 1983ء

میرے کردار

میں نے جتنے بھی کردار تخلیق کیے ان میں سے ”ماں جی“ کا کردار میرے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ ”ماں جی“ لکھتے ہوئے مجھے کسی قسم کی وقت محسوس نہیں ہوئی۔ ”ماں جی“ کا کردار میں نے زندگی سے پتا اور افسانے میں سجاد کیا۔ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ہر کردار ری کری ایٹ کرنا پڑتا ہے لیکن ماں جی کا کردار مجھے ری کری ایٹ نہیں کرنا پڑا۔ میں نے صرف اس کی تصویر کشی کی ہے اور مجھے احساس ہے کہ میں اس کی مکمل تصویر کشی نہیں کر سکا۔ ”ماں جی“ کا کردار اتنا بھرپور تھا کہ میرے ذہن کی گرفت میں تو تھا مگر الفاظ اس کردار کو پوری طرح اپنے اندر سمونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے کیونکہ کسی غیر معمولی چیز کو بیان کرنا آسان ہوتا ہے مگر ماں جی کا کردار بالکل عام اور معمول کا تھا۔ عام اور معمول کی چیزوں کو بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

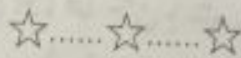
میری ساری ادبی زندگی اور تحریروں میں صرف یہی ایک کردار ہے جو مجھے مفت ملا اور اس کردار کا اثر شاید یہ ہوا کہ اس کے بعد میں نے افسانہ لکھنا ہی نہیں یہ میرا آخری افسانہ تھا۔

”ماں جی“ کا کردار کوئی عجیب کردار نہیں بالکل سادہ، عام اور خاموش ایسا کردار جو گھر میں موجود تو ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن بات ہے کہ یہ کردار جب گھر پر نہیں ہوتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ نہیں ہے۔ اگر موجود ہوتا تھا تو کوئی بھی خاص نوٹس نہیں لیتا تھا کہ ہے۔ ماں جی کا کردار ایک ایسا کردار تھا کہ جس نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی طلب نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماں جی کے اندر خواہش پیدا ہوتی تھی اور وہ اسے دبا لیتی تھیں بلکہ میں نے بہت کوشش کے بعد اندازہ لگایا کہ یہ کردار اس لیے کچھ طلب نہیں کرتا کہ اس کے اندر کسی چیز کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی چونکہ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے اس لیے یہی وجہ تھی کہ اس کردار نے مجھے متاثر کیا۔ اس کردار کے پاس صرف دو جوڑے کپڑے، ایک جائے نماز اور تسبیح تھی۔ نہ کوئی سوٹ کیس، نہ پیسے اور نہ کچھ اور۔ جب میں نے اس کردار پر کہانی ”ماں جی“ لکھی تو مجھے مولانا غلام رسول مہر کا ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں بھی اپنی والدہ کے بارے میں ایسی ہی کہانی لکھنا چاہتا تھا لیکن لکھ نہ سکا۔ اس قسم کے تاثرات کا اظہار اور بھی کئی لوگوں نے کیا۔ بعض نقادوں نے اس کردار کو ایک علامت کے روپ میں بھی دیکھا لیکن میری اپنی ذاتی رائے اس کردار کے بارے میں یہ ہے کہ میں نے اسے جس طرح دیکھا بیان کر دیا۔

ماں جی کا خاندان پاکستان بننے سے پہلے اقبال ضلع سے فیصل آباد منتقل ہوا اور اس وقت یہاں نئی نئی نہریں جاری

ہوری تھیں اور یہ علاقہ آباد ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کردار کی شادی ہو گئی۔ اس کے میاں ایک عالم تھے اور ملی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے اور اچھی پوسٹ پر متعین تھے مگر اس تبدیلی کا بھی اس کردار کے مزاج اور رہن سہن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کردار کی پسندیدہ غذا روٹی اور چٹنی ہی رہی اور ان کے مزاج میں وہی سادگی، عام پن اور بے طلبی قائم رہی۔ ان کی اولاد میں سب سے بڑا بیٹا ڈاکٹر بن کر انگلینڈ چلا گیا اور وہاں فوت ہو گیا مگر اس واقعے کا بھی اس کردار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دو بیٹیاں شادی کے بعد فوت ہو گئیں لیکن اس کا بھی ماں جی کے کردار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اس کردار کی بے حسی نہیں بلکہ صبر اور توکل ہے۔ میں بھی ان کا بیٹا تھا۔ اچھی خاصی نوکری میں رہا اور وہ میرے ساتھ رہیں لیکن اس کا بھی انہوں نے کوئی اثر نہ لیا اور میرے ساتھ رہ کر بھی ہمیشہ ریل کے تھڑکاس میں سفر کیا۔ یہ بات اس کردار کی مستقل مزاجی کی دلیل بن سکتی ہے۔ میرے خیال میں ایسے کردار ہم لوگوں سے زیادہ خوش رہتے ہیں اور ہماری طرح زندگی گزارنے یا دنیا سے رخصت ہونے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ افسانے میں تو وہ کردار اپنی وفات کے بعد لوگوں سے جدا ہو گیا لیکن میرے ساتھ وہ کردار اب بھی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ سادہ، عام، بے طلب۔ میں نے پہلے یہی کہہ دیا تھا کہ میرے افسانوں کا صرف ایک ہی کردار ہے جس کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن ماں جی کے کردار کے بعد میں اپنے ایک اور کردار کا ذکر نہ کر کے اس کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتا وہ کردار میرے افسانے ”یا خدا“ کی دلشاد کا ہے۔ دلشاد مسلمان لڑکی ہے جو پہلے مشرقی پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں لٹی اور پھر پاکستان آ کر مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں بھی تکلیفیں اٹھاتی رہی۔ میں نے دلشاد کے کردار کو شعوری طور پر پختا اور ایک علامت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک ایسی نوجوان مفلس اور بے کس لڑکی کی علامت جو ہر معاشرے میں، ہر زمانے میں ہر قسم کے ستم کا شکار ہوتی ہے۔ مجھے اب بھی دلشاد یاد آتی رہتی ہے۔

روزنامہ ”جنگ“ راولپنڈی، یکم اکتوبر 1984ء



حرفِ شیریں

مجھے مسرت ہے کہ اس کتاب میں سلیم خان گمی نے کشمیری ادب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری نظر میں یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ مصنف نے ان موضوعات پر بڑی محنت سے تحقیق کی ہے اور مواد اور معلومات کی چھان بین اور فراہمی میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ایسے حضرات کو بہت مدد ملے گی جو ریسرچ میں مصروف ہیں یا جنہیں کشمیر سے دلچسپی ہے۔ کشمیر پر اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے یہ خطہ زمین سارے عالم کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے لوگ اہل کشمیر کی طرز زندگی، محسوسات، فکر، تہذیب و تمدن اور بود و باش کے متعلق صحیح حالات جاننے کے خواہاں ہیں مجھے یہ خوشی ہے کہ ہمارے نوجوان مصنف اس قسم کے سنجیدہ اور تحقیقی موضوعات کو اپنا رہے ہیں۔

”کشمیر ادب و ثقافت“، سلیم خان گمی، یونیورسٹی پریس، 1989ء

☆.....☆.....☆

پیغام

اس سال جب کہ میرے اور آپ کے درمیان ہزار ہا میل خشکی و تری حائل ہے، میں اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا ہوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی پانچویں سالگرہ پر کسی قدر یکسو ہو کر نظر ڈالوں۔

جتنا میں گلڈ کے آغاز اور نشو و نما پر نظر ڈالتا ہوں اتنا ہی اس مہتمم بالشان ادارہ پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ دنیا میں اور کہیں بھی مصنفین کا کوئی ایسا رضا کارانہ ادارہ موجود نہیں جو دو قومی اور پانچ علاقائی زبانوں پر حاوی اور ہر وضع، ہر نوع، ہر انداز فکر کے مرد و زن پر مشتمل ہو۔ آج کل کی دنیا میں یہ ادارہ کثرت میں وحدت کی بڑی ہی حوصلہ افزاء مثال ہے پھر کثرت بھی وحدت کو ماند یا محو نہیں کرتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم ہیں ایک دوسرے کے ساتھ گھلی ملی ہوئی۔

ایک تشبیہ کو کسی قدر بے تکلفی سے برتتے ہوئے میں کہوں گا کہ گلڈ ایک خاصا بڑا کھر دار تختہ ہے جس پر ہنسی، غیلے، کالے، ہرے، لال، نارنجی، روغن بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی خشک کوئی تر، بڑی ہی بے ڈھب وضع، اگر اس تختے کو تیزی سے دائیں جانب لے جایا جائے تو یہ سفید نظر آئے گا اور اگر اتنی ہی تیزی سے بائیں جانب لے جایا جائے تو یہ پھر بھی سفید ہی دکھائی دے گا لیکن اگر اسے عین وسط میں رکھ کر آنکھیں جھپکائے بغیر غمگینی باندھ کر دیکھا جائے تو حسن و کیف و نشاط کی ایک قوس قزح آنکھوں میں لہرا جائے گی۔

جب گلڈ عالم طفولیت میں تھا تو جتنا مجھے اس نے تکلیف و ترددات میں مبتلا رکھا اتنا اور کسی چیز نے نہیں کیا پھر بھی یہ تشبیہ میرے لیے بے حد تسکین بخش اور امید افزاء ثابت ہوئی۔ لہذا میں یہی نسخہ ان سب لوگوں کے لیے بھی تجویز کروں گا جو کسی وقت بھی گلڈ کے بارے میں شک یا تردد کا شکار ہوں۔

خدا کے فضل سے گلڈ اب اپنی ہی تنظیم کے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہے۔ اب اس نے استحکام کی منزل میں قدم رکھ لیے ہیں تمام نمونہ پذیر منصوبوں کی طرح اس کو بھی اس مرحلے میں بیش از بیش وسائل کی ضرورت پیش آئے گی چونکہ ہم کوئی بیرونی امداد قبول نہیں کرتے اس لیے ہمیں اپنے ہی قومی وسائل پر انحصار کرنا پڑے گا، بنا بریں ہمیں اپنے ارادے کی مضبوطی، مقاصد کی توضیح اور درستی کا رے اپنے ہم وطنوں میں گلڈ کے متعلق اور زیادہ اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں آپ سے التماس کروں گا کہ اس اتحاد اور نظم و ضبط کو اور بھی تقویت دیں جس کا گلڈ نے ہمیشہ ثبوت دیا ہے اور قائم مقام سیکرٹری جنرل کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں اس کے ساتھ تعاون کریں میں ذمہ داری کے اس بارگراں کا بہ خوبی تصور کر سکتا ہوں جو اسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور اپنے تمام فریق کار راہکین سے التماس کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ اس کی کامیابی، نیز پاکستان رائٹرز گلڈ کی زیادہ بڑائی اور بہبود کے لیے دعا کریں۔ آمین۔

سات سمندر پار

پہلے زمانے کے سفر نامے جغرافیائی حدود سے شروع ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ تاریخ کے دھارے میں جذب ہوتے جاتے تھے۔ ماضی کا مسافر مستقبل کا مورخ بن بیٹھتا تھا لیکن زمانہ حال کا دور کچھ اور ہی طرز کا ہے۔ سائنس کی تیز رفتاری نے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کی طنائیں اس طرح کھینچ رکھی ہیں کہ وقت اور فاصلے کا وجود مسلسل سمٹتا جا رہا ہے، اب فاصلے ارضی کم اور نظریاتی زیادہ ہیں چنانچہ اب مسافر بھی آنکھ سے کم اور عینک سے زیادہ زیادہ دیکھتا ہے۔ اس عینک کے شیشے نیویارک میں بنے ہوں یا ماسکو میں، ان میں ہر ایک کے حسب حال کچھ دنیا سرخ، کچھ دنیا سفید اور باقی ساری کی ساری دنیا سیاہ نظر آتی ہے، ماسکو کی آنکھ سے دیکھیے یا نیویارک کی آنکھ سے، لندن کی آنکھ سے دیکھیے یا پیرس کی آنکھ سے، ان سب کی نظر میں افریقہ کالا اور ایشیا پیلا ہے۔ سرخی اور سفیدی کے امتزاج میں حسن، نکھار، صحت اور خوشبو ہے۔ کالے پیلے کی ملاوٹ میں جدوجہد کا غبار، محنت کی تھکن، مشقت کے پسینے کی بو ہے۔ رنگ و بو کی یہ نظریاتی بھول بھلیاں ایک عام مسافر کو شدید ذہنی انتشار میں سرگرداں رکھ سکتی ہیں لیکن بیگم اختر ریاض ایسی کسی سرگردانی کا شکار نہیں ہوئیں۔ آہنی پردے کے اُس طرف یا اس طرف انہوں نے کسی سے کوئی عینک مستعار نہیں لی۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اپنی آنکھ سے دیکھا اور جو کچھ لکھا اپنے قلم سے لکھا ہے۔ میری نظر میں یہ ایک قابل رشک کامیابی ہے۔

سات سمندر پار میں خالی مزاح، رنگینی اور روانی ہی نہیں، اس میں ایسی فکر نہیں جس سے کتاب کی بو آئے یا جو بوجھل ہو، مصنفہ کی فکر محسوسات میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن جزئیات میں جا کر منتشر نہیں ہو جاتی بلکہ ہر وقت کل کی طرف رجوع کرتی ہے، تخلیقی اور جبلی قوت، احساس اور ادراک کا جو بہترین سنگم ان کی تحریر میں ملتا ہے بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کردار نگاری میں بیگم اختر ریاض کو ملکہ حاصل ہے، تشبیہات میں انفرادیت، اشاروں میں مزاح کی جھلکیاں اور طنز میں ایک اچھوتا پن ہے۔ ہر کردار کی بنیادی خصوصیت کو وہ برش کی ایک بے جھجک جنبش سے اُجاگر کر دیتی ہیں۔ وہ ہنس ہنس کے ہم سفر ہیں پھرے کستی ہیں اس انداز سے کہ ان سے تعصب پیدا نہیں ہوتا، الٹی دلچسپی بڑھتی ہے۔ پیار آتا ہے۔

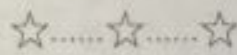
”ایک شرارہ تھیں تو صرف انیس سال کی، لیکن ان کی شخصیت میں بیسویں صدی اپنے پورے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا حلیہ بیان کرنا مشکل ہے۔ پکا سواپنے تجریدی آرٹ کے دو نصف دائروں میں، (یوں پیش کر سکتا ہے۔“

انہیں مناظرِ قدرت اور ناظرِ قدرت سے عشق معلوم ہوتا ہے، سمندر سے ان کا لگاؤ جنون کی حد تک ہے۔
 ”معلوم ہوتا تھا ہزار ہا بلوریں جھاڑ فانوس چٹچ کر پانی میں کرچی کرچی ہو رہے ہیں، ان پانیوں میں کتنے نقش بننے اور بگڑتے، گویا کوئی بے چین مصور واٹر کلر میں لطیف عظمتیں بے اعتنائی سے کھینچے اور منادے.....“
 چاند سے وہ کھیلتی ہیں، چھیڑتی ہیں ترس کھاتی ہیں۔

”رات کی خنک خلاء میں چاند اکیلا تنہا لٹک رہا تھا۔ گویا ساری مخلوقات کے گناہ کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو.....“

سات سمندر پار میں جدت ہے، جہاں بینہ نظر ہے، شوخی ہے اور مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ اس کی رنگینی اور لطافت کے پس منظر پر مغربی فکر میں مشرق کا دل دھڑکتا ہے۔
 بیگم اختر ریاض نے جس آن بان سے ادب کی وادی میں قدم رکھا ہے، اس سے اُمید بندھتی ہے کہ وہ بہت سے اور گل کھلائیں گی، یہ بڑی نیک فال ہے۔ کیونکہ ع
 ”گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے“

دیباچہ..... ”سات سمندر پار“ اختر ریاض الدین



حرفے چند

جس طرح بعض بزرگوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدائشی ولی ہیں۔ اسی طرح سید حسن برنی مرحوم کے لیے بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ پیدائشی مصنف تھے۔ اس قول کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں جب وہ ایم اے اوکالج علی گڑھ میں بی اے کے طالب علم تھے البیرونی جیسی ہمہ گیر شخصیت پر قلم اٹھایا اور اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اس سلسلے میں دو اہم باتیں سامنے آئیں ایک تو یہ کہ یہ برنی صاحب کے زمانہ طالب علمی کی کاوش تھی، دوم یہ کہ ان کی یہ کاوش اتنی دقیق تھی کہ ”انجمن ترقی اردو“ جیسے اہم ادارہ کی نظر انتخاب اس پر پڑی اور اس نے اس کے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔

سید حسن برنی صاحب کی اس تصنیف کی اہمیت صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کی گئی بلکہ اس بات سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ختم ہو گئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کے تقاضے شروع ہو گئے لیکن چونکہ مصنف موصوف اس میں زہیم و اضافہ کرنا چاہتے تھے اس لیے اس کی دوسری اشاعت میں بارہ سال لگ گئے۔ اس سلسلے میں وہ البیرونی کے بیاچہ دوم میں خود لکھتے ہیں:

”اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے اور دوسرے ایڈیشن کے لیے میرے محترم اور فاضل دوست مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو اور بعض دیگر احباب کا مدت سے تقاضا تھا۔“
ان تقاضوں کے جواب میں مصنف نے ترمیم و اضافہ کے بعد جو دوسرا ایڈیشن پیش کیا وہ پورے اٹھاون برس گزر جانے کے بعد آج بھی اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتا ہے۔

طالب علمی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد برنی صاحب نے دو کام کیے۔ ایک وکالت کے پیشے کو اپنایا۔ دوسرے تصنیف و تالیف کی طرف رجوع ہوئے۔ پھر زمانے نے دیکھا کہ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی ان کے کام میں انہماک بڑھتا گیا اور اتنا ہی ان کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کے تمام موقر جریدے ان کے مضامین شائع کرنا اپنے لیے موجب افتخار سمجھنے لگے۔ ملک کے گوشے گوشے سے ان کے پاس مضمون لکھنے کی فرمائشیں آتی رہتی تھیں اور انہیں پورا کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان فرمائشوں کو وہ کوئی معاوضہ لیے بغیر پورا کرتے تھے۔ اگر کوئی معاوضہ دینا بھی چاہتا وہ قبول نہ کرتے تھے۔

برنی صاحب بہ یک وقت مؤرخ، محقق، ناقد اور ادیب تھے۔ کئی زبانوں پر عبور رکھنے کی وجہ سے وہ مختلف زبانوں

کے مصنفین کی تحریروں سے براہ راست استفادہ بھی کر سکتے تھے۔ برنی صاحب کے مضامین کی تعداد بیسکڑوں تک پہنچتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی ان میں بڑا تنوع ہے۔ پختہ کاری اور تحقیق و نظر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کام میں اتنی وسعت ہونے کے باوجود کسی موقع پر بھی وہ اپنے مخصوص اعلیٰ معیار سے نیچے اترنے کا احساس قاری کو کبھی نہیں ہونے دیتے بلکہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہر مضمون کافی مطالعہ، پورے غور و فکر اور شخص و تلاش کے بعد اس طور پر لکھا گیا کہ تحقیق کا حق ادا ہوا اور موضوع زیر بحث کا ہر پہلو بھی اجاگر ہو جائے۔

مضامین میں اس ہمہ گیری، تنوع اور جامعیت کے باوصف برنی صاحب کی طبیعت کا جھکاؤ تاریخ کی جانب زیادہ ہے بلکہ یہی ان کا غالب رجحان ہے۔ وہ اس میدان میں اپنی جولانی طبع کے پورے جوہر دکھاتے ہیں۔ تاریخی واقعات کا ان کی تحریروں میں تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کو پوری طرح کام میں لاتے ہیں۔ ان کا انداز بیان بھی تاریخی واقعات کے لیے نہایت موزوں ہے۔ وہ عبارت کی رنگینی میں حقائق کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ طالب علمی کے زمانے میں کسی قدر رنگینی طرز بیان میں راہ پائی تھی لیکن بعد میں انہوں نے اسے خطرناک سمجھ کر رد کر دیا چنانچہ ”الہیرونی“ کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں اس کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

اب سے بارہ برس پہلے الہیرونی کے لکھنے میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا تھا وہ فی الجملہ اُس سے جدا ہے جو اس وقت ان ابواب میں اختیار کیا گیا ہے جو نئے طور پر لکھے گئے ہیں۔ گزشتہ انداز قدرے رنگین، جذبہ انگیز اور خطیبانہ اور اس جوش طبع کے موزوں ہے جو نو عمر طالب علم کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ میں اس قسم کے انداز بیان کو تاریخ کے لیے خالی از خطرہ نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔ نظر ثانی میں اعتدال قائم کرنے کے لیے جا بجا الفاظ قلم زد کیے گئے ہیں اور کبھی کبھی فقرات کو دوبارہ لکھا ہے۔“

اس تبدیلی اور احتیاط کے باوجود الہیرونی کے نقش ثانی کی عبارت میں خشکی پیدا نہیں ہوئی اور قاری تاریخی واقعات کو اسی دلچسپی سے پڑھتا چلا جاتا ہے جس دلچسپی سے کوئی شخص ناول پڑھ رہا ہو۔

برنی صاحب کے یہ قیمتی مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ سارے رسائل بھی اب ایک جگہ دستیاب نہیں۔ خاص طور پر پاکستان میں ان سب کا کسی ایک کتب خانہ یا نجی ذخائر کتب میں ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ سب سے پہلے مصنف کے فرزند جناب ابن حسن برنی نے ان رسائل کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی صاحب جب ہندوستان تشریف لے گئے تو ان مضامین کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر وہ ان تمام مضامین کی جو انہیں دستیاب ہو سکے، فوٹو سٹیٹ کا پیاں کرا لائے اور ان کو انجمن کے ارباب حل و عقد کے سامنے رکھا۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ فی الحال ان تاریخی مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے جن کا خصوصیت سے سلطنت دہلی سے تعلق ہے چنانچہ یہ مجموعہ مقالات زیادہ تر سلطنت دہلی کے بعض اہم امور پر مشتمل ہے۔ تاریخ کی اہمیت و افادیت کو بتانے کے لیے شروع میں پانچ مضمون ”تاریخ اور وقت، تاریخ کے تعلیمی فائدے“ وغیرہ درج کر دیے گئے ہیں اور مختصر اور دلچسپ ہونے کی بناء پر دو ایسے مقالات بھی شامل کر لیے گئے ہیں جن کا تعلق سلطنت مغلیہ سے ہے۔ ”تاج گنج“ سے مصنف کی ادبیت اور لطافت طبع کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے اسے بھی فہرست مقالات میں شامل کر لیا گیا ہے تاہم غلطی کا امکان باقی ہے۔

مضامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں جو ہندوستان سے آئی تھیں نہایت ناقص تھیں۔ بہت سے مواقع پر الفاظ اور فقرے تک غائب تھے۔ ایسے موقعوں پر مصنف کی عبارت کو تو اندازے سے مکمل کر دیا گیا اور اقتباسات کو ان کے ماخذات سے مقابلہ کر کے خانہ پُری کر دی گئی اگرچہ اس سلسلے میں پوری احتیاط سے کام لیا گیا ہے تاہم غلطی کا امکان باقی ہے۔ کتاب کے شروع میں جناب ابن حسن برنی صاحب نے اپنے والد گرامی کا نہایت دلچسپ تعارف تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کی اشاعت کا ہر مرحلہ جناب مشفق خولجہ صاحب کی نگرانی میں طے ہوا ہے۔ ہم جناب ابن حسن برنی اور جمیل الدین عالی سمیت ان دونوں حضرات کے علمی تعاون کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے انجمن کی یہ پیشکش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور خاص طور پر نئی نسل کو ماضی کے ایک اہم مصنف کی نگارشات سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔

ماہنامہ ”قومی زبان“ کراچی اکتوبر 1986ء



پہلا شمارہ

اردو پنچ کا پہلا شمارہ ملا، تو بے اختیار جی چاہا کہ بس اس کا سرورق ہی دیکھتے رہے۔ کافی دیر تک رسالہ کھولنے سے ہچکچاہٹ رہی۔ ڈرتھا کہ اس کے اندر اس کے سرورق سے زیادہ خوبصورت اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟۔

ٹائٹل پیج کے سنہری حصے میں ایڈیٹر صاحبان کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ واقعی یہ نام اتنے قیمتی ہیں کہ انہیں سونے کی تختی پر ہی لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نظر بد سے بچانے کے لیے انہیں جان بوجھ کر ایسے باریک حروف میں لکھا گیا ہے کہ ہر ایرے غیرے کی نگاہ خواہ مخواہ ان پر نہ پڑتی رہے۔ یوں بھی ایڈیٹر میل بورڈ کی تشکیل میں بڑی سوجھ بوجھ، دانش مندی اور دوراندیشی سے کام لیا گیا ہے۔ سرسچی کے لیے ضمیر جعفری سے بہتر انتخاب ناممکن تھا۔ بے مثال شاعر، باکمال نثر نگار، پُر خلوص اور خوش مزاج انسان۔ دوسری بہت سی خوبیوں کے علاوہ کرنل محمد خان کی ایک خاص خوبی یہ بھی کہ وہ سابق فوجی ہیں۔ اس وجہ سے غالباً انہیں اس رسالہ کے ساتھ امام ضامن کے طور پر باندھا گیا ہے۔ آج کل ادب اور مسلح افواج میں جو چولی دامن کا ساتھ ہے، اس کے پیش نظر بے شک یہ بڑا مستحسن اقدام ہے۔ سلطان رشک نے ساہا سال تک حکیم یوسف حسن مرحوم کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس لیے ایڈیٹری ان کے گھر کی لونڈی ٹھہری۔ کسی رسالے کے مدیروں میں کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی شامل ہو جائے، تو بظاہر سنسر شپ والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ پروفیسر صفدر محمود کی ایڈیٹریل بورڈ میں شمولیت سنسر والوں کی اسی فراخ دلی کا نتیجہ نظر آتی ہے۔

”اردو پنچ“ کا پہلا نمبر طویل انتظار کے بعد آیا۔ سست روی فریبی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ آج کل عورتیں پتی اور کتابیں موٹی ہونے کا فیشن عام ہے۔ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسالے بھی اسی مرض کا شکار ہیں۔ یہ بدعت غالباً مفروضہ پر مبنی ہے کہ رسالے کی ضخامت بڑھانے سے تخلیق ادب کی رفتار بھی اسی تناسب سے بڑھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے رقبہ زیر کاشت بڑھانے سے گندم کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

”اردو پنچ“ کے لیے ہر تیسرے ماہ اسی طول و عرض کی جوئے شیر کھود کر لانا بڑے جان جوکھوں کا کام ثابت ہو سکتا ہے۔ ادب کے یہ چاروں فرہاد پہلی نہر جو ہمارے پاس بہا کر لائے ہیں، اس میں کچھ دودھ تو بالکل تازہ، خالص اور شفاف ہے لیکن باقی جگہ کہیں کہیں پانی کی کچھ ملاوٹ بھی شامل ہے۔ آئندہ چل کر اگر مزید پانی کی ضرورت پیش آئی جو جلدی یا بدیر ہر دودھ والے کو لازماً پیش آتی ہے تو بڑی دقت کا سامنا ہوگا کیونکہ پانی کی شدید قلت اسلام آباد اور راولپنڈی کا خاص طرہ امتیاز ہے۔ اس صورت میں شاید ایڈیٹر صاحبان کو کسی وقت اپنی جوئے شیر میں صرف پاؤڈر ملک کی وصول اڑانی پڑے۔ اس وقت اکیڈمی آف لیٹرز کے لیے لمحہ فکریہ ہوگا کہ ”اردو پنچ“ کو روٹوں کو ہٹانے کا انعام دیا جائے یا ہنستوں کو رُلانے کا۔ میزان عدل قائم رکھنے کے لیے ممکن ہے کہ اکیڈمی اسے بیک وقت دونوں انعام دے دے۔

ہوں بھی جس کسی نے بھی بنی آدم کو ہنسانے کا بیڑا اٹھایا اس نے اپنی جان کو بڑا سخت روگ لگا لیا۔ یہ اشرف الملوقات دنیا میں اپنے ورد و مسعود کا اعلان ہی رونے سے کرتی ہے۔ ہنسا اس کے لیے کسی قدر خلاف فطرت واقع ہوا ہے۔ عام طور پر انسان برضا و رغبت بہت کم ہنستا ہے۔ جب کبھی ہنستا ہے کسی پر احسان دھرنے یا کسی کی خوشامد کرنے کے لیے ہنستا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رولانے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ہنسانے کے لیے ہزاروں جن کرنا پڑتے ہیں۔ بادشاہوں کے لیے مٹلا دو پیازے فراہم کیے جاتے تھے۔ آج کل بھی سرکاری درباروں میں مسخروں کی نہیں ہونے پاتی۔ عوام میں ضرورت کے مطابق بھانڈوں کی تعداد کھنتی بڑھتی رہتی ہے۔ یوں بھی لطائف و طرائف اور ہنسی کے گول گپے ہماری ثقافت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سوال فقط یہ ہے کہ ان سب کے ہوتے ہوئے اب ”اردو پنچ“ کن نام حضرات کو ہنسانے کے لیے میدان میں اُتر رہے؟ اگر اس کا ہدف اسلام آباد کے نیور و کریٹ ہیں، تو یہ سنی لا حاصل ہے کیونکہ پہلے شمارے میں گریڈوں پر ایک بھی مضمون نہیں۔ گریڈ کے بغیر تو اس شہر کا قانون مریض کو ہسپتال تک میں نہیں گھسنے دیتا۔ ”اردو پنچ“ کو سیکرٹریٹ میں کون داخل ہونے دے گا؟

یا ہو سکتا ہے کہ ایڈیٹر صاحبان ہم لوگوں کو اپنے آپ پر ہنسنے کا فن لطیف سکھانے آئے ہوں۔ اگر ان کا یہ ارادہ ہے تو ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وطن عزیز میں اب تک تعلیم بالغاں کا کوئی منصوبہ پروان نہیں چڑھا۔ اس کے برعکس اگر ان کا مقصد دوسروں کی ہنسی اڑانا ہے تو اس ہنر میں ہم لوگ پہلے ہی انتہائی عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اس میدان میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔

اب تو لے دے کے یہی نظر آتا ہے کہ ”اردو پنچ“ محض خدمت گزاری کے جذبہ سے سرشار ہو کر مفت کی ہیکار کے طور پر طنز و مزاح کو فروغ دینے میدان عمل میں کودا ہے۔ پی جی وڈ ہاؤس نے بھی کچھ ایسا ہی مشن اپنایا تھا۔ ایک محفل میں دو طنز و مزاح پر اپنا فلسفہ بگھار رہا تھا۔ اس کی شامت جو آئی، تو جوش خطابت میں اس کے منہ سے ایک فقرہ یہ بھی نکل گیا۔

Humour is a Smile Not the Face Wisdom

یہ سن کر ایک چھوٹی سی بچی نے بڑے غور سے پہلے اس کے چہرے کو گھورا پھر اس کے مذاحوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور کھڑے ہو کر حیرت سے پوچھا۔

Pleas Sir, Wisdom on Whose Face? Writer or the Readers's

Face

پی جی وڈ ہاؤس سے کبھی اس سوال کا جواب نہ بن پڑا۔ اگرچہ اس نے پچاسی سے اوپر کتابیں لکھیں لیکن اس کا کہنا یہی تھا کہ بھری محفل میں ایک دس بارہ سال کی بچی نے اسے پہلے ہی بال پر وکٹ آؤٹ کر دیا تھا۔

اب گیند ”اردو پنچ“ کے فیلڈ میں ہے۔ دیکھیں یہ ٹیم کیا سکور بناتی ہے۔ ہم تو بس یہی دعا کریں گے کہ پٹری پر پٹری ناٹ آؤٹ کا کھیل قائم ہو اور دائم جاری رہے۔

اردو پنچ شمارہ نمبر 2 راولپنڈی

پاکستان تصور سے حقیقت تک

جس پاکستان نے علامہ اقبالؒ کے تصور میں جنم لیا تھا حقیقت تک پہنچنے کے بعد آج تک اس کا رنگ و روپ کس قدر نکھرا اور کس حد تک بگڑا؟ یوم آزادی کے ہر جشن پہ خود احتسابی کا یہ عمل جلسوں، جلوسوں اور جھنڈیوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے

1940ء سے 1947ء تک برصغیر میں تحریک پاکستان کی جو بے مثال اور قوی ہیکل مشین حرکت میں آئی اس کا سرچشمہ مسلمانان ہند کا سوادِ اعظم تھا۔ اس مشین کو چالو رکھنے والے ڈانٹو میں حصول پاکستان کے لیے ان سب کے انفرادی اور اجتماعی جذبے، جوش اور جنون میں ایک مشترکہ آرزو کا رفرما تھی۔ اس آرزو کے کئی رنگ تھے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی آرزو تو اپنے دین اور ایمان کی سلامتی تھی لیکن چند محدود عناصر کی آرزو مندی کا اپنا اپنا الگ زاویہ تھا۔ حرص و ہوا کے مارے ہوئے کچھ لوگوں کو ایک نئی مملکت میں مال و دولت کے گراں بہا انبار اپنا اپنا الگ زاویہ تھا۔ کچھ سیاسی عناصر کو میونسپل کمیٹیوں کی رکنیت کی جگہ وزارتوں اور سفارتوں کے سہانے خوابوں نے اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔ سول، ملٹری اور دیگر ہر سطح کی بیوروکریسی کو بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں ترقی اور خوشحالی کی نئی نئی شاہراہوں کے نشان ابھرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ چنانچہ خدا کا فضل شامل حال رہا اور قیام پاکستان کے بعد سب عناصر کی اپنی اپنی آرزوئیں توقع سے زیادہ پوری ہو گئیں۔ البتہ ان سب کے باہمی اشتراک عمل کی آرزو کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے برعکس یہ مخصوص طبقہ اپنے مفاد کے آرزو کے خول میں گھس کر پاکستان کے وجود کو عصائے سلیمانی کی طرح اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے میں مصروف ہو گیا جن معصوم اور غریب عوام نے ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ“ کے پرچم تلے حصول پاکستان کے لیے سردھڑکی بازی لگا کر بے شمار قربانیاں دی تھیں، بدلے ہوئے ماحول نے ان میں سے بھی بہت سوں کو اپنی غلاظت اور کثافت سے آلودہ کر کے ایسے رنگوں میں ڈبو دیا جس کے اظہار کے لیے بس اتنا ہی کہنا کافی ہے۔

خُرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم قیام پاکستان کے پس منظر کے چند انتہائی اہم پہلو بڑی حد تک فراموش کر بیٹھے۔ مثلاً 14 جون 1947ء کے روز آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تقسیم ہند کی قرارداد پر بحث کرتے ہوئے قریباً

سب نے اس سانحہ پر شدید رنج و غم کا اظہار کر کے انتہائی وثوق سے اس اُمید اور عزم کا اعلان کیا تھا کہ تقسیم ہند ایک عارضی بندوبست ہے جو وقت کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ وہ دن دور نہیں جب بھارت ایک بار پھر متحدہ ہندوستان بن کر رہے گا۔ اس موقع پر ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولوشن پاس کیا تھا، اس میں مندرجہ ذیل چہرہ گراف آج تک جوں کا توں موجود ہے۔

”ہندوستان کی شکل و صورت اس کی جغرافیائی حدود، اس کے پہاڑوں اور اس کے سمندروں نے وضع کی ہے۔ کوئی انسانی طاقت اس صورت کو نہ بدل سکتی ہے نہ اس کے حقیقی مقدر کو ٹال سکتی ہے۔ معاشیاتی حالات اور بین الاقوامی امور کے شدید تقاضوں کے پیش نظر ہندوستان کی وحدت اور بھی زیادہ ضروری ہے۔“

ہندو مہاسبھانے بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا تھا۔

”ہندوستان واحد ہے اور غیر منقسم ہے جب تک الگ کیے ہوئے علاقوں کو انڈین یونین میں واپس لا کر انہیں اس کا مکمل حصہ نہیں بنایا جاتا اس وقت تک امن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔“

اب بھارت میں اقتدار کانگریس کا ہو یا کانگریس کے مخالفین کا دونوں صورتوں میں ہر بھارتی حکومت اس نصب العین کو پورا کرنے کی پابند ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا اعلانات میں بڑی وضاحت سے موجود ہے۔ مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھارتی عزائم پوشیدہ نہیں رہے۔ بھارت ہمارے ساتھ خیر گالی کی بات کرے، یا تعلقات کو معمول پر لانے کا آغاز کرے یا تجارتی لین دین ہو یا زراعتی گفت و شنید ہو یا ثقافتی بہرہ پھیر ہو..... ہر شعبے میں بھارت کی حکمت عملی کی سڑک ایک اور صرف ایک منزل کی طرف جاتی ہے۔ وہ منزل اکھنڈ بھارت ہے۔

خطرات کی ان سرخ بتیوں کو نظر انداز کر کے ہم پاکستان میں پورے انتالیس برس سے فقط آئین کو توڑنے پھوڑنے اور مروڑنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ قانون کی عظمت اور آئین کی حرمت چادر عصمت کے مترادف ہے۔ یہ ایک دفعہ چاک ہو جائے تو اسے رفو کرنا انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ ایک لغزش دوسری کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور اگر عقوبت کا تازیانہ شروع ہی میں اس کا راستہ نہ روکے تو ارتکاب جرم عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ راج نراج، حکومت اور طوائف الملوکی، قانون اور بد نظمی آئین اور آمریت کے فرق کا ادراک کمزور ہو جاتا ہے۔ نظام حکومت سے آئینی شائستگی رخصت ہو جاتی ہے۔ نظم و نسق میں عدل و انصاف کا عنصر ماند پڑ جاتا ہے جسے وقتی یا ذاتی مصلحتوں کے مطابق توڑا مروڑا جاسکتا ہے۔ ملک کے دستور کا جب یہ حشر ہونے لگے تو دوسری بہت سی قابل احترام روایات اور اقدار کا تقدس بھی اسی تناسب سے کم ہونے لگتا ہے۔ سیاست کا عمل رک جاتا ہے یا روک دیا جاتا یا غلط رخ اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں آئینہ یلزم کی جڑیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ جذبہ وطنیت اور قومیت کے فروغ میں وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ بے یقینی، تذبذب اور شکوک و شبہات کی فضاء میں سانس لے کر معاشرہ کلیت اور یاسیت کا شکار ہونے لگتا ہے یا تخریب کاری کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ آئینی نظام کا نعم البدل صرف آئینی نظام ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب دعوے باطل ہوتے ہیں اور عام طور پر چند محدود عناصر کے ذاتی مفادات

کی غریب کاری کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔
 یہ مقام عبرت و ندامت ہے کہ ہم اپنی جوان نسل کو بس یہی ایک ورثہ سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں ہمارے بزرگوں
 نے حسن تدبیر، قیادت اور صداقت سے کام لے کر پاکستان کی صورت میں ایک ایسی امانت ہمارے سپرد کی تھی جو عالم
 اسلام میں سب سے بڑی اور دنیا میں پانچویں بڑی مملکت شمار ہوتی تھی۔ ہماری نسل نے اس امانت میں اس قدر خیانت
 کی کہ وطن عزیز دو نیم ہوا، اور معاشرے کو رشوت، بد عنوانی، بددیانتی، لالچی، ملاوٹ، اخلاقی گراؤ، جھوٹ، غریب اور
 منافقت کی لکھن اور سڑن سے متعفن کر دیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہماری نئی نسل اس غفلت کدے میں روشنی کی دھندلکیں
 زندہ ہے۔ یہ نسل ہم لوگوں سے زیادہ حساس ہے پاک فعال، صادق اور محبت وطن ہے۔
 لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم ان نوجوانوں کو نظر یہ پاکستان لب الوطنی اور اخلاقیات کے درس دینے کے بارے
 میں ہانگ دعوے کرتے ہوئے شرماتے بھی نہیں!
 چہ لا اور است و زوے کہ بکف چہ افع و ارد

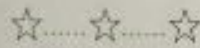
روزنامہ "نہار" اسلام آباد، 6 ستمبر 1986ء

☆—☆—☆

یادگارِ غالب

آج ادارہ یادگارِ غالب کی دوسری سالگرہ کی تقریب میں شرکت کا موقع نصیب ہوا۔ مرزا ظفر الحسن صاحب کی رضا کارانہ محنت، لگن اور دھمن نے کراچی کو ایک ایسا ادارہ عطا کیا ہے جو پاکستان کے کسی اور شہر کو میسر نہیں۔ غالب پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے غالب لائبریری کا قیام ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی طرح یہ ادارہ بھی اکثر مقروض ہی رہا ہے لیکن اس کا دو سالہ وجود اس امر کا ثبوت ہے کہ اگر ہر اچھی چیز کی ابتدا کا انحصار روپے پیسے ہی پر ہوتا تو غالباً دنیا کی کوئی دینی یا ادبی یا علمی تحریک آگے نہ بڑھ سکتی۔ مجھے امید ہے کہ وزارتِ تعلیم کے ثقافتی اور ادبی شعبے اس ادارے کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں گے اور اس کی مزید ترقی و توسیع میں پوری پوری مدد دیں گے۔

ماہنامہ ”قومی زبان“، کراچی، اکتوبر 1986ء



پچاس کا روپے کا خط

کراچی میں ڈومینیکل کالج اور اردو کالج کے درمیان بابائے اردو روڈ پر ایک ملکی سی ٹی وی ٹوئن بار اور بوسیدہ عمارت میں ہمارے وطن کا سب سے پرانا (مسلم لیگ سمیت)..... ادارہ قائم ہے جس کا نام انجمن ترقی اردو پاکستان ہے

اس عمارت کے بھر بھرے درو دیوار ہاتھ لگاتے ہی ریزہ ریزہ ہونے پر ہمہ وقت تلے رہتے ہیں چھتوں کی دراڑوں سے اگرچہ فی الحال آسمان تو نظر آنا شروع نہیں ہوا لیکن بارش کے پانی نے اپنا راستہ نکال لیا ہے اس عمارت میں انجمن کا اصول اثاثہ اس کی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں وہ کتابیں بھی ہیں جو بالکل نایاب ہیں۔ یہ انجمن سرسید کی تحریک کے شاخسانے کے طور پر 1903ء میں قائم ہوئی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، سر تاج بہادر سپرو، اس مسعود اور دیگر بہت سے اکابرین نے اس کی آبیاری کی۔ علامہ اقبالؒ نے ہمیشہ اس کی سرپرستی فرمائی اور قائد اعظم کی رہنمائی میں یہ انجمن تحریک پاکستان کا ایک سرگرم حصہ بن گئی۔ تقسیم کے وقت ڈاکٹر مولوی عبدالحق کسی نہ کسی طرح انجمن کی لائبریری کو بھارت سے کراچی لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی طرح انجمن کو ہندو اوقاف کی یہ بوسیدہ سی بلڈنگ سالانہ کرائے پر عارضی طور پر دے دی گئی۔ بابائے اردو نے اپنی لائبریری سجا کر انجمن کا علمی پروگرام از سر نو شروع کر دیا اور پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں ایسے جم کر بیٹھے کہ مرنے کے بعد بھی انجمن سے باہر نہ نکلے ان کی قبر انجمن ہی کے احاطے میں ہے۔ انجمن نیا ادب نہیں چھاپتی کیونکہ اس مقصد کے لیے ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک ناشر موجود ہے۔ انجمن زیادہ تر ان نایاب مخطوطات اور پرانی کتب کو شائع کرتی ہے جو ہمارے ادبی، علمی اور ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں، اس بنیاد کو منصفہ شہود میں لائے بغیر ہمارا ماڈرن علم، ادب اور ثقافت آوارہ اور معلق رہتے ہیں۔ دوسرے پبلشر یہ فریضہ سنبھالنے پر آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ مالی سطح پر یہ خسارے کا سودا ہے۔

انجمن یہ خسارہ شوق سے برداشت کرتی ہے کیونکہ اس کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں جن میں کوئی خسارہ پڑنے کی گنجائش ہو۔ انجمن کے کارکنوں کی اکثریت قلیل قلیل مشاہروں پر آئی، ساری عمر انہی تنخواہوں پر کام کیا اور انجام کار انہی مشاہروں پر کام کرتے کرتے دم دیدیا۔ یہ اس زمانے کے لوگ تھے جو محض خلوص پر زندہ رہتے اور خلوص ہی پر جان چھڑکتے تھے۔ سید شبیر علی کاظمی کا نام اسی فہرست میں آتا ہے۔ سنسکرت، ہندی اور بنگالی کے عالم ہونے کے علاوہ راج

شادی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے تھے۔ بنگلہ دیش کی تحریک میں ان کے کئی جوان بیٹے اور عزیز جان سے مارے گئے، لٹ پٹ کر پاکستان آ گئے اور کچھ عرصہ بعد قلیل سی تنخواہ پر انجمن میں دھرماتار کر بیٹھ گئے۔ دل کے مریض تھے لیکن دیوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ صبح سویرے آ جاتے اور شام اپنے دفتر چھوڑتے۔

ایک روز کہنے لگے کہ انجمن کو جو سالانہ گرانٹ ملتی ہے وہ اتنی کم ہے کہ آج کل کے زمانے میں یہ پوری رقم ایک ولیمہ کی دعوت پر خرچ ہو جاتی ہے۔ صدر مملکت بہت سے اداروں میں جاتے ہیں اور بڑے بڑے عطیات کا اعلان کر جاتے ہیں انہیں انجمن میں تشریف لانے کی دعوت دیں۔ اس لائبریری کو دیکھیں جو اور کہیں نظر نہیں آ سکتی ہمارے وسائل کا جائزہ لیں اور جاتے جاتے بابائے اردو کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھتے جائیں، مسلمان کے لیے یہ باعث ثواب بھی ہے۔

ناظم اعزازی نور الحسن جعفری صاحب اور دوسرے رفقاء کے کار سے مشورہ کر کے ہم سب نے مل جل کر صدر مملکت کے نام ایک تفصیلی دعوت نامہ تیار کیا میں نے کاظمی صاحب سے کہا کہ اس خط کو کسی اچھے کاتب سے لکھوا لائیں۔ یہ سن کر وہ کسی قدر تردد میں پڑ گئے۔ ”صاحب خط طویل ہے کاتب کم از کم پچاس روپے طلب کرے گا، انجمن کے وسائل کا حال معلوم ہی ہے۔“

”کاظمی صاحب کوئی بات نہیں“ میں نے کہا ”صدر مملکت کا معاملہ ہے ان کی خدمت میں خوش خط لکھا ہوا مکتوب ہی جانا چاہیے۔“

دل پر جبر کر کے کاظمی صاحب نے پچاس روپے خرچ کیے اور وہ خط ایک اچھے کاتب سے تحریر کروا لیا۔ یہ وسط اپریل 1984ء کی بات ہے۔ لگے بندھے دستور کے مطابق میں نے یہ خط ملٹری سیکرٹری کے نام ایک کورنگ لیٹر کے ساتھ ایک سیشنل ہرکارے کے ذریعے ڈیلیور کروا دیا تاکہ ملٹری سیکرٹری صدر مملکت کی سہولت پر یہ خط ان کی خدمت میں پیش کر دے۔ ساتھ ہی ایک مطبوعہ کتاب ”انجمن کی پچاس سالہ تاریخ“ کا ایک نسخہ بھی منسلک کر دیا وہ دن اور آج کا دن ایک سال اور دو ماہ گزر گئے انجمن کو اس خط کے جواب میں نہ صدر مملکت نے مشرف فرمایا ہے اور نہ ملٹری سیکرٹری یا کسی ماتحت عملے نے ایک دوسطری رسید بھیجنے کی زحمت گوارا کی ہے۔

ایوان صدر سمیت میری عمر کا بیشتر حصہ مختلف سطح کے سرکاری دفاتر ہی میں گزرا ہے۔ ان کی نوازشات اور بے انتہائیوں سے بھی کسی قدر واقف ہوں لیکن پچارے سیدھے سادھے عالم فاضل کاظمی صاحب اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ ان پر یہ صورتحال بڑی شاق گزری اس کے بعد ان کی زندگی میں صدر محمد ضیاء الحق صاحب درجنوں بار کراچی شریف لائے۔ ان کے دورے کی تفصیلات اخباروں میں شائع ہوتیں تو کاظمی صاحب اپنا پیار دل پکڑ کر بیٹھ جاتے کبھی کبھی وہ اخبار اٹھائے میرے پاس آتے اور کسی قدر تلخی سے کہتے بس صاحب منہ نہ کھلوائے یہ دیکھیے اب پھر کراچی شریف لائے ہوئے ہیں سیمینار بھی ہو رہا ہے، کانفرنس بھی ہو رہی ہے وفد سے بھی مل رہے ہیں۔ شادی میں گئے ہیں ایمر میں بھی شامل ہوئے بس ایک انجمن ہی میں ایسے کیڑے پڑے ہیں کہ اس طرف نظر اٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔

میں انہیں تسلی دیتا..... ”کاظمی صاحب بھول جائیں سربراہ مملکت کی مصلحتوں اور ترجیحات کا اندازہ ہم آپ یہاں بیٹھ کر کس طرح لگا سکتے ہیں؟“۔

”لیکن صاحب اس غریب انجمن کے پچاس روپے کا وہ خط!.....“۔

جنوری 1985ء میں کاظمی صاحب نے اچانک داعی اجل کو لبیک کہا ان کی وفات سے انجمن کا ایک مضبوط ستون ٹوٹ گیا اور وہ انجمن کے پچاس روپے کے خط کا داغ سینے میں لیے زیر زمین جا سوئے۔ خدا کرے یہ نیند پچاس روپے کے خط کا جنون ان کے ذہن سے محو کر دے تاکہ حشر کے روز بھی وہ یہی نعرہ لگاتے ہوئے بیدار نہ ہوں۔

اگر جناب صدر جنرل ضیاء الحق صاحب انجمن کو وزٹ کر لیتے تو ان کو کوئی ملال نہ ہوتا۔ ڈومیسٹک کالج اور اردو کالج کے درمیان سینڈویچ ہونے کے باوجود انجمن کا ماحول امن و امان کا گہوارہ ہے۔ ایک عجیب و غریب نایاب لائبریری دیکھ کر ان کا دل خوش ہوتا۔ بابائے اردو کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر اسلام کا ایک تقاضا بھی پورا کرتے۔ اس 82 برس پرانی انجمن کی خدمات کا احوال سن کر انہیں ضرور یہ احساس ہوتا کہ وطن عزیز میں ایک ایسا ادارہ بھی موجود ہے جسے قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں بالکل کوئی حرج نہیں اور سید شہیر علی کاظمی بھی پچاس روپے کے خط کا داغ سینے پر لیے اس دنیا سے کوچ نہ کرتے۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

روزنامہ ”جنگ“ راولپنڈی 10 جون 1985ء



آخری تحریر

جناب واصف علی واصف کی تصنیف 'کرن کرن سورج' پڑھنے کے بعد میرے دل میں جو تاثر بے اختیار ابھرا، وہ یہ تھا:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

فطرت کا قانون ہے کہ تشنگی سراب سے نہیں بلکہ آب سے بجھتی ہے۔ 'کرن کرن سورج' کے افکار اعلیٰ اور اقوال زریں، جھلمکیاں تو سمندر کی دکھاتے ہیں لیکن میرے جیسا کم فہم، بے بصیرت اور پیاسا مسافر قطرہ شبنم کو ترستارہ جاتا ہے۔ یہ کتاب جن جن نئی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں کی نشاندہی کرتی ہے ان پر سر پٹ بھاگنے کو جی تو بہت چاہتا ہے لیکن چند قدم چلنے کے بعد سڑک اچانک ختم ہو جاتی ہے، بنتی ہوئی سڑک کو ادھورا چھوڑ کر بیٹھ رہنا دراصل پی ڈیوڈی کا پیدائشی حق ہے۔ واصف صاحب ان سے یہ حق چھیننے کا ظلم کیوں ڈھانا چاہتے ہیں؟

جسم و جان اور روح و عرفان کا گورکھ دھندا بے حد پُر پیچ اور خم دار غلام گردشوں کی بھول بھلیاں ہے۔ اس غلمت کدے میں واصف صاحب اپنے دل نواز اقوال کی تیلیاں جلا جلا کر لٹھ بھر کے لیے دو قدم تک روشنی تو کر دیتے ہیں لیکن اس کے بعد تلاش حق کا راہرو پھر اندھیرے میں بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ کسی مسافر کے پاس اتنے Match Box نہیں ہوتے کہ محض دیا سلاخیوں کی روشنی میں وہ اتنا طویل اور پُر خطر سفر طے کر سکے۔ اس کے لیے ماچس کی نہیں بلکہ ہزاروں کینڈل پاور کے بلب کی ضرورت ہے۔

یہ روشن بلب واصف صاحب نے کسی وجہ سے اپنے دامن میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اب انہوں نے کرن کرن سورج کی ایک جھلک دکھا دی ہے تو ان کا اگلا قدم لازماً یہی ہونا چاہیے کہ وہ سورج کو بھی طلوع کر کے کرن کرن دکھا دیں۔

امید کے اس سہارے پر میرا گمان ہے کہ یہ تصنیف کتاب کا متن نہیں بلکہ محض دیباچہ ہے۔ اصلی کتاب ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ خدا کرے وہ کتاب اپنے وقت پر منصف شہود پر آئے اور بے شمار آرزو مندوں کے لیے حال و قال، ظاہر و باطن اور طریقت و شریعت کی گتھیاں سلجھائے۔

واصف صاحب کے اپنے الفاظ میں ان کا قول ہے کہ پہاڑ کی چوٹی تک جانے کے لیے کتنے ہی راستے ہو سکتے ہیں لیکن سفر کرنے والے کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔

بھولا بھلا مسافر اس کا سراغ کہاں اور کس طرح لگائے؟ اس راستے کو تلاش کرنے میں رہنمائی کا فرض بھی اب

واصف صاحب پر ہی عائد ہوتا ہے۔

ان کا ایک دوسرا قول یہ ہے کہ خواب کی اونچی اڑانیں بیان کرنے سے زندگی کی پستیاں ختم نہیں ہوتیں، بے شک یہ سچ ہے لیکن خواب کی تعبیر نکالنے والا کوئی صاحب نظر بھی تو سامنے آئے۔ اس کے بغیر اونچے اونچے خواب آتے رہیں گے اور زندگی کی پستیاں نیچے سے نیچے دھنستی رہیں گی یہ گتھی سلجھانا بھی واصف صاحب کے ذمے ہے۔

’کرن کرن سورج‘ کو شائع کر کے واصف صاحب نے اپنے کندھوں پر ایک بڑا بھاری بوجھ اٹھالیا ہے اب وہ اس عذر کا سہارا نہیں لے سکتے:

درمیانِ قطرِ دریا تختہ بندی کردہ ای
بعد می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اب ان کا دامن تر ہو یا تارتار ہو، ان کے لیے یہ بوجھ اٹھانے کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں۔ ’کرن کرن سورج‘ میں جس راہ کو وا کیا گیا ہے اس پر کول تار بچھانا بھی انہی کا کام ہے، اس پر سنگ میل نصب کرنا بھی انہیں کا کام ہے اور اس پر سٹریٹ لائٹس جلانا بھی انہی کا کام ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنا یہ فرض بعنوان شاکستہ نبھانے میں جلد از جلد سرخرو ہوں۔

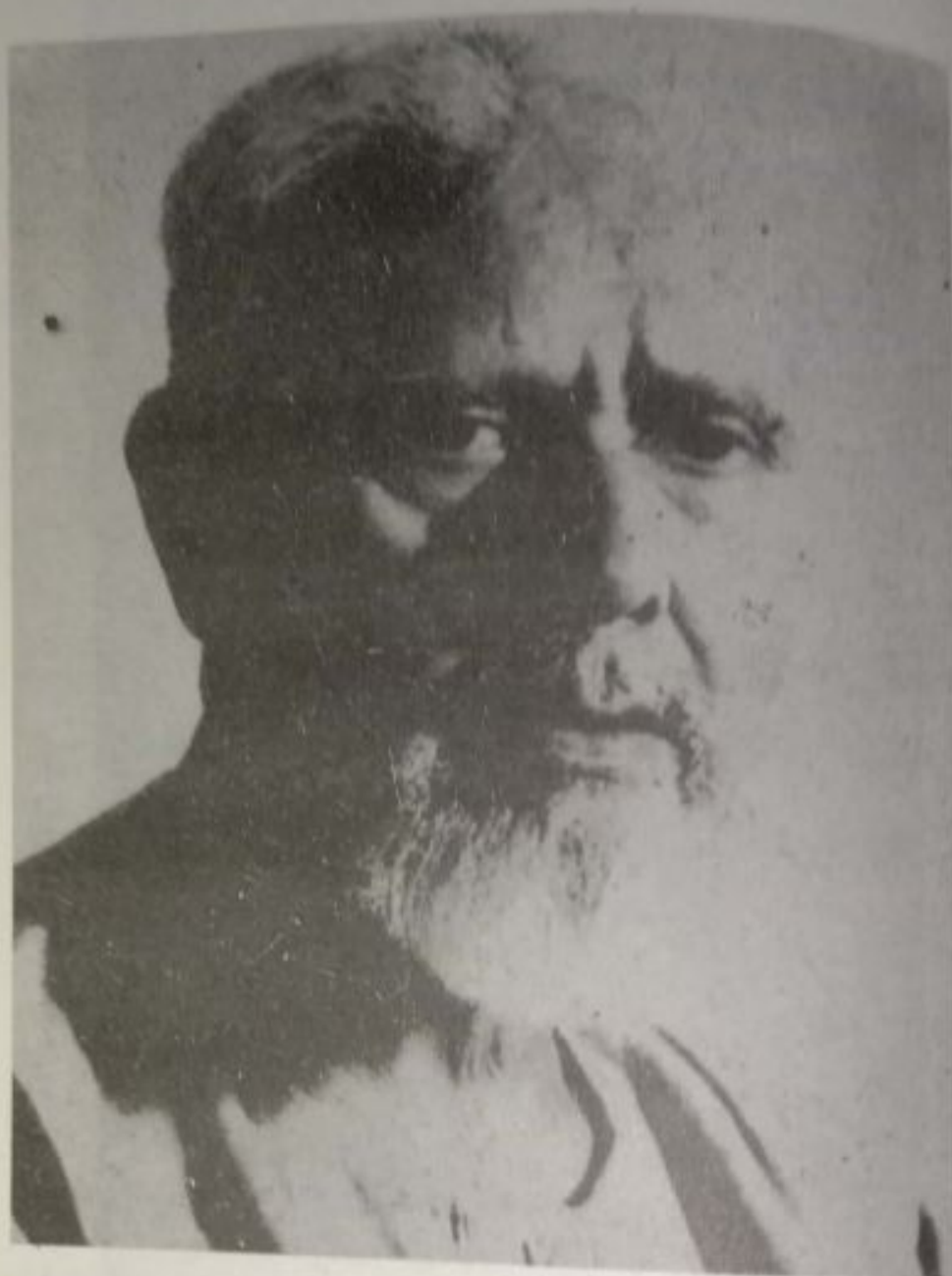
آخر میں جناب واصف علی واصف صاحب سے میں بصد ادب و احترام گزارش کروں گا کہ وہ اپنے بے شمار مداحوں کے ساتھ اس انجینئر کا سا سلوک نہ کریں جس نے ایک دس منزلہ عمارت تو تعمیر کر دی تھی لیکن اوپر جانے والی سیڑھیاں بنانا نظر انداز کر گئے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ سیڑھیاں کیوں نہیں بنائیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ فی الحال پختی منزل میں ہی گزارہ کرو بجٹ میں سیڑھیوں کی گنجائش باقی نہیں رہی اب اگلے مالی سال میں نئے بجٹ کا انتظار کرو ہماری استدعا ہے کہ واصف صاحب اپنے شائقین کو اپنے وجدان کی آمد کا اگلے بجٹ تک انتظار نہ کروائیں کیونکہ ان سب کی تمنا ہے تاب ہے اور یوں بھی اس بے ثبات زندگی میں:

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(شہاب صاحب کی زندگی کی یہ آخری تحریر گزشتہ بدھ کو واصف علی واصف کی کتاب کرن کرن سورج کی تقریب

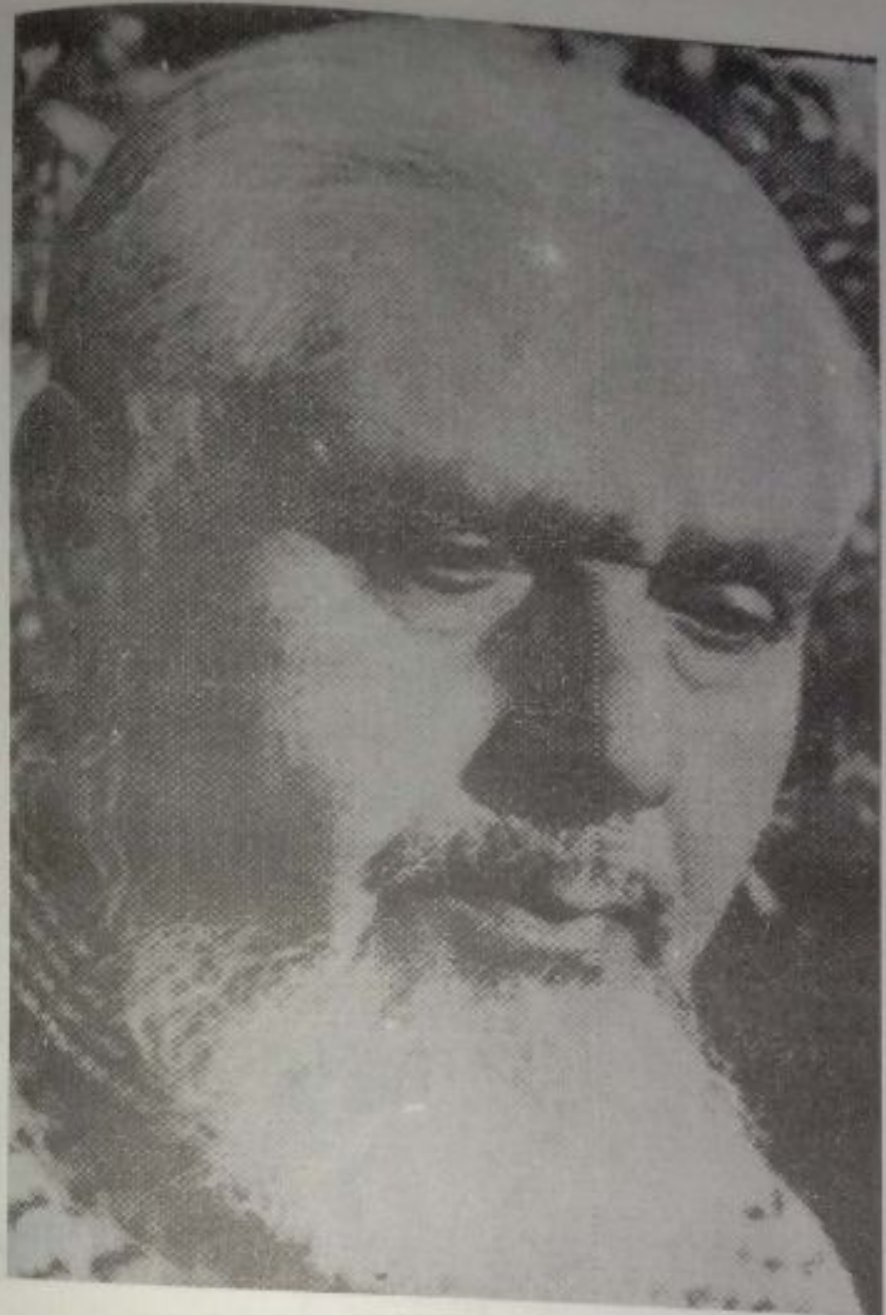
رونمائی میں پڑھی گئی تھی۔ اس تقریب کی صدارت شہاب کو کرنا تھی لیکن افسوس.....!)

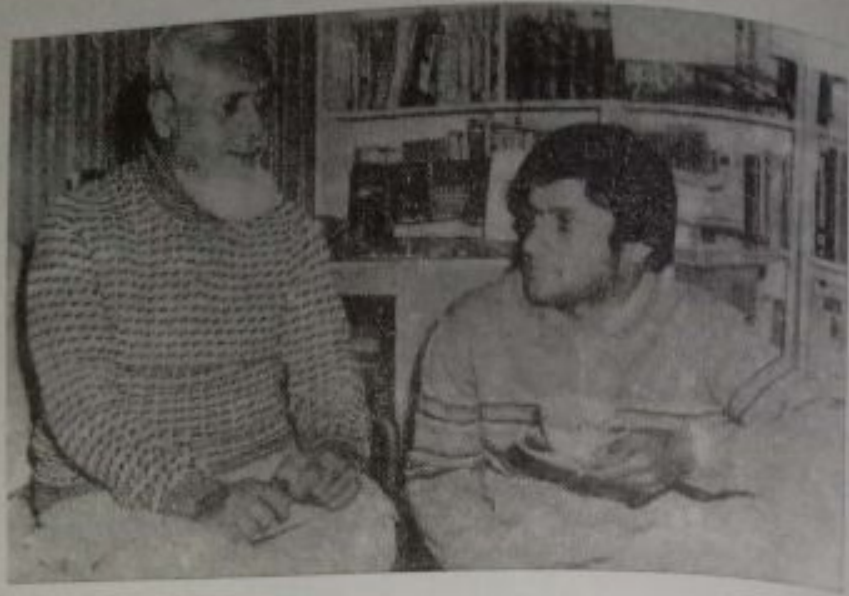
☆.....☆.....☆



Portrait of a man with a beard and mustache.

1-4





قدرت اللہ شہاب اپنے بیٹے ڈاکٹر طاہر شہاب کے ساتھ



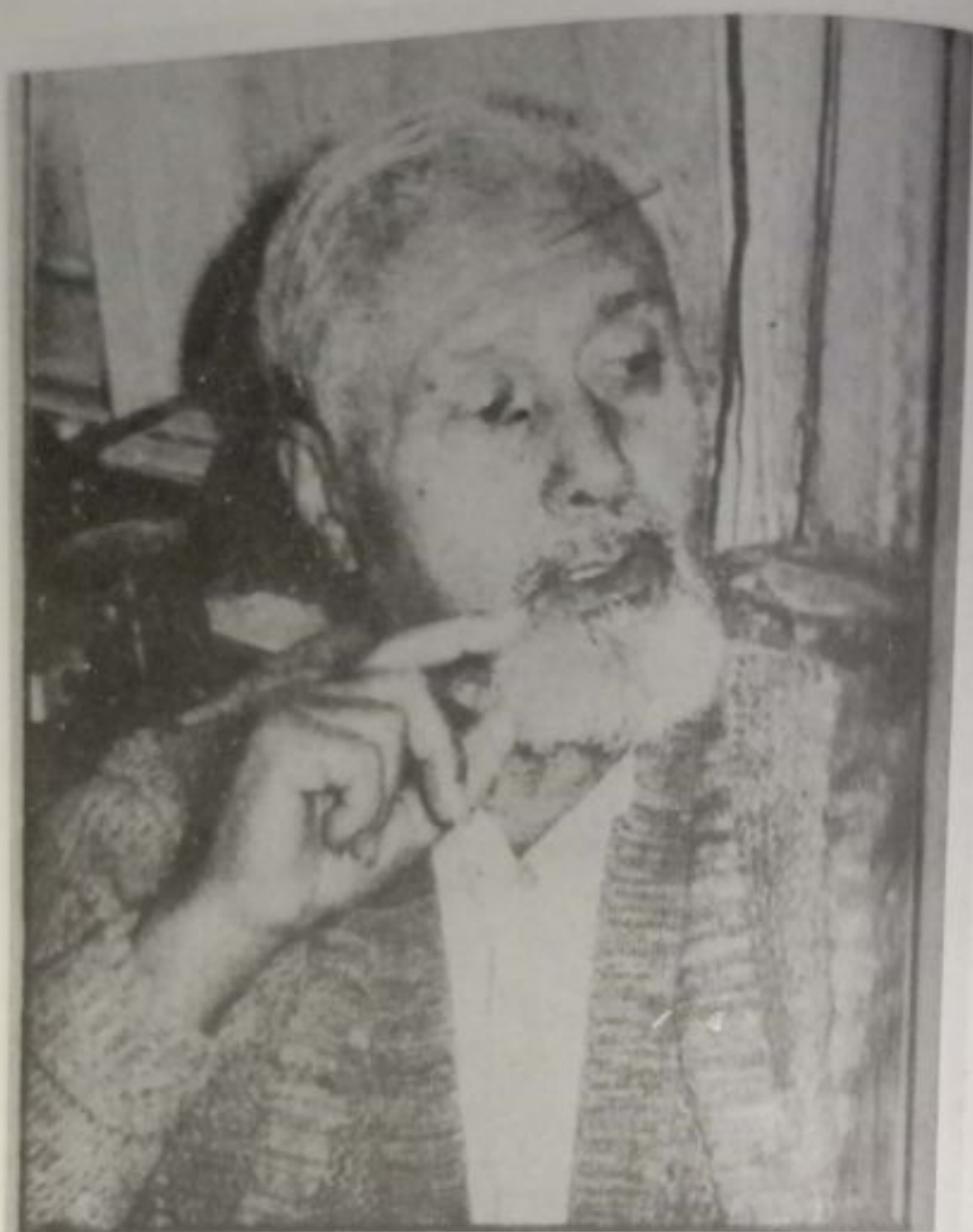
قدرت اللہ شہاب اور بیگم عفت شہاب عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے

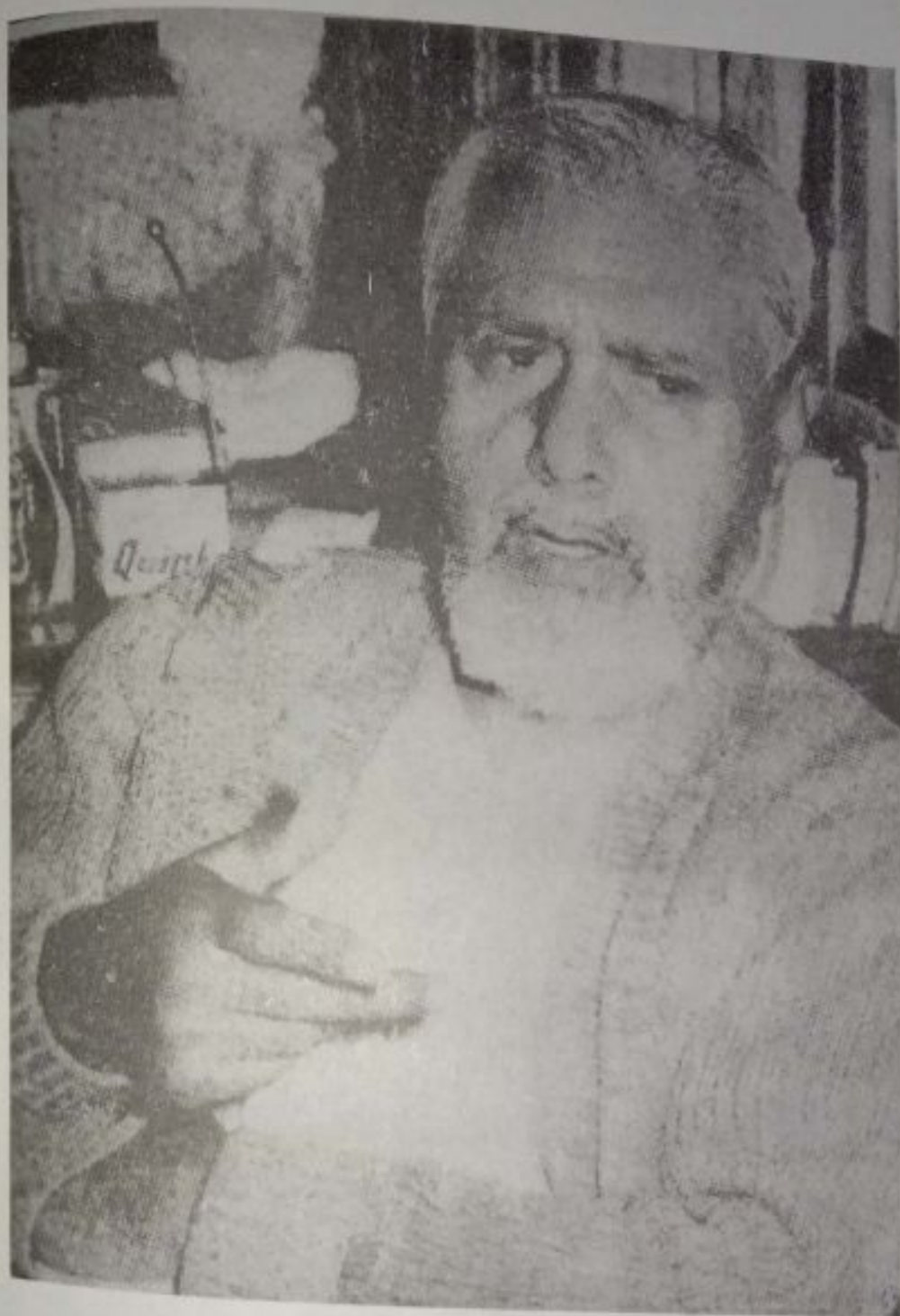


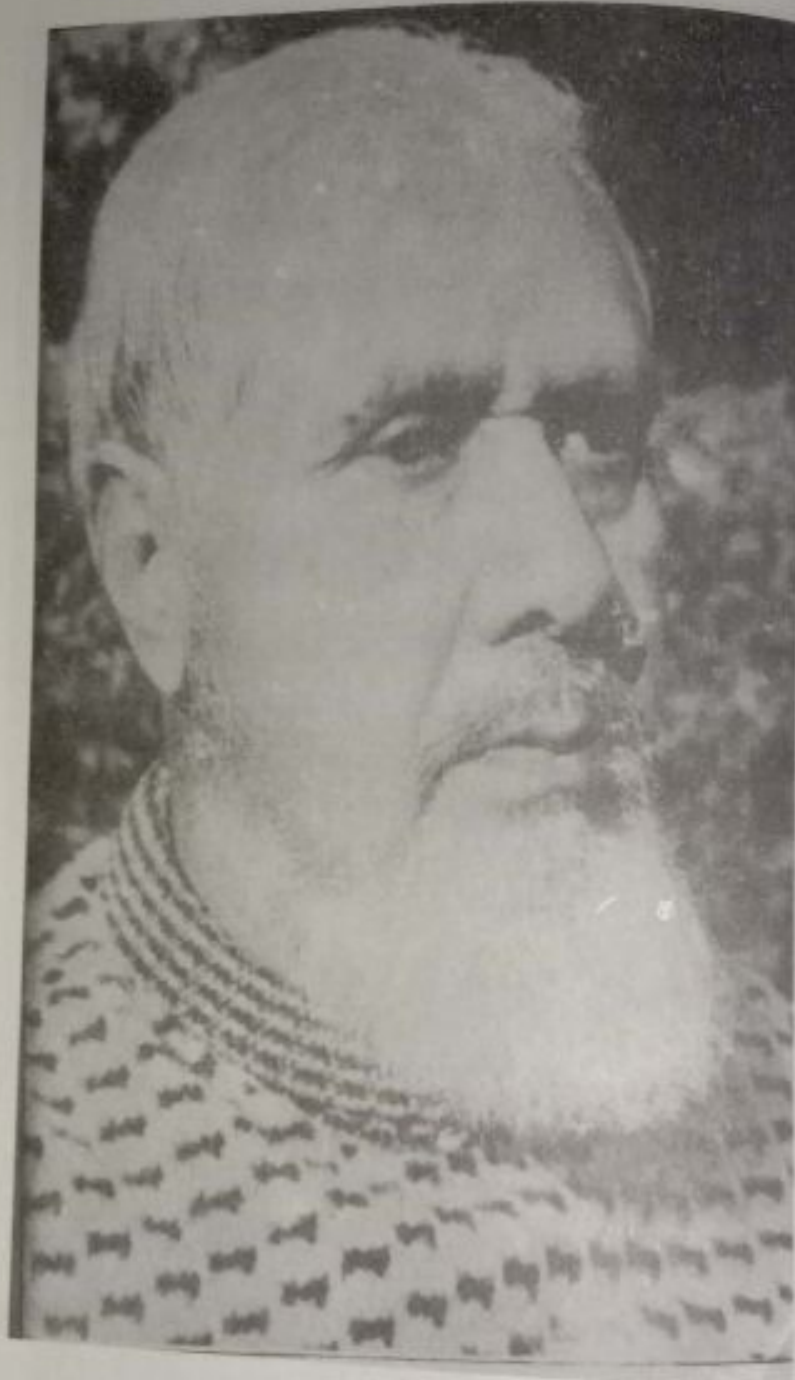
ڈاکٹر وحید قریشی، قدرت اللہ شہاب



ہادیہ طفیل، قدرت اللہ شہاب اور سراج حسین

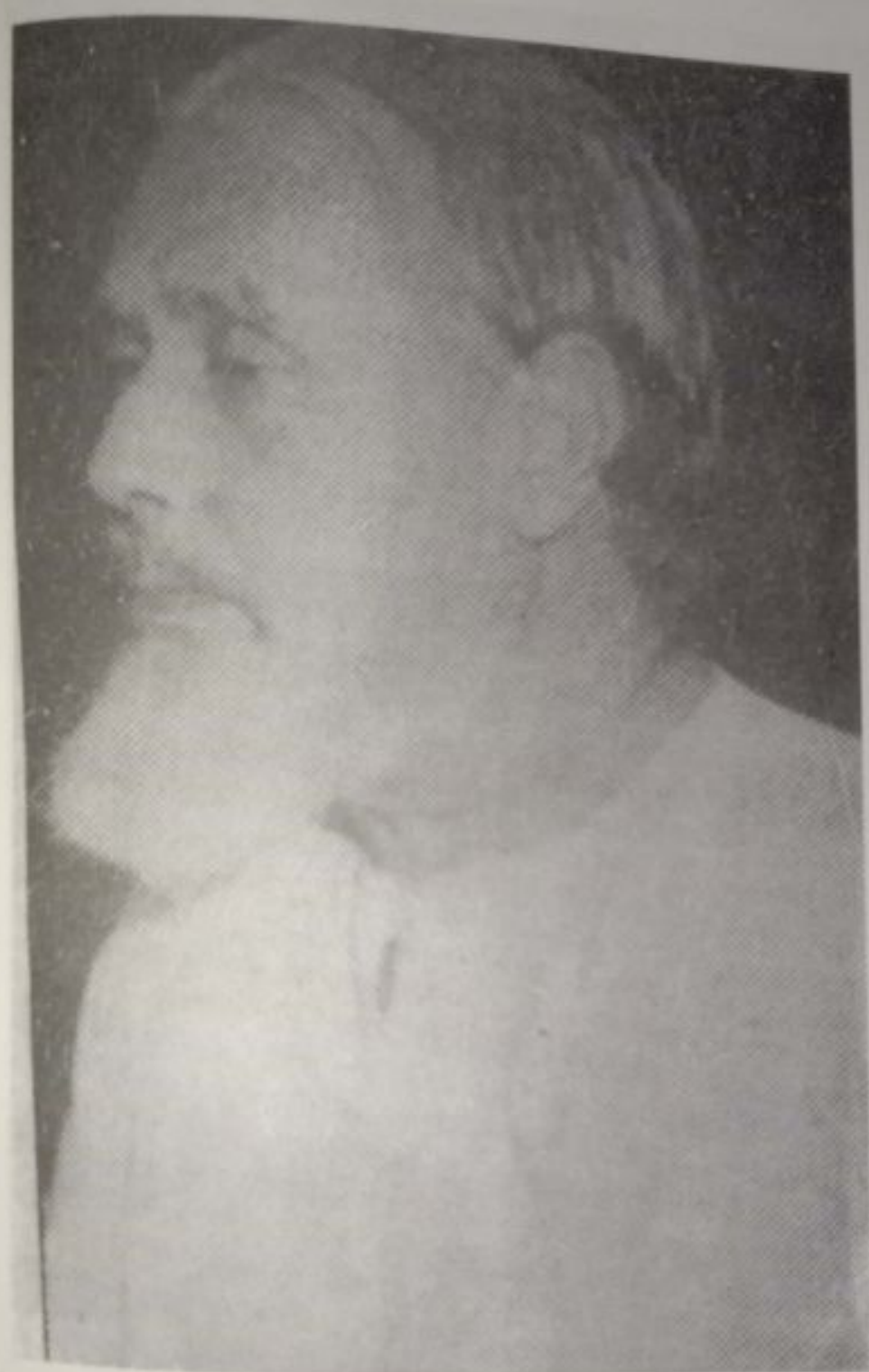


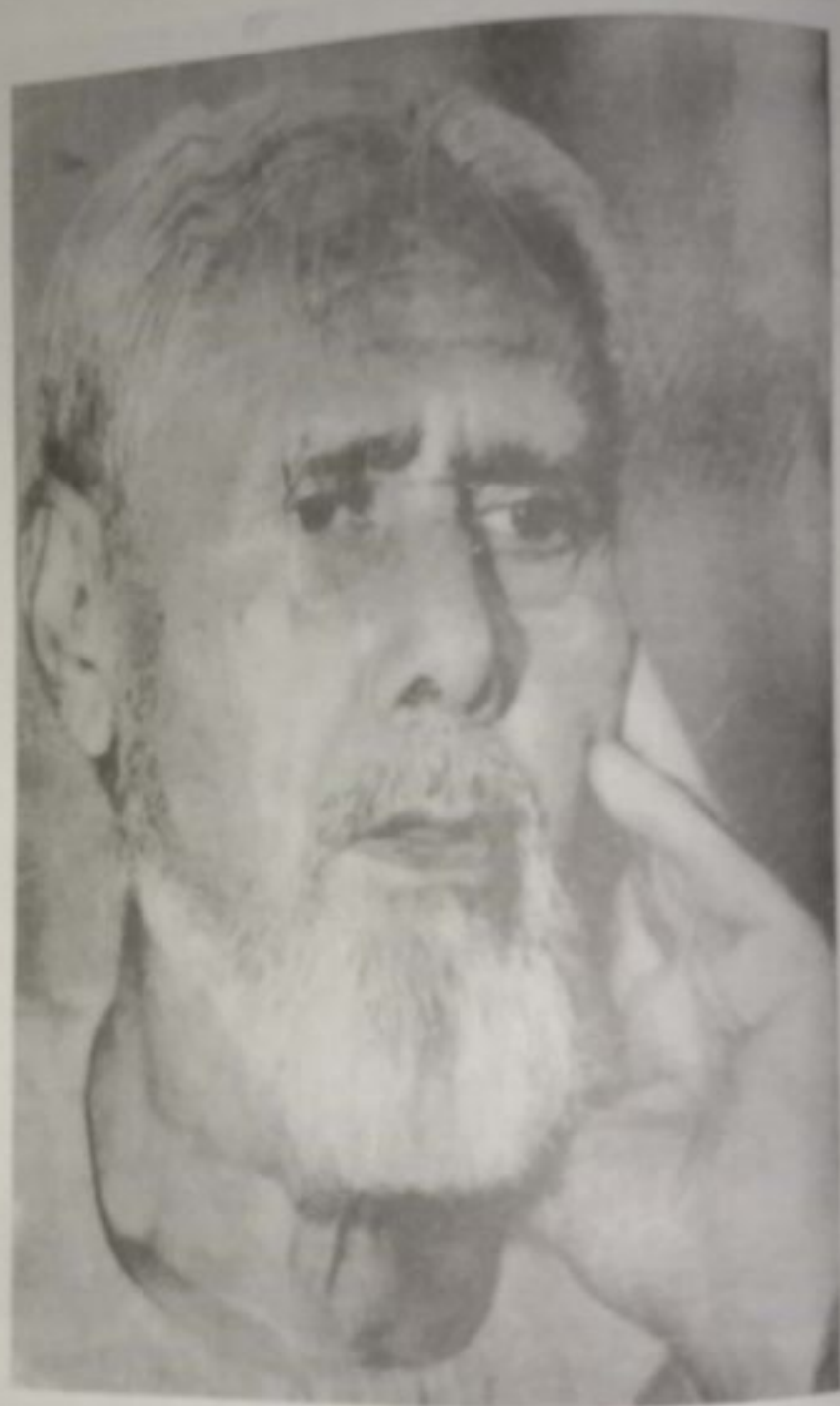


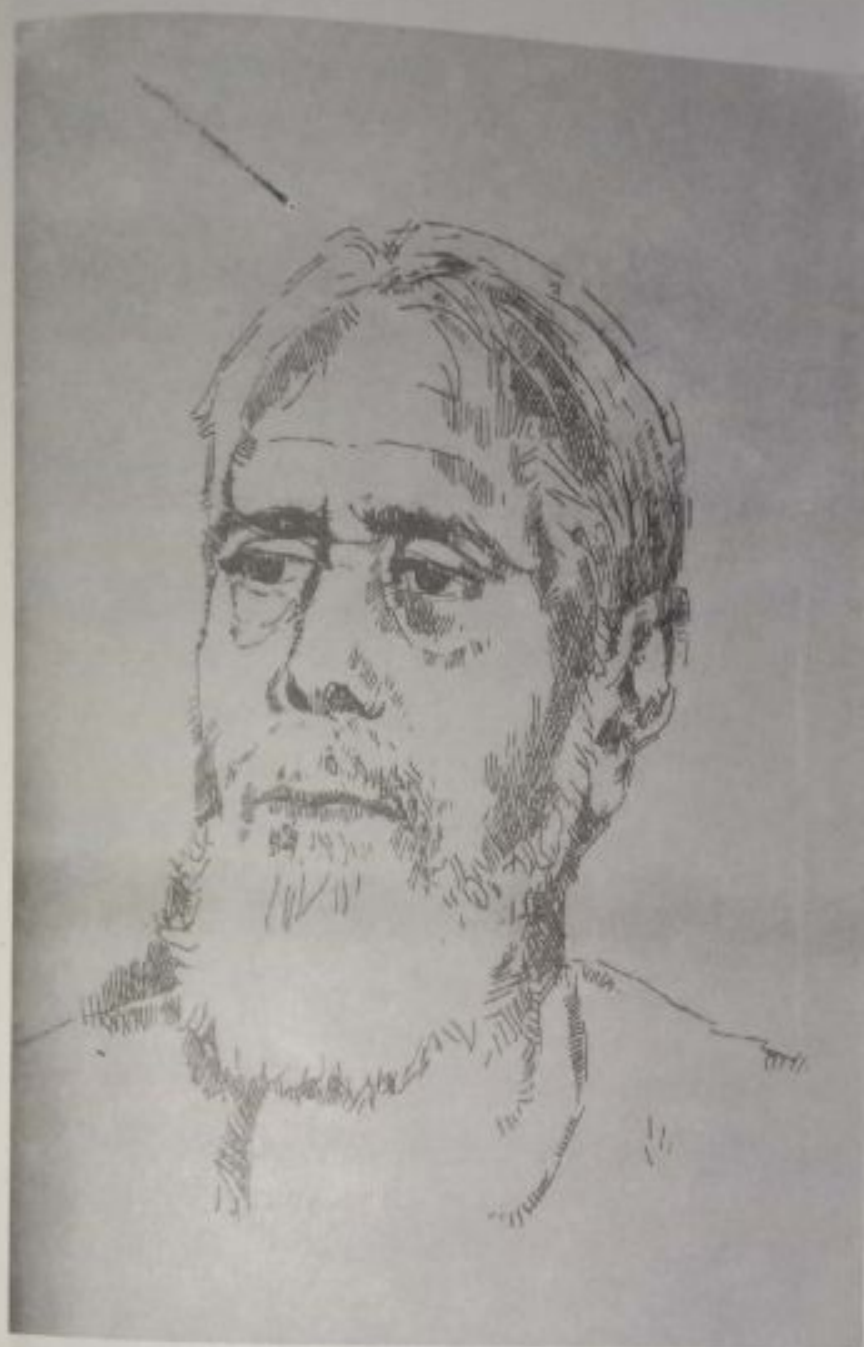


400

400







دَمِ تحریر

شخصیات

☆ قائد اعظم کے تین روپ

☆ مولانا مودودی

☆ مہاراجہ کشمیر

☆ ڈاکٹر احمد سويکارنو

☆ بابائے اردو

☆ میراجی

☆ میرارفق

☆ علی پورکا ایل

☆ محمد طفیل

☆ عباس خاں

☆ کاظمی صاحب

.....

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
(غالب)

قائد اعظم کے تین روپ

ریاست جموں و کشمیر میں جب شیخ محمد عبداللہ صاحب نے مسلم کانفرنس سے ناتا توڑ کر نیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تو مسلمانان ریاست کے لیے یہ بڑی تشویش اور آزمائش کا لمحہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے تمام وسائل مہاتما گاندھی کی ساری مقناطیسی کشش اور پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی مہارت شیخ صاحب کے ایک ایک اشارے پر ہر خدمت اور امداد کے لیے حاضر تھی۔ اس وقت جب کہ چوہدری غلام عباس صاحب مسلم کانفرنس کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو از سر نو منظم کرنے کی تلک و دو میں مصروف تھے تو ان کی ہمت بڑھانے اور ان کی دشوار گزار منزل کو اپنی رہنمائی کی مشعل سے روشن کرنے کا قائد اعظم بھی بہ نفس نفیس جموں تشریف لائے تھے۔

وہاں پر ان کا پُر جوش استقبال ہوا اور شہر کی چیدہ چیدہ راہ گزاروں پر ان کا نہایت شاندار جلوس نکالا گیا جب یہ جلوس رینڈیسی روڈ پر گزر رہا تھا تو مجھے دور سے قائد اعظم محمد علی جناح کی پہلی جھلک نظر آئی۔

ایک کھلی چھت کی موٹر کار میں قائد اعظم اور چوہدری غلام عباس شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں رضا کاروں اور جاں نثاروں کے پہرے لگے ہوئے تھے اور چاروں طرف دور دور تک مسلم کانفرنس کے نام لیواؤں کا جھوم ہی جھوم نظر آتا تھا۔ اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے فضاء میں گونج رہے تھے اور قائد اعظم مسکرا مسکرا کر دایاں ہاتھ پیشانی تک اٹھا کر لوگوں کے سلام و نیاز کا جواب دے رہے تھے۔ کبھی جب جوش و خروش حد سے زیادہ بڑھ جاتا تھا تو قائد اعظم اپنا بازو چوہدری صاحب کے بازو میں ڈال کر سر کی ہلکی سی جنبش سے ان کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

گویا زیادہ جوش سے کہہ رہے ہوں یہ چوہدری غلام عباس ہیں مجھے ان پر انتہائی اعتماد ہے جتنا کہ آپ کو بھی ہے۔ قائد اعظم کے سر کی جنبش دیکھ کر سارے کا سارا مجمع اور بھی جوش میں آ جاتا تھا اور آس پاس کی فضا قائد اعظم زندہ باد، چوہدری غلام عباس زندہ باد کے بلند نعروں سے گونجنے لگتی تھی۔ عوام الناس کی عقیدت اور قائد اعظم کی خوشنودی کے اس مظاہرے پر چوہدری صاحب دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر عجز و انکساری سے سر جھکا لیتے تھے۔ جموں کی سڑکوں نے یہ جاں پرور نظارہ کئی گھنٹے تک دیکھا۔ قائد اعظم کے اس دور کے جلوس کے بعد مجھے ان کی دوسری زیارت نئی دہلی میں نصیب ہوئی۔ 1946ء کے وسط میں جب یہ ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے اور پاکستان کا قیام بھی اٹل ہے تو کانگریس ہائی کمان نے ہندو اکثریت کے صوبوں کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں یہ پچھلے اڑیسہ کے دارالخلافہ کلکتہ میں تھی اور وہاں پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ہاڑیسہ میں کانگریس کی وزارت برسر اقتدار تھی اور شری ہرے کرشن مہتاب وزیر اعلیٰ تھے۔ جس وقت سارا ہندوستان ہندو مسلم مہتاب صاحب بڑے نیک دل، بے تعصب اور منصف مزاج انسان تھے۔ جس وقت سارا ہندوستان ہندو مسلم

فسادات کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ اڑیسہ ان چند خوش قسمت علاقوں میں سے تھا جو اس ہولناک آگ کے شعلوں سے کافی حد تک محفوظ رہے تھے۔ اس کی بڑی وجہ مسٹر ہرے کرشن مہتاب کی اپنی بے تعصبی تھی۔ اس زمانے میں اڑیسہ کا چیف سیکرٹری آئی سی ایس کا ایک انگریز افسر مسٹر کمپ تھا۔ یہ صاحب عجیب ذات شریف تھے۔ اپنی آنکھوں سے صاف دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان پر انگریزی سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے لیکن ان کا دل اس حقیقت کو قبول کرنے سے سراسر انکاری انکار کر رہا تھا۔ گوگو کے اس عالم میں ان کا ذہن پریشانی اور ان کے دفتری کام انتشار میں بری طرح مبتلا رہتے تھے۔ مہتاب صاحب اگر چاہتے تو چشم زدن میں مسٹر کمپ کی جگہ کسی اور اچھے افسر کو چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز کر سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ آئی سی ایس کے انگریز افسر اب محض چراغ سحری ہیں اس لیے وہ ازراہ مروت طرح دیتے گئے اور مسٹر کمپ بدستور ان کے چیف سیکرٹری رہے۔ البتہ شری ہرے کرشن مہتاب نے چپکے سے مجھے ہدایت دی کہ چیف سیکرٹری کو آرام سے اپنے دن پورے کرنے دو اور ان کا ضروری اور اہم کام حکمت عملی سے تم خود دیکھتے رہو۔ خاص خاص کاغذات اور فائلیں تم ہی میرے پاس لے کر آیا کرو۔

مجھے ڈر تھا کہ وزیر اعلیٰ کے ساتھ ڈپٹی سیکرٹری کے براہ راست رابطے کا شاید چیف سیکرٹری صاحب بُرا مانیں لیکن عضو معطل بن کر الگ تھلگ پڑے رہنا غالباً مسٹر کمپ کو بھی راس آیا۔ ایک روز عجیب سی میٹھی میٹھی تلخی کے ساتھ انہوں نے مجھے کہا..... ”مجھے تبخیر معدہ کی شاید شکایت تھی اب بہت افادہ ہے۔“ ”مبارک ہو“ میں نے رسماً کہا..... ”کس کا علاج ہے“ مسٹر کمپ نے بے ساختہ جواب دیا ”تمہارا“ میں نے تعجب سے پوچھا وہ ”کیسے“ مسٹر کمپ بولے..... ”تمہاری حرکت سے اب ہر روز کانگریسی وزیر اعلیٰ کی صورت نہیں دیکھنی پڑتی۔“

ان دنوں ہر ماہ کسی نہ کسی جگہ کانگریس ہائی کمان کے خفیہ اجلاس ہوا کرتے تھے۔ شری ہرے اہنی صندوقچی جو اکثر ان کے ساتھ رہا کرتی تھی بمعہ چابی میرے حوالے کر دیتے اور کہتے سرکاری اور سیاسی کاغذات کو چھانٹ کر الگ الگ کر لینا سرکاری کاغذ دفتر میں لے جانا، سیاسی کاغذ پانڈے جی کے حوالے کر دینا۔ شری دیس راج پانڈے ایک فربہ اندام لیکن نحیف الدماغ کٹر ہندو کانگریسی تھے جو مہتاب صاحب کے پولیٹیکل سیکرٹری کہلاتے تھے۔ ان کی تنخواہ جو صوبائی کانگریس کمیٹی سے ملا کرتی تھی بہت قلیل تھی۔ اس لیے وہ اکثر دھمکی آمیز لہجے میں مجھے طعنہ دیا کرتے تھے..... ”شہاب جی ذرا آزادی کا دن آنے دو کا یا پلٹ جائے گی، دیس راج پانڈے کی تنخواہ آئی سی ایس کی تنخواہ سے روپیہ سو روپیہ زیادہ نہ ہوئی تو گنگا جی میں ڈوب مروں گا۔“ جب میں مہتاب صاحب کی صندوقچی چھان پھٹک کر ان کے سیاسی کاغذات الگ کر لیتا اور انہیں پانڈے کے حوالے کرنے جاتا تو وہ بے اختیار چھی چھی کی گردان کرتے اور اپنا ہاتھ دو تین بار ماتھے پر مار کر کہتے، شہاب جی ذرا سوچو تو مہتاب جی کی تو عقل ماری گئی ہے۔ کانگریس کے سارے خفیہ کاغذ آپ کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ آپ آدمی تو اچھے ہیں لیکن مسلمان ہیں اس لیے پاکستانیے ہیں۔ پانڈے جی کو جب بھی موقع ملتا وہ کرید کرید کر مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہیں میں مہتاب صاحب کے سیاسی کاغذات تو نہیں پڑھا کرتا۔ میں ہر بار انہیں نال دیا کرتا۔ ایک بار جب انہوں نے کوئی خاطر خواہ جواب لینے کے لیے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا..... ”پانڈے جی ایسی باتیں پوچھا نہیں کرتے۔“

”کیوں نہ پوچھیں۔“ پانڈے جی نے زور سے کہا۔

”اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میں یہ کاغذات نہیں پڑھتا تو آپ کو یقین نہیں آئے گا اور اگر کہوں کہ پڑھتا ہوں تو

آپ شور مچائیں گے اور شکایتیں لگائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہتاب صاحب کے تمام سیاسی کاغذات نہایت ذوق و شوق اور غور سے پڑھا کرتا تھا اور کسی کسی اہم دستاویز کی نقل بھی اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا اور ایک بار جب وزیر اعلیٰ ہائے گمریس کی ہائی کمان کی میٹنگ میں شرکت کر کے کنک واپس آئے تو ان کی صندوقچی سے ایک لفافہ برآمد ہوا جس پر کئی جگہ ”بے حد خفیہ“ Top Secret ”صرف مکتوب الیہ اپنے ہاتھ سے کھولے“ کی بڑی بڑی مہریں ثبت تھیں۔ اندر ایک نو دس صفحات کا خط تھا جس میں کانگریس ہائی کمان نے اپنے صوبائی وزراء اعلیٰ کے نام نہایت مفصل ہدایات جاری کی تھیں۔ ان ہدایات کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریس وزارتوں کو فوری حفاظتی اور دفاعی تدابیر پر عمل شروع کر دینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیں۔ پولیس کے مسلمان عملے کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تھانوں سے ہٹا کر پولیس لائن میں رکھیں۔ جہاں تک ہو سکے ان لوگوں کو غیر مسلح رہنے دیں۔ جن صوبوں میں ایسی ملٹری پولیس موجود ہے جن کے گھڑسوار مشرقی سرحدی صوبے سے بھرتی کیے گئے ہیں ان کے رسالوں کو جلد از جلد توڑ دیا جائے۔ آئندہ سے اس قسم کے دستوں میں صرف ہندو سپاہی بھرتی کیے جائیں۔ بڑے بڑے مسلمان زمینداروں، تاجروں اور صنعتکاروں کے مال و املاک کی اصلی دستاویزات کو محفوظ رکھیں اور دوسرے کی تحویل میں رکھا جائے۔ آئندہ ہدایات جاری ہونے تک ایسی دستاویزات کی نقول دینے میں جلدی نہ کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ کانگریس ہائی کمان کے اس خفیہ مراسلے کو پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پاکستان تو مسلمان اکثریت کے صوبوں میں بنے گا پھر ہندو اکثریت کے صوبوں میں کس طرح کی حفاظتی اور دفاعی تدبیروں کی ضرورت ہے جن پر عمل کرنے کے لیے پولیس کے مسلمان عملے کو غیر مسلح کر کے لائن حاضر کرنا اس قدر ضروری ہو گیا۔ مسلمانوں کی زمینداریوں، فیکٹریوں اور تجارتی فرموں کی اصل دستاویزات کو دفتر میں دبا کر رکھنا چہ معنی دارد؟

جب اس قسم کے سوالوں نے ابھرا بھر کر مجھے پریشان کیا تو ایک روز میں نے دس دن کی چھٹی منظور کروائی۔ بہت سی کانگریسی دستاویزوں کی نقول کو سمیٹا جو پہلے سے میرے پاس جمع تھیں اس تازہ ترین خفیہ خط کا اصل مراسلہ جیب میں ڈالا اور اللہ کا نام لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔ نئی دہلی پہنچ کر قائد اعظمؒ کی جائے قیام کا طواف شروع کر دیا، معلوم ہوا کہ قائد بے حد مصروف ہیں۔ مسلم لیگ کے کئی مشہور لیڈر کئی دنوں سے آئے بیٹھے ہیں لیکن انٹرویو کی باری تک نہیں آئی۔ بارے دو تین روز کی تگ و دو کے بعد مجھے رسائی حاصل ہوئی، ہدایت ملی کہ پندرہ منٹ سے زیادہ اندر ٹھہرنے کی کوشش نہ کروں۔

کمرے میں قائد اعظمؒ براؤن رنگ کا دیدہ زیب سوٹ پہنے اور ایک شیشے والی عینک لگائے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں میز کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا تو عینک اتار کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں کہا..... ویل..... جو کہنا ہے جلدی کہو۔ میں نے کچھ کہے بغیر کاغذوں کی فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ شروع میں کچھ نقلیں تھیں قائد اعظمؒ نے کسی قدر بیزارگی سے سرسری طور پر انہیں دیکھا اور جلد جلد ورق الٹتے گئے۔ جب کانگریس کی ہائی کمان کے خفیہ ترین مراسلے کی اصل دستاویز آئی تو ٹھٹک گئے اور میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا بیٹھو۔

میں شکر یہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا، قائد اعظمؒ فوراً سے مراسلہ پڑھنے لگے ایک دفعہ پورا پڑھنے کے بعد اس کے چند حصوں کو دوبارہ دیکھا اور فرمایا ”یہ دستاویز کیسے ملی“۔ میں مختصر طور پر سارا واقعہ سنایا..... کیا میں اس خط کی ایک نقل بنوا کر رکھا سکتا ہوں؟“ قائد اعظمؒ نے پوچھا ”جناب نقل کیسی“ میں نے عرض کیا ”میں یہ اصل دستاویز آپ ہی کے لیے لایا ہوں..... قبول فرمائیں“۔ ”تھٹک یو۔“

قائد اعظمؒ نے فرمایا ”تم بے شک جاؤ“ میں سلام کر کے کمرے کے دروازے تک واپس پہنچا تو قائد اعظمؒ نے پیچھے سے آواز دے کر مجھے روک لیا اور کہا ”کیا تم جانتے ہو یہ حرکت کر کے تم نے کس قسم کا خطرہ مول لیا ہے۔“ یہی جناب اور بالکل بھائی ہوش و حواس۔ میں نے قانونی اصطلاح استعمال کی۔ قائد اعظمؒ مسکرائے ”ویل..... بوائے دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔“

قائد اعظمؒ سے میری آخری ملاقات 1948ء کے شروع میں کراچی میں ہوئی جب چوہدری غلام عباس مرحوم کشمیر کے زندان خانے سے رہا ہو کر آئے تو سیالکوٹ سے سیدھے کراچی تشریف لائے۔ ان دنوں میرا قیام لارنس روڈ پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تھا۔ اس فلیٹ میں دو کمرے اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دونوں کمروں میں فرش ہیستر لگے ہوئے تھے اور کوئی بیس بائیس دوست اور عزیز جو چاروں طرف سے مہاجرین ہو کر آئے ہوئے تھے وہاں فروکش تھے۔ اس بے سروسامانی کے ماحول میں چوہدری صاحب مرحوم تشریف لے آئے۔ ہم نے فلیٹ میں ایک چھوٹی کوٹھڑی میں چوہدری صاحب کا بستر لگا دیا اور چائنا بچھا دی۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا نماز سے فارغ ہوتے ہی چوہدری صاحب نے گورنر جنرل ہاؤس فون کر کے اے ڈی سی کو کراچی میں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ کوئی دس منٹ گزرے ہو گئے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور اے ڈی سی نے کہا کہ قائد اعظمؒ فون پر چوہدری صاحب سے بات کریں گے۔

کوئی ساٹھ منٹ تک قائد اعظمؒ نے چوہدری صاحب سے فون پر بات چیت کی۔ قائد اعظمؒ کا ایک جملہ جو دور بیٹھے بھی ہمیں بار بار سنائی دیا یہ تھا ویکلم عباس ویری ویری ویکلم..... اگلے روز کے لیے قائد اعظمؒ نے چوہدری صاحب کو لنچ پر مدعو کیا۔ اس روز قائد اعظمؒ کراچی کے قریب مالیر کی بستی میں جا کر ٹھہرے ہوئے تھے جب لنچ پر جانے وقت آیا تو میں نے اپنی گاڑی نکالی یہ ایک سیکنڈ ہینڈ پھلپر کا تھی جو چلتی کم اور رکتی زیادہ تھی۔ ایک دفعہ رک جائے تو دھکا لگائے بغیر دوبارہ اشارت نہ ہوتی تھی اور جب اشارت ہوتی تھی تو موٹر رکشا کی طرح گونج دار شور شرابا کیا کرتی تھی۔ چلنے کو تو میں چوہدری صاحب مرحوم کو اس کار میں بٹھا کر مالیر کے لیے روانہ ہو گیا لیکن مجھے مسلسل یہی دھڑکا لگا رہا کہ اگر کہیں یہ کار قائد اعظمؒ کے بنگلے میں داخل ہو کر رک گئی تو پھر اسے دوبارہ چلانے کے لیے دھکے کون لگائے گا۔

مالیر میں قائد اعظمؒ بہاولپور کے نواب صاحب کی کونٹھی ”بہاولپور ہاؤس“ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ہم وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ پورچ میں جا کر گاڑی روکی تو ایک اے ڈی سی بھاگا آیا اور چوہدری صاحب سے کہا آپ ابھی گاڑی میں بیٹھے رہیں قائد اعظمؒ خود پورچ میں آ کر آپ کا استقبال کریں گے۔

یک نہ خُذ مجھے تردد ہوا کہ اب قائد اعظمؒ بھی اس کار کی پھٹ پھٹ سنیں گے؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انجن بند کروں یا چتار رکھوں کہ یکا یک قائد اعظمؒ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ تشریف لے آئے۔ میں بھی تعظیماً کار سے نیچے اتر آیا قائد اعظمؒ نے دیر تک چوہدری غلام عباس مرحوم کو گلے لگائے رکھا۔ جب چوہدری صاحب تعارف کرانے کے لیے آگے بڑھے تو قائد اعظمؒ نے کمال شفقت سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا مسکرا کر فرمایا۔ ”اچھا تو آپ ہیں! عباس ہم ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں۔“

مولانا مودودیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ایک نامور صاحب قلم ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں جو مقام حاصل کیا ہے، وہ بہت کم لوگوں کو میسر آیا ہے۔ وہ اپنے طرز نگارش اور سادہ انداز بیان کے اعتبار سے جس میں استدلالی رنگ غالب ہے۔ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

1- مجھے مولانا سے ملنے کا کئی بار اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ انہیں ایک دانشور، مدبر اور مفکر کے روپ میں پایا۔ ان کی شخصیت پر کشش تھی اور گفتگو باوقار اور مشفقانہ ہوتی تھی، البتہ علمی مسائل یا سیاسی افکار جب موضوع گفتگو ہوتے، تو اس میں تشوق و برتری کا رنگ جھلکنے لگتا تھا۔

2- عموماً اہل علم جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، تو ان کی تحریریں بھاری بھر کم الفاظ و تراکیب اور ادق اصطلاحات و تشبیہات کے باعث عام اور اک و فہم سے بالاتر ہو جاتی ہیں یا پھر اوسیت کی چاشنی ان میں اتنی شامل ہو جاتی ہے کہ موضوع کی ثقاہت اس سے متاثر ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا کی تحریر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ خالص علمی و فکری موضوعات پر بھی جب قلم اٹھاتے ہیں، تو ان کا وہ مخصوص انداز قائم رہتا ہے جس سے اہل علم بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور ایک معمولی پڑھے لکھے کے لیے بھی اس کے معنی اور مفہوم تک رسائی آسان ہوتی ہے۔ تاریخ و تفسیر کے سلسلے میں بھی ان کی تحریروں میں علم بیان کی یہ خوبیاں برقرار رہتی ہیں۔

3- مجھے مولانا کی اکثر تصانیف کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے بعض تصانیف سے نظریاتی و اعتقادی نوعیت کا اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس اختلاف کے باوجود ان کے مطالعے سے ایک نو فکری تحریک پیدا ہوئی ہے جس نے مزید تحقیق و جستجو کی طرف مائل کیا ہے اس سلسلے میں ان کی تصنیف ”خلافت و ملوکیت“ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

4- کوئی کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہوتا۔ تاریخ میں ایسے اہل قلم بھی ملتے ہیں جنہوں نے معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کی بجائے منفی کردار ادا کیا ہے، لیکن بالعموم اہل قلم معاشرے کی بہتر تشکیل کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، خواہ ان کے طرز فکر اور طریق کار سے کسی کو اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

جہاں تک مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا تعلق ہے، وہ اپنے تمام تر اختلافی پہلوؤں کے باوجود خیر کے جذبے سے ماری نہیں۔ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے علم بردار تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے عملی جدوجہد کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی کام لیا جس نے ایک حد تک ذہنوں کو متاثر بھی کیا۔ اس لیے یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ مولانا کی

تصانیف سے بھی کام لیا جس نے ایک حد تک ذہنوں کو متاثر بھی کیا۔ اس لیے یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ مولانا کی تصانیف میں مثبت شعور نہیں، لیکن ان کی جماعتی دائرہ بندی جو صالحت کے سیاست آمیز مذہبی تصور پر مبنی تھی، بھری دالت میں اسلامی تاریخ و ثقافت کے منافی تھی اور اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوئے، بلکہ اس طرز فکر نے ایک مخصوص گروہ میں مذہبی فاشیت کا رنگ پیدا کر دیا۔۔۔۔۔ روح عصر تحذیب و تفریق میں مبتلا ہو گئی اور قوم مذہب پرست اور دنیا پرست کے فرقوں میں بٹ گئی۔ میں اپنی اس رائے کو ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا پرست ہر زمانے میں بکثرت رہے ہیں۔ اس تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مذہبی لوگ ایک نہایت مختصر حزب اختلاف میں سٹ سٹا کر رہ گئے۔ یہ صحیح ہے کہ عمل اور تقویٰ کے لحاظ سے مختلف مدارس ہیں اور تفاعل و تقابل کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ ہم میں اچھے بھی ہیں بُرے بھی۔ اہل بصیرت بھی ہیں اور مست مئے پندار بھی، مگر ہیں سب مسلمان اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے عوام کی اکثریت شریعت کا احترام کرتی ہے اور شرعی قوانین کے نفاذ کی خواہشمند ہے، لیکن عمل کی کوتاہیاں اور فکر نظر کی نارسائیاں بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس عالم کا مزاج ترکیبی علم و عمل اور تقویٰ و طہارت کے اعتبار سے اختلاف و تفاوت کا مقتضی ہے۔ اشیاء اپنے وجود کے لیے تضاد کا تقاضا کرتی ہیں۔ خیر و شر، نیک و بد، مومن و فاسق، متقی و فاجر، لازم و ملزوم کا اعتبار رکھتے ہیں اور اس اختلافات کی گونا گونی اور یو قلمونی پر اس عالم شہادت کا ظہور اور کاروبار کثرت و تفصیل کے وجود پر منحصر ہے۔ ہاں خیر و شر کی باہمی نسبت و اضافت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ علمائے حقہ کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کے اخلاق و اطوار کی اصلاح کریں اور ان کے معتقدات و افکار قانون شریعت یعنی فطرت الہیہ کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کریں۔ یہی منشاء الہی ہے اسی پر سنت الہی جاری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وعظ و تبلیغ اور پند و نصیحت کا کاروبار ازل سے آبد تک جاری رہے گا۔

مولانا نے اس سلسلے میں تصنیف و تالیف کے محاذ پر جو کام کیا ہے، وہ قابل قدر ہے، لیکن اس مقصد کے لیے حصول حکومت اور طلب جاہ و امارت جو ان کے پروگرام میں شامل ہو گئی، وہ مناسب نہ تھی۔ داعیان حق کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ خود دنیا طلبی میں ملوث ہو کر خواہشات نفسانی کے تصور میں پھنس جائیں۔ جو خود مادیت و نفسیات میں گم گشتہ ہوں وہ دوسروں کو اس دلدل سے کیسے نکال سکتے ہیں اور رُشد و ہدایت کا کام کس طرح انجام پا سکتا ہے؟

5۔ نظریاتی ہم آہنگی کے لیے ہم مسلک و ہم عقیدہ ہونا ضروری ہے جو لوگ مولانا کی تحریروں سے نظریاتی ہم آہنگی محسوس نہیں کرتے، ان کی راہ میں یہی مسلک اور عقیدہ رکاوٹ بنتا ہے مجھے خود مولانا کی وہی تحریروں پسند آتی ہیں جن کا میرے عقائد اور مسلک سے ٹکراؤ نہ ہو۔ اگر اہل قلم عقائد کی بحث سے بالاتر ہو کر لکھیں اور کسی دوسرے مسلک فکر کو ہدف تنقید بنائے بغیر اپنا نظریہ پیش کریں تو اس کی مقبولیت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

مولانا کا یہ نظریہ کہ ملک میں قرآن و سنت پر عمل کرنے کا ساز و سامان ہو، غیر اختلافی ہے۔ ہر مسلمان یہی خواہش رکھتا ہے لیکن جب مسلمانوں میں دائرہ بندی کی جاتی ہے اور صالح و غیر صالح کی بات کی جاتی ہے، تو مسلمان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ قرآن حکیم اس قسم کے اختلاف و افتراق کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن سب سے زیادہ جس چیز کا علمبردار ہے، وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن و امان ہو، تاکہ اعلائے کلمۃ الحق ہو سکے،

جی تو جدیدی تخیل و تصور پر بنی نوع انسان متحد و متفق ہو جائیں اور پھر اس مقصد حقیقی کی طرف متوجہ ہو سکیں جو غایت القابا ہے اور یہ منہج و مقصود معرفت نفس ہے جس کے بغیر معرفت الہی محال ہے، جہاں تک اچھے بُرے کی تمیز کا تعلق ہے اس سلسلہ میں شریعت اسلامی کا اصول یہ ہے کہ خدا ہی جانتا ہے اور بہتر جانتا ہے کہ کون اچھا اور کون بُرا ہے، البتہ وجدانی طور پر کراہت و استحباب یعنی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا حق انسان کو ہے، لیکن کفر و ایمان یا فسق و فجور کے بارے میں کوئی فتویٰ کسی جزوی یا فروعی معلومات کی بنا پر صادر نہیں کیا جاسکتا ہے اس لیے حضرت امام اعظم نعمان بن ثابت نے یہ فرمایا تھا کہ اگر کسی شخص میں سترہ وجوہ ایمان میں سے ایک وجہ بھی ہو تو اس کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ تقویٰ و صالحیت ایک کیفیت باطنی اور نور ایمان کا نام ہے جس کا علم ظاہر میں لگا ہوں کو نہیں ہو سکتا اس بنا پر کوئی تفریق من حیث الجماعت صالح یا غیر صالح کی نہیں ہو سکتی۔ فقہ حنفی کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اعمال صالح حقیقت ایمان کا جزو نہیں ہر دور میں لوگوں کے اعمال کی نیکی و بدی کے اعتبار سے عروج و تنزل اور ترقی و انحطاط ہوتا رہتا ہے لیکن خود مسلمانوں میں اعمال کی بنا پر دو جدا گانہ جماعتیں کبھی نہیں بنیں اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک جماعت کو اسلامی قرار دیا گیا اور دوسری کو غیر اسلامی میرے خیال میں جو لوگ اس انداز فکر کے حامل ہیں۔ انہیں مولانا کی تحریروں سے ہم آہنگی کیسے محسوس ہو سکتی ہے؟

”اردو ڈائجسٹ“ لاہور ستمبر 1981ء

☆.....☆.....☆

مہاراجہ کشمیر

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ جموں اور کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک روز اخبار میں پڑھا کہ پرنس آف ویلز کالج، بمبئی کے بی ایس سی کے طالب علم قدرت اللہ شہاب نے انگریزی مضمون نویسی کے ایک بین الاقوامی مقابلے میں اول آکر ساڑھے سات سو پونڈ نقد انعام اور طلائی تمغہ حاصل کیا ہے اس پر ان کی رگ رعیت پروردی پھڑکی تو انہوں نے فرمان بھیجا کہ آئیے اور میرے ساتھ چائے پیچھے میں بڑے بھائی کا سوٹ پہن اور کسی سے ٹائی بندھوا شام کے ۴ بجے مہاراجہ پیلس پہنچ گیا۔

وہاں پر ایک صاحب نے جو ڈیوڑھی وزیر کہلاتے تھے مجھے مہاراجہ کی سرکار میں پیش ہونے کے آداب نہایت وضاحت سے سمجھائے اور ایک آراستہ ویننگ روم میں بٹھا دیا جہاں دس بارہ آدمی درباری لباس پہنے چند پری چروں کے ساتھ پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی صبح کے نو بجے سے بارہ بجے کا منتظر بیٹھا اور کوئی دس بجے سے لیکن سرکار نے ابھی تک یا نہیں فرمایا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بے صبری دکھائی تو ڈیوڑھی وزیر غصے سے بولے کہ میاں تم کس کھیت کی سونے ہو! یہ دوسرے حضرات جو یہاں بیٹھے ہیں سب کرسی نشین درباری ہیں اور یہ آراستہ پیراستہ خواتین سرکار کی منظور نظر ہیں، تین چار دن سے یہ ہو رہا ہے کہ صبح آکر بیٹھ جاتے ہیں اور شام تک انتظار کر کے ہنسی خوشی واپس چلے جاتے ہیں، تم بھی چپکے سے بیٹھے رہو۔

میں گھنٹہ بھر اور چپکے سے بیٹھا رہا اس کے بعد اپنی خودی کو تھوڑا سا بلند کیا اور ڈیوڑھی وزیر کو برملا کہہ دیا کہ مہاراجہ صاحب سے ملنے کی درخواست میں نے نہیں کی انہوں نے خود مجھے چائے پر مدعو کیا ہے۔ اب اگر انہیں فرصت نہیں تو میں چلتا ہوں۔

ڈیوڑھی وزیر صاحب مجبور ہو کر خالص ڈوگرہ زبان میں بظاہر زیر لب بڑبڑاتے، لیکن حقیقتاً مجھے گالیاں دیتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اے ڈی سی آئے اور مجھے کشاں کشاں راج محل کے ایک اندرونی برآمدے میں لے گئے۔ وہاں انواع و اقسام کی وردیاں زیب تن کیے بیروں، ٹکڑوں اور درباریوں کا ہجوم ایک صوفہ کے گرد دست بستہ ایستادہ تھا، صوفے پر فرزند ولید سلطنت انگلیش مہاراجہ اور ہری سنگھ بہادر کے بی ایس سی کی وغیرہ نڈھال بھینے کی طرح اونڈھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت پوست صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے میلے کپڑوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تیز رفتاری گاڑی سے گر کر پھٹ گیا ہو۔

مہاراجہ ہری سنگھ رات بھر شراب کا شغل فرماتے تھے اور دن بھر وہ کھم اور ڈاکٹر ان کے لیے گشتوں کے پھٹنے لگا کر اگلی شب کے لیے تازہ دم کرتے رہتے تھے، چنانچہ اس وقت بھی چند عورتیں اور مردان کے اعضاء رئیسہ و شریفی کی خفی اور جلی ماش کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کی آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ بند تھیں اور ان کے کویوں میں گید گندے

ہر روز کی طرح تہ بہ تہ جم رہی تھی، ایک اے ڈی سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجہ کی سرکار میں پیش دوسرے اے ڈی سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی جو مینڈک کے کچلے پیٹ کو پتیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس تعارف کے بعد مہاراجہ کے خزانے سے غٹ غٹ کی کچھ آوازیں برآمد ہوئیں جن میں دریافت فرما رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

اے ڈی سی نے کمال ادب سے اطلاع دی کہ سرکار یہ وہی شخص ہے جسے انعام جیتنے کا اخبار میں پڑھ کر حضور نے بطور رعایا نوازی اور کرم گستری چائے پر بلایا تھا۔

مہاراجہ بہادر نے بعد استغنا و دریا دلی ہاتھ کے اشارے سے ایک بیرے کو حکم دیا کہ لے جاؤ اسے پلاؤ چائے اور کچھ پیسٹری ویسٹری بھی۔ غنودگی کے مارے مہاراجہ صاحب اپنا فقرہ بھی پورا نہ کر پائے اور ایک دو بیرے میری طرف یوں لپکے جیسے وہ میری مشکلیں کس کر چائے پلانے لے چلیں گے۔

خیر مہاراجہ بہادر کی چائے تو میرے مقدر میں کہاں تھی لیکن گھر پہنچتے ہی میں نے اپنے اندر سوئے ہوئے ٹھنچے کو لات مار کر بیدار کیا اس سے قلمدان منگوا مہاراجہ کے پیس پر، بیت الجن کے عنوان سے ایک جاندار طنز یہ لکھنے بیٹھ گیا۔ ابھی چند سطریں لکھ پایا تھا کہ جموں و کشمیر کے قابل فخر رہنماء چوہدری غلام عباس مرحوم ہمارے ہاں آئے اور پوچھا کہ یہ بیت الجن کیا بلا ہے؟ کسی آسیب کا ذکر ہے اس میں؟

”جی ہاں“ میں نے کہا ”ایک بہت بڑے آسیب کا“

چوہدری صاحب نے مزید تفصیلات دریافت کیں تو میں نے سارا واقعہ کہہ دیا اور کہا کہ میں نے اب یہ عزم کر لیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی ملازمت کبھی اختیار نہ کروں گا بلکہ ”بیت الجن“ کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھ کر مہاراجہ اور اس کے خاندان سے ارباب وطن کی بے بسی کا پورا پورا انتقام لوں گا۔

میرے عزائم کی تفصیل سن کر چوہدری صاحب نے فرمایا ”اگر تمہارا واقعی یہ ارادہ ہے کہ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھو، تو مہاراجہ کے خلاف کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر دو۔ کیونکہ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہارے کاغذات تفتیش کے لیے آخر اسی ریاست کی پولیس کے پاس ہی تو آئیں گے۔ یہ سن کر میں نے قلمدان پیٹ لیا اور ٹھنچے کو آئی سی ایس کی خوشگوار یوں سے بہلا پھسلا کر پھر سلا دیا۔ ”بیت الجن“ میری پہلی ادبی کاوش تھی جو آئی سی ایس میں داخل ہونے کی احتیاط پر قربان ہو گئی۔

آئی سی ایس میں داخل ہونے کے بعد اس احتیاط کی قربان گاہ پر جہ عذیب شمس نا آفریدہ اس بندہ محتاط والا بیٹاق کی چھری اور کیمیر کی زد میں آئے ان کی لہرست طریق ہے، اہم سول سروس کی دوسری مصلحت کی ذات کے نیچے بہت سے باغی اور سرکش جن اب بھی احتجاجاً اچھل کود کر رہے ہیں اور مجھے لمحہ سعید یا ناسعید کا انتظار ہے جب یہ آئینہ عیندی صہبا سے پھلے اور مصلحت کا یہ ڈاٹ بھک سے اڑ کر دور جا پڑے۔

”جام نو“ کراچی 1977ء

ڈاکٹر احمد سوئیکارنو

21 جون 1970ء کے روز جکارٹہ میں ڈاکٹر احمد سوئیکارنو 69 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر سوئیکارنو کی وفات کے ساتھ جدوجہد آزادی کا ایک بہت بڑا سپاہی کارزار حیات سے رخصت ہو گیا۔ اس ایک شخص نے ہزاروں بکھرے ہوئے جزیروں کو ایک ملک کے سانچے میں ڈھالا۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی علاقائی، طبقاتی اور اختلافی عصبیتوں کو یکجا کر کے ان سب کو انڈونیشی قومیت کی تسبیح میں پرو دیا۔ درجنوں مقامی اور علاقائی زبانوں کو رسم الخط اور ایک قومی زبان کے قالب میں سموایا اور ایک ایسی قوم کو جس پر ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے مٹھی بھر ڈبچ چار سو سال تک حکومت کرتے رہے تھے، آزادی، عزت نفس اور خودی کا سبق پڑھا کر دنیا بھر کے سامراجیوں کے لیے وبال جان بنا دیا۔

ڈاکٹر سوئیکارنو 1901ء میں سورا بایا میں پیدا ہوئے تھے۔ 1925ء میں انہوں نے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ہی اپنے وطن کی آزادی کی تحریک کے سرگرم کارکن بن گئے۔ ڈبچ حکومت نے انہیں کئی بار گرفتار کیا اور کئی بار انہیں ایک جزیرے سے نکال کر دوسرے جزیروں میں نظر بند کرتے رہے۔ اس قید و بند، خانہ بدوشی اور در بدری کی حالت میں وہ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کو مستقل اور مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1941ء میں جب جاپانی افواج نے انڈونیشیا پر قبضہ کیا تو انہوں نے ڈاکٹر سوئیکارنو کو یہ پیشکش کی کہ اگر انڈونیشیا کی تحریک آزادی جاپانی حملہ آوروں کے ساتھ تعاون کرے تو جنگ ختم ہونے پر انڈونیشیا کو مکمل آزادی دیدی جائیگی۔ ڈاکٹر سوئیکارنو اور ڈاکٹر محمد حطے نے اس پیشکش کا نہایت ہوشیاری اور حکمت عملی سے فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو انہوں نے جاپانیوں کے ساتھ تعاون کا معاہدہ کر لیا تاکہ جاپانی افواج انڈونیشیا پر مسلط ڈبچ اقتدار کا قلع قمع کر دیں اور دوسری طرف انہوں نے ایک خفیہ تنظیم کی داغ بیل ڈال دی جو زیر زمین سرگرم رہے اور جنگ ختم ہوتے ہی فوراً جاپانیوں کو بھی انڈونیشیا کی سرزمین سے نکال باہر پھینکے۔

اس دودھاری تلوار کو ڈاکٹر سوئیکارنو، ڈاکٹر محمد حطے، ڈاکٹر سلطان شہریار اور دوسرے رہنماؤں نے کچھ ایسی چابک دستی سے چلایا اور اپنی ظاہری اور خفیہ مجاہدانہ سرگرمیوں کے کچھ ایسے جوہر دکھائے کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی انڈونیشیا ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا۔

آزادی سے کچھ عرصہ قبل ایک وقت ایسا بھی آیا جب ڈبچ اور جاپانی ناکہ بندیوں کی وجہ سے انڈونیشی مجاہدین کے

ہاں بچوں کے نائز نبوب، زخمیوں کی مرہم پٹی اور سپاہیوں کے علاج خاص طور پر پلیریا کے علاج کے سامان کا سناک قریبا قریبا ختم ہو گیا۔ اس آڑے وقت میں غیر منقسم ہندوستان کے چند سر پھرے نوجوانوں نے انڈونیشی جنگ آزادی میں شہرہ بہت ہاتھ بٹانے کا بیڑا اٹھایا چنانچہ اڑیسہ کے دارالحکومت کلک میں ایک خفیہ تنظیم بنائی گئی جس میں چار ہندو اور چار مسلمان شامل تھے۔ کلکتہ کے قریب ڈم ڈم اتر پورٹ پر ایک فوجی کباڑ خانے سے دو ایسے ڈکونا ہوائی جہاز کوڑیوں کے مول حاصل کیے گئے جو بالکل کنڈم شدہ حالت میں اور ناقابل پرواز تھے۔ مرمت کر کے انہیں ٹھیک ٹھاک کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ٹوٹے پھوٹے ہوائی جہاز مہینے میں دو یا تین بار ضروری ادویات اور سامان جنگ لے کر چوری چھپے جو گجا کر تانا انڈونیشی جنگ آزادی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ جہاز کلک سے کوئی تیس میل دور بھوبھہ نیشنل نامی ایک مقام سے پرواز کیا کرتے تھے۔ آج کل تو بھوبھہ نیشنل اڑیسہ کا نیا اور ماڈرن دارالحکومت ہے لیکن اس زمانے میں یہ مقام ایک ویرانہ تھا جہاں چند قدیم مندروں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی جب یہ ہوائی جہاز سامان اتار کر انڈونیشیا سے واپس لوٹتے تھے تو کبھی نہ کبھی ان میں جنگ آزادی کی کوئی اہم ہستی بھی ایک آدھ روز کے لیے ضروری ہدایات و مشورہ دینے بھوبھہ نیشنل آجایا کرتی تھی۔ ایک بار ڈاکٹر سلطان شہریار آئے دوسری بار ڈاکٹر سوائیکار نو محض ایک روز کے لیے آئے ان کا چہرہ ایک گول مٹول بچے کی طرح شگفتہ اور بھولا بھالا تھا۔ آنکھوں میں عقاب کی چمک اور تن بدن میں سیماب کی طرح اضطراب و اضطراب تھا۔ بھوبھہ نیشنل اترتے ہی انہوں نے بھوک اور پیاس کی شدت کا اظہار کیا۔ جلدی جلدی انہیں صندل کا شربت پلایا گیا اور کھانے کے لیے مرغ کا سالن اور سادہ چاول پیش کیے گئے۔ انہوں نے بچوں کی طرح جھوم جھوم کی بڑی رغبت سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد 1965ء تک انڈونیشیا اور پاکستان میں جب بھی وہ کسی دعوت میں شریک ہوئے اور جب کبھی کسی نے یہ پوچھا کہ آپ کو کوئی خاص ڈش پسند ہو تو بتا دیں تو اکثر وہ بے ساختہ فرمائش کیا کرتے تھے ”ہاں ہاں، چکن کری اینڈ رائس“۔

ڈاکٹر سوائیکار نو کی تحریر اور تقریر میں خدا نے جادو کا اثر بھر رکھا تھا خاص طور پر ان کی تقاریر میں فصاحت کے شرارے اور بلاغت کے فوارے پھوٹتا کرتے تھے۔ وہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک آٹھ آٹھ دس دس لاکھ کے مجمع کو اپنی تقریر کے جادو سے مسحور کر کے بٹھائے رکھتے تھے۔ ان کی تقریروں میں سیاست بھی ہوتی تھی اور صحافت بھی۔ خوشامد بھی ہوتی تھی اور ملامت بھی، تلخی بھی ہوتی تھی اور لطائف و ظرائف بھی، عربی کے اشعار بھی ہوتے تھے اور قرآنی آیات بھی، زبان وہ ہمیشہ انڈونیشی ہی بولتے تھے لیکن جوش یا جذبے یا فحش کی رو میں بہ کر وہ کبھی کبھی بے اختیار ڈچ زبان کے فقرے بھی استعمال کرنے لگتے تھے۔

ایک بار ان سے اس صورتحال کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بڑا لطیف جواب دیا۔ ڈاکٹر سوائیکار نو نے کہا ڈچ حکومت کے دور میں میں اختیاری غلام نہ تھا بلکہ اضطراری غلام تھا۔ اس مجبوری کے عالم میں جو تعلیم میں نے حاصل کی وہ ڈچ زبان میں تھی۔ یہ شاید اسی کا اثر ہے کہ جب تک میرا بیان میرے اختیار میں رہتا ہے۔ میں اپنی مادری زبان بولتا ہوں لیکن جوں جوں میرا بیان میرے اختیار سے باہر نکلنے لگتا ہے توں توں میری زبان بھی ڈچ ہونے لگتی ہے۔

اتنا کہہ کر ڈاکٹر سوائیکار نو کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے چند لمحہ سکوت کے بعد وہ مسکرائے اور کہا ”یوں بھی گالی دینا ڈچ زبان میں ہی بھلا لگتا ہے کیونکہ ساری عمر ہم نے گالیاں کھائی بھی اسی زبان میں ہیں۔“

امپیریل ازم اور سامراجی ریشہ دوانیوں پر ڈاکٹر سویکارنو کی زبان، قلم اور ذہن تیز دھار تلوار کی طرح کاٹ

کرتے تھے۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ سامراجی حکمران اتنے خود غرض اور بے اصول ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اہمیت بڑھانے کی خاطر اپنی زبان کی گرائمر تک بدل دیتے ہیں۔

مثلاً جب برٹش امپائر اتنی پھلی، پھولی اور پھیلی کہ اس پر آفتاب غروب نہ ہوتا تھا تو فرنگی نے لگے ہاتھوں انگریزی زبان کی گرائمر میں ایک بے ٹکی سی تحریف کر ڈالی۔ قاعدے کی رو سے جب کوئی مسافر کسی شہر میں وارد ہوتا ہے تو انگریزی میں یہ کہا جاتا ہے کہ

HE ARRIVED AT NEWYORK, TOKYO, KARACHI, PARIS, ETC

لیکن جب وہی شخص لندن پہنچتا ہے تو انگلش زبان کا مزاج بدل جاتا ہے اور

HE ARRIVED IN LONDON

LONDON کی جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک اور موقع پر ڈاکٹر سویکارنو نے بتایا کہ اپنی مرکزیت کو ثابت کرنے کے لیے مغربی اقوام نے ایک اور جھنڈا بھی استعمال کیا ہے جب کبھی مشرق کا ذکر آتا ہے تو کسی خطے کو مشرق قریب کہا جاتا ہے کسی خطے کو مشرق وسطیٰ کہا جاتا ہے۔ کسی علاقے کو مشرق بعید کہا جاتا ہے۔ یہ علاقے قریب کہاں سے ہیں؟ وسط کہاں سے اور بعید کہاں سے؟ مغربی ممالک کے متعلق مغرب قریب، مغرب وسطیٰ اور مغرب بعید کی اصطلاحیں کبھی ایجاد نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ پہلے سارے کے سارے مغرب کو کائنات کا مرکز قرار دے دیا جاتا ہے اور اس کے بعد مشرق کے اطراف و کنار مقرر کیے جاتے ہیں۔

ایک بار ڈاکٹر سویکارنو سے پوچھا گیا کہ حضور آپ کے ملک میں گھر گھر چار چار، پانچ پانچ، سات سات بچے ہوتے ہیں۔ کیا انڈونیشیا جیسے غریب ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ ڈاکٹر سویکارنو نے ایک تلخ سا قہقہہ بلند کیا اور یو این او کی مطبوعات میں چھپے ہوئے اعداد و شمار کا حوالہ دے کر بتایا کہ جب سے خاندانی منصوبہ بندی کا چرچہ عام ہوا ہے اس وقت سے دنیا کے ہر حصے میں سفید فام آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے اور رنگ دار آبادی کو مسلسل گٹھانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

یہ بھی ایک سوچی سمجھی ہوئی سازش ہے۔ ڈاکٹر سویکارنو نے کہا..... ”کہ دنیا کے مسائل یا بیلٹ سے طے ہوتے ہیں یا بیلٹ سے (یعنی یا ووٹوں سے طے ہوتے ہیں یا بندوق کی گولی سے) دونوں صورتوں میں آخری فیصلہ انسانوں کی استعداد کے علاوہ تعداد سے بھی ہوتا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے عوام کو یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔“

شروع شروع میں ڈاکٹر سویکارنو جذباتی اور ذہنی طور پر پنڈت جواہر لعل نہرو سے بہت متاثر تھے لیکن جب پہلی پنڈ ونگ کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ سحر بڑی حد تک ٹوٹ گیا۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر سویکارنو نے پہلی بار محسوس کیا کہ پنڈت نہرو کے نزدیک ایشیا کے اتحاد کا دوسرا نام بھارت کی قیادت کو تسلیم کرنا ہے۔ اس مایوسی کے بعد ڈاکٹر سویکارنو بھارت سے کھینچے گئے اور رفتہ رفتہ پاکستان کے قریب سے قریب تر آتے گئے یہاں تک کہ ستمبر 1965ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ تو ڈاکٹر سویکارنو نے اپنی ذاتی نگرانی میں عملی اشتراک و تعاون کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا جسے ہم قیامت تک

فراموش نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر سوہی کا رنوکی قیادت میں بائکپن، ان کی سیاست میں کچھ ایسی، صدارت میں اصراف اور ذات میں رنگینا پن
 تھا لیکن جنگ ہو یا امن، عروج ہو یا زوال، اقتدار ہو یا بے اختیاری، آزادی ہو یا نظر بندی، ہر حالت میں ڈاکٹر سوہی کا رنوک
 اپنے ملک کے عوام کے لیے ہمیشہ ”جنگ کا رنوک“ یعنی ”عظیم بھائی“ ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار سے محروم ہونے کے
 اسی سال بعد بھی جب نظر بندی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے جسدِ خاکی کو انڈونیشیا کے پرچم میں لپیٹ لیا گیا۔
 انڈونیشیا کے صدر جنرل سوہارتو کی قیادت میں بحری، بری اور ہوائی افواج نے ان کے جنازے کو سلامی دی اور ساری قوم
 نے عالم سوگواری میں انہیں ایک محسن اور ہیرو کی طرح رخصت کیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہفت روزہ ”شہاب“، 16 جولائی 1970ء

☆ — ☆ — ☆

بابائے اردو

بابائے اردو کی وفات کی خبر سن کر ایسا محسوس ہوا گویا ہمارے سر سے ایک شفیق اور مہربان کا سایہ اٹھ گیا ہے جو ہر وقت ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے تیار رہتا تھا۔

ابھی یہ کل کی بات نظر آتی ہے کہ کراچی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس روز جب ہم نے گلڈ کی ممبر شپ کا رجسٹر کھولا تو سب سے پہلے بابائے اردو نے اپنی سفید شیروانی کی جیب سے نیلے رنگ کا قلم نکال کر رجسٹر میں سر فہرست اپنا نام لکھا۔ جب رجسٹر میں ”عبدالحق“ کے دستخط ثبت ہوئے تو یہ نظر آتا تھا کہ سر سید، حالی، شبلی سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر ہماری سب سے کم عمر ممبر ڈھاکہ کی ام عمارہ تک ادب اور ثقافت کی ایک مکمل تاریخ گلڈ کو اپنی شرکت سے نوازا رہی ہے۔

اس کے بعد جب بھی گلڈ کا کوئی اہم اجلاس ہوا بابائے اردو اپنی مجبوری اور بیماری کے باوجود اس میں ضرور شرکت کرتے ایک بار ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ہم نے سوچا کہ ان کو گلڈ کے جلسے میں شامل ہونے کی تکلیف نہ دی جائے۔ ابھی جلسہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی لیکن جو صاحب مکملمین کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ وہ ”بابائے اردو“ تھے۔ آتے ہی بگڑ کر بولے۔ ”آج کل سعادت مندی کا مفہوم بگڑ گیا ہے۔ آج کل کے نوجوان چاہتے ہیں کہ بزرگوں کا نام تو لیا جائے ان سے کام نہ لیا جائے لیکن یاد رکھو، عبدالحق کے ہاتھ پاؤں ابھی چلتے ہیں تمہارا بچہ آسانی سے نہیں چھوڑوں گا کیونکہ تم ایک مفید تحریک چلا رہے ہو۔“

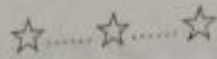
دو ماہ قبل جب صدر مملکت کی دعوت پر بابائے اردو مری کے فوجی اسپتال میں داخل ہوئے تو صدر ایوب ان سے ملنے کئی بار اسپتال گئے اور ہر بار واپسی پر صدر ایوب نے نہایت عقیدت سے یہی کہا کہ اگر انسان کی زندگی پر کسی بلند مقصد کا جنون چھا جائے تو وہ مولوی عبدالحق کی طرح بڑھا پے، جوانی اور بیماری میں بھی ہمدرد رہتا ہے۔

جس وقت مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ جگر کے سرطان کا مرض لا علاج طور تک بڑھ چکا ہے تو انہوں نے صدر ایوب سے اصرار کیا کہ انہیں کراچی بھیج دیا جائے تاکہ وہ اپنے آخری ایام انجمن اردو کے قدموں میں گزاری سکیں۔

15 اگست کی صبح کو جب تیز گام گاڑی راولپنڈی کے ریلوے سٹیشن پر آ کے رکی۔ تو فوجی اسپتال کے وردی پاشی جوانوں نے مولوی صاحب کا اسٹریچر بڑی احتیاط سے ان کے کوبے میں پہنچا دیا۔ ایوان صدر کے ایک ڈاکٹر ان کے

ساتھ سفر کر رہے تھے۔ آکسیجن کے سلنڈر اور دوائیوں کے ڈبے کوپے میں رکھ دیے تھے، مولوی صاحب نے آنکھیں کھول کر سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہر ایک کو باری باری خدا حافظ کہا ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک اور آواز میں وہی مخصوص گرج تھی۔ ایسی گرج اور چمک جس نے پچھلی نصف صدی کے ہر سیاسی، ثقافتی اور ادبی طوفانوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا اور آج اگرچہ ان کا جسم خاک کی زیر زمین چلا گیا ہے لیکن ان کی شخصیت کی چمک اور ان کے عظیم کارناموں کی گرج ہماری تاریخ میں ہمیشہ زندہ سلامت رہے گی۔

بشکریہ ریڈیو پاکستان، اکتوبر 1961ء



میراجی

سب سے پہلے میں آپ کو رُوئے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میراجی کے متعلق مجھے جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ محض اس کے مطبوعہ کلام اور کتابوں کے ذریعہ سے ہے۔ اتفاق سے مجھے کبھی میراجی سے ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا، اس وجہ سے بہت ممکن ہے کہ میراجی کے متعلق میرے تاثرات میں آپ کو وہ شدت اور جذبات نظر نہ آئیں جو اس کے زیادہ قریبی عقیدت مندوں کا حصہ ہیں۔ اس کوتاہی کا مجھے احساس ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ تسلی بھی ہے کہ اچھا کلام شاعر کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور کئی صورتوں میں آئینہ حقیقت سے زیادہ صحت مند، روشن اور بے عیب ہوا کرتا ہے۔

میراجی کی موت کے بعد اس پر مختلف رسالوں اور اخباروں میں جو مضامین اور مقالات وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میراجی کی شخصیت بے حد غیر معمولی، اثر آفریں اور مسکون کن تھی۔ ایسی شخصیت میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خطرات بھی، سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایسی بے پناہ اور استثنائی شخصیت دیکھنے اور ملنے والوں کو اپنی ذات کی انفرادیت میں اس درجہ منہمک کر سکتی ہے کہ اس کے دیگر کمالات کی طرف پوری توجہ کے ساتھ رجوع ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے چنانچہ میراجی کے ساتھ کسی حد تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میراجی کام لیتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان پُر اسرار گولوں کا ذکر کیا جائے جو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا عادی تھا یا اس کے لباس، اس کے بالوں، اس کی آنکھوں، اس کے معاشقوں اور اس کی دیگر اضطرابی حرکات کا ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے وہ زندگی کے ساتھ ایک ترچھے زاویے پر وابستہ تھا۔ میراجی کی زندگی کتنی ہی دلکش اور سحر کار کیوں نہ ہو اس بات کو فراموش کرنا حقیقت سے بعید ہوگا کہ ادب کے لیے اصلی وراثت میراجی کا کلام ہے، میراجی کی زندگی میں کسی حد تک یہ دونوں لازم و ملزوم ضرور ہیں لیکن ان کے درمیان ایک محتاط توازن قائم رکھنا بہر حال ضروری ہے اگر یہ توازن برقرار نہ رہے تو شاعر اور فرد دونوں کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ابھی میراجی اور ہمارے درمیان وقت کی اتنی وسیع خلیج حائل نہیں ہوئی کہ ہم ان نقوش کو نظر انداز کر سکیں جو اس کی شخصیت نے ہمارے اذہان پر ثبت کیے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ نقوش ابھی بہت عرصہ تک دھندلے نہ پڑیں گے کیونکہ ان میں بے پناہ شدت اور شدی ہے لیکن اس خطرے سے خبردار رہنا بھی ضروری ہے کہ کہیں انجام کار میراجی کی شاعری محض اس کی زندگی کا پس منظر بن کر نہ رہ جائے۔ یہ کوئی فرضی خطرہ نہیں ہے اس کی بنیاد ایک الٹا حقیقت پر مبنی ہے۔ آج اگر آپ ایک عام پڑھے لکھے نوجوان سے میراجی کے متعلق گفتگو کریں تو ہو سکتا ہے کہ اسے میراجی کی غیر معمولی باتوں کے متعلق تو پانچ دس قصے ازبر ہوں گے، لیکن شاید وہ اس کی کسی نظم یا گیت کے دو شعر بھی ٹھیک طرح نہ سانسے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر چند میراجی کی زندگی رسائل کے صفحات میں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے یا بڑی تیزی سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی ہے لیکن اس کی کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ آپ اسی لاہور میں نکل جائے دو تین ابتدائی کتابوں کے علاوہ آپ کو میراجی کی کوئی تصنیف کسی کتاب گھر میں نظر نہ آئے گی۔

اگر میراجی کی روح لاہریوں اور ذاتی کتب خانوں میں محدود رہی اور اس کے جسم کی میزبانی لکیروں کو جنسی دواخانوں کے پوشروں کی طرح مشتہر کیا جاتا رہا، تو اگر میراجی کا کوئی نصب العین تھا تو یہ اس نصب العین کی شکست ہوگی۔ یوں تو سارے ادب کے ضمن ہی میں نصب العین کا تذکرہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے لیکن شاید میراجی کے سلسلے میں نصب العین کا ذکر اور بھی بُدی طرح کھٹکے لیکن جس طرح مذہبیت اور خدا کے وجود سے انکار بھی بذات خود ایک مذہب یا عقیدے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح ادب یا شاعری میں نصب العین کی نفی اپنی جگہ ایک خاص نقطہ نظر کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ اگر میراجی کو اس زاویے سے دیکھا جائے تو اس کے کلام میں نصب العین کی جستجو گناہ ہو تو ہو لیکن گناہ بے لذت ہرگز نہیں کیونکہ میراجی کے ابتدائی گیتوں میں اس قدر لذت اور جمال ہے کہ اس کے سامنے ادب کی افادیت اور مقصدیت ایک بیکار اور فرسودہ خیال نظر آتا ہے۔ اس وقت میراجی کا دل اور دماغ جمالیاتی محوروں کے گرد گھوم رہا تھا اور اس کے اپنے الفاظ میں دھیان کی لہریں جھکولے دیتی ہوئی اسے بہت دور لے جاتی تھیں دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے۔ ہر طرف ایک دھندلا چھا جاتا تھا۔ آنکھیں سایوں کو دیکھتی تھیں لیکن پہچان نہیں سکتی تھیں، کان گونج کو سنتے تھے سمجھ نہیں پاتے تھے، پاؤں بڑھتے تھے لیکن دھرتی پیچھے کو نہیں سرکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ امرت کی دھاریں پہنچنے سے دور نہیں ہیں جب عورتیں گیت بناتی تھیں کبھی کامنی مورت بن کر، کبھی سیدھی سادی صورت کے ساتھ جب اس کے دائیں پہلو میں بہتی ہوئی ندی گنگنائی تھی۔ بائیں پہلو میں لینے ہوئے میدان پر چھایا ہوا جنگل ہوا کے جھوکوں سے اور پرندوں کی صداؤں سے گونج اٹھتا تھا۔ ایک طرف پرہت سے گرتی ہوئی دھارا شور مچاتی تھی، ایک طرف ساگر سے اٹھتی ہوئی اندھی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں اور ان سب آوازوں کے اوپر پھیلا ہوا آسمان اپنے آغوش میں اکٹھا کر کے ہم آہنگ بناتا تھا۔

یہ میراجی اس میراجی سے مختلف تھا جو چند برس ہوئے کہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں مر گیا ہے۔ رفتہ رفتہ تجربہ ہونے لگا کہ امرت کی دھاریں فی الحقیقت اس کی پہنچ سے بہت دور ہیں اور وہ کامنی عورت جو گیت بناتی تھی عملی طور پر اس کی دسترس سے باہر ہے۔ آبشاروں اور سایوں کی جگہ اس کا واسطہ ریڈیو اسٹیشنوں سے پڑنے لگا اور جنگلوں اور سمندروں کی جگہ اس کا تعاقب خود زندگی کرنے لگی اگر میراجی کا ذہن معائنہ باطن سے قاصر ہوتا تو غالباً وہ بھی زندگی سے بھاگ کر کسی رقص گاہ میں چلا جاتا اور التجا کرتا کہ ”اے مری ہم رقص مجھ کو تمام لے اے“ لیکن میراجی نے زندگی کے خونی بھجڑیے سے بھاگنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اسے اس کے اپنے نہاں خانوں میں لے گیا۔ نہاں خانہ خواہ دل کا ہو یا دماغ کا اکثر تاریک ہوا کرتا ہے اور اس میں نور کی کرنیں پیدا کرنا شاعروں سے زیادہ اولیا کا مشغلہ ہے۔ یوں بھی انسان کے اپنے باطن سے زیادہ غیر شفاف اور پیچیدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اس انسان کا باطن جو محرومی کی خلش سے اندھا رہا ہو اور جس کے لیے اپنے خلسمی رنگ محل پور پور ہو گئے ہوں۔ استعاروں میں قلب کی وسعت کا نکات کی وسعت سے زیادہ ہوتا ہو، لیکن جب انسان دل کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے تو یہ دنیا بڑی محدود، بے حد الجھی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ میراجی میں ایک مبہم الجھن کا احساس تو شروع ہی سے موجود تھا اور وہ اپنے ابتدائی گیتوں میں بھی اس

الجھن سے ملتی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا تھا لیکن جب وہ شعوری طور پر خود اپنے اندر پناہ گزین ہو گیا تو یہی الجھن ایک مستقل زاویہ نظر، بلکہ ایک فلسفے کی صورت اختیار کر گئی۔ اگر میراجی کے فلسفہ حیات کا تجزیہ کیا جائے تو اسے ایک لفظ میں بیان کرنا شدید غلط نہ ہوگا۔ وہ ایک لفظ "الجھن" ہے۔

یہ بھی میراجی کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کی "الجھن" کو ایسا مقام عطا کیا کہ وہ ایک فن، ایک عظیم اور زندہ رہنے والے فن کا درجہ پا گئی۔ روحانی الجھن انسان کو درجہ ولایت تک لے جاسکتی ہے اور دماغی الجھن پاگل خانے تک۔ لیکن میراجی میں ان دونوں الجھنوں کے ساتھ ساتھ GENIUS اور جنون کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ اس سے نہایت خوبصورت اور پراثر شاعری جنم لیتی رہی۔

"اس نظم میں" کے زیر عنوان میراجی کے مضامین اس کی الجھنوں کے ارتقا، میں ایک واضح منزل کا نشان ہیں جس طرح اپنے شروع کے گیتوں والا میراجی اس میراجی سے مختلف ہے جو آگے چل کر جنگلوں اور سمندروں اور ندیوں کو چھوڑ کر اپنے دل کی دنیا میں جا بسا۔ اسی طرح دوسروں کی نظموں میں سوالیہ نشان تلاش کرنے والا میراجی بھی اس میراجی سے مختلف ہے جس کی شاعری اپنے عروج پر پہنچ کر خود سرتا پا ایک سوال بن گئی۔ ان مضامین میں وہ ایک نباض کی طرح دوسروں کی الجھنیں ٹول ٹول کر برداشت کرتا ہے، ان کے جواب ڈھونڈتا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے مفید مشورے دیتا ہے لیکن بعد میں یہی میراجی خود اس قدر مبہم اور پیچیدہ بن جاتا ہے کہ کوئی نباض آسانی سے اس کی شرگ بھی نہیں ٹول سکتا۔ ابہام پسندی اور اس میں فطرتی طور پر ودیعت ہوتی تھی۔ فرانسیسی شاعروں کے مطالعہ نے اسے ایک شعوری راستہ دکھایا اور اس کے داخلی کردار نے آخر ابہام پسندی کو ایک عقیدہ بنا ڈالا۔ یوں بھی حساس فنکاروں پر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں، جب ان کی زبان اور قلم، ان کے جذبات کی شدت اور رفتار کا ساتھ نہیں دیتے اور وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جو آرٹ تخلیق ہوتا ہے اسے ایک طرز کی INTELLECTUAL STENOGRAPHY کہنا چاہیے۔ میراجی ان منزلوں سے اکثر گزرا ہے اور اسکے آخری دور کی بہت سی نظمیں ان منازل کا سنگ میل ہیں۔

اقبال نے ایک جگہ کافر اور مومن کی پہچان یوں قائم کی ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں غم ہے

مومن کی یہ پہچان کہ غم اس میں ہیں آفاق

اگر خلش دروں اور ابہام کو عقیدے کا مقام دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میراجی اس مسلک کا بے حد سچا اور پختہ ہوا مومن ہے۔ وہ کسی کی بھی الجھنوں میں گم نہیں ہوتا، بلکہ ہر جگہ خود الجھنیں اس میں گم ہیں اور یہی اس کی عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے۔

(خطہ صدارت، جو یوم میراجی پر چھاپا)

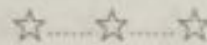
"نقوش" لاہور شمارہ نمبر 28، 27 نومبر دسمبر 1952ء

میرا رفیق

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ایک عجیب ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے جس باغ و بہار شخصیت نے اپنی تحریر اور گفتار سے لاکھوں کا دل خوش کیا ہو وہ یوں دفعتاً موت کی آغوش میں سو جائے اس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا ہے لیکن اس کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھالیا۔ ایسے بندوں کی بخشش کا یہی ایک نشان ہے کہ ان کی موت پر ایک زمانہ سوگوار ہوتا ہے۔

آج بھی اردو دان طبقے کا ہر فرد شوکت تھانوی کی وفات پر اشک بار ہے شوکت کے اٹھ جانے سے اردو کی محفل ویران ہو گئی ہے پاکستان رائٹرز گلڈ اپنے ایک محترم اور بزرگ ممبر سے محروم ہو گیا ہے ذاتی طور پر میرا ایک عزیز دوست اور رفیق مجھ سے ٹھٹھڑ گیا ہے اللہ تعالیٰ اس کی روح کو جنت میں اس طرح ہستار کھے جس طرح اس دنیا میں اس نے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو اپنی شگفتہ تحریروں اور تقریروں سے ہنسایا۔

”فقوش“ لاہور، شوکت تھانوی نمبر، ستمبر 1963ء



علی پور کا ایللی

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا، تو جرائم پیشہ ہوتا، چونکہ لاشعور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے محمد خان اور بھوپت ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا۔ ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ جب وہ عقیدت طاری کرے، تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔ اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ ”علی پور کا ایللی“ میں مفتی بدرجہ محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شہزاد مفتی کی محبت پھوڑے کی ٹیسوں اور لذت کی دودھاری ٹھہری تلے ترپ رہی ہے۔ مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی تحریر شعور اور لاشعور کے تصادم کو سلجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔ علی پور کے ایللی مفتی نے افسانوں میں لاشعور کے تجزیاتی نظام کو تصوف کی ابتدا کے پہلے مرحلے پر پہنچا دیا ہے۔ اگر مفتی ”علی پور کا ایللی“ کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا، تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دو آتشہ ہو کر یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کرے گی۔

پیش لفظ ”علی پور کا ایللی“، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1985ء

محمد طفیل

(1)

میں جس زمانے میں وزارت اطلاعات و نشریات میں سیکرٹری کے طور پر کام کر رہا تھا، ایک روز میرے کمرے میں کابینہ کی اہم میٹنگ ہو رہی تھی، طفیل صاحب پہلی بار ملنے آئے اور ایک چٹ پر اپنا نام لکھ کر اندر بیچھا۔ میں نے انہیں پیغام بھجوایا کہ وہ تھوڑی دیر تشریف رکھیں، میں میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں حاضر ہو جاؤں گا۔ میٹنگ توقع سے زیادہ طویل ہو گئی۔ اس سے فارغ ہو کر طفیل صاحب کو تلاش کیا تو میرے پی اے نے بتایا کہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں کہ یہ کیا بد ماغ اور متکبر شخص ہے جو اتنا انتظار کروانے کے باوجود ابھی تک نہیں ملا، مجھے پریشانی بھی ہوئی اور ندامت بھی، چند روز بعد میں خود لاہور گیا اور انارکلی کی بغل میں ایک روڈ پر ”ادارہ فروغ اردو“ پہنچا۔ طفیل صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ میری طرف آنکھ اٹھائے بغیر پوچھا ”جی فرمائیے، کیا چاہیے“ میں نے اپنا نام بتا کر کہا ”میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔“ اپنی میٹنگ کے حوالے سے انہیں اپنی معذوری سنائی، تو وہ اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور خوشدلی سے میری معذرت قبول کر لی۔

طفیل صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات:

اس روز سے 4 جولائی 1986ء تک ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار اور برادرانہ رہے۔ 4 جولائی کو جمعہ تھا۔ شام کے وقت وہ اچانک احسن علی خان اور بیگم اختر جمال کے ہمراہ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں شکوہ کیا ”بچھیلی بار تم لاہور آئے تھے تو مجھے ملے بغیر واپس چلے گئے تھے میری طرف دیکھو ڈیڑھ دن کے لیے اسلام آباد آیا ہوں لیکن تمہیں ملنا نہیں بھولا“ کچھ دیر تک نقوش کے قرآن نمبر کے بارے میں گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ کر جانے لگے تو بتایا کہ کل صبح پانچ بجے لاہور روانہ ہو جاؤں گا اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صبح پانچ بجے سے چند گھنٹے پہلے وہ لاہور کی بجائے نیند ہی نیند میں خاموشی سے سفر آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔

طفیل صاحب کا ذہن ”نقوش“ کے بارے میں نت نئے منصوبے بنانے اور نبھانے میں ہمہ وقت مصروف رہتا تھا جب انہیں خبر ملی کہ مجھے انجمن ترقی اردو پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا ہے تو انہوں فوراً ٹیلیفون کر کے مجھے اطلاع دی کہ انجمن کے کتب خانہ خاص کی نایاب کتابوں اور مخطوطات کی بنیاد پر نقوش کا ایک ”مولوی عبدالحق نمبر“ شائع کرنے کا سوچ رہے ہیں لیکن زندگی نے انہیں اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔

(2)

جب سے مجھے محترم طفیل صاحب سے نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا ہے اس وقت سے میرے اس یقین میں دن
دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی جا رہی ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشہ خدائے بخشندہ

ورنہ جن حضرات نے طفیل صاحب کی دوستی تو بزورِ بازو حاصل کر لی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشش ان کے شامل
حال نہیں رہی ان کا حشر چشم بینا و نابینا دونوں پر عبرت کی کھلی ہوئی نشانیوں کی طرح عیاں ہے۔

ان میں کچھ تو وہ خوش نصیب احباب ہیں جن کی ذات کے ساتھ آپ، جناب، صاحب، محترم، مکرم کا دم چھلا اگا
کر طفیل صاحب ایسا خاکہ اڑاتے ہیں جس طرح یادش بخیر بھلے زمانے میں خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔

کچھ وہ نیک بخت حضرات ہیں جن کی شخصیت کو طفیل صاحب نے دوسروں سے بڑی فراخ دلی کے ساتھ تہ تیغ
کر وادیا۔ شخصیت نمبر کی رو سے ان کی تعداد 174 ہے۔ بقیہ السیف حضرات میں اکثریت ان سادہ لوح بزرگوں کی ہے

جو طفیل صاحب کی چکنی چڑی باتوں میں آکر اقبال جرم کرنے پر آمادہ ہو گئے اور من آنم کہ من دانم کا ورد کرتے کرتے
بطیب خاطر آپ بیتی کی سولی پر چڑھ گئے چنانچہ نقوش کے کوئی دو ہزار سے زائد صفحات ایسے ہیں جن میں 255 حضرات

نے اپنے ہاتھوں اپنے سر قلم کیے اور انہیں طشتریوں میں سجائے قطار در قطار طفیل صاحب کی خدمت میں ”کیو“ لگائے
کھڑے ہیں..... لیکن طفیل صاحب ہیں کہ ان کی رگ تفتیش و تحقیق کسی عنوان بھی پھڑکنے سے باز نہیں رہتی۔ جو

لوگ طفیل صاحب کے احترام کی زد میں آنے سے بال بال بچ گئے۔ یا آپ بیتی کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے سے بھی چوک
گئے، طفیل صاحب نے کسی نہ کسی طرح ان کے خطوط ہی پکڑ لیے اور انہیں ادب کے بام پر یوں چسپاں کر دیا جسے لاہور کی

دیواروں پر پوشیدہ امراض کے دوا خانوں اور مار کٹائی سے بھرپور فلموں کے اشتہار لگے ہوتے ہیں خط طویل ہو یا محض
دلچسپ ہو یا سپاٹ ذاتی ہو یا صفاتی..... بس خط ہونا چاہیے اور اگر کتاب کو دو تین واسطوں سے بھی ادب یا ادیب کی ہوا

چھو گئی ہے تو یہ اہم تاریخی دستاویز فوراً نوادرات نقوش میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ مکاتیب کے سلسلے میں اس دھن اور دھیان
کا صرف ایک اور انسان میری نظر سے گزرا ہے یہ صاحب انگریزی راج کے خطاب یافتہ بزرگ تھے اور اتوار کے اتوار

بڑی پابندی سے اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی معلومات میں مفید اضافہ کرے تشریف لایا کرتے تھے ان کا سرمایہ امتیاز ایک
الہم تھا جس میں انہوں نے وہ تمام خطوط چسپاں کر رکھے تھے جو انہیں وقتاً فوقتاً افسران والا کرام کی طرف سے موصول ہوا

کرتے تھے ان میں اکثریت ایسے خطوط کی تھی جن میں کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کے پی اے نے قدرے سختی سے ڈانٹ کر انہیں
اطلاع دی تھی کہ صاحب بہادر کے پاس ان کے لیے کوئی فالتو وقت نہیں ہے۔

فن تاریخ کے ساتھ خان بہادر صاحب کی دیانت داری اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نہ صرف ان خطوط کو
اپنے الہم کی زینت بنا رکھا تھا بلکہ وہ ہر محفل میں فخریہ انداز سے انہیں در قادر و در قاپڑھ کر سنایا بھی کرتے تھے۔

دراصل طفیل صاحب ادب کے پی سی بروا ہیں۔ بروا صاحب بڑے پائے کے فلم ڈائریکٹر تھے۔
چنڈی داس اور دیو داس کی کلاسیکی فلمیں انہی کی ہدایت کاری کا اعجاز تھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بروا صاحب

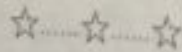
ڈائریکٹر تو ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کہانی نگار، مکالمہ نویس، پروڈیوسر حتیٰ کہ اپنی فلموں کے ہیرو بھی بن گئے۔ طفیل صاحب بھی شروع شروع میں بڑے کامیاب مدیر تھے، پر انہوں نے پرنٹنگ اور پبلشنگ کے روگ پالے اور اب وہ بڑی معصومیت سے ادب کی بلندی اور ادیبوں کی پستی پر بھی بے دریغ ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔

طفیل صاحب جتنے پیارے دوست ہیں اس سے کہیں زیادہ پراسرار ادیب ہیں۔ ایک شریف آدمی کے متعلق مشہور تھا کہ اگر ہتھوڑی مار کر اس کے سر میں ایک سیدھی سادی میخ گاڑی جائے تو وہ بیچ در بیچ کارک سکرو بن کر باہر نکلتی تھی۔ بعینہ جب پیارے طفیل صاحب اپنے احباب کے گوشت پوست میں اپنے مشاہدے کے نشتر چبھوتے ہیں تو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ٹوٹی پھوٹی میڑھی ترچھی ہڈی بھی ضرور ان کے نوک قلم سے ٹکرا جاتی ہے۔

طفیل صاحب کا حسن بیان یہ ہے کہ وہ کبھی کو بر ملا کبھی کہہ دیتے ہیں اور ان کا حسن طبیعت یہ ہے کہ وہ اپنے انداز میں کسی قسم کی تلخی نہیں آنے دیتے۔ ان کی چھری میٹھی تو ضرور ہے لیکن کند نہیں وگرنہ وہ اپنے دوست احباب کو کند چھری سے ذبح کرنا شروع کر دیتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا۔

نفوش کے خاص الخاص نمبروں کا فن ایجاد کر کے طفیل صاحب نے اردو زبان پر جو احسان عظیم کیا ہے ان کے بوجھ سے ادب اور ادیب کی گردنیں مدت تک اوپر نہ اٹھ سکیں گی۔ جب کبھی نفوش کا کوئی تازہ شمارہ شائع ہوتا ہے تو اس کا ادارہ پڑھ کر مجھے جیسے عقیدت مند طیفیلوں کو ہمیشہ بڑی تشویش لاحق ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں نفوش کے مالی وسائل اور طفیل صاحب کی صحت کے متعلق اکثر بے حد روح فرسا اطلاعات درج ہوتی ہیں لیکن مقام شکر ہے کہ اگلے خاص نمبر تک نفوش اور طفیل دونوں ماشاء اللہ پہلے سے زیادہ فربہ اور شگفتہ اور تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ نفوش اور مدیر نفوش ہمیشہ اسی طرح کے مصائب معکوس میں مبتلا رہیں۔ آمین

”نفوش“ لاہور شمارہ نمبر 81، 82



عباس خان

عباس خان ایک کہنہ مشق افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ عباس خان روایتی انداز کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہر کہانی میں ایک مرکزی خیال یا واقعہ ہوتا ہے جس کے گرد کہانی کا تاروپود بنا جاتا ہے پھر ایک نقطہ عروج آتا ہے اور کہانی اپنا بھید کھول دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات براہ راست زندگی سے اخذ کیے ہیں۔ تفصیلات کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ کہانیاں آپ بیتیوں ہوں یا تو یہ واقعات خود ہیج ہوں یا اس قدر قریب سے دیکھے ہوں اور انہیں اس شدت سے محسوس کیا گیا ہو کہ وہ آپ بیتیاں بن گئی ہوں۔ عباس خان زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اور بنیادی طور پر طنز کو کام میں لاتے ہیں۔ ان کی طنز کی دھار بڑی تیز اور کاٹ دار ہوتی ہے، ٹینکشن کا انداز بڑا ڈرامائی ہوتا ہے۔

عباس خان کا کہانی بیان کرنے کا طریقہ منفرد ہے۔ بڑی سنجیدگی سے جزویات کے ذریعے کہانی کی تعمیر کیے جاتے ہیں پھر نقطہ عروج پر پہنچ کر دفعتاً طنز کی تلوار کو میان سے نکال کر ایک بھرپور وار کرتے ہیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے عباس خان کی کہانیاں قاری کو ہنسنے پر مجبور کر رکھتی ہیں اور سوچنے پر مائل کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر عباس خان اپنی کہانی کنٹرول ایک مسئلہ خیز بلکہ کامک منظر سے شروع کرتے ہیں۔ ایک ٹریک سارجنٹ ٹریک جام کر کے سڑک کے درمیان کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑیاں رک جاتی ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف کاروں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ ڈرائیور پوچھتے ہیں کہ ٹریک کیوں بند کر رکھی ہے۔ کسی کو تسلی بخش جواب نہیں دیا جاتا۔ گاڑیوں والے متحمل ہو جاتے ہیں کاروں سے باہر نکل آتے ہیں شور مچاتے ہیں لیکن ٹریک سارجنٹ گل محمد نا بیخار ہوتا ہے۔

یہ پتویشن بڑی مسئلہ خیز ہے لیکن مصنف پتویشن کے اس پہلو کے متعلق بات نہیں کرتے وہ سنجیدگی سے تفصیلات پر دقلم کیے جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ایسا کرنے سے کہانی کے نقطہ عروج کے تاثر میں وہ شدت نہیں رہتی وہ ہنسنے پر مجبور نہیں رہتی جو وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

کہانی کے دوران قاری کو شبہ نہیں پڑتا کہ یہ سارا بکھیر اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ نئے ایس پی کا مہمان مقرر کیا جائے۔ کہانی میں سب سے زیادہ مسئلہ خیز تفصیل خود ٹریک سارجنٹ ہے جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وقار و قسم کا کردار ہے۔ ہمارا معاشرہ اس نوعیت کا ہے جو شاہ سے زیادہ شاہ کا وقار و قسم کے لہاکاروں کی پرورش کرتا ہے۔

”لا دوا“ افسانے میں غلام فرید نمبردار کے ذریعے پر تحصیل دار کو پیٹ کا درد ہوا پھر وہ گردے کے درد میں ترچے رہے درد اس حد تک بڑھ گیا کہ چڑشاپ کرنے کے لیے ہاتھ روم میں جانا ممکن نہ رہا۔ ساری رات وہ ٹکیموں کے جوشاندہ

اور کل قد کھاتے رہے۔ اگلے روز انہیں پانگ پڑا الا گیا چار آدمیوں نے پانگ اٹھایا اور انہیں گھر تک پہنچایا۔
ان تصنیفات کو مصنف اس قدر تعجیدگی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کو شہ نہیں چاہتا کہ یہ سارا اجماع صرف اس
لیے کیا گیا ہے کہ وہ پانگ جو تحصیلدار کو بہت پسند تھا ان کے گھر پہنچ جائے۔

عباس خان کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے۔ کہانی کو دلکش بنانے کے لیے وہ لفظوں کا سہارا نہیں لیتے۔ ہماروں کی پھول
پتیاں نہیں لگاتے۔ جذباتی قسم کے اہم صفت استعمال نہیں کرتے اس کے برعکس وہ فٹنگ اور سپاٹ لفظوں میں تصنیفات بیان
کئے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بیان نلو سے پاک رہتا ہے۔ روایتی کہانی میں یہ خصوصیت قابل قدر سمجھی جاتی ہے۔

عباس خان تفصیل نگار ہیں۔ انہیں جزویات پر بڑا امکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی تصنیفات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں
لیکن یہ تفصیل نگاری بے مقصد نہیں ہوتی۔ وہ صرف ان تصنیفات کو اہم لائق میں لاتے ہیں جو کہانی کو بڑھا دیتی ہے۔
اس مجموعے میں بیشتر کہانیوں کا موضوع دفتر اور دفتریات ہے۔ ان کے کردار دفتری اہلکار ہیں اور مرکزی خیال
دفتری کرپشن ہے۔

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عباس خان نے اہلکار کی حیثیت سے زندگی گزاری ہو اور دفتر کو بہت قریب سے دیکھا ہو۔
ظاہر ہے کہ وہ خود دفتر کے رنگ میں نہیں ڈھلے بلکہ خود کو الگ رکھ کر دفتری ماحول اور کرداروں کا مشاہدہ کرتے
رہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعی بڑا انمول ہے چونکہ اس میں دفتری کرداروں ان کے برعکس دفتری رسم و رواج اور طور
طریقوں کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی گئی ہے اور دفتری بیوروکریسی کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ مصنف نے ایک
ہی موضوع پر خود کو مقید کر کے قاری کو زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے محروم کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں زیادہ تر اہلکاروں کے کردار پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف نے زیب داستان کے لیے کسی خاتون یا
لڑکی کا کردار پیش نہیں کیا۔ دراصل وہ اپنے افسانوں میں زیب داستان کے قائل ہی نہیں وہ اپنی تحریر میں دلکشی پیدا کرنے
کے لیے کوئی اضافی منظر شامل کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو پیش کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔
ظاہر ہے کہ عباس خان ایک سنجیدہ مفکر ہیں اور اپنی تحریروں میں معاشرے کے اہم پہلوؤں پر قلم اٹھانے کے
قابل ہیں۔

ان تحریروں میں یہاں وہاں کی ایسی جھلکیاں ملتی ہیں جو مصنف کے ذاتی مسلک پر روشنی ڈالتی ہیں۔ عباس خان
موجودہ زندگی کی مادی روش سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ بیرونی ترقی کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ہم
اپنے اندر کے انسان کی طرف توجہ نہیں دیتے صحیح معنوں میں ترقی ممکن نہیں۔

مانا کہ وہ معاشرے سے مایوس ہیں لیکن میری دانست میں وہ افراد کی عظمت پر ضرور یقین رکھتے ہیں۔ وہ افراد
جن کے کردار کی عظمت کے بل بوتے پر اپنی خامیوں کے باوجود یہ معاشرہ ابھی تک قائم ہے اور جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ
بنی نوع انسان سے ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔

کاش کہ عباس خان اس مجموعے میں ایسی کہانیاں بھی شامل کرتے جن کا تاثر منفی کی بجائے مثبت ہوتا تاکہ
ہمارے گرد پھیلے ہوئے گھور اندھیرے میں روشنی اور امید کی ایک کرن جھلکی دکھائی جاتی۔

”تیرنگ خیال“ دسمبر 1983ء

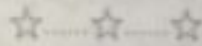
کاظمی صاحب

شبیر علی کاظمی صاحب کی وفات سے انجمن کا ایک بھاری ستون ٹوٹ گیا۔ متولیان انجمن نے جب مجھے صدر انجمن کے طور پر کام سنبھالنے کا حکم دیا تو مجھے اپنی نااہلیت کی بنا پر یہ بارگراں اٹھانے میں بڑی ہچکچاہٹ پیش آئی۔ میں نے کاظمی صاحب مرحوم سے کہا کہ جن اکابرین نے اس انجمن کو پالا پوسا ہے میں تو ان کے جوتے صاف کرنے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ اب ان کا چھوڑا ہوا کام آگے بڑھانے کی ہمت کہاں سے لاؤں۔

کاظمی صاحب مسکرائے اور دھیمے لہجے میں بولے۔ ”آپ آئیں تو سہی ان مشاہیر کے گراں قدر ورثے کی گرد ہی جاڑتے پونچھتے رہنا بہت بڑی سعادت ہے۔“ ان کی شہ پا کر میں نے کام شروع تو کر دیا لیکن ایک روز اچانک وہ اسے ادھورا چھوڑ کر ایسے گئے کہ اب واپس آنے کی کوئی امید نہیں۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون

ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اکتوبر 1986ء



محشر خیال

(خطوط)

قدرت اللہ شہاب

بنام

مرتبہ

یہ خطوط قدرت اللہ شہاب نے شیما مجید کے نام مختلف اوقات میں لکھے تھے جن میں انہوں نے
اپنے روحانی مشاہدات کے علاوہ اپنی نجی زندگی کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں تحریر کی ہیں.....

اسلام آباد

یکم مارچ 86ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

استقام علیکم

آپ کے ٹیلیفون سے یہ سن کر دکھ ہوا کہ پچھلے چند ماہ کے دوران آپ کو پے درپے مصدمات سے گزرنا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ گزرنے والوں کو اپنے سایہ رحمت میں رکھے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ایسے حالات میں صبر سے کام لینا ایک جہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے راز ہم گناہگاروں کی نگاہ سے اوجھل ہیں صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

میری کتاب کی کتابت جاری ہے بڑھتے بڑھتے اس کا حجم سات یا آٹھ سو صفحات تک پہنچے گا۔ آج کل اسی کی شہادت کے مرحلوں میں مصروف ہوں۔ اس طرف سے ذرا فراغت نصیب ہو تو اپنے بکھرے ہوئے مضامین اور مقالات کو بھی آپ کے لیے جمع کرنا شروع کر دوں گا۔ غالباً ان کی فہرست بھی کافی طویل ہوگی۔ اپنی والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں باقی عزیز گان کو دعا۔ والسلام

نیاز مند

قدرت اللہ شہاب

☆—☆—☆

اسلام آباد

17 اکتوبر 82ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

استقام علیکم

امید ہے کہ آپ کو میرا پہلا خط بھی مل گیا ہوگا اس میں لکھا تھا کہ 19 اکتوبر کو کراچی جا رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پروگرام کی تبدیلی کی وجہ سے اب میں 18 اکتوبر کو کراچی روانہ ہو رہا ہوں وہاں پردس روز کے قریب ٹھہر کر انشاء اللہ گناہ کے آخر تک واپس لوٹوں گا۔

امید ہے آپ کا کالج باقاعدہ کھل گیا ہوگا اپنی والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں اور بہنوں بھائی کو پیار۔ والسلام

شہاب نگر
دعا گو
قدرت اللہ شہاب

☆.....☆.....☆

اسلام آباد

15 اکتوبر 84ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

السلام علیکم

آج ہی میں نے آپ کو ایک خط پوسٹ کیا تھا جس میں میرا لاہور کا پروگرام درج تھا اس کے بعد میں پرانے جمع شدہ کاغذات کی ترتیب دے رہا تھا، تو مجھے چغتائی صاحب پر آپ کا مسودہ بھی مل گیا۔ اس کے ساتھ مسٹر جنید اقبال کا خط مورخہ 15 جولائی تھا جس میں یہ لکھا تھا۔ ”ہمیں خوشی ہوگی کہ اگر آپ اس کتاب پر اپنی ماہرانہ رائے دیں اس سلسلے میں آپ کا تعاون ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔“

میں یہ مسودہ اور خط اپنے ہمراہ لاہور لیتا آؤں گا اور وہاں پر آپ کے ساتھ مزید بات کروں گا۔ مجھے بے حد افسوس اور ندامت ہے کہ میری غیر موجودگی میں موہول ہونے کی وجہ سے یہ مسودہ ایسی جگہ پڑا رہا جہاں پر ہماری نظروں سے اتنا عرصہ اوچھل رہا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آخر مل گیا اس سلسلے میں آپ کو جو رحمت ہوئی اس پر آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

والسلام

دعا گو

قدرت اللہ شہاب

جیسا کہ میں دوسرے خط میں اطلاع دے چکا ہوں میں 18 اکتوبر سے دو تین روز لاہور رہوں گا جیسے آپ کو آسانی ہو اشفاق صاحب کے دفتر یا گھر مجھے فون کر لیں جمعہ اور ہفتہ کے روز دفتر نہیں ہوں گا۔

☆.....☆.....☆

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

السلام علیکم!

میں دو روز کے لیے لاہور آیا تھا حسب وعدہ ارادہ تھا کہ آپ کو خود مسئلہ کتاب پیش کروں گا لیکن میں جتنا وقت یہاں رہا نزلہ، زکام اور بخار میں مبتلا رہا اس لیے نیاز حاصل کرنے سے معذور رہا۔ انشاء اللہ اگلی دفعہ جب آیا تو حاضر خدمت ہوں گا۔ اسلام آباد میں اس قدر تکلیف اٹھا کر جب آپ ہمارے ہاں تشریف لائی تھیں تو آپ سے مل کر دل

بہت خوش ہوا تھا۔ آپ نیک روح ہیں۔ کبھی کبھی اس بندہ عاجز کے لیے بھی دعائے خیر فرما دیا کریں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے عزیز و اقارب کو خوش رکھے۔

والسلام

نیاز مند

قدرت اللہ شہاب

☆.....☆.....☆

اسلام آباد

14 اگست 1983ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

السلام علیکم

فون پر آپ سے یہ سن کر تشویش ہوئی کہ آپ کی والدہ محترمہ کی طبیعت ناساز تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ
شفائی مطلق انہیں صحت عطا فرمائے اور ان کا سایہ آپ پر تادیر سلامت رکھے۔ آمین
ایسے حالات میں پریشان ہونے سے بچنا چاہیے اور دعا کا سہارا پکڑ کر اللہ پر مکمل بھروسہ رکھنا چاہیے۔
یہاں پر بھی گرمی کا بڑا زور رہا اب موسم قدرے بہتر ہو رہا ہے۔ کراچی میں بھی شدید گرمی تھی آپ کے کالج کی
تفویلات بھی اب ختم ہونے والی ہوں گی۔

اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں اور ان کی صحت کے متعلق مجھے خبر دیں۔

والسلام

دعا گو

قدرت اللہ شہاب

☆.....☆.....☆

اسلام آباد

16 جولائی 83ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

السلام علیکم!

آپ کا نہایت اچھا عید کارڈ ملا شکر یہ میری طرف سے بھی آپ سب کو دلی عید مبارک ہو۔
خدا کا شکر ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ خیر و خوبی سے پورا ہوا اور امید ہے کہ آپ کے روزے بھی اچھی طرح

گزرے ہوں گے۔
میں ایک کام پر 23 جولائی کی شام کو لاہور پہنچوں گا 24 اور 25 وہاں رہوں گا 26 کو چند روز کے لیے کراچی
جا رہا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ کسی وقت اشفاق صاحب کے ہاں فون کر لیں۔
اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں بھائیوں اور بہنوں کو پیار۔
والسلام

طالب دعا
قدرت اللہ شہاب

☆.....☆.....☆

اسلام آباد
28 مارچ 83ء

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ

السلام علیکم!

امید ہے کہ لندن سے بھی میرا خط آپ کو مل چکا ہوگا میں خدا کے فضل سے 23 کو یہاں بخیریت پہنچ گیا تھا اب
اپنی آنکھ کے متعلق ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کر رہا ہوں۔ یہ مرحلہ گزر جائے تو گرمی کا موسم شدید ہونے سے پہلے لاہور کا
ایک چکر لگانے کا بھی ارادہ ہے۔ انشاء اللہ پروگرام بنا تو آپ کو اطلاع دوں گا۔
ڈاکٹروں کی انہی ہدایات کی وجہ سے میں اس بار عمرہ سے بھی محروم رہا۔ خدا کرے یہ سعادت پھر کبھی نصیب ہو۔
امید ہے کہ آپ کے ہاں ہر طرح کی خیر و عافیت ہوگی اپنی والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں بھائیوں بہنوں کو دعا۔
والسلام

طالب دعا
قدرت اللہ شہاب

☆.....☆.....☆

محترمہ عزیزہ شیمہ مجید صاحبہ
السلام علیکم

امام غزالی کی جو کتابیں آپ نے حاصل کی ہیں وہ بہت اچھی ہیں لیکن میری رائے میں ابھی ان کا مطالعہ ضروری
نہیں۔ ابھی آپ طالب علم ہیں اس لیے اولین فرض حصول علم کی تکمیل ہے اس دوران اتنا ہی کافی ہے کہ انسان نماز میں
رسوخ حاصل کرے۔

نماز میں رسوخ حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عادتاً یہ حالت ہو جائے کہ جب نماز ادا کرنے میں سستی محسوس ہو، سستی کا مقابلہ کر کے اسے ادا کرے اور جب دل میں نماز قضا کرنے کا خیال اور تھکا سہا پیدا ہو، اس خیال اور تھکائے کا مقابلہ کر کے اس سے بچے۔ نماز میں دل لگے یا نہ لگے اسے ادا کرتا رہے۔ نماز پڑھنا فرض ہے، نماز میں دل لگنا فرض نہیں۔

جس نے نماز میں رسوخ حاصل کر لیا، اس نے ایک بہت بڑے پہاڑ کو سر کر لیا۔ اس کے بعد ترقی کی سب راہیں، شاہراہیں بن جاتی ہیں اور شاہراہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی ترقی اور بلندی کی صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپ ان صلاحیتوں کو خوب سنبھال کر رکھیں اور ایسی احتیاط اور مہارت سے کام میں لائیں کہ آپ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ارفع مقامات کو چھو لیں۔

میری بیٹی بن کر آپ نے مجھے باعزت کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ رشتہ اس بندۂ حق تعالیٰ کی نجات کا باعث بھی بنے گا۔ جیسے جیسے نماز میں رسوخ قائم ہو مجھے لگھتی رہیں تاکہ اس سے اگلی شاہراہوں پر قدم رکھنے کا اہتمام کیا جاسکے۔
(10 اکتوبر 83ء)



آپ نے لکھا ہے کہ جب کسی انسان کو اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو وہ تیزی کے ساتھ اوپر بڑھتا ہے اگر اس کا تعلق عوام کے ساتھ ہے تو وہ تیزی سے نیچے گرتا ہے اس لیے حقوق العباد پورے کرنا مشکل ہے۔
سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معرفت الہی حاصل کرنے کے خلا یا VACUUM میں بیٹھنا ہرگز ضروری نہیں۔ ایسا کرنا روح اسلام کے خلاف اس لیے ہے کہ اسلام رہبانیت کو اپنے دامن میں کوئی جگہ نہیں دیتا۔ اسلام کا مقصد تو یہ ہے کہ انسان بالکل نارمل زندگی گزارے جس میں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد اس کے سامنے آتے جائیں انہیں پورا کرتا رہے۔ الہی دنیا کے معاملات میں میانہ روی اختیار کرنا مناسب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا داری میں بہت زیادہ انہماک نہ ہونا چاہیے۔ اس میانہ روی کے ساتھ جو جو حقوق العباد پیش آتے جائیں انہیں پورا کرتے رہیں۔ دنیا داری میں بہت زیادہ انہماک سے بچنے کے لیے بزرگوں نے ایک طریقہ تو یہ بتایا ہے کہ کم کھانا، کم بولنا، کم سونا، کم ملنا جلنا۔ ایک دوسرا طریقہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ”خلوت در انجمن“ کی عادت ڈالی جائے۔ یہ ایک فنی اصطلاح ہے جس کا سادہ الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ انسان کا دل اور دماغ اللہ کے ذکر میں اس طرح رچ بس جائے کہ بھری سے بھری محفل میں بھی وہ ظاہر آمو جو ہو لیکن باطن مشغول۔

آپ نے پوچھا ہے کہ عام تعلیم کی طرح روحانی تعلیم و تربیت کے لیے بھی کوئی نصاب مقرر کیا جاتا ہے یا نہیں اسلی نصاب تو سب کے لیے قرآن اور شریعت ہے لیکن قرآن اور شریعت کی پابندی کو آسان بنانے کے لیے بزرگوں نے رام سلوک کے کئی نصاب اور طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ ان کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے کوئی MOTENSORY

طریقے سے زیادہ آسانی سے پڑھتا ہے کوئی KINDERGARTEN سے زیادہ سیکھتا ہے، کسی کے لیے SEMESTER SYSTEM آسان ہے، کسی کے لیے ANNUAL SYSTEM اسی طرح راہ سلوک پر گامزن ہونے کے لیے اور اس پر PROGRESS کرنے کے لیے بھی مختلف نصاب اور COURSES مقرر ہیں۔ یہ سب خفیہ نہیں ہیں بلکہ کتابوں میں درج ہیں لیکن از خود صرف کتابیں پڑھ کر ان پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں جس طرح اپنے آپ میڈیکل کی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننا ممکن نہیں اس لیے اس معاملے میں کسی پابندِ شرع اور بے غرض EXPERT سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ عام طور پر اس مقصد کے لیے کسی سے بیعت کی جاتی ہے لیکن بیعت کرنا لازمی نہیں ہے البتہ رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

(9 مئی 83ء)

☆.....☆.....☆

میں اپنی کتاب کے آخری دو ابواب ختم کرنے میں الجھا ہوا ہوں۔ ایک باب ہے ”پاکستان کا مستقبل“۔ چند اندازے۔ دوسرے اور آخری باب کا عنوان ”قلب و نظر“ ہے۔ یہ باطنی معاملات پر مشتمل ہے دونوں باب نازک اور مشکل ہیں۔ ان کا مواد تو پکا پکا یا ذہن میں موجود ہے لیکن انہیں الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا بے حد کٹھن ہے۔ تین ماہ سے انہی دو ابواب کو مکمل کرنے کی کوشش میں ہوں شاید تین ماہ اور لگ جائیں اور پھر بھی یہ کوشش ناتمام ہی رہے۔

(17 اکتوبر 85ء)

☆.....☆.....☆

علامہ اقبالؒ کے محترم والدین اور خود علامہ کے خیالات و عقائد حضرت ابن عربیؒ اور شیخ شہاب الدین کے متعلق کیا تھے، اور کیوں تھے؟ اس موضوع پر مجھے زیادہ علم حاصل نہیں۔ ان علوم کے اصلی ماہرین تو اقبال اکادمی کے پروفیسر مرزا منور اور سہیل عمر صاحب ہو سکتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ اس بارے میں ان سے یا ان کے تجویز کردہ حضرات سے استفادہ کیجئے۔

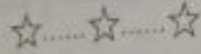
2- دوسرا سوال ہے کہ علامہ نے تصوف کی مخالفت کیوں کی؟ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ انہوں نے کسی خاص قسم کے تصوف کی مخالفت کی اور اگر کی تو کیوں کی؟ اس کا جواب بھی اقبالیات کے ماہرین ہی دے سکتے ہیں مجھے اس باب میں کچھ زیادہ علم نہیں اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

3- تیسرا سوال کہ کیا علامہ نے اپنے فلسفہ خودی کی بنیاد حضرت شہاب الدینؒ اور حضرت ابن عربیؒ کے تصوف پر رکھی اس کا صحیح جواب اقبالیات کے ماہرین ہی دے سکتے ہیں۔

4- ایک عظیم مفکر اور عظیم تر شاعر کے طور پر علامہ کا دل سے مداح ہوں لیکن دین میں میں ان کو اپنا رہنما نہیں

باتا۔ دینی معاملات میں اگر آپ کچھ سوال اقبالیات کے حوالے سے پوچھیں گی تو ان کا جواب دینا میری اہلیت اور صلاحیت سے باہر ہے کیونکہ مجھے اس کا پورا ادراک حاصل نہیں ہے۔

(13 فروری 85ء)



خضوع و خشوع کی ضرورت نماز، تلاوت قرآن اور اللہ کے نام کے ذکر اذکار کے وقت اور دوران پیش آتی ہے۔ مثلاً نماز میں خضوع و خشوع کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ جسم اور کپڑے پاک ہوں، وضو درست ہو، نماز کے ارکان قائم رہے اور ترتیب سے ادا کرے۔ نماز کے دوران نہ کسی سے بولے نہ ادھر ادھر دیکھے۔ جہاں تک اختیار ہو دل و دماغ میں دوسرے خیالات اور وساوس نہ لائے اگر بلا اختیار کچھ دوسرے خیالات اور وساوس آنے لگیں تو ان کی طرف متوجہ نہ ہو اور حتیٰ الوسع نماز میں جو کچھ پڑھا جا رہا ہے اس کے الفاظ اور معانی کی طرف متوجہ رہے۔

اس سے اگلا درجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں درجات کی سب امور کے علاوہ اس کے دل میں یہ احساس غالب ہو کہ وہ سچ سچ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہے۔

اس سے اگلا درجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا تینوں درجات کے سب امور کے علاوہ اس کا دل و دماغ محویت کے ایسے عالم میں ڈوب جائے جہاں پر ساری کائنات کی نفی ہو کر کائنات کا وجود معدوم ہو جائے اور معبود کی بارگاہ میں اس کا صرف ایک عبد موجود اور سر بسجود ہو۔

ہم جیسے عامیوں کے لیے خضوع و خشوع کا بس پہلا درجہ ہی کافی ہے۔ باقی کے درجات کے پیچھے بھی لگے رہنا چاہیے۔ جب کبھی کسی اگلے درجے تک چند لمحوں کے لیے رسائی ہو جائے تو اسے توفیق الہی سمجھ کر اپنی خوش نصیبی تصور کرے۔ اگر مدت تک کسی اگلے درجے تک قرب کے آثار تک نظر نہ آئیں تو ہرگز مایوس نہ ہوں اپنی کوشش اور تلاش جاری رکھے۔ اس راہ میں کوشش نامتوام لیکن کوشش مسلسل ہی ترقی کا اصلی ذینہ ہے۔

آپ کا دوسرا سوال..... عہد رسالت میں تصوف کی بات۔ اس زمانے میں تصوف نام کی کوئی چیز معرض وجود میں نہیں تھی۔ صاحب وحی قرآن اور صاحب شریعت کی موجودگی میں کسی اور علم اور فن کی حاجت نہ تھی۔ حضور کی ذات مبارک کا مقناطیسی اثر حضور کے وصال کے بعد بھی کافی عرصہ تک جاری و ساری رہا لیکن جوں جوں زمانہ نبوت سے فاصلہ بڑھتا گیا ویسے ویسے لوگوں کے قلوب زنگ آلود ہوتے گئے اور حضور کی شریعت کی آب و تاب ان زنگ آلود قلوب کے لیے ماند پڑتی گئی چنانچہ رفتہ رفتہ مختلف ادوار میں مختلف طریقوں سے تصوف یا طریقت کا علم اور فن ظہور میں آیا تاکہ زنگ خوردہ قلوب کو صاف شفاف کر کے انہیں شریعت کا نور حاصل کر کے قرآن کی فہم پا کر قرب الہی کے راستے پر ڈال سکیں۔ طریقت اور تصوف کوئی الگ شعبہ نہیں۔ شریعت پر عمل اور قرآن کی سمجھ کی استعداد اجاگر کرنے کے لیے یہ راستہ صاف کرنے کا جھاڑو ہے۔ ماڈرن اصطلاح میں اسے ظرف قلب کا زنگار دور کرنے کے لیے ایک روحانی سٹح کا BRASSO بھی کہہ سکتے ہیں۔

آپ نے کسی حدیث شریف کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق انسان کے لیے تقوف کا لفظ استعمال ہو اور عہد نبوی میں بھی تقوف کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اگر ایسی حدیث یا حدیثوں کے متعلق ان کی نشاندہی فرمائیں، تو میں انہیں ضرور پڑھنا چاہوں گا کیونکہ اس سے میرے علم میں اضافہ ہوگا۔

جن حدیثوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سب صحابہ کرام کو ایک ہی طریقہ نہیں سکھایا بلکہ کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بتایا، اس کی بھی مجھے تحقیق حاصل نہیں ہے۔ اگر ان حدیثوں کی نشاندہی بھی ہو جائے تو میرے لیے مفید ثابت ہوگا۔

(20 دسمبر 83ء)



انجمن ترقی اردو کی صدارت میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے جس کرسی پر مولانا شبلی سے لے کر بابائے اردو تک بیٹھ چکے ہوں، میرے جیسا کم علم آدمی تو اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ میں اس کی قریب بھی جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا فرمادیا ہے تو حتیٰ الوسع نبھانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ کراچی میں رہنا ضروری نہ ہوگا۔ دوسرے تیسرے ماہ وہاں ہوا یا کروں گا کامیابی کے لیے دعا فرمائیں۔

اخبار میں جو رائج کسی نجومی نے لکھا ہے اس میں کوئی بات حقیقت پر مبنی نہیں کچھ باتیں سنی سنائی لکھ دی ہیں، کچھ محض بے پرکی اڑائی ہیں۔ مذہب کے بارے میں اس نے جو لکھا ہے وہ سب غلط ہے۔

آپ نے اسلامی تقوف میں احسان کے متعلق سوال کیا ہے۔ عبادات میں کئی مدارج اور مقامات ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا درجہ خضوع و خشوع کا ہے اس کے بعد رسوخ کا مقام آتا ہے۔ رسوخ کے متعلق میں اپنے پہلے کسی خط میں وضاحت کر چکا ہوں اگر وہ آپ کے پاس موجود ہو تو اسے دوبارہ پڑھ لیں۔

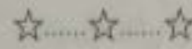
جب عبادات اور اخلاقیات میں رسوخ حاصل ہو جائے تو اس کے بعد احسان کا درجہ آتا ہے۔ غالباً یہ آخری مقام ہے جسے کوئی انسان حاصل کر سکتا ہے لیکن مقام احسان میں بذات خود بے شمار درجات ہیں جس طرح ایک ہی سروں میں ہونے کے باوجود کوئی سیکشن آفیسر ہوتا ہے، کوئی ڈپٹی سیکرٹری، کوئی جوائنٹ سیکرٹری، کوئی ایڈیشنل سیکرٹری وغیرہ وغیرہ۔ کسی کو پروموشن ملتی ہے کسی کو نہیں ملتی، کسی کو کم ملتی ہے کسی کو زیادہ لیکن جو ایک بار مقام احسان میں داخل ہو جائے وہ بہر حال اسلامی تقوف کے آخری اور SUPREME مدارج میں ضرور رہتا ہے۔

مقام احسان کی وضاحت الفاظ میں بیان کرنی آسان نہیں کیونکہ یہ تجزیاتی مقام ہے بیانیہ مقام نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو شخص ایک بار اس میں داخل ہو جائے وہ اس سے باہر یا نیچے کبھی نہیں گرتا۔ اس کی مثال کسی پھل مثلاً سیب کی طرح ہے اگر کچا سیب ایک بار پک جائے تو دوبارہ کبھی کچا نہیں بن سکتا البتہ یہ بات ضرور ہے کہ

اگر مقام احسان میں آنے کے بعد گناہ گاری کی کسی بشری کمزوری میں آلودہ ہو جائے تو وہ پکا ہوا سیب فوراً گل سرسبز جائے گا اور تصوف کی نوکری سے نکال کر اسے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے گا جہاں پر کسی کو اس کا وجود بھی نظر نہ آئے گا۔

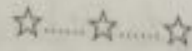
مقام احسان میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کی بارش بندہ پر مسلسل ہوتی ہے اور بندہ دوسرے لوگوں پر اپنے احسانات کی بارش کرتا ہے۔ مقام احسان میں عہد پر معبود کا حسن اجاگر ہوتا ہے اور کائنات کی مخفی رونق اس پر طرح طرح سے منکشف ہونے لگتی ہے۔ میں یہ سنی سنائی باتیں لکھ رہا ہوں ورنہ میرے جیسا گناہ گار بندہ تو اس مقام کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہے۔

(2 اکتوبر 83ء)



اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی رضا اور شان بے نیازی ہی سے نازل ہوتا ہے، اس کا حقدار کوئی نہیں ہوتا البتہ انسان کو اس کا اہل ہونے کی لیے جو خصائل اپنانا لازمی ہیں ان کو میں نے لاٹری کا ٹکٹ سے تشبیہ دی ہے۔ یہ وہی خصائل ہیں جو ایک مومن کے لیے ضروری ہیں اور عام طور پر معروف ہیں۔ لاٹری کے ٹکٹ ہوتے تو لاکھوں کے پاس ہیں لیکن لاٹری صرف ایک کے نام نکلتی ہے۔ اسی طرح مومن بھی ضرور لا تعداد ہیں لیکن یونہی بیٹھے بیٹھے اللہ کا فضل صرف چند ایک پر ہی ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی ہے اس کے لیے کوئی خاص طریق کار سوچنا عبث ہے۔ جو عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے کی جائے، اسی عبادت میں اصلی خلوص پیدا ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو عبادت ذاتی یا دنیاوی یا دیگر مقاصد یا مرادوں کو پورا کرنے کی غرض سے کی جائے اس میں خلوص خالص نہیں ہوتا۔

(26 جون 84ء)



ڈاکٹر اجمل نے مولانا اشرف علی کے حوالے سے شخصی دعا کے متعلق جو لکھا ہے وہ میں نے نہیں پڑھا البتہ شخصی دعا سے غالباً یہی مقصد ہوگا کہ انسان براہ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خضوع و خشوع سے اپنی فریاد کرے۔ ایسا کرنے میں کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دروازہ ہر کس و نا کس کے لیے یکساں کھلا ہے۔ ہاں جو لوگ عام طور پر اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے کے غور میں نہیں باری تعالیٰ کے ساتھ شخصی رابطہ استوار کرنے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسروں کو کسی قدر پہچاننا محسوس ہوتی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے راستہ سب کے لیے کھلا ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ خدا سے وعدہ کیسے کیا جاتا ہے؟ خدا سے وعدہ ویسے ہی کیا جاتا ہے جیسے بندوں سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بندوں سے کیا ہوا وعدہ کبھی ٹوٹ بھی جاتا ہے لیکن خدا سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں ٹوٹنا چاہیے۔

☆.....☆.....☆

آپ کا نوازش نامہ ملا فیض صاحب کے انٹرویو کی خبر بھی ملی۔ میں ان کا دیرینہ مداح ہوں اور آج کے دور میں ان کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہمیشہ مہربانی اور مروت ہی سے پیش آتے ہیں۔ پاکستان ناٹمنز پر جب حکومت وقت نے قبضہ کیا تو اس کا پہلا ادارہ واقعی میں نے لکھا تھا۔ اس میں فیض صاحب کا بالکل کوئی ذکر نہ تھا اس لیے ان کی مخالفت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فیض صاحب کے متعلق میرے وہی خیالات ہیں جو ”جنگ“ میں میرے ایک انٹرویو میں شائع ہوئے تھے شاید میں نے اس کی ایک کاپی آپ کو بھی ارسال کی تھی۔ میرے نزدیک مذہب دراصل ”دین“ کا نام ہے۔ اس کی آسان ترین DEFINITION میں یہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور لاشریکیت اور اس کے پیغمبروں اور ملائکہ پر صدق دل سے ایمان لایا جائے۔

انسان میں عاجزی اور انکساری کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اس کا تو مجھے خود بھی پورا علم نہیں لیکن صحیح معنوں میں اپنے آپ کو دوسروں سے کمتر سمجھنا اس راستے میں آسانی پیدا کرتا ہے جو شخص ہمیں بُرے سے بُرا بھی نظر آئے، اس کے متعلق بھی صدق دل سے یہ احتمال رکھنا چاہیے کہ ممکن ہے اس میں کوئی ایسی خوبی پوشیدہ ہو جو ہم میں موجود نہ ہو۔

(2 اپریل 84ء۔ لندن)

☆.....☆.....☆

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا اسلام میں روحانیت اور مادیت برابر ہے۔ قرآن شریف میں روحانیت کی اصطلاح کی کوئی خاص DEFINITION نہیں ہے۔ عُرف عام میں یہ اس کیفیت کا نام ہے جو ایمان، تقویٰ اور توکل پر عمل پیرا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ برابری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں مادیت کی (یعنی دنیاوی مال و متاع کمانے کی) کوئی ممانعت نہیں۔ اجازت ہے کہ جائز طریقے سے جتنا مرضی کماؤ۔ ساتھ ہی حکم ہے کہ گن گن کر اسے اپنے پاس جمع نہ کرتے رہو بلکہ اسے اپنے اوپر، عزیز و اقارب پر، مسافروں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔ خرچ کرنے میں نہ اسراف سے کام لو نہ بخل سے بلکہ اعتدال سے کام لو، اس طرح کی مادیت اور روحانیت میں نہ کوئی فرق ہے نہ تصادم۔ چنانچہ امیر سے امیر آدمی اگر اپنی دولت جائز طور پر کماتا اور جائز طور پر خرچ کرتا رہتا ہے تو وہ اپنی مادی دولت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ روحانی مقامات بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن ایک غریب آدمی اگر تھوڑی سی رقم بھی گن گن کر رکھے اور دوسروں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرے تو وہ گناہ گار ہو سکتا ہے۔ مادیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کے تیسویں پارے میں سورہ ہمزہ ضرور پڑھیں یہ سورہ فیل سے بالکل پہلے ہے۔

(13 جنوری 83ء)

آپ نے پوچھا ہے کہ جو علوم محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتے ہیں، انسان کو اس کا امیدوار کیسے رہنا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ لائری کیسے نکالتا ہے؟ اور اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے؟

اللہ کے فضل کا حقدار تو کوئی نہیں کہلاتا لیکن امیدوار سب کو اسی طرح رہنا چاہیے جس طرح لائری کا ٹکٹ لے کر یقین تو کسی کو نہیں ہوتا لیکن گمان سب کو رہتا ہے کہ شاید میرا نمبر ہی نکل آئے۔ لائری کی تشبیہ کو ذرا سا کھینچ کر بات مزید صاف ہو جاتی ہے۔ لائری کا انعام نکلنے کی امید اسی کو ہو سکتی ہے جس نے لائری کا ٹکٹ لیا ہو۔ جس نے ٹکٹ ہی نہ لیا ہو وہ اگر انعام کی توقع لگا کر بیٹھ جائے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اللہ کے فضل کی لائری کا ٹکٹ اللہ کی عبادت اور معرفت ہے جو لوگ یہ ٹکٹ حاصل کر لیتے ہیں، ان کو فضل کی لائری کے انعام کی امید لگانے کا حق پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی لائری کیسے نکالتا ہے؟ اس کا علم تو فقط اسی کی ذات کو ہے۔

اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے؟ ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد، درجہ اور مقام کے مطابق اپنے علم کا پیمانہ خود بخود اپنے آپ پر منکشف ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے نور باطن سے ایسی چیزیں اور باتیں معلوم اور محسوس ہونے لگتی ہیں جو نہ دوسروں کو معلوم اور محسوس ہوتی ہیں اور نہ دوسرے عام ذرائع سے معلوم اور محسوس ہو سکتی ہیں۔ اگر کبھی ایسی کیفیت وارد ہو تو اسے ہر کس و نا کس پر ظاہر نہیں کرنا چاہیے البتہ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا رشتہ قائم ہو تو اس سے ہر گز چھپانا نہیں چاہیے کیونکہ کبھی کبھی ایسی واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا تخیلیہ کی کرشمہ سازی ہوتی ہیں اور انسان انہیں نور باطن سمجھ کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(18 دسمبر 82ء)

مرد کامل کی ذات تو فقط رسول پاک ﷺ ہی کی کہلائی جا سکتی ہے البتہ حضور کی امت میں مرد مومن ہوتے ہیں جن میں کچھ مثالی ہوتے ہیں، کچھ نیم مثالی اور کچھ غیر مثالی۔ لیکن اپنے اپنے فہم و ادراک، اعمال اور کردار کے لحاظ سے ان کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

اسلام ایک کھلی اور روشن کتاب ہے۔ قرآن حکیم اور عبادات میں کسی قسم کا کوئی راز پنہاں نہیں سوائے حروف مقطعات کے جن کا علم اللہ کی ذات کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اقبال کے ہاں دانائے راز، دیدہ وور وغیرہ کی اصطلاحات ان کی شاعری کا زیور ہیں۔ ان کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ قرآن سے ماوراء کوئی ایسا راز ہے جسے پا کر ہی کسی دانائے راز کا ایمان مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی عبادات اور شریعت اور اخلاقیات کی تہہ میں کوئی ایسے خفیہ راز پوشیدہ ہیں جن تک پہنچ کر ہی دیدہ وری کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

جن بڑے بڑے بزرگوں نے اپنے معمولات کو کسی قدر خفیہ رکھنے کا اہتمام کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک

تو یہ کہ وہ فرائض، سنت اور واجبات کی بر ملا ادائیگی کے علاوہ اپنی نقلی عبادات اور ذکر و فکر کا چرچا کر کے شہرت سے بچنا چاہتے ہیں۔ دوسرے روحانیات، کشفیات وغیرہ کی واردات قلبی جن سے وہ گزرتے ہیں وہ سراسر ذاتی تجربات ہوتے ہیں اگر انہیں ظاہر کر کے ان کی تشہیر کی جائے تو یہ باتیں نہ دوسروں کی سمجھ میں آئیں گی اور نہ ان سے کسی کو فائدہ پہنچے گا۔ البتہ وہ لوگ اپنے قابل اور ہونہار ساتھیوں اور مریدوں کو ضرور اپنے CONFIDENCE میں لیتے رہتے ہیں۔

اچھے اور سچے بزرگوں کی اس روش نے جھوٹے مدعیوں اور نام نہاد صوفیوں کے ہاتھ میں ایک بہانہ دے دیا کہ تصوف کو انہوں نے بھان متی کا پہاڑ بنا کر ایک سر بستہ راز بنا کر رکھ دیا۔ یہ محض سادہ لوح انسانوں کو لوٹنے کا ایک تہیارتی ہتھکنڈہ ہے۔ دین اور تصوف میں بالکل کوئی راز کی بات نہیں جو لوگ اسے راز بنا کر پیش کرتے ہیں وہ یقیناً کسی دنیاوی غرض کو پورا کرنے کے لیے جھوٹ اور فریب سے کام لیتے ہیں۔

(20 جنوری 85ء)

☆.....☆.....☆

آپ نے یہ صحیح فرمایا کہ خود شناسی اور خدا شناسی کی راہ میں مرشد کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے لیکن یہ بندہ ماضی کسی کا مرشد ہونے کی اہلیت ہرگز نہیں رکھتا۔ البتہ ان معاملات میں جو کچھ تھوڑا بہت پڑھایا سنا ہے۔ اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے سے انشاء اللہ کبھی دریغ نہ کروں گا۔

انسان کو اپنے اندر اخلاق الہیہ پیدا کرنے کے لیے بہت سے ذرائع اور طرائق میسر ہیں یہ ہر انسان کے اپنے اپنے ماحول، مزاج اور استعداد پر منحصر ہیں انشاء اللہ اس موضوع پر کبھی زبانی گفتگو ہوگی۔

اسی طرح مادی بیماریوں کی مانند ہر روحانی بیماری کا بھی اکسیری اور تیر بہدف علاج موجود ہے البتہ علاج تجویز کرنے سے پہلے بیماری کی تشخیص صحیح طور پر کرنی لازمی ہے۔

(18 مارچ 84ء، لندن)

☆.....☆.....☆

تصوف کے معاملے میں امام غزالی کی مثال پر نہ جائیں وہ گفتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے راہ سلوک پر ایک خاص طرز کی زندگی اختیار کی اور ایک علم کوفن کے درجہ پر پہنچا دیا۔ باقی لوگوں کے لیے تقلید کی صرف ایک مثال ہے وہ حضور رسول کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ ہے۔ ہم گناہ گاروں کو اپنی بساط کے مطابق حضور کے نقش قدم پر ہی چلنا چاہیے جس میں دین اور دنیا کا مکمل ترین امتزاج اور توازن ہے۔

تصوف کے شوق میں نہ تارک دنیا ہونا چاہیے نہ متروک دنیا۔ اصلی کمال تو یہ ہے کہ ظاہر میں نارمل دنیاوی زندگی گزارے۔ باطن میں صرف اللہ کا ہو ہے باطن کی خبر ظاہر سے کبھی نظر نہ آنی چاہیے حتی الوسع۔

آپ نے لکھا ہے میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ جب تک انسان ایک گوشے میں بیٹھ کر خدا کی طرف پوری طرح

متوجہ نہ ہو جائے تب تک اس پر کشف والہام کے دروازے نہیں کھلیں گے۔

آپ کی ذاتی رائے ضرور صحیح ہوگی لیکن میری گزارش ہے کہ کشف والہام کے دروازے کھلنا مقصود ہی نہیں۔ اصلی مقصود تو معرفت الہی ہے اس کے لیے ترک دنیا کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر جگہ موجود اور ممکن الحصول ہے بشرطیکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے ہوتے رہیں اور اس کے علاوہ اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق کچھ مزید کوشش اور مشق بھی کرتے رہیں۔

(5 جون 83ء)

☆.....☆.....☆

آپ کے خطوط ملے، آپریشن کی وجہ سے جلد جواب دینے سے معذور رہا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم اور آپ کی دعاؤں کے طفیل آپریشن کامیاب رہا، لیکن اس بار واپسی پر عمرہ کی سعادت سے محروم رہوں گا۔ آپریشن کے بعد تین چار ماہ تک چند احتیاطیں کرنا لازمی ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں سالہا سال سے میری جو عادت و روایت بن چکی ہے، اس کے پیش نظر اس بار عمرہ کے دوران ان احتیاطوں کو نہ نبھاسکوں گا۔ زندگی رہی تو اللہ پھر کوئی موقع نصیب فرمائے گا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ انسان میں قوت فکر کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے تھا کیونکہ آپ میں اللہ کے فضل سے قوت فکر بڑی جولانی اور تابانی سے موجود ہے۔ احقر بڑی حد تک اس قوت سے محروم ہے۔ آپریشن کی کامیابی کے بعد اب سوچتا ہوں کہ جس طرح بصارت بحال ہوگئی، کاش کہ اسی طرح کچھ بصیرت بھی نصیب ہو اس کے لیے میرے حق میں دعا فرمائیں۔

(11 مارچ 83ء)

☆.....☆.....☆

آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ذکر کے ساتھ فکر بھی لازمی ہے۔ ذکر تو دریا کی روانی کی طرح ہے جو اگر جاری ہو جائے تو رواں دواں رہتا ہے۔ فکر سیڑھیوں کی طرح ہے اس پر کوشش، ہمت اور محنت کر کے چڑھنا پڑتا ہے۔ وحدت جائے تو رواں دواں رہتا ہے۔ فکر سیڑھیوں کی سیڑھی کافی دیر اور دور کے بعد آتی ہے اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے دل و دماغ سے آپ کو نوازا ہے، الوجود اور شہود وغیرہ کی سیڑھی کافی دیر اور دور کے بعد آتی ہے اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے دل و دماغ سے آپ کو نوازا ہے، مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ آپ ان سب سیڑھیوں کو بے تکان عبور کر جائیں گی فی الحال یہی افضل ہے کہ آپ اپنی فکر کو کالج کی تعلیم مکمل کرنے تک زیادہ سے زیادہ کام میں لائیں اس کے بعد آپ کے سامنے نئی نئی فکر کے لامحدود میدان کھلے ہوں گے۔

(9 فروری 83ء..... لندن)

آپ کا خط ملا، انٹرویو میں جن نو مسلم یورپین حضرات کا ذکر ہے، وہ دنیاوی لحاظ سے غیر معروف اور غیر مشہور ہیں لیکن عملی اسلامی اور روحانی زندگی میں قابل رشک ہیں۔ ڈاکٹر شوانی صاحب سے کئی برس پہلے ایک بار ملاقات ہوئی تھی ڈاکٹر مارٹن لنگ عرف ابوبکر سے بھی چند بار ملنے کا موقع ملا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؑ کا یہ فرمودہ ایک لاثانی قول ہے کہ سالک کا اصلی مقام عبودیت ہے۔ یہ حدیث شریف بھی صحیح ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا۔ نفس کو پہچانا عبودیت کا اعلیٰ مقام ہے اس مقام پر پہنچ کر عہد کو یہ پورا پورا ادراک نصیب ہوتا ہے کہ وہ بندہ ہے، معبود اللہ ہے، عبد فانی ہے، اللہ الحق القیوم ہے، عبد معذور ہے، اللہ قادر مطلق ہے، عبد کی عقل، فہم و بصیرت اور بصارت محدود ہے، اللہ علیم، قدیر، حکیم، سمیع، اول، آخر، ظاہر، باطن، کبیر ہے۔ عبد غلیظ، کثیف، خطا کار اور غافل ہے، اللہ لطیف، قدوس، تواب، ستار غفار ہے..... علیٰ ہذا القیاس اپنے نفس کا پورا پورا ادراک پانے اور پہچاننے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ایک ہلکے سے پرتو کی معمولی سی جھلک ہی انسان کی فہم و خیال میں آ سکتی ہے۔ ذات و صفات کے اسی ہلکے سے پرتو کی روشنی میں سیر اسماء الحسنیٰ کا امکان بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ سرتامس آرنلڈ کی کتاب THE ISLAMIC FAITH میں نے نہیں پڑھی اگر آپ کے پاس موجود ہے تو ضرور پڑھیں۔

عبدالرحمن چغتائی صاحب کے مضامین کو یکجا جمع کر کے آپ نے اس عظیم فنکار کی نمایاں خدمت کی ہے۔ اس کتاب کو اس حقیر پر تقصیر کے نام منسوب کرنے کی کیا ضرورت تھی اسے کسی بڑے ادیب یا فنکار کے نام منسوب کیا جاتا تو چغتائی صاحب کے زیادہ شایان شان ہوتا، میں تو محض ان کا ایک معمولی سامدہ آج ہوں۔

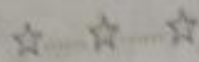
(5 فروری 84ء)

آپ نے لکھا ہے کہ روحانی کیفیت ایسی ہوتی ہے جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نایاب ہوتے ہیں۔ مطلب دراصل یہ ہے کہ جس حد تک بیان ہو سکتا ہو اس ممکنہ حد تک بیان کر دیں۔ وحدت الوجود اور شہود وغیرہ کسی روحانی واردات کا نام نہیں بلکہ روحانیت کی آرٹ میں فلسفانہ موشگافیوں کو جنم دیتی ہیں۔ ان سچے داروادیوں سے بچ کر ہی رہنا چاہیے۔ ہمارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق مطلق ہے اور انسان محض اس کی مخلوق۔

علامہ اقبالؒ نہایت عظیم شاعر، فلسفی اور مفکر تھے۔ ان کے خیالات میں آپ نے جن تضادات کا ذکر کیا ہے اس پر نہایت عزت و احترام کے ساتھ علمی بحث کی جاسکتی ہے۔ انشاء اللہ واپسی کے بعد کسی موضوع پر گفت و شنید ہوگی۔ یہاں آتے ہی یہاں کی ادبی انجمنوں نے مجھے گھیر لیا۔ پاکستان میں تو میں ان چیزوں سے دامن چھڑائے رکھتا

ہوں لیکن یہاں پر یہ لوگ پردہ کی ہیں ان کے مسلسل اصرار پر میرا انکار کیے جاتا ہوں یہ مروتی نظر آتی ہے۔ اس لیے مجبوراً مان لیتا ہوں چنانچہ اب ہر ہفتے کسی نہ کسی تقریب پر ذی بونی بھی بھانا پڑتی ہے۔

(14 جنوری 83ء لندن)

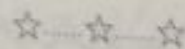


خطبات بہاولپور میں نے کافی عرصہ پہلے دیکھے تھے لیکن پوری طرح پڑھے نہیں۔ ان میں سے جو نکات آپ زیر غور لانا چاہیں تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے لکھ دیں اگر میری سمجھ میں آگئے تو میں آپ کو بتا دوں گا۔

جو حضرات اللہ تعالیٰ کی معرفت عقل کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ غالباً لامکان کو عقل کے چھوٹے سے قفس اور بے پایاں کو کوزے میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ عقل کا اپنا مقام اور اپنی اہمیت ضرور ہے لیکن اس کی پرواز نہایت محدود ہے۔ انسانی عقل محدود ہے۔ اللہ کی ذات و صفات لامحدود ہیں۔ محدود لامحدود کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر، مجبور اور معذور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت ایک وجدانی امر ہے اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ دل معرفت الہی کا میدان ہے، دماغ اس کا محض ایک چھوٹا سا لیکن لازمی پاسہان ہے۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کس ذریعہ حاصل کرنی چاہیے۔ ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ احکام اسلام کے مطابق جو کوئی ایمان داری اور نیک نیتی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کر رہا ہو اسے اللہ کا قرب اور اللہ کی معرفت حاصل ہے خواہ اس کو خود یا کسی اور کو اس کے متعلق کوئی احساس ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن عرف عام میں یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ معرفت الہی اور قرب الہی کا ثبوت درجہ ولایت کا حصول یا کشف و کرامات ہی سے ملتا ہے لیکن درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات لاقتناہی ہے اس طرح معرفت الہی کا سلسلہ بھی لامحدود اور بے پایاں ہے۔ معرفت الہی میں فزوں سے فزوں ترقی کرنے کے لیے راہ سلوک پر گامزن ہونا سودمند ہوتا ہے۔ راہ سلوک کے متعلق بہت سے بزرگوں کی بہت سی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کو دیکھنے سے آپ کو اس کے متعلق طرح طرح کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

(13 اپریل 83ء)



علم کی بہت سی DEFINITIONS ہو سکتی ہیں میرے نزدیک علم وہ ہے جو کسی امر یا شے کو غیب سے ظہور اور شہود میں لے آئے، غائب کو آشکارا کرے۔

انسان کے لیے سب سے بڑا "غیب" اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے جو علم معرفت الہی کو فروغ دے وہی سب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ اس سے نیچے کے درجہ پر علم کے بے شمار شعبے، راستے اور مقام ہیں لیکن وہ سب گمراہی کی حیثیت رکھتے ہیں منزل مقصود صرف ایک ہے۔ معرفت الہی۔

کوئی علم کتنا ہی وسیع و عریض و عمیق کیوں نہ ہو اگر اس کا رخ اپنی حقیقی منزل مقصود کی طرف نہیں تو وہ علم غیر نافع رہے گا، جس سے بچنے کے لیے دعائیں آئی ہیں۔ ایسا ہی علم حجاب بن جاتا ہے بلکہ حجاب اکبر۔ ”علموں بس کریں اوپار“ میں بھی بلھے شاہ نے غالباً ایسے ہی علم سے اجتناب اختیار کرنے کو فرمایا ہے۔

علم کے حصول کے ذرائع مختلف ہیں کتابی، اکتسابی، وہبی، ظاہری، باطنی، الہامی، لدنی اور علم بالوحی۔ علم بالوحی صرف پیغمبروں کے لیے مختص ہے۔ وہبی، الہامی اور لدنی علم صرف اللہ کے فضل سے ملتا ہے۔ انسان کی اپنی محنت اور کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں باقی سب علوم اپنے اپنے طریقوں پر ریاضت اور محنت کرنے سے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کی کوئی انتہا نہیں اس لیے اللہ کی معرفت کی بھی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ جو علوم معرفت الہی کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے فروغ کی کوئی حد نہیں۔

دبّ زدنی علما کی دعا غالباً ایسے ہی علوم کے عروج کی بابت ہے۔

گورنمنٹ کالج کا رسالہ ”ذہن“ میں نے نہیں دیکھا۔ بہت عرصہ سے مجھے اپنے متعلق دوسروں کی رائے اور تبصرے پڑھنے کا شوق نہیں رہا کیونکہ میرے لیے تعریف و تنقید، مدح و ذم یکساں ہے لیکن ڈاکٹر اجمل صاحب کا نام سن کر CURIOSITY پیدا ہوئی کہ وہ ماہر نفسیات استاد ہیں شاید ان کی باتیں میری کچھ رہنمائی کر سکیں۔ آپ پورا رسالہ بھیجنے کی زحمت نہ اٹھائیں فقط متعلقہ صفحات نکال کر ارسال فرمادیں اگر اس میں بھی کوئی دقت ہو تو بے شک رہنے دیں۔ (3 نومبر 82ء)

☆.....☆.....☆

یہ بات درست نہیں کہ نفسیات اور فلسفہ سے مذہب کی بنیاد کئی ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کمزور عقیدہ اور ایمان والے لوگ جب ان علوم کو حاصل کرتے ہیں تو یہ احتمال ہوتا ہے کہ وہ ان علوم کے مفروضات میں گرفتار ہو کر کہیں مذہب سے ہی برگشتہ نہ ہو جائیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علوم کا مرکز اور منبع عقل اور منطق ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں محدود ہیں اس لیے روح اور ایمان جیسی لامحدود گہرائیاں ان کی گرفت سے باہر رہتی ہیں۔ جن لوگوں کا عقیدہ درست ہے اور ایمان مضبوط ہے ان کے لیے فلسفہ اور نفسیات کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے پاس ایک جانماز ہے جو کئی عمروں میں میرے ساتھ رہا ہے اور متعدد بار خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ کی خاک پجوّم چکا ہے واپسی پر انشاء اللہ میں وہی آپ کی نذر کر دوں گا اس لیے آپ اپنا جانماز بھیجنے کی تکلیف نہ اٹھائیں۔

ٹی وی کے ماہنامہ میں سیرت کے موضوع پر میں نے جو مختصر سا مضمون پڑھا تھا اس کا متن مل گیا ہے آپ کے ارشاد کے مطابق وہ بھی اسی خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ وہ لوگ کون سے ہوتے ہیں جن کو کچھ علوم صرف اللہ کے فضل سے ملتے ہیں میرے خیال میں ایسے لوگوں میں سبھی لوگ شامل ہیں۔ حق دار تو ایک بھی نہیں لیکن امیدوار سب کو رہنا چاہیے بالکل لاٹری جیسا حال ہے کوئی نہیں جانتا کس کے نام لاٹری نکلے گی لیکن امید سب لگائے ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کا قصہ آپ نے پڑھا ہوگا انہیں ایک بزرگ کی تلاش میں جانے کا حکم ہوا، بزرگ نے اپنے ساتھ رہنے کی یہ شرط لگائی کہ کوئی سوال نہ کرنا جب اس بزرگ نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک لڑکے کو مار ڈالا اور ایک دیوار سیدھی کر دی تو حضرت موسیٰ سے صبر نہ ہو سکا اور وہ ہر قدم پر پوچھتے گئے کہ یہ کیوں کیا۔ آخر میں بزرگ نے وجوہات تو بتا دیں لیکن حضرت موسیٰ کو اپنے ساتھ مزید رکھنے سے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ ایک عظیم الشان پیغمبر تھے ان پر اللہ کا ایک طرح کا فضل تھا کہ ان پر وحی آتی تھی۔ دوسرے بزرگ پر اللہ تعالیٰ کا دوسری طرح کا فضل تھا کہ انہیں ایسا علم اللہ فی حاصل تھا جس سے حضرت موسیٰ جیسے عظیم پیغمبر بھی محروم تھے چنانچہ اللہ کے فضل کی بھی بے حد اور بے شمار قسمیں ہیں کسی پر ایک طرح کا ہوتا ہے کسی پر دوسری طرح کا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کب، کس طرح اور کہاں پر کیا فضل نازل ہو جائے گا۔ عام طور پر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر میں رسوخ حاصل کر لیتے ہیں وہ اس کے فضل سے محروم نہیں رہتے۔

آپ نے دوسری بات یہ پوچھی کہ علم میں ریاضت کیسے کی جاتی ہے؟ ریاضت کا دار و مدار علم کی نوعیت پر ہے۔ ہر علم کی اپنی اپنی نوعیت ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لیے ریاضت کا طریق کار بھی اپنا ہی ہوگا۔ مثلاً اپنے کانچ کے کورس کو پاس کرنے کے لیے محنت اور ریاضت کا جو مروجہ طریقہ ہے وہ آپ بخوبی جانتی ہیں اسی طرح دوسرے علوم پر عبور حاصل کرنے کے لیے بھی انہی کے مطابق ریاضت درکار ہے جس علم کے متعلق آپ پوچھیں گی، بتانے کی کوشش کروں گا۔

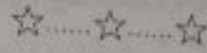
(23 نومبر 84ء)

مندرجہ بالا آپ کے پہلے خط کا جواب تھا ابھی آپ کا 21 نومبر والا خط بھی ملا ہے۔ اس میں آپ نے پوچھا ہے کہ جب نماز میں رسوخ حاصل ہو جائے تو اس کے بعد کیا کرنا چاہیے۔ اس کا صحیح جواب تو اس وقت مل سکتا ہے جب نماز میں رسوخ ہونے کی کیفیات تفصیلاً بتائی جائیں۔ رسوخ کے تہہ در تہہ کئی درجات ہوتے ہیں پہلے ان کا تعین کرنا ضروری ہے۔

حرم شریف میں خدا کے موجود ہونے کا زیادہ احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ وہاں خدا زیادہ موجود ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس ماحول میں انسان کی اپنی PERCEPTION اور احساس اللہ تعالیٰ کی ذات کو محسوس کرنے کے لیے زیادہ تیز، تیار اور شعوری طور پر بیدار ہوتی ہے۔

عربی کا جو جملہ آپ نے لکھا ہے (جو حرم سے جتنا نزدیک ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے اتنا ہی دور ہوتا ہے) غالباً اس زبان کی کوئی ضرب المثل ہے۔ ہر زبان میں اس مفہوم کی ضرب الامثال اور محاورے معروف ہیں مثلاً اردو میں ”مسجد کے زیر سایہ خرابات“ یا چراغ تلے اندھیرا وغیرہ۔ فارسی میں ”خبر عیسیٰ ہمکے رود چوں باز آید هنوز خبر باشد“ (عیسیٰ کا گدھا مکہ تو گیا لیکن واپس آیا تو گدھے کا گدھا رہا) ایسی ضرب الامثال کسی خاص واقعات یا روایات پر مبنی ہوتی ہیں ممکن ہے عربی کا فقرہ بھی اسی تاویل سے ہو۔ یہ فقط محاوراتی اور لسانی نکلتے ہوتے ہیں روحانی نہیں۔

(25 نومبر 84ء)



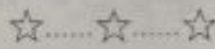
آپ نے نبوت اور ولایت میں فرق پوچھا ہے۔ فرق ایسا ہی ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ نبوت قرب خداوندی کا انتہائی درجہ ہے۔ یہ صرف اللہ کے فضل سے عطا ہوتا ہے اس میں کسی انسانی خواہش، کوشش اور کسب کا بالکل کوئی عمل دخل نہیں۔ رسولوں اور انبیاء کرام کے درمیان بھی مختلف درجات ہوتے ہیں لیکن ہم عامیوں کو ان میں تفریق کرنے کی اجازت نہیں سب کی برابر عزت و حرمت لازمی ہے۔

ولایت میں بھی مختلف درجات ہیں۔ یہ سب درجے بھی محض اللہ کے فضل ہی سے ملتے ہیں لیکن ان کو حاصل کرنے کی توفیق پانے کے لیے اعلیٰ کردار، بلند اخلاق، ذکر و فکر اور عبادت میں خلوص لازمی ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ ہرگز لازمی نہیں کہ کوئی درجہ ضرور مل جائے کیونکہ یہ ملتا تو صرف اللہ کے فضل سے ہے لیکن ان بلند اقدار کے بغیر کچھ ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے کسی خاص درجے سے بغیر انسانی کوشش اور خواہش کے بیٹھے بٹھائے سرفراز فرمادے۔ یہ اس کی رضا ہے جیسے کبھی بغیر توقع کے لائبریری نکل آتی ہے البتہ نکت موجود ہونا لازمی ہے۔

عارفوں کے شکاری ہونے کے متعلق آپ نے مولانا روم کے اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ شعر و شاعری میں مبالغے اور تلمیحات سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس قسم کے اشعار کو بھی استعارۃ ہی لینا چاہیے ورنہ بڑے سے بڑے عارف کی کیا مجال ہے کہ وہ ملائکہ، انبیاء کرام اور اللہ کی ذات پر کمند ڈالنے کا تصور تک دل میں لاسکے۔ جیسے جیسے عرفان بڑھتا ہے ویسے ویسے خودی کھنٹی جاتی ہے۔ عارف کی اصلی منزل تو فنا اور آخری منزل فنا فی الفنا ہے۔ اگر ہر مقام پر عارف کے سر پر شکار کرنے کا جنوں ہی سوار رہے تو یقیناً اس کا عرفان ابھی کمزور ہے۔

ممکن ہے کہ شکار کرنے سے مولانا روم کا اشارہ یہ ہو کہ عارف ملائکہ، انبیاء اور اللہ کی صفات اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ان کا یہ مقصد ہے تو یہ مناسب اور جائز ہے۔

(4 جون 84ء)



میرے متفرق مضامین تو کافی تعداد میں ہیں لیکن فی الحال بکھرے ہوئے ہیں۔ مکان تبدیل کرنے کی وجہ سے آج

کلی سامان کی حالت اور بھی زیادہ گنڈھ ہے کچھ عرصہ بعد جب سامان ترتیب سے لگ جائے گا تو سب مضامین تلاش کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا، انشاء اللہ

(10 مئی 85ء)

☆.....☆.....☆

آپ نے کسی بزرگ کا قول لکھ کر پوچھا ہے کہ کیا کسی وقت دعا غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے؟ مثلاً نماز کے وقت جبکہ عبد کا اللہ کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم ہوتا ہے۔

میرے خیال میں دعا کسی وقت بھی کسی کے واسطے غیر ضروری نہیں ہوتی۔ البتہ مختلف اوقات اور افراد میں دعا کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن کوئی بندہ کسی وقت بھی دعا کرنے سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

(15 جولائی 84ء)

☆.....☆.....☆

آپ کا خط ملا رمضان شریف کے ایام خیر و خوبی سے گزر رہے ہیں۔ اس مبارک مہینے میں آپ بھی میرے لیے دعا کریں میں بھی آپ سب کے لیے دعا گو ہوں۔

رمضان شریف میں قرآن پاک کی تلاوت زیادہ کرنی چاہیے۔ میں بھی حتی الوسع یہی کوشش کرتا ہوں اسی لیے ان ایام میں دوسرا سب لکھنا پڑھنا کافی حد تک چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ طالب علم ہیں اس لیے آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔ آپ کو عبادات کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا پورا خیال رکھنا بھی فرض ہے۔

(26 جون 83ء)

☆.....☆.....☆

”سائیکی“ میں ڈاکٹر اجمل صاحب کے انٹرویو کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے وہ میرے لیے باعث حیرت ہے۔ وہ بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اس کے علاوہ نفسیات کے عظیم اور نامور ماہر بھی۔ اس بندہ حقیر کی بابت جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے اسے سن کر میں خود حیران ہوں۔

آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں بڑی خوبیوں کا مالک ہوں اور کن وجوہات سے ہوں۔ میں تو صرف یہی سمجھتا ہوں کہ میں ایک حقیر، پُرتقصیر، اسیر نفس شریر بندہ ہوں۔ اس کے علاوہ میری اور کوئی پہچان اپنے نزدیک نہیں ہے۔

آپ نے اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگنے کا سوال اٹھایا ہے اس کے متعلق میری ناچیز سمجھ یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات الگ ہے، صفات الگ، اللہ کے رنگ میں رنگنے کا مطلب اس کی صفات کو اپنے اوپر طاری کرنے کا یا اس کی

صفات میں ڈوبنے کا مقصد ہے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کی ایک دو یا ایک سو یا دو سو یا ایک ہزار یا دو ہزار یا لاکھوں صفات میں رنگ جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں بن جاتا۔ اس لیے انا الحق کا دعویٰ ہر منزل پر ہر کسی کے لیے نازیبا ہے۔ عبد کی آخری منزل فنا اور اس سے بھی آخری منزل فنا فی الفنا ہے۔ یہاں پر انا کوئی وجود نہیں۔

علامہ اقبالؒ کا فلسفہ خودی نہ تو کوئی دینی فلسفہ تھا اور نہ ہی کوئی روحانی فلسفہ تھا۔ یہ سراسر ایک دنیاوی تخیل تھا جو برصغیر میں ایک خاص دور میں مسلمانوں کو انگریزوں اور غیر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی برتری کے مقابلے میں ابھارنے کے لیے غالباً الہامی طور پر علامہ کی شاعری پر نازل ہوا۔ ورنہ عبد کی معراج خودی نہیں بلکہ فنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں انسان کی نہ کوئی انفرادیت ہے نہ کوئی EGO

موت سے پہلے مرنے والی حدیث کا پورا مفہوم یا متن تو مجھے معلوم نہیں لیکن غالباً اس کا تعلق بھی روحانیت کے اس درجہ فنا سے ہوگا جس کے متعلق احقر نے مندرجہ بالا سطور میں کسی قدر اشارہ کیا ہے۔

(28 فروری 84ء)

☆.....☆.....☆

تصویر کے پردے میں

(فلم - تمثیل)

نئی کرن

(دستاویزی فلم)

شہید انتظار کر رہے ہیں

(تمثیل)

(بیان)



شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
(غالب)

نئی کرن

ادارہ تعمیر نو کی پیشکش

اداکار جس ترتیب سے آئے ہیں۔

ریکھا۔ اعجاز۔ احمد غازی۔ طالش۔ نیلو۔ ذوالقرنین۔ گل زمان۔ سکندر شاہین۔ مرزا سلطان۔ سلطان کھوسٹ۔
منیر۔ شیخ اقبال۔ الیاس کاشمیری۔ بٹ کاشر۔ علی بابا۔ اجمل ساقی۔
لیلیٰ۔ ایم ریحان۔ اکمل۔ نور جہاں۔ مسرت نذیر۔ رجنی۔ بہار۔ زینت

مکالمے اور منظر نامے

قدرت اللہ شہاب

منظر کشی

نبی احمد۔ رشید چوہدری۔ فضل حسین۔ اظہر برکی

معاونین منظر کشی

بابر۔ سعید۔ نقو خان

صدا بندی

روشن۔ بیگ۔ تاج

معاونین صدا بندی

لالہ مشتاق۔ فضل راہی۔ مبارک

گانے ریکارڈنگ ری ریکارڈنگ

شاہ نور اسٹوڈیو

عمل کیمیائی

پیارے خان۔ خواجہ رشید

موسیقی

رشید عطرے۔ سجاد سرور نیازی۔ اقبال

نغمہ نگار۔ سیف الدین سیف

گلوکار۔ نور جہاں۔ ناہید نیازی۔ فتح علی خان۔ مبارک علی خان۔ نسیم بیگم

رقص

رختی

ہدایت

فیروز عزیز۔ سراٹ۔ عاشق حسین

آرٹ ڈائریکٹر

غلام نبی سیفی

منتظمین غنی۔ ایوب۔ کرم دین۔ انور

میک اپ..... رحمت

فوٹو اسٹیٹ..... گرین آرٹ

ملبوسات..... ظفر

آرٹ..... اسماعیل

پروڈکشن کنٹرولر

سید ثار علی شاہ

ایگزیکٹو آفیسر

افتخار مفتی

تدوین

حمید قاضی۔ داؤد۔ اے رشید۔ اے کے مسرت

معاون ہدایت کار

اے رشید۔ مقصود۔ شریف۔ ریاض

یہ فلم ایور نیو اسٹوڈیو میں تیار کی گئی

پروڈیوسر
ایچ۔سی۔ ہاشم

ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر
ضیاء محی الدین

ہدایت کار

فرید احمد

محکمہ اشتہارات فلم و مطبوعات حکومت پاکستان نے تیار کی

گھر کا منظر

عورت:- کتنی بڑی سفارشیں کرائی ہیں تمہارے چچا نے کہ میں کیا بتاؤں۔ خود وزیر نے کہا ہے کہ یہ میرا اپنا آدمی ہے بس دو چار دن میں حکم آنے والا ہے۔

خالد:- لیکن چچی جان نوکری کون سی ہے۔

عورت:- کہتے تھے کہ بہت بڑی افسری ہے اور افسری بھی وہ کہ جس میں تنخواہ کے علاوہ.....

خالد:- لیکن کام کیا کرنا پڑے گا۔

عورت:- یہ تو مجھے معلوم نہیں، پر کام کا کیا؟ میرا مطلب تو یہ ہے کہ عہدہ ہو، حکومت ہو اور نوکری ایسی ہو جس میں تنخواہ کے علاوہ اللہ کا فضل بھی ہو۔ آج کل خالی تنخواہ میں گزارہ ہوتا ہے؟

خالد:- آپ نہیں سمجھتیں چچی جان

عورت:- تمہیں تو خوش ہونا چاہیے الٹا سوچ میں پڑ گئے۔

خالد:- اصل میں چچی جان میں چاہتا ہوں کچھ کام کروں کچھ کر کے دکھاؤں میز کرسی لگا کر خالی افسری کرنا مجھے

پسند نہیں۔

عورت:- گھبراتے کیوں ہو وہ بھی ہوتا رہے گا فی الحال تو حکم ملتے ہی نوکری پر چلے جاؤ۔ کیا بات ہے شرفو؟

شرفو:- کچھ نہیں سمجی کالج سے آگئی ہے۔

عورت:- ہاں وہ تو آنا ہی تھا اور کچھ کہتی ہے؟

شرفو:- وہ کتابیں لائی ہیں کہتی تھیں آ کر اپنی کتابیں لے جانا۔

عورت:- ہاں خالد جاؤ سمجی سے اپنی کتابیں لے آؤ صبح کہہ رہی تھی کہ کالج سے تمہارے لیے کچھ اچھی اچھی

کتابیں لاؤں گی۔

عورت کا شوہر:- کس سے باتیں ہو رہی ہیں۔

عورت:- اپنا خالد تھا۔

شوہر:- اچھا تو سنا دی اسے خوشخبری۔

عورت:- اب آپ ذرا حکم جلدی سے نکلوائیے نا۔

شوہر:- نکل آئے گا حکم بھی وہ وزیر مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ ابھی کل ہی اس کے بیٹوں کو تین تین لاکھ

کے پاسپورٹ پر مٹ دلوائے ہیں۔ خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دیں اُس ہاتھ لیں۔
عورت:- چھوڑیے یہ شاعری اب خالد کے کام میں بالکل دیر نہ کیجیے۔
شوہر:- بڑا خیال ہے خالد کا۔

عورت:- ہائے اپنی سمنی اب جوان ہو رہی ہے آپ کو فکر نہیں اس کا
شوہر:- اچھا تو یہ بات ہے میں بھی حیران تھا کہ بھائی صاحب کی اولاد سے دفعتاً ہماری بیگم صاحبہ کو کیوں دلچسپی
ہو رہی ہے۔

نیا منظر

سمنی اور خالد

سمنی ہنستی ہے۔
خالد:- یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے سمنی۔
سمنی:- اور کیا روؤں۔
خالد:- تم مذاق کر رہی ہو!
سمنی:- آخر تم چاہتے کیا ہو؟
خالد:- میں زراعت کے متعلق تجربے کرنا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں کوئی نئی چیز پیدا کروں کوئی نیا کام کر کے
دکھاؤں۔
سمنی:- تو کیا افسری زراعت سے متعلق نہیں ہے۔
خالد:- یہ بھی تو تماشا ہے۔ ٹریننگ میں نے زراعت میں لی ہے اور بنا رہے ہیں مجھے پاسپورٹ افسر، اس لیے
کہ چچا جان کی سفارش اسی محکمہ میں چلتی ہے۔
سمنی:- بن جائیے پاسپورٹ آفیسر شاید اسی بہانے اس بندے کو بھی پاسپورٹ مل جائے۔
خالد:- یہ تم کہہ رہی ہو سمنی؟
سمنی:- ہاں ہاں میں کہہ رہی ہوں بڑی حکومت ہوگی لوگ باگ سلام کریں گے ڈالیاں آئیں گی اور اللہ کے
فضل سے اوپر کی آمدن کا تو حساب ہی نہیں ہوگا۔
خالد:- یہ میری زندگی کا سوال ہے۔
سمنی:- پیدل جوتیاں چٹانے کے بجائے خالد صاحب موٹر میں گھومیں گے، رات کو دیر تک ڈانس ہوگا اور صبح
سوٹ پہن کر آفس جایا کریں گے۔
خالد:- میرا جی چاہتا ہے انکار کر دوں۔

سمنی:- جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

خالد:- یہ ہی تو ڈر ہے مجھے میں چاہا ہوں زمین کا ایک ٹکڑا لے لوں اور اس کے اوپر زور شور سے ٹالوؤ گاؤں۔

سمنی:- یہ ٹالو کیا بلا ہے؟

خالد:- مطلب یہ ہے کہ پہلے آٹو بوئے پھر اس پر ٹماٹر کا پیوند لگا دیا اب نیچے آلوؤ گ رہے ہیں اور اوپر ٹماٹر۔

فصل بھی دُغنی ان کو انڈے کے ساتھ مکس کر کے آلیٹ بہت مزے دار بنتا ہے۔

سمنی:- خالی آلیٹ ہی نہیں میں اس میں سبز مرچ اور دھنیا ملا کر پھر آٹے کی تہہ میں جماؤں گی تمہیں پراٹھے پسند

ہیں نا خالد۔

خالد:- اور اس کھیت کے کنارے ایک ہٹ بھی ہو۔

سمنی اقبال کی نظم الاتی ہے۔

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

خالد:-..... اس میں ہم رہیں۔ تم اور میں

صف باندھے دونوں جانب بوئے ہرے ہرے ہوں

ندی کا پانی صاف تصویر لے رہا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم

امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

سمنی کی ماں:- سمنی۔

خالد:- جاؤ سمنی چچی جان بلا رہی ہیں۔

سمنی:- آئی امی

سمنی کی ماں:- سمنی سے کتاب لے آئے ہو بیٹا

خالد:- کتاب او کتاب

ماں:- اچھا کوئی بات نہیں جاتے ہوئے لیتے جانا۔

خالد:- جی ہاں جی

سمنی کا باپ:- اوہ خبروں کا وقت ختم ہو گیا ہے بیٹا ذرا ریڈیو لگانا۔

ریڈیو پاکستان

خبریں ختم ہونے سے پہلے خاص خاص خبروں کا خلاصہ ایک بار پھر سنیے صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر جناب شاہ

علی کا آج دُھا کہ میں انتقال ہو گیا۔ پرسوں اسمبلی کے اندر ایک سیاسی ہنگامے میں آپ کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ مغربی

سمٹی:- یہ لوگ ہماری نمائندگی کرتے ہیں ہمارے قانون بناتے ہیں ہمارے اوپر حکومت کرتے ہیں خود ان کا

خالد:- آخر اس میں تاؤ کھانے والی کون سی بات ہے جمہوریت میں ایسے واقعات تو ہوا ہی کرتے ہیں کون سا ایسا ملک ہے جس کے ہاؤس میں ایسے ہنگامے نہیں ہوتے۔

سمٹی:- یہ اچھی جمہوریت ہے ہنگامے کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کا خون کر دیا جائے۔

خالد:- نہیں نہیں یہ تمہاری زیادتی ہے اسے خون کیسے کہا جاسکتا ہے۔ جمہوریت میں اس قسم کے احتجاج تو ہوا ہی کرتے ہیں۔

سمٹی:- اگر یہ جمہوریت ہے تو جناب والا ہم جمہوریت کے بغیر ہی اچھے۔

سمٹی کا باپ:- یہ بات نہیں ہے بیٹے آخر انگلستان بھی تو بیڈ پارلیمنٹ کے دور سے گزر چکا ہے۔

سمٹی:- ابا جان ایک تو یہ انگلستان نہیں اور دوسرا آج کل زمانہ بیڈ پارلیمنٹ سے ایک سو سال آگے جا چکا ہے۔

خالد:- تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔ سمٹی سیاست کو دل کی آنکھ سے نہیں دماغ کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔

سمٹی:- یہ کامیابیاں تمہیں مبارک ہوں میرا بس چلے تو

خالد:- بس بس خدا کا شکر ہے کہ تم صاحب اقتدار نہیں۔

سمٹی:- آپ لوگوں کے دل بڑے سخت ہیں آپ انسان کے خون کو سیاست کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اب اس

ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

سمٹی کا باپ:- اب نوجوانوں کو کون سمجھائے۔

سمٹی کی ماں:- آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔

سمٹی کا باپ:- کچھ نہیں کچھ نہیں۔

سمٹی کی ماں:- آخر مجھ سے کیا پردہ۔

سمٹی کا باپ:- میں سوچ رہا تھا کہ مرنے والا تو مر گیا اب دیکھیے اس کی جگہ کون پُر کرتا ہے۔

سمٹی کی ماں:- کوئی بھی ہو آپ خالد کی نوکری کے آرڈرنگوالیس کیا خبر حکومت ہی بدل جائے۔

سمٹی کا باپ:- ہوں۔

گاؤں کے چوپال کا منظر.....

آدمی:- غلام محمد جی اللہ کرے حکومت بدلے کوئی نئے وزیر آئیں۔

آدمی:- ارے بھئی خدا کے لیے یہ دعائے مانگو اللہ نہ کرے کہ کوئی نئے وزیر آئیں تو بہ تو بہ.....

آدمی:- وزیر کیوں نہ آئیں حکومت کا کام فرشتے چلائیں گے۔

آدی:- کام کون مائی کالال کرتا ہے۔ پرسوں ہی نمبردار آیا تھا چار مرغیاں پال رکھی تھیں کا کے کے ختنے کے لئے۔
وہ لے گیا کہ وزیر صاحب دورے پر آ رہے ہیں۔

آدی:- اللہ کی شان ہے اللہ نے مسلمانوں کو ایک وطن دیا۔ ہم خود ہی گھر پھونک کر تماشا دیکھنے بیٹھ گئے۔
آدی:- مم مم میں کہتا ہوں.....

آدی:- گھر پھونکنے والوں سے کہو نا ماسٹر جی ہمارا کیا قصور ہے۔

آدی:- نہیں بھئی ہم سب کا یہی حال ہے۔

آدی:- مطلب تو صاف ہے کرم دین کو دیکھ لو دو آنے کی چیز 8 آنے میں بیچ کر شوہر کا رہن گیا۔

آدی:- کیوں نہ بیچے زمیندار کا پٹھو جو ہے۔

آدی:- واہ رے میرے گورے آج تو نے پوری کی پوری بات کہہ ڈالی۔

آدی:- احسان اپنے پٹواری کو دیکھ لو جب تک روپے کے پیسے نہ لگائیں عرضی نہیں چلتی۔

آدی:- اس حمام میں سب ننگے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اسمبلی کے ممبر اور وزیر اُن کے ہاتھ ذرا لمبے ہیں لمبا ہاتھ مارتے ہیں۔

آدی:- ہمارا کیا بنے گا ماسٹر جی۔

آدی:- بھیا آخر آزادی ملنے کے بعد.....

آدی:- آزادی، آزادی، جان لے گئی ہماری چمڑی ادھیڑ دی آزادی نے ابھی چار ہی مرغیاں پال رکھی تھیں
کا کے کے ختنے کے لیے ارے وہ بھی نمبردار لے گیا۔ کہ وزیر دورے پر.....

آدی:- دور بدل جائے گا انشاء اللہ

آدی:- اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔

آدی:- احسان بھیا تم ہر وقت کتابوں کی باتیں کرتے ہو یہ غریبوں کو جگانے کون آتا ہے۔

آدی:- آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ انشاء اللہ

گاؤں میں چودھری کی حویلی کا منظر

چودھری:- بکواس بند کر یونہی بک بک کیے جا رہا ہے۔ چل دفع ہو دو رہو جا یہاں سے۔ تم کیا دیکھ رہے ہو گئے
چل دو رہو جا اور گھوڑی کو دانہ ڈال..... کہو بھئی فتح محمد حکومت بدلنے کی کوئی خبر آئی۔
فتح محمد:- ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی۔

چودھری:- ارے بھئی اتنے ہنگامے ہوئے۔ اسمبلی میں مار پیٹ ہوئی قتل ہوا اور ابھی تک حکومت، بدلنے کے کوئی
آثار نہیں۔

فتح محمد:- فکر نہ کرو چودھری جی کوئی حکومت ۶ مہینے سے زیادہ ٹھہری بھی ہے ۵ مہینے تو ہو گئے ہیں۔ بس اب وقت

چودھری:- اب کی بار حکومت بدلی تو ہماری باری پتھر پر لکیر سمجھو۔
نوکر:- حویلی پر جھنڈا لگائیں گے چودھری

دوسرا نوکر:- جیپ پر بھی جھنڈا ضرور لگے گا۔

آدمی:- السلام علیکم!

وعلیکم السلام کی آوازیں

چودھری:- ارے بھئی کرم دین وہ تمباکو نہیں پہنچا۔

کرم دین:- چودھری جی دکان پر صبح مال آ جائے گا اسی وقت بھجوادوں گا۔

چودھری:- دوستو! پتھر پر لکیر سمجھو! ۱۲ ووٹ تو میرے پاس ہیں، آٹھ ممبروں سے سودا ملے ہو چکا ہے یہ سب مل کر

۲۰ ووٹ ارے وہاں تو دس دس ووٹ والے کرسیاں سنبھالے بیٹھے ہیں۔

نوکر:- اجی حضور کی فتح یقینی ہے میں نے استخارہ بھی کر لیا ہے۔

چودھری:- پتھر پر لکیر سمجھو، پتھر پر لکیر۔

نوکر:- چودھری جی اگر آپ وزیر بنے تو ایسا مجرا ہو ایسا مجرا کہ گاؤں والے پشتوں تک یاد رکھیں۔

بڑا نوکر:- ارے گلو مجرا تو ہوتا ہی رہے گا سب سے پہلے مراد پور والی زمین پر ہاتھ مارنا چاہیے۔ ۴۰ مربع سرکاری

زمین ایسی پڑی ہے کہ ہاتھ لگے تو سونا اگلے سونا۔

نوکر:- چودھری یہ کام تو ہو ہی جائے گا۔

آدمی:- چودھری جی گاؤں سے شہر تک بس چلانے کے لیے اگر حکومت سے روٹ پر مل جائے تو کیا بات

ہے اس دھندے میں پیسہ ہی پیسہ ہے۔

آدمی:- خوشی محمد تحصیلدار کو کھڑے کھڑے نہ نکلوا دیا تو باقر علی میرا نام نہیں۔

آدمی:- چودھری جی کرم داد تھا نیدار بڑا کھنکار کے بولتا ہے اگر اسے پہلے ہی دن تبدیل نہ کیا تو.....

چودھری:- ارے مرے کیوں جاتے ہو اللہ کے فضل سے سب کچھ ہو جائے گا مراد پور والی زمین تو اپنی ہی سمجھو

روٹ پر مل جائے گا۔ تقاوی بھی ملے گی۔ لیکن فتح محمد اس دفعہ مجرے میں ناچنے والی کوئی فلمسٹار لاؤ تو بات ہے۔

پیسے کا خیال نہ کرنا اے بولولاؤ گے۔

فتح محمد:- اچھا۔

مشرکہ آوازیں انشاء اللہ انشاء اللہ

نیا منظر

ریڈیو پاکستان سے حکومت کی تبدیلی کی خبر پورے پاکستان میں سنی جا رہی ہے۔

ریڈیو پاکستان

رات گئے ایوان صدر سے ایک اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں فوراً برطرف کر دی گئی ہیں قومی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئی ہیں دوسرے انتظامات ہونے تک ملک میں مارشل لاء کا نفاذ رہے گا بڑی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوں گے۔

بازار کا منظر۔ فروٹ کی ایک دکان

گاہک:- یہ سیب کیا بھاؤ دیے بھئی۔

دکاندار:- ایک روپیہ سیر باؤ جی۔

گاہک:- ایک روپیہ سیر کچھ کم نہیں کرو گے۔

دکاندار:- نہیں بابو جی دام مقرر ہیں اب تو مول تول کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ ایک دام پکا تول بابو جی پکا تول

گاہک:- یہ اپنی دوکان بہت صاف ستھری کر رکھی ہے تم نے۔

دکاندار:- بابو جی تین ہفتے کے اندر اندر کا یا پلٹ گئی سمجھو کا یا، دکان تو دکان یہ..... یہ سیب تک چکا دیے ہیں

مارشل لاء نے بابو جی۔

گاہک:- بہت خوب بہت خوب اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میوہ کھانے کا بھی لطف آئے گا۔

گھر کا منظر

سمنی کا باپ:- آگئی بیٹا۔

سمنی:- ذرا دیر ہو گئی تھی ابا جان

باپ:- مارشل لاء کے دنوں میں اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا ٹھیک نہیں بیٹے۔

سمنی کی ماں:- میں تو روز کہتی ہوں اسے لیکن میری کون سنتا ہے اس گھر میں۔

سمنی:- آئی ایم سوری، لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گی۔

باپ:- کیا؟

سمنی:- عورتیں آج کل اتنا آسانی سے چل پھر سکتی ہیں نہ کوئی سیٹی بجاتا ہے۔

نہ کوئی کندھے سے کندھا مار کر چلتا ہے۔ مارشل لاء کی وجہ سے غنڈے تو ایسے غائب ہوئے ہیں جیسے گدھے کے

سر سے سینگ اور ابا جان لوگوں میں تمیز بھی پیدا ہو رہی ہے۔

خالہ:- میں سمجھتا ہوں سمنی، یہ سب دکھانے کی بات ہے مارشل لاء بہت خوفناک چیز ہے عزت والے سر

چھپائے گھروں میں بند ہیں۔

سمٹی :- اگر تمہارا مطلب ان لوگوں سے ہے جو پہلے حکومت کرتے تھے تو ان کا گھروں میں بند رہنا ہی اچھا ہے۔
خالد :- یہ تمہارا وہم ہے اتنا لکھ پڑھ کر بھی تم نہیں سمجھتیں کہ جمہوریت کتنی ہی بُری ہو بہر حال مارشل لاء سے بہتر

سمٹی :- جی ہاں میں جاہل ہی سہی لیکن جب چند لوگ حکومت پر قبضہ کر بیٹھے ہیں تو انقلاب کا آنا ضروری ہو

جاتا ہے۔

خالد :- یہ مارشل لاء ہے REVOLUTION کہاں

سمٹی :- جناب اسے REVOLUTION اس لیے کہتے ہیں کہ اسے عوام کی تائید حاصل ہے۔

خالد :- اب آپ سے کج بخشی کون کرے۔

سمٹی :- آپ REVOLUTION سے کہتے ہیں جس میں خون بہتا ہے گولیاں چلتی ہیں قتل عام ہوتا ہے۔

منظر میں تبدیلی

سمٹی کا باپ :- تم خاموش رہتی ہو آج کل بیگم۔

سمٹی کی ماں :- کیا بتاؤں مجھے تو غم لگ گیا ہے۔

باپ :- کس بات کا۔ میں سمجھتا ہوں یہ اچھا ہی ہوا۔

سمٹی کی ماں :- وہ کیسے

سمٹی کا باپ :- دراصل خالد کے خیالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں خدا جانے وہ سمٹی کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں۔

سمٹی کی ماں :- ہائے اتنا اچھا لڑکا ہے دیانتدار محنتی کیا عیب ہے اس میں۔

سمٹی کا باپ :- آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔

سمٹی کی ماں :- کہتا تھا گاؤں جا رہا ہوں کوئی زمین لے کر کاشت کرے گا۔

سمٹی کا باپ :- وہ بیوقوف ہے جوانی کے ولولے میں۔ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھارد دیکھو۔

گاؤں

فوجی جیب گاؤں سے گزرتی ہے چوہدری کی حویلی کے سامنے سے

چوہدری :- کون تھے وہ کیوں آئے تھے۔

نوکر :- کچھ فوجی تھے چوہدری صاحب۔

چوہدری :- فوجی کے بچے کیوں آئے تھے۔ کیا پوچھتے تھے۔

نوکر :- حضور پکی سڑک کا راستہ پوچھ رہے تھے۔

چودھری:۔ پہلے بتانا تھا اتنی دیر میری جان سولی پر لٹکی رہی۔ میں کہتا ہوں فتح محمد.....
 فتح محمد:۔ جی جی چودھری جی۔
 چودھری:۔ جی جی نہ کر پہلے میری بات سُن لے۔
 فتح محمد:۔ جی سُن تو رہا ہوں۔
 چودھری:۔ میں سوچ رہا ہوں جو چھ سو بوری گندم کی گودام میں پڑی ہے اُسے جتنا جلدی ہو سکے ٹھکانے لگا دیا جائے۔

فتح محمد:۔ جی جی
 چودھری:۔ اُسے جتنا جلدی ہو سکے ٹھکانے لگا دو فتح محمد جتنا جلدی ہو سکے۔
 نوکر:۔ ذرا ٹھہر جاؤ چودھری جی جس دم دام بڑھیں گے بیچ دیں گے۔
 چودھری:۔ تم دونوں جاہل ہو تمہارے باپ فوجی ڈنڈا لیے پھر رہے ہیں میں کہتا ہوں چھ سو بوری نکال دو۔ اُسے آگ لگا دو۔ دریا میں بہا دو کچھ کرو فتح محمد کچھ کرو۔ شریفوں کی جان عذاب میں آگئی ہے۔
 گودام کا منظر سیٹھ اندر گودام میں نوکر کے ساتھ پھر رہا ہے
 سیٹھ:۔ ارے باپ رے باپ اپن مارا جائے گا۔ کسی کو مفت دے دو خیرات کر دو کسی کے گودام میں پھینکو دو۔ تم ایسا کرو کہ اپن کا جان بچ جائے۔

منظر بدلتا ہے

سرکاری افسر کا گھر، سرکاری افسر اور اس کی بیوی
 سرکاری افسر کی بیوی:۔ ہیلو سعیدہ سنوکل مارنگ شو پر چلنا ہے نا اچھا؟؟؟ اچھے ہیں۔ آج کل بہت مصروف ہیں ایس پی جو چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ ہاں بھی سنوہ تم نے آدمی نہیں بھیجا۔ اچی وہی نیلون والا.....
 کیا کہا؟ نہیں بھی مجھے تو سفید نیلون چاہیے۔ ہاں ہاں وہی جو بلیٹس نے پہنی ہوئی تھی۔
 افسر:۔ خدا کا خوف کرو بیگم اپنے طور طریقے بدل دو روازے پر دو دو کاریں، یہ زیور یہ لباس یہ کونھی یہ ٹھاٹ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ میں سے سب کچھ کہاں سے ہو رہا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔

منظر کی تبدیلی

گاؤں کا منظر

آدمی:۔ انور علی انور علی اب بتا مزہ آ گیا کہ نہیں۔

انور:- مزے جیسا مزہ۔ اب تو نمبردار بھی کہتا تھا اپنی مرغیاں لے جانا ورنہ نہیں آیا۔ اب کا کے کے فقے لٹا
سے ہوں گے۔

آدمی:- پٹواری بھی کل چوپال پر آیا تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔
انور:- ارے کرم داد کو نہیں دیکھا میں نے سلام کیا تو گالی نہیں دی وعلیکم السلام کہا۔
آدمی:- اور ہاں اب تو زمیندار بھی گھوڑی پر چڑھ کر تاک جھانک نہیں کرتا۔
انور علی:- ارے احسان کہاں ہے وہ کہیں آئے تو خبریں سنیں، آج کل تو روزنی نئی خبریں آرہی ہیں۔
آدمی:- احسان کو شہری بابو خالد کی جانب جاتے دیکھا ہے۔
آدمی:- آج کل ان کی بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔
آدمی:- چلو اچھا ہوا بیچارے کو کام کا ساتھی مل گیا۔
آدمی:- لڑکا بڑا اچھا ہے۔
آدمی:- زمین کو دیکھتے ہی دیکھتے گلزار بنا دیا ہے۔
آدمی:- اپنے ہاتھوں سے دو کمروں کا گھر بھی بنا لیا ہے۔
آدمی:- کیا کرے بیچارہ سارا دن کام کرتا ہے اور رات پڑھتا ہے۔
آدمی:- پڑھتا کب ہے بیٹھا خط لکھتا رہتا ہے سنا اب شادی کرانے شہر جا رہا ہے چچا کی لڑکی سے۔
آدمی:- اور کیا تجھ سے کراتا۔

قہقہہ

منظر بدلتا گاؤں اور کھیت

(احسان خالد کو زرعی اصلاحات سے متعلق اخبار دکھاتا ہے)

احسان:- ارے او خالد ارے او خالد.....

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
خالد:- زیادہ جوش میں نہ آؤ اس میں ایسی کون سی بات ہے۔

منظر کی تبدیلی

ریڈیو پاکستان سے خبریں اور پس منظر

لوگ خبریں سن رہے ہیں۔

حکومت پاکستان نے زرعی اصلاحات پر رپورٹ پیش کرنے کے سات ممبروں کا ایک کمیشن مقرر کیا ہے۔

لوگوں میں خوشی کا اظہار

عورتوں کی آوازیں

ساڈا حشر دا روز انصاف دا سی
دن موت وانگوں پئے ٹالڈے ساں

کھیت اپنے لہونال

مردوں کی آوازیں

ہرے بھرے کھیتاں دی جوانی اج ساڈی اے

سونے جی فصلماں دی رانی اج ساڈی اے

ہرے بھرے کھیتاں

دہلا بہہ کے کھان والا اج غمگین اے

آج آسماناں اُتے ساڈی ایہہ زمین اے

دنیا تے..... کہانی اج ساڈی اے

ہرے بھرے کھیتاں دی

سونے جی فصلماں

ہرے بھرے کھیتاں دی

بلے بلے بلے..... آہا آہا آہا.....

آج تک لے ٹوں سپ دی نور

مُومینوں جہا نجران منگا دے

جہا نجران منگا دے ہور

جیویں نچدے نیں

جیویں نچدے نیں جنگلاں اج مور

ہن مینوں جہا نجران

آج سانوں پتہ لگا اے نویں قنون دا

جالی دی قیص دوپٹہ سنوں دا

دن آگئے ہور تے ہور

ہن مینوں جھانجھراں
 آج تک لے ٹوں سپ دی نور
 آج تک لے ٹوں

منظر میں تبدیلی

خالد کی سمنی سے شادی ہو جاتی ہے اور وہ اسے لے کر گاؤں آ جاتا ہے۔

منظر تبدیل ہوتا ہے

ریڈیو پاکستان سے لوگ خبریں سن رہے ہیں

یہ ریڈیو پاکستان ہے اگلے چند مہینوں میں ملک کے اندر بنیادی جمہوریتوں کا ایسا نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کی چار منزلیں ہوں گی یعنی یونین، پنچائتیں، تحصیل یا تھانہ کونسلیں، ضلع کونسلیں اور ڈویژن کونسلیں، ہتھیالگی میں صدر ایوب خان کی صدارت میں اعلیٰ سطح کی دوروزہ کانفرنس ختم ہونے کے بعد رات ان بنیادی جمہوریتوں کی تشکیل اور طریقہ کار کا اعلان کیا گیا۔

منظر بدلتا ہے..... گھر کا منظر

سمنی کی ماں:- تو اس کا مطلب ہے کہ ایکشن پھر ہوں گے۔

سمنی کا باپ:- ہوں۔

سمنی کی ماں:- خدا کرے وزیر پھر آ جائیں خالد کی نوکری کا بندوبست ہو جائے اب تو خیر سے سمنی بھی اپنے

گھر چلی گئی۔

سمنی کا باپ:- خدا کرے سمنی کا گاؤں میں جی لگ جائے۔

سمنی کی ماں:- اسی لیے تو کہتی ہوں وزیر پھر آ جائیں خالد کی نوکری کا کوئی بندوبست ہو جائے۔

سمنی کا باپ:- اب یہ خیال چھوڑ دو بیگم سیاسی وزیروں کا زمانہ گیا اب تو نیا سیاسی دور آ رہا ہے۔

منظر تبدیل ہوتا ہے

نغمہ کا پس منظر

پس منظر میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں، صدر ایوب خان مختلف شہروں کا دورہ کر رہے ہیں اور

جہاں نام سے خطاب کہ ہے ہیں لوگ تھیں میں کھڑے نہ ڈال رہے ہیں۔

نغمہ

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ

باری کو مول کھیت مہاجر کو لوکانہ

سلطانی جمہور

آج تیرے پاؤں سے اٹھتا زمین ہے

اولاد تیری غیر کی جاگیر نہیں ہے

وہ بات گئی بیت گیا دھڑکا

سلطانی جمہور کا

اے یارے وطن دیکھ تیری فوج میں ہم لوگ

تو ایک سمندر ہے تیری مورت میں ہم لوگ

گاتے چلے آتے ہیں اخوت کا ترانہ

سلطانی جمہور کا آتا ہے

منظر تبدیل ہوتا ہے

دو شخص ہوں میں بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں۔

ایک شخص :- آپ کے امپورٹ لائسنس کا کیا ہوا۔

دوسرا شخص :- یار تم امپورٹ لائسنس کو چھوڑ دو فٹنری میں میرا ایک دوست تھا دو تو اب وہاں ہے نہیں۔ اب میں

مال بھجیوں گا باہر میرا خیال ہے یونس لائسنس لوں۔

پہلا شخص :- میں سوچتا ہوں آپ وارڈ کونسل کی ممبری کے لیے کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے۔

دوسرا شخص :- یار خیال تو میرا بھی تھا لیکن مجھے امید نہیں ہے۔

پہلا شخص :- امید کیوں نہیں آپ نے تمام ٹیکس تو پے کر دیے ہیں، ۲۵ لاکھ کی آمدنی ظاہر کر دی ہے رہا سوال

فاران آپ کیسے کا دو بھی آپ نے ظاہر کر دیا ہے۔ تو کسے اعتراض ہو سکتا ہے۔

دوسرا شخص :- سب کو اعتراض ہے۔

پہلا شخص :- پر کیوں کوئی بات بھی ہو۔

دوسرا شخص :- بات یہ کہ پرانی بات تو بھول گئے مگر ابھی ان کی یاد تازہ ہے۔

پہلا شخص :- ہزاروں آدمی ووٹ دیتے تھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا اب ایک ہزار ایک ممبر چنیں گے اس لیے کوئی بچھ نہیں سکتا۔

دوسرا شخص :- یار ایک ہزار آدمی ہوتا ہی کیا ہے سب کو معلوم ہے کہ ان کے گھر میں کھانے کو کیا ہے۔ دراصل بات تو یہ ہے کہ ایک ہزار ووٹ کو نیچے اوپر کرنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔

منظر بدلتا ہے

انتخابات کیلئے اجلاس ہو رہا ہے

آدمی :- ہم نے محلے میں انتخاباتی کمیٹی بنادی ہے۔

آدمی :- مجھے تو کوئی اچھا آدمی نظر نہیں آتا۔

عورت :- لیکن فرشتے کہاں سے ڈھونڈ کر لائے جائیں ہمارے وارڈ میں تین خواتین امیدوار ہیں، لیکن تینوں کے خاوند سیاست یا تجارت میں کوئی نہ کوئی جرم کر چکے ہیں۔

شخص :- خاصا زر خیز مال ہے۔

عورت :- چوتھی کہاں سے لائیں۔

شخص :- تم کیوں نہیں کھڑی ہو جاتیں۔

عورت :- میں۔

شخص :- ہاں ہاں تم پر جی لکھی بھی ہو اور یوں بھی فرشتہ ہو۔

عورت :- حضور عورتیں فرشتہ نہیں ہو رہی بنتی ہیں۔

منظر بدلتا ہے

انتخابات کیلئے اجلاس ہو رہا ہے

ایک مقرر تقریر کر رہا ہے.....

آدمی :- جن لوگوں کو خدا کا خوف ہے جن لوگوں کے ایمان سلامت ہیں۔ جن کے دامن بے داغ ہیں جو خدمت کرنا جانتے ہیں۔ یہ جمہوریت ان لوگوں کی جمہوریت ہے اور یہ الیکشن صرف انہی لوگوں کے الیکشن ہیں۔ ہمارا امیدوار غریب ہے اس نے اپنا پسینہ بہا کر روٹی کمائی ہے ملک کو نہیں بیچا ملک کی خدمت کی ہے وقت آنے پر پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگ جائے گا۔

گاؤں کا منظر

گاؤں کے لوگ موزوں اُمیدوار کے لیے اجلاس کر رہے ہیں
 آدمی:- ابھی تک تو ایک نام بھی کام کا نہیں آیا۔
 آدمی:- سوچو دماغ پر زور ڈالو۔
 آدمی:- ماسٹر جی بہت زور ڈال رہے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔
 آدمی:- اس وقت نہ سوچو گے تو پھر کب سوچو گے پہلے تو تم میلے باندھ کر ووٹ ڈالنے جاتے تھے۔
 آدمی:- پہلے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ جسے ووٹ ڈالنے جا رہے ہیں وہ آدمی ہے یا ریل کا ڈبہ چور ہے، یا
 سادھ ہے لیکن اب تو ہم نے خود ہی لوگوں کو چننا ہے کون کسی سے ڈھکا چھپا ہے۔ گاؤں کے لیے تین نشستیں تھیں اب تو
 دو ہی رہ گئی ہیں سنا ہے چودھری بڑے زور شور سے تیاری کر رہا ہے۔
 آدمی:- ہاں یہ بھی سنا ہے کہ اس نے گلو اور فتح محمد کو شہر بھیجا ہے کہ ناچنے والی لے کر آئیں بڑے مجرے ہوں گے
 دعوتیں ہوں گی ووٹ جو لینے ہیں۔
 آدمی:- واہ جی واہ ہم غریب بھی اس بہانے آنکھیں سیک لیں گے۔

منظر تبدیل ہوتا ہے

ناچنے والی کا گھر

رقاصہ:- کون
 فتح محمد:- چودھری جمال دین نے یہ ہزار روپیہ پیشگی بھیجا ہے اور دو ہزار مجرے کے بعد، سفر خرچ الگ۔
 گلو:- الیکشن کا معاملہ ہے میم صاحب ناچ ایسا ہو کہ ووٹ اڑا کر ہمارے چودھری صاحب کے صندوق میں آئیں۔
 رقصہ:- تم کس زمانے کی بات کرتے ہو چودھری صاحب اب تو ووٹ انسانوں کو ملیں گی ناچ گانے کو نہیں۔
 فتح محمد:- آپ حامی تو بھریں میم صاحب، اللہ نے چاہا تو جیت ہماری ہوگی انشاء اللہ
 گلو:- انشاء اللہ

منظر بدلتا ہے

گاؤں میں چودھری کی حویلی میں لوگ جمع ہیں اور رقصہ رقص کر رہی ہے
 مست نظر کا یہ پیمانہ رات کی رات ہے
 ہنسا ہنسا پینا پلانا رات کی رات ہے

چال جوانی چل جائے گی رات سہانی دھل جائے گی
شمع کے پہلو میں پروانہ رات کی رات ہے
ہنسنا ہنسنا.....

غم کے مارے پی لیتے ہیں جینے والے جی لیتے ہیں
یہ ساقی اور یہ پیانہ رات کی رات ہے
ہنسنا ہنسنا.....

او نادان جوانی ہے یہ ایک رات کی رانی ہے
رخ پر زلفوں کا لہرانا رات کی رات ہے
ہنسنا ہنسنا.....

.....ہو ہو ہو..... ہا ہا ہا.....

منظر تبدیل ہوتا ہے

چودھری کی حویلی کے باہر

آدی :- چودھری ابھی تک وہی پرانے خواب دیکھ رہا ہے۔

آدی :- پہلے تو اپنی دولت کے زور پر ووٹ خرید لیتا تھا اب ناچ گانے کی آڑ میں شکار کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آدی :- اب اسے ووٹ کون دے گا۔

آدی :- ویسے ناچ خوب تھا۔

آدی :- ہمت تیرے کی چل یہاں سے.....

منظر بدلتا ہے

گاؤں میں گاؤں والے کسی موزوں امیدوار کے بارے میں غور کر رہے ہیں

آدی :- حاجی اللہ بخش کیسا رہے گا۔ آدی بھی نیک اور

آدی :- دس دفعہ حج کر چکا ہے سونا جو لے کے آتا ہے اس بہانے

آدی :- بھئی روشن خان کیسا ہے

آدی :- بٹائی کا آدھا حصہ مار لیتا ہے باقی تو سب ٹھیک ہے

آدی :- پھر اللہ دیتا اچھا رہے گا

آدی :- صرف جھوٹی گواہیاں دیتا ہے

آدی :- سوچو اور سوچو

آدی :- اور کہاں سے سوچ کر لائیں آسمان سے فرشتے آئیں یہ تو ہر آدی میں کیڑے نکالتا ہے۔

آدی :- آسمان سے فرشتے لانے کی کیا ضرورت ہے زمین کے فرشتے تلاش کرو زمین کے۔

منظر تبدیل ہوتا ہے

پورے ملک میں انتخابات ہو رہے ہیں اور انتخابات کی جھلکیاں

..... منظر تبدیل ہوتا ہے

گاؤں میں منتخب ممبران اجلاس کر رہے ہیں ایک ممبر تقریر کر رہا ہے

ممبر :- بھائیو ان پندرہ آدمیوں پر جو اس کونسل میں بیٹھے ہیں دس ہزار آدمیوں نے اپنا اعتماد کیا ہے اور یہ نمائندے تحصیل اور ڈویژن کونسلوں میں جائیں گے ہماری کوششوں اور ہمارے مشوروں کا ملک گیر سطح پر اثر ہوگا۔

ہماری اس کونسل کے سامنے جو کام ہیں ان پر ساری قوم اور سارے ملک کی ترقی کی بنیاد ہے امن و امان قائم رکھنے کے لیے ہم نے دیانتداری سے کام لینا ہے۔ ہم نے نئی سڑکیں بنانی ہیں ہم نے ہسپتالوں کا انتظام کرنا ہے۔ ہم نے پیداوار بڑھانی ہے۔ ہم نے صفائی کے لیے پراچار کرنا ہے ہم نے تجارت اور صنعت پر نظر رکھنی ہے گھریلو صنعتوں کو قائم کرنا ہے اور زراعت کی ترقی کے لیے ماڈل فارم کھولنے ہیں۔

منظر تبدیل ہوتا ہے

گاؤں میں خالد کا گھر اور سمنی کے صبح کے وقت خالد کو جگا رہی ہے.....

سمنی :- خالد..... خالد..... اٹھو..... خالد

خالد :- اوہو.....

منظر تبدیل ہوتا ہے

خوشی سے خالد اور سمنی کھیتوں میں بھاگ رہے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں۔

سمنی :- تم بہت خوش ہونا خالد

خالد:- بہت۔ یہ کھلی ہوا یہ محبتی ماحول سادہ اور پُر خلوص لوگ یہ مددگار محنتی اعتماد کرنے والے ایک نئی کروٹ لیجی ہوئی زندگی..... چاروں جانب کھوؤں کا پھلتا ہوا باغ۔
سمنی:- یہ تو مارشل لاء ہے خالد۔

خالد:- نہیں سمئی..... میں نے اپنے گرد عجیب انقلاب آتے دیکھا ہے سینکڑوں برس کی جاگیریں ایک خاموش امن و امان کے ساتھ ختم ہو رہی ہیں۔ سہمے ہوئے ان پڑھ دیہاتی پہلی دفعہ اپنے قدموں پر خود کھڑے ہو رہے ہیں اب انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر جلسوں اور جلوسوں میں نہیں لے جایا جاسکتا۔ اب انہیں دھواں دھار تقریروں کے ذریعے سبز باغ نہیں دکھائے جاسکتے۔ اب انہیں صاف صاف کہا جاسکتا ہے..... یہ تمہارا ملک ہے..... یہ تمہارا ملک ہے۔ تم محنت کرو محنت کرو۔ خلوص سے دیانتداری سے۔ یہ سادہ لوح مخلوق ایوان حکومت کے دروازے پر ڈرو میٹ کی طرح نہیں بچھائی جاتی جس پر وہ پاؤں رگڑ کر ذاتی اقتدار کی سیڑھیاں چڑھا کرتے تھے۔ اب ان کی بات کھلے بندوں خندہ پیشانی سے سنی جاتی ہے..... اور اب ان بے بس لوگوں کو زبردستی ٹرکوں میں ٹھونس کر ووٹ ڈالنے کے لیے نہیں لایا جاتا..... اب یہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے نمائندے آپ چن رہے ہیں..... نہ کسی کاروبار نہ کسی کی دھونس نہ دولت ان کا ووٹ خرید سکتی ہے..... اب یہ لوگ دُور سے بیٹھ کر دوسروں کی حکومت کا نظارہ نہیں کرتے۔

منظر میں تبدیلی

سمنی اور خالد چھتینار درخت کے نیچے بیٹھے ہیں

سمنی اقبال کی نظم الاپ رہی ہے

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے مری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

فروری 1960ء

☆.....☆.....☆

شہید انتظار کر رہے ہیں

کردار

جامع مسجد

لال قلعہ

پرانا قلعہ

چاندنی چوک

مقام: دلی

وقت: 15 اگست

جامع مسجد: خاموش! مؤذن اذان دینے کھڑا ہوا ہے۔

پرانا قلعہ: ہو چکی اذان؟ (وقفہ)

جامع مسجد: دعا پڑھتی ہے۔ اے اللہ تو نے ہمیں اپنی طرف بلایا۔ ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پرانا قلعہ: مجھے تو سنائی نہیں دی۔ میں پوچھتا ہوں۔ جامع! وہ تمہارے بلال کیا ہوئے۔ جن کی گونج دم بھر کے لیے میرے ویرانوں کو بھی اللہ کے نام سے آباد کر دیتی تھی۔

جامع مسجد: میرے بلال تو اللہ رکھے، اب بھی جیتے ہیں لیکن یہ چاندنی چوک میں دن رات کا اودھم مچا رہتا ہے، اس کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتا۔

چاندنی چوک: لو بی بی..... یہ بھی خوب رہی، اپنی آئی اوروں کی لگائی خدا کے لیے میری زبان مت کھلواؤ۔

جامع مسجد: خود تو سیکڑوں برس سے میری چھاتی پر مونگ دل رہی ہو اور مجھے زبان بھی ہلانے کی اجازت نہیں۔

چاندنی چوک: اے ہے کیا چھین لیا میں نے تمہارا۔ کون سے مونگ دالے میں نے تمہاری چھاتی پر..... جب دیکھو لڑنے کو آکھڑی ہوتی ہے۔

جامع مسجد: اللہ نہ کرے۔ میں کسی سے لڑتی پھروں۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ۔ بی بی میں کیوں تیرے منہ لگی۔

چاندنی چوک: اری چل..... مصلوں میں لپیٹ کے رکھ اپنی عزت کو۔ آئی بڑی پارسا کہیں کی، میری زبان نہ کھلواؤ۔

نہیں تو ساری عزت خاک میں ملا کر رکھ دوں گی۔۔۔۔۔

لا حول ولا قوۃ۔ یہ تمہاری آپس کی جھج جھج بھی ہند بھی ہوگی یا نہیں؟

لال قلعہ:-

جب دیکھو تو تم ہیزار ہے ہم تو تنگ آ گئے اس روز کی انکا طبیعتی سے۔ ابھی قیلولہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ اُف طبیعت کس قدر مغلض ہے ہم کہتے ہیں ذرا چپ ہو جاؤ تو ہم بھی دو گھڑی کو آنکھ بھر چکا لیں۔ ہمیں ذرا عادت ہے آرام کی۔

(پرانا قلعہ ایک تلخ اور طنزیہ ہنسی ہنستا ہے)

تم ہنسے؟

لال قلعہ:-

ہم یوں ہنسے کہ تمہارے منہ سے سنا کہ تمہیں آرام کی عادت ہے۔

پرانا قلعہ:-

تو میاں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے، تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے۔ اب نہ سہی، لیکن کبھی ہمارے بھی دن ایسے تھے کہ زمین ہمارے وجود کو نگینہ سمجھتی تھی اور تاروں بھرا آسمان زمین کی قسمت پر رشک کرتا تھا۔ صاحب قرآن ثانی کا دربار معلیٰ ہے۔ دیوان عام دم بخود دوزانو بیٹھا ہے۔ دیوان خاص غلبہ ادب سے سر بسجود ہے۔ قدید ہے۔ طنطنہ ہے۔ سکوت ہے۔ اک خاموشی ہے کہ رعب شاہی کے حضور میں سرنگوں ہے۔ تحفہ ملاؤس کے ہیرے، موتی اور جواہرات قاف کی پریوں کی طرح نایاب رہے ہیں۔ چمک رہے ہیں، جگمگا رہے ہیں۔ نقیب نے نزول شاہی کا اعلان کیا۔ با ادب باعلا حفظ۔ ہوشیار۔ با ادب۔۔۔۔۔

لال قلعہ:-

”اے حضور۔ قربان جاؤں۔ کیا بات چھیڑ دی، مہابلی نے۔ لال قلعہ کا جھروکا اٹلس و کنواب سے مزین ہے۔ رعایا ہے کہ جوق در جوق آ رہی ہے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ظن سبحانی کی ایک جھلک، شہنشاہ عالم کے حضور میں عقیدت کی نظریں۔ سینے میں ارمان، ارمانوں میں شوق۔ شوق میں تڑپ۔۔۔۔۔“

چاندنی چوک:-

شہنشاہیت کے کیا کیا رنگین خواب ہماری آغوش میں بیدار ہوئے اور سو گئے بادشاہی کے کیا کیا بلند پرچم ہماری پیشانی پر لہرائے۔ نغمہ و سرود کے کیسے کیسے چشمے ہماری چھاتی سے پھوٹے۔ عشرت و نشاط کی کیا کیا راتیں ہماری آنکھوں میں جاگیں۔۔۔۔۔ ہائے، ہماری اینٹ اینٹ سے پوچھو۔ ہماری رنگوں میں تڑپتے ہوئے ڈڑے ڈڑے سے دریافت کرو جن کی روح پر ایک سو سال کی بے رنگی، بے طربئی، بے خوابی کا رنگ سانپ کے زہر کی طرح چڑھا ہوا ہے۔

لال قلعہ:-

مہابلی! قلعہ معلیٰ کی وہ پُر کیف شامیں جن کا سرور ساری ولی پر شراب کے نشے کی طرح چھا جاتا تھا۔ نایاب اور رنگ کی وہ ترنگیں بجن کی جھنکار سے میری چھاتی بھی گونج اٹھتی تھی۔ کبھی مشاعرہ کبھی نایاب اور کلام ظفر کی وہ ظفر یابی، ہائے حضور، آپ کے دم سے میری دنیا آ باؤ تھی۔ دور رویہ چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ گلی گلی میں محفلیں جبی ہوئی ہیں۔ کٹر کٹر پروا دین مل رہی ہے۔ ادھر پھنمی جان نے ہلپت کی تال پر کائنات کو نچا کے رکھ دیا۔ ادھر استاد بقر علی کے طلبوں کی تھاپ پر دل کی دنیا لرزنے لگی۔ یہاں کباب وہاں شیشہ، یہاں رنگ وہاں بو، ہائے وہ سرور رفتہ ہائے روزگار تیری شان کبریائی۔۔۔۔۔

چاندنی چوک:-

لال قلعہ :- ہماری زگ زگ میں گلاب اور موچے کے ٹھٹھک بارعطر سمندری لہروں کی طرح بہتے تھے۔ پھر بھی ہوا کی ذرا سی گرمی سے، فضا کی ذرا سی کشافت سے ہماری سیم تن، زہرہ جمال، نازک بدن، نازک خیال شہزادیوں کا دم گھٹنے لگتا تھا اور ہمارے برفانی سروخانوں کی گود میں وہ جلیں پریاں یوں کھو جاتی تھیں جیسے برف کے گالوں میں سیب کے پھول، جیسے.....

چاندنی چوک :- اگر میری روشوں پر ایک کانٹا بھی بکھرا رہ گیا تو بیگمات کو پاکی میں بیٹھے بیٹھے بھی خلش کا احساس ہوتا تھا۔ اگر میرے راستوں میں کنکر نظر آتے، تو رنگین چلمنوں کی اوٹ سے جھانکنے والی زہرہ جبینوں کے پاؤں میں موج آ جاتی تھی۔

(پرانا قلعہ زور زور سے ہنستا ہے۔ اس قدر ہنستا ہے کہ اس کی ایک دیوار کے چند پتھر لڑھک کر نیچے آ رہتے ہیں)

لال قلعہ :- یادداشت! یہ ہنسی کا کون سا خزانہ مل گیا آخر تمہیں؟
چاندنی چوک :- اے حضور! بندی کی توبہ۔ اتنی ہنسی بھی آخر کیا۔ ذرا ملاحظہ تو فرمائیے! بی بی جامع مسجد کے ماتھے پر غصے سے لاکھ تیوریاں تل کھا رہی ہیں۔

لال قلعہ :- بُرا نہ ماننا بی جامع! مجھے ذرا ہنسی ہوئی گھڑیاں یاد آ گئیں۔ آہ تمہاری آنکھ بھی تو ہمارے ہی ساتھ ساتھ کھلی تھی۔ صاحب قرآن ثانی نے کس پیار اور شوق سے ہمیں پالا پوسا۔ تمہارے ہاں تو آج بھی پانچ وقت کے نمازی جمع ہو جاتے ہیں لیکن ہماری دنیا میں صرف بھیا نک ویرانیاں ہیں۔ اللہ تمہیں نیکی دے۔ کچھ کم ایک سو سال سے ہم نیم زندہ لاش کی طرح سسک رہے ہیں۔ نہ تو سر شام ہمارے سر پر چراغاں کا تاج چڑھتا ہے۔ نہ صبح سویرے طرب نواز حنائی انگلیاں، ستار کی دھن چھیڑ کر ہمیں خواب استراحت سے بیدار کرتی ہیں، نہ ہمارے ایوانوں میں ماہ وا نجم کے دربار منعقد ہوتے ہیں۔ نہ ہمارے شبستانوں میں حُسن و سرود کی محفل جمتی ہے۔ چاندنی! ہم جیتے جی بھی مُردہ ہیں۔ ہم کیوں نہ ایک روز زمین سے سر پھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو جائیں گے۔

چاندنی چوک :- ایسا نہ کہیے مہابلی! ایسی بے آ سی بھی آخر کیا۔ دن تو کبھی کے پھرتے ہیں۔ ایک ذرا میری ہی طرف دیکھیے! کیا کیا زمانے دیکھے تھے میں نے۔ تیموری اور نادر شاہی قتل عام، خونریز حملے، ہولناک لڑائیاں، مہیب عذاب آہ، میرا ذرہ ذرہ گرم گرم خون کے دھاروں پر پروان چڑھا ہے۔ اگر کچھ روز مجھے یہ لال دودھ نہ ملے، تو میری چھاتی کی رگیں سوکھ کر کاٹا ہو جاتی ہیں۔ حضور مہابلی کی طرح میں بھی ایک سو برس سے پیاسی تڑپ رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ سوکھ رہی تھی۔ لیکن نصیب بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ حضور ابھی اگلے دن کی بات ہے کہ میری چھاتی پر خون کی وہ وہ ہولی کھیلی گئی، لہو کے وہ وہ چھینٹے اڑے کہ کیا کہوں۔ بس مزہ آ گیا۔ تیموری سواروں اور نادر شاہی بادل چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے۔ وہ پیاس جو برسہا برس سے میرے گلے میں کانٹے کی طرح انگی ہوئی تھی بجھ گئی اور ساتھ ہی مہابلی کی مستک کا جھنڈا بھی تو بدل گیا ہے۔ کون جانتا ہے کہ اب حضور کے دن بھی کروٹ لیں۔ بابا بابا! اس پچارے کے دن کیا کروٹ لیں۔ خون، خنجر، لاشیں، تیر، تفنگ..... یہ بہادروں کے زیور پرانا قلعہ :-

ہیں۔ لال قلعہ غریب یہ زیور کیا پہچانے اس کے ہاتھ میں تو ستار دو۔ رُباب دو۔ سارنگی دو۔ وہ توپ کے گولے نہیں جانتا۔ اسے طبلے کی تھاپ سناؤ۔ وہ گرم گرم خون کی لذت سے نا آشنا ہے۔ اسے عنابی شراب کے جام پلاؤ.....

لال قلعہ :-

دیکھو بھائی! تم ہماری عزت پر حملہ کر رہے ہو۔

پرانا قلعہ :-

کاش تمہارے پاس کچھ عزت ہوتی تو میں اس پر حملہ بھی کرتا۔ تم اپنے آپ کو لال قلعہ کہتے ہو۔ میں تمہیں لال پری سمجھتا ہوں۔ تم میدان کارزار میں لڑنے والے سپاہی نہیں ہو۔ تم ناچ اور رنگ کی محفلوں میں تھرکنے والے جام اور سبکی مجلسوں میں بنکارنے والے مدہوش، بے ہوش، بے جس بہروپیے ہو۔ تم قلعہ نہیں ہو۔ تم قلعے کے نام پر کلنگ کا ٹیکہ ہو.....

لال قلعہ :-

دیکھو! ہم ہمیشہ سے تمہیں بڑا بھائی کہتے آئے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ تم ہماری نوازشوں کا یہ بدلہ دو گے لیکن خدا کی شان ہے کہ ٹوٹی ہوئی قبریں اور پامال کھنڈر بھی ہمارے منہ لگنے لگے؟

پرانا قلعہ :-

میں ایک پرانا اور پامال کھنڈر تو ضرور ہوں، لیکن مجھے اپنی پامالی اور ویرانی پر بھی فخر ہے۔ میرے سینے میں ایک کشادہ اور بہادر دل ہے۔

لال قلعہ :-

کشادگی تو میرے قدموں میں بہنے والی جمنائے کناروں میں بھی ہے۔

پرانا قلعہ :-

بے فیض گر ہے چشمہ آب بقا تو کیا..... آہ، جب چاندنی چوک کی پیاس بجھانے کے لیے دلی کے گلی کوچوں میں خون کے چشمے پھوٹنے لگے۔ تو سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی پریشان مخلوق کے سیلاب کو نہ تو جمنائے کنارے سنبھال سکے نہ تمہارے منقش و مرصع ایوان ہی روک سکے۔

لال قلعہ :-

پھر، تم نے ان کے لیے کون سے مَرَمَر کے محل بنا رکھے تھے؟ ساری ساری رات وہ تمہارے کھلے میدانوں میں پڑے ٹھہرتے رہتے تھے۔ ٹخنوں ٹخنوں غلاظت۔ گھٹنوں گھٹنوں کوڑا۔ نہ پانی، نہ ساہبان، نہ چھت۔

پرانا قلعہ :-

لیکن میری کہنہ اور خمیدہ دیواریں ان کے سامنے فولاد کی ڈھال بن کر کھڑی ہو گئیں۔ میرا پتھر پتھر تلوار بن کر بیدار ہو گیا۔ باہری جلال کی قسم، اگر میں چاہتا تو میرے بھنڈر آگ اور آندھی بن کر دُنیا پر چھا جاتے اور اس ٹوٹنے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیتے، جو تمہارے جیسے عشرت کدوں کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔

لال قلعہ :-

ہائے رے جوش! چھا گئے تم آندھی اور آگ بن کر!

پرانا قلعہ :-

میری آنکھ نے ہزار ہا سال کے مہیب اور پُر عظمت انقلاب دیکھے ہیں لیکن میں نے بربریت اور بہمیت کا وہ منظر نہیں دیکھا، جو تمہارے سامنے دن رات وقوع پذیر ہوتا رہا اور تم بیٹھے دیکھا کیے۔ جیسے وہ خون جو دلی کے گلی کوچوں میں بدرو کے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ تمہاری اپنی رگوں کا خون نہیں تھا، کسی غیر کا خون تھا؟

(لال قلعہ ذرا خفت سے کھانسنے کی کوشش کرتا ہے)

پرانا قلعہ :-

اور خون کے اس طوفان میں غلامی کے طوق در طوق تمہاری گردن میں پیوست ہوتے گئے اور تم نے

کروٹ تک نہ لی۔ کھانا ہار کی قسم، میں نے توپوں کے گولے اور زہر آلود تیر کھا کر کبھی آف تک نہیں کی
لیکن غلامی کے پرچم کا ذرا سا بوجھ میری کمر توڑ دیتا ہے۔ اس کی ایک ایک پھریری مجھے یوں لگتی ہے
جیسے بڑے بڑے قوی وکیل بدست ہاتھی میری چھاتی پر زور زور سے گزریں مار رہے ہوں۔
لیکن بہادر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ میں کبھی نہیں مروں گا۔ میرا وجود لاٹھانی ہے۔ میرے ہاتھی لاٹھانی
ہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔ وہ آتے رہیں گے۔ وہ شمشیر و سناں والے۔ وہ پہاڑوں کا سینہ چیرنے
والے۔ وہ دریاؤں اور صحراؤں کی وسعتیں نگل جانے والے۔ وہ ابدی، ازلی غیر فانی باہر۔ نگر
سے دور کوہساروں میں۔ خیال سے بھی دور ریگستانوں میں۔ میری ہڈیاں ان کا انتظار کر رہی
ہیں۔۔۔۔۔

جامع مسجد:- خاموش! اذان ہو رہی ہے۔

چاندنی چوک:- وہ مارا!

(وقفہ)

پرانا قلعہ:- ہو چکی اذان جامع؟ مجھے تو سنائی نہیں دی۔

جامع مسجد:- انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پرانا قلعہ:- کیا ہوا؟

جامع مسجد:- مؤذن شہید ہو گیا۔

پرانا قلعہ:- وہ کیسے؟

جامع مسجد:- وہ میرے مغربی منارے پر اذان دینے کھڑا ہوا تھا۔ جونہی اس نے اللہ اکبر کہہ کے ہاتھ اٹھائے۔

چاندنی چوک کی طرف سے ایک گولی آئی اور سن سے اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

پرانا قلعہ:- انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جامع مسجد:- شہید کی لاش سیڑھیوں پر بے گور و کفن پڑی ہے کوئی اٹھانے والا نہیں۔

پرانا قلعہ:- بس میری بہن وہ آتے ہی ہوں گے۔ مایوس نہ ہو میرے کان ان کے پروں کی سنناٹ سن رہے

ہیں۔ میری آنکھیں ان کے نورانی جسموں کو فوج و رفوج لشکر در لشکر آتا دیکھ رہی ہیں۔ اُن کے پروں

کا سایہ اس کے سر پر ہوگا۔ وہ اس بے گور و کفن شہید کی لاش کو کاندھوں پر اٹھا کر جنت الفردوس میں

لے جائیں گے اور اس کی اذان کی آوازیں وہاں بھی اسی طرح گونجیں گی۔۔۔۔۔

ہفت روزہ "نوائے وقت" لاہور، 7 ستمبر 1948ء

انتظاریہ

یونیورسل یوتھ ڈے پر خطاب

ایک تو آج کی تقریب یونیورسل یوتھ ڈے پر ہے جسے یونائیٹڈ نیشن کے زیر اہتمام منایا جاتا ہے یو این او سے ساری دنیا عموماً اور کشمیر، فلسطین، کاکو اورویت نام خصوصاً بی ایچ ای طرح واقف ہیں۔ اس ادارے میں تقریر کا جادو برملا سرچہ کر پڑتا ہے۔ تحریر کا جوار بھاتا ہے سے بڑے بین الاقوامی مسئلے کو بڑی شائستگی سے فرق سے تاب کر دیتا ہے اور جب کوئی زبردست انجمن والا کسی غریب کی بھینس کو زبردستی ہانک کر لے جائے، تو یو این او کی رگ انصاف بے اختیار پھڑک اٹھتی ہے اور ساری دنیا کا ضمیر جاگ کر ایک ایسی سینر فاؤنڈیشن کھینچ دیتا ہے، کہ وہ بھاری بھینس ہمیشہ انجمن والے کے پاس ہی رہے اور پھر کبھی اپنے اصلی مقام پر واپس نہ آ سکے۔

جب ایسا پر عظمت، باہمیت اور انصاف پرور ادارہ ہر سال بڑے اہتمام سے ساری دنیا میں یونیورسل یوتھ ڈے مناتا ہے، تو بھارے یوتھ کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ سوال اٹھائے کہ اگر یوتھ پر ابلم واقعی کسی چیز کا نام ہے، تو اس عجیب و غریب پرندے کا گھونسلہ آخر واقع کہاں ہے؟

یونائیٹڈ نیشنز کا ایک ادبی، ثقافتی اور سائنسی ادارہ ہے جسے یونیسکو کہتے ہیں۔ اس کا ایک چھوٹا سا ایگزیکٹو بورڈ ہے جسے دنیا کے سارے ملک مل کر منتخب کرتے ہیں۔ عموماً اس میں علم و ادب، سائنس و ثقافت اور اہل دانش کے ایسے ایسے مشاہیر انتخاب کیے جاتے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنا تو دور کنار بلکہ جنہیں دوری دور سے ایک نظر دیکھ لینا بھی قلب نظر کے لیے باعث افتخار ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے، کہ پانچ برس پہلے مجھے بھی اس ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یونیسکو کے اس عجیب حسن انتخاب کی وجہ محض میری کم مائیگی اور بے علمی تھی۔

بات یہ ہوئی، کہ چند برس پیشتر یونیسکو نے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد یہ تھا کہ نئی نسل میں جو نیکان، تشدد اور جہی ازم کا رجحان پایا جاتا ہے، اس کا حل تلاش کیا جائے۔ اس کانفرنس میں جو ڈیٹیکٹ شریک ہوئے، ان میں سے اکثریت کی عمر ستر سال سے اوپر تھی۔ جب جلسہ شروع ہوا تو میں نے یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا کہ یہ کانفرنس بے معنی اور بے مقصد ہے، کیونکہ اس نے پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ نئی نسل دنیا کے لیے وبال جان بنی ہوئی ہے، اور اسے ٹھیک کرنا بڑے بڑھوں کا فرض منہی ہے۔ میں نے مزید عرض کیا کہ اس کانفرنس کا موضوع یہ ہونا چاہیے

کہ کیا نئی نسل دنیا کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے یا پرانی نسل نئی نسل کے لیے ایک پرابلم ہے؟
اس بات پر بڑی لے دے ہوئی اور کانفرنس درہم برہم ہونے کو ہی تھی کہ چلی کے عظیم المرتبت شاعر پابلو نرودا نے
کھڑے ہو کر میری پرزور تائید کی۔ ان کی اپنی عمر ستر برس کے قریب تھی۔ وہ عصر حاضر کے عظیم ترین شاعروں اور
دانشوروں میں سے تھے۔ انہیں شاعری کا نوبل پرائز ملا ہوا تھا اور ابھی حال ہی میں چلی کے انقلاب کے دوران ان کا
انتقال بڑی کمپری کی حالت میں ہوا ہے۔ پابلو نرودا نے یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ میں میرے الیکشن کے لیے بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا اور اس طرح ایک بڑے آدمی کی حمایت سے میرے جیسے چھوٹے آدمی کو دنیا کے عظیم علمی اور ثقافتی ادارے
تک رسائی حاصل ہو گئی۔

اب ہم ہر سال یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور دنیا بھر کے لیے یوتھ پروگرام بنانے
پر غور و خوض کرتے ہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت و تلقین کا فریضہ
تو پرانی نسل انجام دیتی ہے، لیکن عمل کی توقع صرف نئی نسل سے رکھی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں آج کا نوجوان ذہنی، روحانی اور جسمانی غصے کی بھٹی میں جل رہا ہے۔ وہ ایک
ایسے معاشرے میں سانس لے رہا ہے جس کا سب سے بڑا طرہ امتیاز ریا کاری ہے۔ آج کل کی دنیا دوغلی اقدار کا
عبرت ناک مجسمہ ہے۔ امن کے نام پر جنگ، صلح کی آڑ میں چمکے سازی، تعاون کے پردے میں استحصال، تعمیر کے پردے
میں تخریب کاری اور اخلاق کے نام پر بے حیائی ساری دنیا میں ذاتی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر روزمرہ کا معمول بنا ہوا
ہے۔ مسئلہ فلسطین کا ہو یا کشمیر کا یا مشرقی پاکستان کا..... دنیا کی اکثریت کہتی کچھ ہے اور کرتی کچھ ہے۔ انسانی قول اور
فعل، اعلان اور عمل کے درمیان یہ تضاد اور تضادم صرف ایک چیز کو جنم دیتا ہے اور وہ ہے معاشرے سے بغاوت۔ آج کا
نوجوان ہم پرانے لوگوں کی نسبت زیادہ باشعور، زیادہ راست گو، زیادہ بے باک اور زیادہ حساس ہے۔ اس لیے اپنے
ماحول اور معاشرے کے خلاف اس کا رد عمل بھی نہایت شدید ہوتا ہے۔

پچھلے زمانے میں جب کچھ صاحب کردار اور بلند حوصلہ نوجوان اپنے معاشرے کی بے راہ روی اور کثافت کے
خلاف علم بغاوت بلند کرتے تھے، تو وہ اپنے ماحول سے بھاگ کر رہنمائی کی تلاش میں اپنی روح کی تنہائیوں میں پناہ
لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بنی نوع انسان کے لیے زندگی کے نئے نئے صحیفے لایا کرتے تھے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کی ظالم، جابر، جاہل، سرکش اور دغا باز قوم کی بربریت کے خلاف علم
جہاد اٹھایا، تو آپ کی ساری جوانی صحرا نوردی اور دشت پیمائی میں اس قدر صرف ہو گئی کہ آپ کے بال سفید ہو گئے اور
آپ کی ہڈیاں بڑھاپے کے درد سے چیخ چیخ گئیں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے زوال عصمت کے ایک حادثے کے خلاف بغاوت کی، تو آپ کا سارا شباب
ایک تنگ و تاریک زنداں خانے کی نذر ہو گیا۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوپر اٹھائے گئے تو آپ کی عمر فقط 33 برس کی تھی۔
جب ہمارے رسول کریم خاتم النبیین ﷺ نے اپنے زمانے کے دور جاہلیت کے خلاف بغاوت فرمائی، تو حضور کی
ساری جوانی غار حرا کی بے آب و گیاہ تنہائی میں بسر ہوئی۔

آج کی دنیا کا نو جوان بھی انسانیت کے ان دسکتے ہوئے نگینوں کی طرح اپنے معاشرے کی ذوقی ہوئی اقدار کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ لیکن اپنے ماحول کی کشمکشوں سے بھاگ کر وہ روح کے پاکیزہ ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف پرواز نہیں کرتا، بلکہ مادی دنیا کی تنگ و تاریک گلیوں میں راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی جوانی کا خون جلا کر علم و عرفان کی نئی شمعیں روشن نہیں کرتا، بلکہ بجھتے ہوئے پرانے چراغوں کو اور بھی تیزی سے بجھا دینے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ وہ ماحول اور معاشرے کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دے کر تازہ بستیاں آباد نہیں کرتا، بلکہ اپنے غصے کی کدال سے انہیں مسمار کر دینے کے درپے ہو جاتا ہے بغاوت اور جہاد کا یہ جذبہ کسی وقت انسانیت کے تاج پر پیغمبری اور اولیائی کے تاج سجایا کرتا تھا۔ لیکن آج یہی جذبہ کبھی تخریب اور تشدد کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ کبھی لی ایس ڈی کا روپ دھارتا ہے۔ کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، کجکامی اور ناراضگی کے ظلمت کدے ایجاد کرتا ہے۔

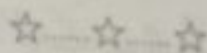
سرکشی، بے باکی اور وارفتگی نو جوانوں کا حق ہے اور جو ہر بھی۔ لیکن اگر اس کی سمت یعنی ڈائریکشن راست نہ ہو، تو یہ چراغ مصطفوی نہیں بنتی بلکہ محض ایک رسم چنگیزی بن کے رہ جاتی ہے۔ اللہ کے فضل سے اپنے پاکستان میں سمتوں کی کمی نہیں ہے۔ یہاں پر دوا کی ٹکیوں میں چاک سفوف، گھی میں گندہ بیروزہ، چائے میں مردار چمڑے کے ریزے، پیسی ہوئی مریچوں میں اینٹوں کا برادہ، گندم میں بھس، مٹی کے دیے میں تیل کی جگہ پانی، کسان کے پسینے میں زہر، بندہ مزدور کے خون میں استحصال کا تلخ بے اور ایمان کے چشمے میں قحط مصلحتوں کی غلاظت ملانے والوں کی ریل پیل ہے۔ لیکن آج تک نو جوانوں کی کسی تنظیم یا فرد نے اس کے خلاف نہ کوئی جلسہ کیا ہے نہ جلوس نکالے ہیں۔ اقبال کو گلہ تھا، کہ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔ پاکستان کو بجا طور پر یہ گلہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے نو جوانوں کا خون جب جوش مارتا ہے، تو کہیں بسیں جلائی جاتی ہیں، جن میں بیٹھ کر غریب لوگ اپنی روزی کمانے جاتے ہیں، کہیں عمارتوں اور لائبریریوں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے اور کہیں سکولوں اور کالجوں میں ہڑتال کر کے علم و ہنر کے راستے مسدود کر دیے جاتے ہیں۔

ہمارے اسی وطن عزیز میں دانشوری کا لبادہ اوڑھ کر ایسے ایسے سانپ بھی کنڈلی مارے بیٹھے ہیں، جو پاکستان کی بنیاد اور سالمیت کو کسی طرح تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کے ذہن اور جسم کی پرورش بیرون ملک سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک آنکھ سے ہندوستان میں صرف ایک، اور دوسری آنکھ سے پاکستان میں چار چار قومیتیں دیکھتے ہیں۔ ان کا ذہن کبھی برصغیر میں کنفیڈریشن کے خواب دیکھتا ہے اور ان کے ہاتھ ہماری سرحدوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ قائم کرنے کے لیے کھجلاتے رہتے ہیں۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا، کہ ہمارا نو جوان ذرا اس صورتحال کا نوٹس بھی لے، محبت وطن تو ہم سب ہیں، لیکن ہمیں حب الوطنی کے جذبے کی نہیں بلکہ حب الوطنی کے جنون کی ضرورت ہے۔ جو غریب قوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ۱۲۵ کروڑ سالانہ سے زیادہ رقم صرف کر رہی ہے، اسے یہ حق بھی ضرور پہنچتا ہے کہ آپ صرف بسیں جلانے اور پتھراؤ کرنے کے لیے ہی جلسے اور جلوس نہ کریں، بلکہ ان نظریاتی، تخیلاتی، ذہنی اور روحانی حشرات الارض کا قلع قمع بھی کریں جو اس پاک سرزمین کی بنیادوں کو اندرونی اور بیرونی اثرات کے تحت اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرنے میں ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا اتنا زیادہ وقت لیا۔ میرا مقصد نہ وعظ کرنا تھا، نہ نصیحت۔ لیکن آج میرا دل ضرور یہ چاہتا تھا کہ میں یہ چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی ایجوکیشن سیکرٹری

کی حیثیت سے مجھے دوبارہ ایسا موقع نہ ملے گا کہ میں آپ سے اس قسم کی باتیں کر سکوں۔ کچھ عرصہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا نے مجھے ایک شدید ذاتی آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے پیش نظر میں نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے کوئی ایسی خدمت سونپ دیں جس میں میں اپنی ذاتی آزمائش کے تقاضوں کو بھی کسی قدر پورا کرنے کا حق ادا کر سکوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں وزیراعظم کا شکریہ ادا کر سکوں کہ انہوں نے ازراہ شفقت میری درخواست قبول فرمائی ہے۔ چار برس پہلے جب میں یحییٰ خاں کے سامنے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں مستعفی ہو کر جلاوطن ہو گیا تھا، تو بھٹو صاحب ہی نے مجھے ایک بار پھر وزارت تعلیم کی خدمت کا موقع عطا فرمایا اور وہ بھی اپنی کابینہ کے ایک ایسے جواں سال، جواں فکر اور قابل وزیر مسٹر عبداللطیف چیرزادہ کے تحت جن کے حسن کارکردگی کا سکھ تعلیم، قانون، پارلیمانی امور، بین الصوبائی روابط اور آئین سازی کے ہر شعبے میں مسلمہ طور پر بیٹھا ہوا ہے۔ اب میری اپنی مجبوریوں کے پیش نظر انہوں نے پھر میری ذاتی آزمائش کے دور میں میری دیکھیری فرمائی ہے۔ خدا انہیں خوش رکھے اور پاکستان کی تعمیر و ترقی میں ان کی مساعی جلیلہ کو کامیاب فرمائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

(غیر مطبوعہ)



شملہ کانفرنس

(ایک امریکن اخباری نمائندے کا رپورٹاژ)

25 جون 1945ء

دن کے گیارہ بجے ہیں۔ وائسریگل لاج کے باہر سڑک پر دو رویہ منتظر انسان قطار در قطار کھڑے ہیں۔ شملہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس صحت افزا اور خوشگوار مقام پر ہندوستان کی سیاست کے بہت سے اہم باب لکھے گئے ہیں۔ آج بھی تاریخ ایک نازک کروٹ لینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ اخباری نمائندوں اور نامہ نگاروں کو اندر لان میں ایک طرف جمع کیا جا رہا ہے۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد تالیوں یا نعروں کی آواز گونجتی ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ لیڈر صاحبان تشریف لارہے ہیں۔ وائسرائے سیکریٹری سر ایون جیکز ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے اور انہیں لان کے اس حصے میں لے جاتا ہے جس کے نزدیک اخباری نمائندوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ وائسریگل لاج کے احاطے کے اندر اور باہر چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج کا پہرہ ہے۔ سنگینیوں، راکٹوں اور مشین گنوں کے سائے ہیں آزادی کی گفت و شنید کا تصور بڑا مہمل نظر آتا ہے۔ لیکن میں سگریٹ پی پی کر اپنی اس جتنی الجھن کو چھپانے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ میری پریشانی اس ماحول میں بڑی ناگوار گزرے گی۔ ہندوستانی نامہ نگار بڑے جوش و خروش میں ہیں۔ لیکن انگریز اخباری نمائندے افسردہ نظر آ رہے ہیں اس کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے کہ اگر وہ احساسِ فرض سے مجبور نہ ہوتے، تو اس منحوس موقع پر آنے سے ضرور گریز کرتے۔ میرے ساتھ ایک اور امریکی نامہ نگار ہے۔ ہم دونوں اس گروہ میں اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ ہم میں نہ ہندوستانی نامہ نگاروں ایسا جوش و خروش ہے، نہ انگریز نامہ نگاروں ایسی افسردگی۔ میرا ساتھی میرے کان میں کہہ رہا ہے کہ شملہ کانفرنس کی سچی خبریں صرف امریکی اخباروں ہی میں چھپ سکیں گی۔ کیونکہ ہمارے ڈپٹی ایچ ایچ اس کانفرنس کی صحیح ترجمانی کریں گے۔ ہمیں ہندوستانیوں سے مخاصمت ہے نہ انگریزوں سے چڑ۔ ان میں سے جو بھی اس برصغیر پر حکمرانی کرے ہم اس کی خیرنگالی کے طلبگار ہیں۔ امریکہ منڈیاں چاہتا ہے ہم سیاست میں دخل دینا نہیں چاہتے لیکن ہمارا ڈالر..... میرا ساتھی اپنی دھن میں امریکہ کی خارجہ پالیسی پر تبصرہ کر رہا ہے۔ وہ آزادی، سیاست اور حکومت کو ڈالروں کے ترازو میں تول رہا ہے۔ وہ اس عجیب و غریب ماحول کی لافانی شعریت کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔ یہ سیاست یا حکومت یا ڈالروں پر بحث کرنے کا وقت نہیں۔ بلکہ ان تاریخی لمحات کی روح کو جذب کرنے کا موقع ہے جو اس وقت پگڑی کی ہر ٹک ٹک کے ساتھ

ہمارے گرد و پیش جنم لے رہے ہیں۔ وائسریگل لاج کے باہر ہندوستان کے طویل و عریض برصغیر میں مذہبوں کی طرح پھیلے ہوئے بھوکے، ننگے، لنگڑے، لو لے انسان، وائسریگل کے اندر لان پر جمع ہوتے ہوئے لیڈر..... ان کے درمیان وائسریگل لاج کی چار دیواری کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے مسلح سپاہی، ہندو قس، سنگتینس، مشین گنیں..... بس میں اپنے ساتھی کے تبصرے کو خاموشی سے سنتا رہتا ہوں۔ میرے لیے نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔ اگر میں اسے لوک دوں۔ گو خواہ مخواہ بحث میں الجھنا پڑے گا اور میں اس وقت کسی قسم کی بحث میں الجھ کر اپنے احساسات کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتا۔

جب کوئی لیڈر وائسریگل لاج کے احاطے میں داخل ہوتا ہے، تو کیمرے اٹھتے ہیں اور آنے والے کی ہر زاویے اور ہر پہلو سے بے شمار تصویریں لے لی جاتی ہیں۔ لیکن جب مسٹر محمد علی جناح آتے ہیں، تو بہت کم کیمرے کو جنبش ہوتی ہے۔ غیر ملکی نامہ نگاروں کو چھوڑ کر صرف تین ہندوستانی نامہ نگار اس کی تصویریں لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک پارسی ہے اور دو مسلمان ہیں۔ باقی نامہ نگار جو ہندو ہیں چپ چاپ اپنے کیمرے کو بند کر لیتے ہیں۔

میرا ساتھی کہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں برہمنوں پر اگر اتفاق سے کسی مسلمان کا سایہ پڑ جائے، تو وہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ یہ نامہ نگار شاید برہمن ہیں۔ مسٹر جناح کی تصویر لینے سے ان کے کیمرے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ انکشاف ہے۔ میں آج ہی یہ کہانی اپنے اختیار کو بھیجوں گا۔

ہر چند میں اپنی ساتھی کے ساتھ کسی بحث میں الجھنے سے گریز کرتا ہوں۔ پھر بھی اس کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ لیکن یہ ہنسنے کا مقام نہیں۔ کیونکہ مسٹر جناح کی آمد پر لیڈروں اور نامہ نگاروں پر دم بھر کے لیے خاموشی کا عالم چھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ ہاتھ ملانے کے لیے ان کی طرف بڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ بے اعتنائی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، لیکن کر نہیں پاتے۔ کیونکہ ان کی نگاہیں بار بار اس دبلے پتلے انسان کی طرف اٹھنے پر مصر ہیں، جس کے چہرے کی متانت اور لباس کی نفاست سارے مجمع پر بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔

لیڈروں کے مجمع میں چند چیزیں بہت نمایاں ہیں۔ ماسٹر تارا سنگھ کی نیلی اکالی پگڑی اور تین فٹ لمبی کرپان۔ حضرت حیات ٹوانہ کا مورچھل طرہ۔ چکر اور تی راجکو پال اچار یہ کا فارغ البال سر اور سیاہ چشمہ۔ پنڈت پنت کی دھوتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سفید فرنج کٹ داڑھی.....

میرے ساتھی کا خیال ہے کہ اگر یہ ٹیم نیویارک کے کسی فینسی ڈریس ہال کے مقابلے میں شریک ہو۔ تو اسے آسانی سے اول درجے کے انعامات مل سکتے ہیں۔

مسٹر جناح کی آمد کے کچھ دیر بعد لارڈ اور لیڈی ویول اپنے سیکرٹری کے ساتھ لان میں تشریف لاتے ہیں۔ لارڈ ویول نے ہلکا گرے سوٹ پہنا ہوا ہے اور کوٹ کے کالر میں سرخ گلاب کا پھول لگایا ہوا ہے۔ سب سے ہاتھ ملانے کے بعد لیڈی ویول جرنلسٹوں کی ڈیوٹی کے لیے ہماری طرف رجوع فرماتی ہیں۔ لارڈ ویول لیڈروں کے ساتھ کانفرنس روم چلے جاتے ہیں۔ کانفرنس روم کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور دو مسلح سپاہی اس کے سامنے سنگین لے کر ایستادہ ہو جاتے ہیں۔

کانفرنس ناکام رہی۔ ہندوستانی جرنلسٹ جو کئی دنوں سے خراماں خراماں وائسریگیل لاج، آئرس ڈیل اور سیسل ہوٹل کا طواف کر رہے تھے۔ اب پڑمردہ ہیں۔ ان کی جگہ کچھ انگریز نامہ نگار بڑے ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ ایمپائر کی جڑ کاٹنے کے لیے جو کلہاڑا اٹھایا تھا۔ اس کی ضرب فی الحال ملتوی ہو گئی ہے۔ میں اور میرا دوسرا امریکی ساتھی ٹائپ رائٹروں کے سامنے بیٹھے اپنے اپنے اخباروں کے لیے ڈیپٹیج تیار کر رہے ہیں۔ چاروں طرف سے دھڑا دھڑا بیانات موصول ہو رہے ہیں اس ملک میں بچے اور بیانات یکساں رفتار سے پیدا ہوتے ہیں۔

لارڈ ویول نے کہا کہ ”اگر یہ کانفرنس کامیاب ہوتی تو اس کی کامیابی کا سہرا میرے سر ہوتا۔ اب میں اس کی ناکامی کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہرانا نہیں چاہتا۔“

پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان دیا۔ ”سیاست کو مذہب کی آنکھ سے دیکھنا زمانہ جاہلیت کی روش ہے۔ مسلم لیگ کی سیاست پر قرون وسطیٰ کے فرسودہ مذہبی تخیلات چھائے ہوئے ہیں۔ اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں، بلکہ یہ ترقی پسند اور رجعت پسند عناصر کی جنگ ہے۔“

ماسٹر تارا سنگھ نے فرمایا۔ ”پاکستان کا معاملہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہی نہیں۔ بلکہ اس کا اصلی تعلق سکھوں سے ہے۔ جس طرح مسلمان ہندوؤں کے زیر نگین رہنے پر رضا مند نہیں۔ اسی طرح سکھ بھی مسلمانوں کی اکثریت کی دھونس ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

ہندو مہاسبھا کے صدر ویر ساور کر نے بیان دیا۔ ”کسی غیبی طاقت نے کانگریسیوں کا وہ ہاتھ روک دیا ہے، جس سے وہ ہندو قوم اور مذہب کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔“

قادانی جماعت کے امام مرزا بشیر الدین محمود نے پیشین گوئی کی۔ لارڈ ویول کی پیشکش ایک خدائی نعمت ہے۔ اسے ٹھکرانا ہندوستان کے لیے بڑی بد نصیبی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔“

مسٹر جناح نے کہا۔ ”ان تجاویز میں ہمارے لیے ایک جال بچھایا گیا تھا۔ ہندو کانگریس اور ہندوستان کی جغرافیائی یکجہتی کے نئے مبلغ لارڈ ویول نے مل کر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیں۔ ہمارا نصب العین پاکستان ہے۔ مسلمان ایک فرقہ نہیں، بلکہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک ان واضح حقیقتوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہم کسی عبوری تجویز کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

بیانات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ میرے ہاتھوں میں ان سب کو ٹائپ کرنے کی سکت نہیں۔ ہاں، اب رفتہ رفتہ شملہ کی زندگی اپنی اصلی سطح پر واپس آ رہی ہے۔ مال روڈ کی چند دکانوں پر جو کانگریس کے ترنگے جھنڈے لہرانے لگے تھے، اب پھر اپنی الماریوں میں مقفل ہو گئے ہیں۔ مسز رونا چرن داس نے کھدر کی ساڑھی چھوڑ کر فی الحال دوبارہ ریشم کا لباس اختیار کر لیا ہے اور آج صبح سے وہ ”ڈیل“ میں مہاتما گاندھی کے درشن کی جگہ پھر حسب معمول رائڈنگ پر جانے لگی ہے۔ سیسل ہوٹل میں میرے ہمسائے نواب شوق علی بھی اب اپنا لائحہ عمل از سر نو مرتب کر رہے ہیں۔

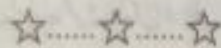
یہ نواب شوق علی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ پانچ فٹ دواچ طول، پونے چار فٹ عرض، پیٹ کا قطر اس سے بھی زیادہ ٹانگیں چھوٹی۔ سر بڑا، جو گردن کی جگہ براہ راست کندھوں پر تریبوز کی طرح ٹکا ہوا ہے۔ آنکھیں اوور کوٹ کے بٹنوں کی طرح بڑی بڑی اور گول گول جو باتیں کرتے وقت الفاظ کے زیر و بم کے ساتھ نیچے اوپر، دائیں بائیں برابر۔

گھومتی رہتی ہیں۔ نواب شوق علی سوٹ پہنتے ہیں اور کبھی کبھی مال روڈ پر مٹر گشتی کے وقت کیلی فورنیا کے امیر زمینداروں کے طرز کی سفید سٹراہیٹ بھی زیب سرفر ماتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کمرے میں دو بڑے بڑے آہنی ٹرک ہیں۔ ایک میں کھدر کے کرتوں، سفید دھوتیوں، چیلوں اور گاندھی ٹوپوں کا اسٹاک ہے۔ دوسرے میں شلواریں، شیر و انیاں ہیں۔ آج صبح لارڈ ویول کے بیان کے بعد یہ دونوں صندوق فی الحال بے کار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کا ملازم انہیں ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر واپس بک کر دیتا ہے۔ اب نواب شوق علی کے پاس فقط ان کا سفری وارڈروب رہ جاتا ہے جس میں تیس سوٹ، پچھتر نکلایاں، ساٹھ قمیص اور درجن بھر ڈنر جیکٹ ہیں۔ مجھے ان تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وائسرائے کے بیان کے بعد نواب شوق علی بیرونی ممالک کے اخباری نمائندوں کو اپنے کمرے میں کاک ٹیل پارٹی پر بلاتے ہیں اور وکی، جن اور رم کی آمیزش سے کوئی ڈیڑھ درجن کاک ٹیل نوش فرما کر اپنی آبائی جاگیر کی آمدنی اور وارڈروب میں اپنے کپڑوں کی تعداد اور اقسام سے لے کر اپنی دائمی قبض کی شکایت اور ہر صبح انہما کی ضرورت پر اس فصاحت اور بلاغت سے روشنی ڈالتے ہیں کہ اسے فراموش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

شملہ کی پہاڑیوں پر جس نئی صبح کا انتظار تھا، وہ سحر طلوع نہیں ہوتی۔ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، لیاقت علی خاں یکے بعد دیگرے رخصت ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی سیاست کو سات ہزار فٹ کی بلندی پر اس نہیں آتی۔ اس کا اصلی مقام ان وسیع و عریض میدانوں میں ہے جہاں اس وقت 115 ڈگری فارن ہائیٹ کا درجہ حرارت ہے اور خربوزے کے چھلوں، بسی ہوئی ترکاریوں اور برسر عام سڑتے ہوئے پھل و براز پر بھنھناتی ہوئی کھیاں پیضے کے جراثیم پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔

رات کے نو بجے آل انڈیا ریڈیو خبریں نشر کر رہا ہے..... پر تاپ گڑھ میں پیضے سے گیارہ انسان ہلاک ہو گئے..... صوبہ بہار کے ایک گاؤں نو گچھیا میں گائے ذبح کرنے پر فساد ہو گیا۔ جس میں دو ہندو اور تیرہ مسلمان مارے گئے۔ میرا ساتھی کہتا ہے، کہ اس ملک میں جب وبا پھوٹی ہے تو انسان مرتے ہیں اور جب فساد ہو تو ہندو یا مسلمان ہلاک ہوتے ہیں۔ وہ اس انکشاف پر بے حد مسرور ہے اور اپنے اخبار کے لیے ایک دلچسپ ستوری تیار کر رہا ہے۔

ماہنامہ ”ادب“ کراچی، خاص نمبر 1951ء







”شہاب نگر“ بنیادی طور پر قدرت اللہ شہاب مرحوم کی ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جو ان کی کسی اور کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں شہاب صاحب کے یادگار انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں جو ان کی زندگی کے کئی اہم گوشوں اور مختلف حوالوں سے ان کے تصورات اور نظریات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

شہاب صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ بیوروکریٹ، سفارت کار، افسانہ نگار، مقرر، سکرین رائٹر، انشا پرداز، ماہر تعلیم، دانشور اور ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ بھی ان کی شخصیت کے متعدد رنگ تھے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی اس رنگارنگ اور ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ ”شہاب نگر“ میں پہلی بار آشکار ہو رہے ہیں کہ اس کتاب میں ان کی آپ بیتی بھی ہے، ان کے مضامین بھی ہیں، خطبات بھی۔ خطوط بھی، افسانے بھی، ڈرامے بھی اور ان کا لکھا ہوا ایک فلم کا سکرپٹ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ دیکھا جائے تو اردو کا شاید ہی کوئی ادیب اتنی پہلودار شخصیت کا حامل ہوگا اور اتنے سارے پہلوؤں کی نمائندگی کے حوالے سے ”شہاب نگر“ اردو ادب میں یقیناً ایک غیر معمولی اضافہ قرار پائے گی۔

شہاب نگر کی دلیلیز پر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، اک شہر بے مثال آپ کے ساتھ ہے، اس کی سحر انگیز گلیوں، محلوں، باغوں، باغیچوں کی جانب قدم بڑھائیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس ”نگر“ کے مستقل رہائشی ہو کر رہ جائیں گے!!

مظفر محمد علی



الفرد

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور